بسم الله الرحمن الرحيم

انتخاب
تفسیر المیزان

(جلد: 1)

تالیف و تصنیف:

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

☆☆☆☆☆

مترجم:

علامہ سید افتخار حسین نقوی النجفی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں!

تعارف

نام کتاب:	انتخاب تفسیر المیزان
تالیف:	علامہ محمد حسین طباطبائیؒ
ترجمہ و حاشیہ:	سید افتخار حسین نقوی النجفی
معاونت:	مولانا محمد نقی
کمپوزنگ و فارمیٹنگ:	شاہد علی جعفری
فنی معاونت:	قرآن سنٹر، لاہور
جلد:	اوّل
ناشر:	مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر لاہور: 042-37211214

معراج کمپنی لاہور: 042-37361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد: 0333-5234311

فہرست

پیش لفظ 41

اظہار تشکر.. 42

تلخیص کرنے والے کا بیان 47

ا۔ صفات الٰہی کی نگہداری.. 50

فارسی مترجم کا بیان 53

احمد سیاح کا بیان 57

سورۃ الفاتحہ (مکی).. 59

مقصد.. 60

بسم اللہ کی افادیت واہمیت.. 60

حمد کا بیان.. 61

اللہ کی ربوبیت کا بیان 64

اللہ کی رحمانیت ورحیمیت.. 65

یوم حساب کا مالک 65

اللہ ہی کی الوہیت وعبادت.. 66

حقِ عبودیت 67

اللہ سے استعانت ومدد چاہنا.. 68

ہدایت کے بارے بیان 68
صراط مستقیم کی خصوصیت 69
صراط اور سبیل کا فرق 70

سورۃ البقرۃ (مدنی) 73
سورہ کے مطالب 73
حروف مقطعات 74
قرآن کا تعارف 75
تقویٰ اپنانے والے 76
تقویٰ کا معنی 77
غیب پر ایمان 78
ایمان کے مراتب 78
رسول اللہؐ کی جانب سے ڈرانے کا عمل 81
فطری ہدایت سے انحراف کا نتیجہ 83
کافروں کیلئے دو حجاب 83
منافقین کی صفات 84
دھوکے باز 85
بدنیت بیمار دل 86
فتنہ پرور اور فسادی 86
بے اعتبار 87

تکبر کرنے والے 88
دو غلے 89
منافقین کا انجام 90
منافقین کیلئے خسارے کا سودا 90
منافقین بھٹکے ہوئے، دربدر 91
منافقین اندھے، بہرے گونگے 92
کافروں کی حالت 93
منافقین فرار کی جستجو میں 94
تمام انسانوں کے لیے دعوت 95
اللہ کے انعامات کا تقاضا 96
قرآن کی حقانیت کا بیان 97
قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہ کرنے کی سزا 98
مومنین کے لیے بشارت 99
اللہ کا مثالیں دینے سے مقصد 101
اللہ کے ساتھ کیا گیا عہد توڑنا 103
نعمت وجود وحیات کا کفران کیوں؟ 105
اللہ کی انعامات سے آسمانوں اور زمین کی خلقت 106
حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت 107
حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم 110
فرشتوں کا اظہار لاعلمی 111

علم الٰہی کی وسعت 113
ابلیس کا حضرت آدمؑ کے سجدہ سے انکار 114
آدمؑ و حواؑ کی جنت میں سکونت 115
آدمؑ و حواؑ کا زمین پر اتارا جانا 119
حضرت آدمؑ کی توبہ کا قبول ہونا 120
اللہ کی ہدایت پر چلنا 122
اللہ کی آیات کا انکار کرنے کا انجام 124
بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا انجام 124
بنی اسرائیل کے لیے فرمان 126
حق و باطل کو ملانا 127
نماز اور زکات کا فریضہ 128
نماز اور صبر سے مدد طلب کرنا 129
اللہ کے پاس پلٹ کر جانا 131
بنی اسرائیل کے لیے یاددہانی 132
ایسا دن جس میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا 133
بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات اور ان کی نافرمانیاں 135
بنی اسرائیل کا جرم اور موسیٰؑ کیلئے کتابِ ہدایت 137
اللہ کو ظاہر بظاہر دیکھنے کی خواہش کا انجام 139
بنی اسرائیل پر بادل کا سایہ اور من و سلویٰ 140
الٰہی انعامات کی ناشکری پر سزا 141

حضرت موسیٰ کی قوم کے لیے پانی کی فراوانی 143
اللہ کی نعمت کا کفران 144
اللہ پر ایمان لانے والوں کا حال 146
الٰہی وعدہ کی یاد دہانی 147
وعدہ دینے کے بعد پھر جانا 148
عبرت و تذکر کے لیے واقعات کا بیان 149
قتل کا واقعہ اور اسکے بارے تحقیق کا عمل 150
گائے کے ذبح کرنے کا مسئلہ 153
قتل چھپانے کی سازش 154
قاتل کی نشاندہی 154
بنی اسرائیل پتھر دل 155
گائے کا قصہ 156
بنی اسرائیل کے جوان کا قصہ 157
یہودیوں کا پرانا رویہ 159
یہودیوں کی منافقت 160
اللہ کا علم مطلق 161
علم کے بغیر خواہشات کی پیروی 162
اللہ پر افتراء اور جھوٹ باندھنا 163
بنی اسرائیل کا جنتی ہونے کا دعویٰ 163
گناہوں کا نتیجہ 165

ایمان لانے والوں کیلئے نوید 165
بنی اسرائیل سے لیا گیا عہد و پیمان 166
بنی اسرائیل کی نافرمانی 168
بعض احکام کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا 170
آخرت پر دنیا کی ترجیح 171
رسولوں پر ایمان نہ لانا 172
سابقہ آسمانی کتابوں میں قرآن کی تصدیق 174
بنی اسرائیل کی نفسانی خواہشات کی پیروی 175
بنی اسرائیل کی بہانہ تراشیوں کا جواب 176
بنی اسرائیل کا موسیٰؑ کے معجزات کا انکار 178
بنی اسرائیل کے دعویٰ کا جواب 179
بداعمالیوں کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرنا 180
لمبی عمر کی آرزو 181
جبرئیل امین سے دشمنی 182
فرشتوں اور پیغمبروں کا انکار اللہ سے دشمنی 184
اللہ کی کتاب قرآن کا انکار کرنا 185
جادو کی تعلیم اور اس کا غلط استعمال 187
سحر کے ذریعے آزمائش و امتحان 189
ہاروت و ماروت کا جادو کی تعلیم دینا 191
اللہ کا اجر و ثواب 192

مومنوں کے لیے خصوصی فرمان 193

رسول اللہؐ سے اہل کتاب کی دشمنی کی وجہ 194

آیت کے نسخ ہونے کی حکمت 195

اللہ کی مالکیت اور یاوری 197

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات کرنا 198

یہودیوں کی سازشیں 198

نماز اور زکات کا فریضہ 200

یہودیوں اور نصرانیوں کا غلط دعویٰ 200

اللہ کے آگے تسلیم ہونا سعادت کی ضمانت 201

یہودیوں اور نصرانیوں کا ایک دوسرے کو جھٹلانا 202

پیغام 203

اللہ کے ذکر سے منع کرنے والے 203

پیغام 204

اللہ ہر سمت میں ہے 205

اللہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے 206

اللہ کی بے پایان قدرت اور احاطہ علمی 207

اللہ کے بارے غلط خیالات 208

پیغام 209

رسول اللہؐ کی ذمہ داری 210

یہود و نصاریٰ سے دوستی 211

قرآن کے نزول کا ہدف.. 212
بنی اسرائیل پر اللہ کا احسان.. 213
قیامت، اعمال کے بدلے کا دن.. 214
ابراہیمؑ کیلئے امامت کا عہدہ.. 215
امامت ظالموں کے لیے نہیں.. 217
کعبہ کے متعلق ابراہیمؑ کو اللہ کا حکم.. 218
مکہ کے بارے ابراہیمؑ کی دعاء.. 220
ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعاء.. 221
دعائیہ کلمات.. 222
اہل مکہ سے رسول بھیجنے کی دعاء.. 224
ملتِ ابراہیمؑ سے روگردانی.. 225
ابراہیمؑ کیلئے تسلیم ہو جانے کا فرمان.. 227
ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں کو وصیت.. 229
یعقوبؑ کا اپنی اولاد سے سوال.. 230
ہر ایک سے اسکے اعمال بارے سوال.. 231
مشرکین کی خواہش.. 232
سب نبیوں کی فرمانبرداری.. 233
ہدایت یافتہ ہی کامیاب ہیں.. 235
اللہ کا رنگ ہی بہترین رنگ ہے.. 235
سب کا رب اللہ ہے.. 236

تمام انبیاءؑ کا ایک دین پر ہونا 237
بے مقصد گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں 238
قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ 239
بندوں کا الٰہی امتحان 241
حالت نماز میں مسجد الحرام کی جانب رخ کرنے کا حکم 244
بنی اسرائیل کی ضد وہٹ دھرمی 246
جانتے پہچانتے ہوئے حق کو چھپانا 247
حق بارے شک و شبہ صحیح نہیں 247
اللہ کی ذات ہی ہر کام کا محور 248
رسول اللہؐ کا پسندیدہ قبلہ 249
مسجد الحرام کی جانب رُخ کرنے کا حتمی حکم 250
اہل مکہ پر اللہ کا انعام 252
اللہ کا ذکر اور شکر کرنا 252
نماز اور صبر سے مدد لینا 253
شہداء زندہ ہیں 255
امتحان اور آزمائش کا الٰہی قانون 257
رحمت الٰہی اور ہدایت پانے والے 259
مناسک حج اور طواف کعبہ 260
احکام الٰہی چھپانے والوں پر اللہ کی لعنت 261
توبہ اور اصلاح 262

کافروں کا انجام 263
ہمیشہ کا عذاب 264
توحید الوہی 265
صاحبان عقل کیلئے اللہ کی نشانیاں 266
کفار کا رویہ اور آخرت میں ان کا انجام 269
قیامت پیروکاروں سے بیزاری کا دن 271
قیامت کے دن حسرت کا اظہار 272
تمام انسانوں کیلئے خطابِ الٰہی 273
شیطان کی پیروی سے منع 274
بدی کی جانب شیطان کی دعوت 274
آباء واجداد کی پیروی کی سرزنش 275
کفار حیوانوں کی مانند 276
نعمات الٰہی پر شکر بجالانے کا حکم 278
حرام چیزوں سے پرہیز 279
اہلِ کتاب کی گمراہی 280
ہدایت کے بدلے گمراہی کے خریدار کا انجام 281
سچائی اور حق پر مبنی اللہ کی کتاب 282
نیکی کی قبولیت کا ضابطہ 283
قصاص کا حکم 285
قصاص کی حکمت 286

وصیت کا حکم.. 287
وصیت کو تبدیل کرنے کی ممانعت.. 288
وصیت میں کمزوریوں کی اصلاح کرنا.. 289
روزے کا قانون.. 290
روزہ رکھنے سے مستثنیٰ افراد.. 291
قرآن کا تعارف اور ماہِ رمضان کے روزوں کا حکم.. 294
اللہ دعاء کرنے والے کی دعا سنتا ہے.. 296
روزے کی حالت میں ممنوع چیزیں.. 299
طلوع فجر تک کھانے پینے کی اجازت.. 300
روزے کے اختتام کا وقت.. 301
معتکفین کے لیے فرمان.. 301
باطل طریقے سے دوسروں کا مال کھانا.. 302
چاند کی مختلف شکلوں کی حکمت.. 304
گھروں میں آنے کے آداب.. 305
مشرکین سے جہاد کا حکم.. 306
مشرکین کو مکہ سے نکال دینے کا حکم.. 307
مسجد الحرام میں قتال کا حکم.. 308
فساد کے خاتمے کے لیے لڑائی کا حکم.. 308
حج اور عمرہ کا حکم.. 311
حج کے مہینے.. 313

اعمال حج...315
عرفات اور مزدلفہ کے احکام...315
دنیا کے طالب کے لیے دنیا ہی ملے گی...316
اللہ سے دنیا و آخرت کی بھلائی کا سوال...317
جو مانگو گے وہی ملے گا...318
حج کے بعد کے اعمال...319
منافقین دو دل...320
منافقین فسادی ہیں...321
منافقوں کی روش...322
رضای الٰہی کیلئے اپنی جان بیچنے والے...323
شیطان کی پیروی سے دُوری کا حکم...324
بھٹکنے والے خود ہی خسارہ میں...325
بے جا خواہشات و مطالبات...325
بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتیں اور ان کی ناسپاسی...326
کافروں کا مزاج اور ان کے نفسانی رجحانات...328
انبیاءؑ سے پہلے انسانوں کی کیفیت...330
بہشت میں جانے کا ضابطہ...332
اللہ کی راہ میں انفاق...333
جہاد کا حکم...335
حرمت والے مہینے...337

ایمان عمل اور جہاد فی سبیل اللہ.. 338
شراب اور قمار کی حرمت 339
یتیموں سے نیک سلوک.. 341
مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم.. 343
ایام حیض کے احکام.. 345
بیویوں سے لطف اندوز ہونا 347
اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ.. 349
جھوٹی قسموں کا مواخذہ.. 350
بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم.. 351
ایلاء کے بعد کفارہ یا طلاق دینا.. 352
مطلقہ عورتوں کی عدت.. 354
طلاق کے دیگر احکام.. 356
تین دفعہ طلاق دی گئی عورت سے دوبارہ نکاح.. 358
طلاق کے بعد کے مسائل.. 360
عورتوں کے سرپرستوں کے لیے خصوصی فرمان.. 362
بچوں کو دودھ پلانے کے احکام.. 364
عدت وفات 366
عدت وفات کے دوران نکاح کا پیغام دینا.. 367
ہمبستری کرنے سے پہلے طلاق کا حکم 368
مہر مقرر کی گئی عورت کی طلاق کا حکم.. 370

نماز کے اوقات کی حفاظت 371

نماز خوف کا طریقہ 372

عدت وفات میں عورتوں کا نفقہ 373

مطلقہ عورتوں کا نفقہ 374

عقلمندی بارے تاکید 374

موت سے فرار ممکن نہیں 375

جہاد فی سبیل اللہ 376

قرض الحسنہ کی تاکید 377

بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی داستان 379

طالوت کا بادشاہ مقرر کیا جانا 380

طالوت کے لیے موسیٰؑ وہارونؑ والا صندوق 382

لشکر طالوت کا امتحان 384

مومنین کی فتح کی دعا 385

جالوت کے لشکر کی شکست 386

داستانوں کو بیان کرنے کی حکمت 387

پیغمبروں کی عظمت 389

اللہ کی راہ میں انفاق 392

اللہ کی ذات جامع صفات کمالیہ 393

دین میں جبر نہیں 396

ایمان کی نورانیت 399

حق کی دعوت کیلئے ابراہیمؑ کا استدلال........................ 401
اللہ تعالیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا 404
ابراہیمؑ کیلئے مُردوں کا زندہ کیا جانا........................ 406
راہ خدا میں خرچ کرنے کا اجر........................ 407
راہ خدا میں کئے گئے انفاق پر احسان جتانے سے منع........................ 409
مناسب بات، تکلیف دہ احسان سے بہتر........................ 410
احسان جتانے سے خیرات کا ضائع ہو جانا 411
رضائے الٰہی کیلئے خرچ کرنیوالوں کی مثال........................ 413
انسان کی طبیعت کا تقاضا........................ 414
اللہ کی راہ میں بہترین مال خرچ کرو........................ 416
شیطان کا تنگدستی کا وعدہ........................ 417
حکمت، خیر کثیر ہے........................ 418
انفاق کے متعلق اللہ کا علم........................ 419
ظاہری اور مخفی صدقات........................ 420
اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا انعام 421
خیرات کے مستحق افراد........................ 422
اللہ کی راہ میں ظاہری اور پوشیدہ انفاق........................ 423
سود کی حرمت اور اس کے خطرناک نتائج 424
سود اور صدقات کا تقابل........................ 426
خدا پر ایمان اور نیک اعمال کا صلہ........................ 428

تقویٰ کا حکم 428

سودی معاملہ اللہ اور پیغمبرؐ سے اعلان جنگ 429

اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ 430

تنگ دست کو مہلت دینا 430

قیامت کے دن سے ڈرو 431

قرض لینے اور دینے کی سند لکھنے کا حکم 434

تحریری دستاویز نہ ہونے پر گروی کا حکم 437

اللہ پورے جہان کا مالک 438

رسولؐ اللہ اور مومنین کا ایمان 440

طاقت کے مطابق ذمہ داری 441

سورہ آل عمران 444

مدنی۔ کل آیات 200 444

سورہ کے مطالب 444

اللہ کا تعارف 445

قرآن اور سابقہ آسمانی کتابیں 446

اللہ پر ہر چیز آشکار ہے 448

اللہ ہی تخلیق کرنے والا ہے 448

قرآن میں محکمات اور متشابہات 450

اللہ سے ہدایت پر قائم رہنے کی دعا 453

قیامت کا حوالہ 454
کافروں کا انجام 455
فرعون اور اس سے پہلے والی اقوام کا انجام 456
مشرکین کے لیے تنبیہ 457
اللہ کی راہ میں لڑنے والوں کی مدد 458
دنیاوی لذات 460
اخروی نعمات کی بہتری 462
اللہ کی رضا حاصل کرنے والے 463
مومنوں کی اللہ سے التجاء 464
مومنوں کے اوصاف 465
مومنین کے اوصاف پر اللہ کی گواہی 467
دین اسلام کی حقانیت 468
اہل کتاب کو رسول خداؐ کا جواب 470
آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے والے 471
محنت کا ضائع ہونا 472
اہل کتاب کا حق سے منہ موڑنا 473
بنی اسرائیل کا اپنی نجات کا غلط دعویٰ 474
قیامت کے دن سب کا جمع کیا جانا 475
اقتدار اور عزت اللہ کی طرف سے ہے 476
اقتدار اور عزت اللہ کے لیے ہے 477

دن اور رات کا نظام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔.................................. 479
مسلمان، کفار سے دوستی نہ کریں.................................. 480
اللہ کی ہر چیز سے آگہی.................................. 483
قیامت کے دن ہر عمل کا حاضر ہونا.................................. 484
قیامت کے دن گناہگاروں کی آرزو.................................. 484
اللہ کی محبت کا معیار.................................. 485
اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت.................................. 487
سارے جہان سے پسندیدہ بندے.................................. 488
حضرت عمرانؑ کی بیوی کا نذر ماننا.................................. 490
مادر مریمؑ کی اپنے رب سے مناجات.................................. 491
مادرِ مریمؑ کی دعا کا قبول ہونا.................................. 493
زکریاؑ کی اللہ سے پاک بچے کی درخواست.................................. 495
زکریاؑ کی دعا کی قبولیت.................................. 496
یحییٰ کی بشارت پر زکریاؑ کا تعجب.................................. 497
زکریاؑ کا دعا کی قبولیت کیلئے نشانی مانگنا.................................. 498
مریمؑ کے لیے اللہ کا پیغام.................................. 499
مریم کے واقعات اور زکریاؑ پر احسان.................................. 500
حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت.................................. 502
مریمؑ کا اپنی پاکدامنی اور بچے کی ولادت پر حیرانگی کا اظہار.................................. 504
حضرت عیسیٰؑ کی خصوصیات.................................. 505

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات..........507
حضرت عیسیٰؑ کا بنی اسرائیل کو خطاب..........509
بنی اسرائیل کیلئے واضح فرمان..........510
بنی اسرائیل کا امتحان..........511
اللہ سے حواریوں کی درخواست..........511
حضرت عیسیٰؑ کے خلاف سازش..........512
اللہ کا حضرت عیسیٰؑ کیلئے پیغام..........513
عیسیٰؑ کے پیروکاروں کے غلبے کی بشارت..........513
کفر اختیار کرنے والوں کا انجام..........514
نیک اعمال بجالانے والے مومنین کا صلہ..........515
اللہ کی آیات کا بیان اور عیسیٰؑ کی خلقت..........516
قرآن کی حقانیت..........517
مباہلہ کا واقعہ..........518
اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی داستانیں حق ہیں..........520
حق کا انکار کرنے والے..........521
توحید الوہی اور عبادی..........522
ایک دوسرے کو رب قرار دینے کی نہی..........523
جو الٰہ ہے وہی رب ہے..........524
ابراہیمؑ کے بارے اہل کتاب کا اختلاف..........525
علم کے بغیر کسی بات پر جھگڑا کرنا..........525

حضرت ابراہیمؑ کا تعارف..526
ابراہیمؑ کے قریب ترین افراد..527
مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی سازش..528
حق کی معرفت کے بعد اس کا انکار..528
اہل کتاب کی سرزنش..529
اہل کتاب کا آیات الٰہی پر ایمان لانا اور پھر انکار..530
اہل کتاب کی چالیں..531
فضل دینا اللہ کا اختیار ہے..533
اہل کتاب میں امانتدار اور خائن..534
عہد الٰہی کی پابندی، کرامت کا معیار..535
عہد الٰہی کو توڑنے والوں کا انجام..536
اہل کتاب کی کلام الٰہی میں تحریف..537
عبادت صرف اللہ کی ذات کیلئے ہے..538
اللہ کے سوا کوئی رب نہیں..539
انبیاءؑ سے لیا گیا میثاق..540
اللہ کا دین اسلام..542
تمام انبیاءؑ پر ایمان..543
اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں..544
ایمان لانے کے بعد کافر ہو جانا..544
ارتداد کے بعد توبہ..546

ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والے 546
کفر کی حالت میں مرنے والے 547
اللہ کی راہ میں بہترین چیزوں کا انفاق 548
بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی حلال چیزیں 549
اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینے والے 549
دین ابراہیمی کی پیروی 550
عبادت کے لیے بنایا گیا پہلا گھر 550
کعبہ کی عظمت اور فریضہ حج 552
اللہ اہل کتاب کے اعمال کا شاہد 553
اللہ کے راستہ سے روکنا 554
اہل کتاب کی اطاعت باعث کفر 554
آیات الٰہی سننے کے باوجود کفر اختیار کرنا 555
مومنین کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم 555
اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم 556
امر بالمعروف اور نہی از منکر 558
تفرقہ واختلاف کا سرچشمہ 559
اختلاف کرنے سے منع 559
قیامت کے دن سرخرو اور سیاہ رُو لوگ 561
آیات الٰہی کی تلاوت 562
سارے جہان کا مالک اللہ ہے 563

بہترین اُمت.. 564
ایذا رسانی کرنے والے ناکام لوگ 565
اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں کا انجام 566
سارے اہل کتاب برابر نہیں 567
اللہ کے احکام کی تصدیق کرنے والے 568
دعوت الٰہی کا انکار.. 569
اپنے اوپر ظلم کرنے والے.. 570
غیروں کو اپنا رازدار بنانے سے منع.. 571
یک طرفہ دوستی بے فائدہ.. 572
مومنوں کے ساتھ منافقوں کا رویہ.. 573
جنگ میں سستی کرنے پر مومنین کی سرزنش.. 574
جنگِ احد کے حالات.. 574
جنگ میں اللہ کی مدد 578
جنگِ بدر میں مومنین کی نصرت 579
اللہ کی مدد ملنے کی شرائط.. 580
ظاہری اسباب کی تاثیر اللہ کے اذن سے ہے 580
کافروں کو شکست دینے کے لیے الٰہی امداد.. 581
سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں.. 582
سود کھانے کی ممانعت.. 583
مومنین پر رحمت اتارنے کا وعدہ.. 584

رب کی بخشش اور جنت کی طرف سبقت.................................... 584
اللہ کے دوست.. 585
برائی کرنے کے بعد استغفار.. 587
متقین کا اجر و ثواب.. 588
زمین پر گھومنے کا حکم 588
الٰہی آیات کی عمومیت 589
غلبہ مومنین ہی کو حاصل ہوگا 589
الٰہی سنتیں 590
مومنین کی چھان پھٹک اور کافروں کی نابودی.............................. 591
مشکلات کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں 592
جنگ سے پہلے کی کیفیت 593
محمدؐ فقط اللہ کے رسول ہیں... 594
موت ایک قطعی الٰہی سنت 596
انبیاءؑ کے ہمراہ جنگ میں شریک ہونے والے 597
نیکی کرنے والے، اللہ کے پسندیدہ بندے.................................. 598
کافروں کی اطاعت کا انجام 599
کافروں کا انجام 600
ایمان والوں پر اللہ کا فضل... 601
رسول خداؐ کو چھوڑ کر بھاگنے والوں کی سرزنش 602
جہاد کرنے والوں پر اللہ کی نعمتیں.. 604

شیطان کے دھوکہ سے جہاد سے بھاگنے والے.................................. 607

مارنے اور زندگی دینے والا اللہ ہے.. 608

مومنین پر پیغمبرؐ کا نرم مزاج ہونا رحمت الٰہی..................................... 610

مومنین اللہ کی نصرت پر بھروسہ کریں.. 611

نبی خیانت نہیں کرتا... 612

اللہ کی اطاعت کرنے والا اور نافرمان برابر نہیں 613

رسول اللہؐ کی بعثت مومنین پر اللہ کا احسان ہے 614

مشکلات انسان کے عمل کا نتیجہ ہیں... 615

جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کا حوالہ.. 616

منافقوں کی بہانہ تراشیاں.. 617

اگر سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال دو... 618

راہ خدا میں مارے جانے والے زندہ ہیں 619

زخمی حالت میں نصرتِ رسولؐ پر قائم رہنے والے 621

اللہ مومنین کیلئے کافی ہے 622

اللہ کی نعمت سے بہرہ ور ہونا.. 623

انسان کی صورت میں شیطان.. 623

کفار اللہ کو کچھ بھی ضرر نہیں دے سکتے 624

ایمان کے بدلے کفر اختیار کرنے والے 625

کافروں کیلئے ڈھیل دینا.. 626

مومنوں کا امتحان سنت الٰہی ہے 627

اللہ کے عطاء کردہ فضل سے بخل کرنے والے.......... 628

یہودیوں کے اعتراض کا جواب.......... 629

عذاب، انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے.......... 630

یہودیوں کے مطالبے کا جواب.......... 631

پیغمبر اکرمؐ کو تسلی.......... 632

ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے.......... 633

اللہ کی طرف سے آزمائش کا سامان.......... 634

اہل کتاب سے لیا گیا عہد الٰہی.......... 635

بغیر عمل کے اپنی ستائش چاہنا.......... 636

اللہ مالک و قادر ہے.......... 637

صاحبان عقل کیلئے اللہ کی نشانیاں.......... 637

عقلمندوں کی خصوصیات.......... 638

مومنوں کی دعاء.......... 639

رسولوں سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ.......... 640

مومنین کی دعا کی قبولیت.......... 641

کافروں سے دھوکہ نہ کھائیں.......... 642

بدترین ٹھکانہ.......... 643

نیک لوگوں کیلئے اللہ کی ضیافت.......... 643

بعض اہل کتاب کیلئے اللہ کا اجر و ثواب.......... 644

مومنین کیلئے خصوصی ہدایت.......... 645

سورۃ النساء 647
سورہ کے مطالب 647
نسل انسانی کے پھیلاؤ کا تذکرہ 648
یتیموں کے اموال کا حکم 649
تعدد ازواج کا حکم 650
بیویوں کو حق مہر کی ادائیگی 651
اپنے اموال ناسمجھ لوگوں کے سپرد نہ کرو 652
یتیموں کے بلوغ کے بعد ان کے اموال کا حکم 654
وراثت کے احکام 656
میراث کی تقسیم کے آداب 657
یتیم بچوں کی فکر مندی 658
یتیم کے حق کا پاس رکھا جائے 659
وراثت کی تقسیم کا ضابطہ 660
بیوی اور شوہر کی میراث کے احکام 663
اللہ کی حدود کا لحاظ رکھنا 665
اللہ کی حدود کی مخالفت کا انجام 665
زانیہ عورتوں کی سزا کا قانون 666
بدکاری کرنے والے مَردوں کا حکم 667
توبہ کی قبولیت بارے 668
گناہ نہ چھوڑنے والوں کی توبہ 669

عورتوں کے حقوق 671
شوہر کا بیوی سے نباہ نہ ہونا 674
حق مہر کی واپسی بارے حکم 675
باپ کی منکوحہ سے شادی کا حکم 676
حرام رشتے 677
شوہردار عورتوں سے شادی کا حکم 679
عورتوں سے نکاح کرنے کے احکام 682
توبہ کی حقیقت 684
شہوات میں گھرے لوگ 685
انسان کے لیے آسانی 686
ایک دوسرے کے جان و مال کا احترام 687
مال کی حرمت کے بعد جان کی حرمت بارے بیان 687
اللہ کے قوانین کی مخالفت کی سزا 688
بڑے گناہوں سے بچنے کا فائدہ 689
ہر ایک اپنی حدود میں رہے 690
اموال میں وراثت کا قانون 692
شوہروں کا بیویوں پر اختیار 693
شوہر اور بیوی کے درمیان مصالحت کروانا 695
معاشرہ کے مختلف طبقات سے حسن سلوک کا حکم 696
دوسروں کے ساتھ تعاون نہ کرنے والے 698

دکھاوے کیلئے مال خرچ کرنا................................ 699
اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہ لانا................................ 699
اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا................................ 700
رسول اللہؐ کا اُمت پر گواہ ہونا................................ 701
قیامت کے دن کافروں کی خواہش................................ 702
نماز کیلئے طہارت و پاکیزگی کا حکم................................ 703
کتاب سے گمراہی حاصل کرنا................................ 704
دشمنوں کی شناخت................................ 705
یہودیوں کی بے راہ روی................................ 706
اہل کتاب کے لیے راہنمائی................................ 707
شرک ناقابل معافی جرم................................ 709
تزکیہ کے بارے بیان................................ 710
اللہ پر جھوٹ باندھنا................................ 711
اللہ کی لعنت کے مستحق................................ 713
آل ابراہیمؑ پر اللہ کا فضل و انعام................................ 714
یہودیوں کی تھوڑی تعداد کا ایمان لانا................................ 715
الٰہی آیات کا کفر کرنے والوں کی سزا................................ 716
صالح مومنین کیلئے انعامات................................ 717
انصاف اور امانت داری پر مبنی فیصلے کا حکم................................ 718
اللہ، اللہ کے رسولؐ اور اُولوالامر کی اطاعت................................ 719

ایمان کا دعویٰ کافی نہیں.. 722
منافقین کی نشانی.. 723
منافقین کی بہانہ تراشیاں 724
عذر پیش کرنے والوں کو جواب 725
رسول بھیجنے کا ہدف اور طلبِ مغفرت کا انداز 726
رسول اللہؐ کے فیصلہ کو قبول کر لینا.. 727
اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا... 728
اطاعت کرنے والوں کیلئے انعام.. 729
اللہ اور رسولؐ کے پیروکاروں کے رفقاء 730
فضیلت اللہ کی جانب سے ہے.. 731
جنگی حکمت عملی.. 731
جنگ سے جی چرانے والے.. 732
جنگ میں کامیابی کے بعد منافقین کا اظہارِ خیال.............................. 733
اللہ کی راہ میں جنگ کا ثواب.. 734
مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی امداد....................................... 735
مومنوں اور کافروں کے درمیان فرق 736
مسلمانوں کی عمومی حالت زار 738
موت کا ہر حال میں آنا.. 739
اچھائی اور برائی کی نسبت دینا 741
رسول اللہؐ کی بات کو ماننا... 743

رسول اللہؐ کے بارے منافقوں کی سازش 743
قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے کا واضح ثبوت 744
بغیر تصدیق خبر پھیلانے میں جلدی نہ کرنے کا حکم 745
اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کا حکم 747
شفاعت بارے بیان 748
تحیت وسلام کا جواب 749
قیامت کا حتمی ہونا اور سب کا اکٹھا ہونا 750
منافقین قابل رعایت نہیں 751
کافروں سے دوستی بارے 752
مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے والے منافقین کا حکم 754
دغا باز منافقین 755
مومن کے قتل کا بدلہ 756
قتل عمد کی سزا 758
سلام کرنے والوں کو غیر مسلم مت کہو 759
مجاہدین اور گھر بیٹھے رہنے والے برابر نہیں 762
اللہ کی طرف سے رحمت ومغفرت 763
اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کا انجام 764
مستضعفین کا حکم 765
مستضعفین کے لیے اللہ کی معافی 766
مہاجرین فی سبیل اللہ کے لیے وسعت 767

سفر میں نماز قصر پڑھنے کا حکم........................... 768
حالت جنگ میں نماز کا طریقہ........................... 770
فریضہ نماز کی اہمیت 771
دشمن کے تعاقب کا حکم 772
انصاف قائم کرنے کے لیے کتاب الٰہی کا اتارا جانا........................... 773
اللہ سے طلب مغفرت........................... 774
خیانت کار لوگوں کا دفاع نہ کرو........................... 775
اللہ کا انسان کے سارے اعمال پر احاطہ........................... 776
آخرت کا سخت مرحلہ 777
اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے........................... 778
گناہوں کا بوجھ گناہ کرنے والے پر........................... 779
بے گناہ پر تہمت لگانا صریح گناہ........................... 780
کفار تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے........................... 782
خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں 783
دوزخ، پیغمبرؐ کے مخالفین کا ٹھکانہ........................... 784
خدا مشرک کو نہیں بخشتا........................... 786
اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے والے........................... 787
شیطان پر اللہ کی لعنت 788
انسان کو گمراہ کرنے کے متعلق شیطان کا اعلان 789
شیطان کے جھوٹے وعدے........................... 791

شیطان سے دھوکہ کھانے والوں کا انجام.. 791
نیک کام کرنے والے مومنین کا انجام.. 792
برائی کرنے والے کو برائی کی سزا.. 793
نیک کام کرنیوالوں کے عمل کا پورا بدلہ.. 795
اسلام اور ایمان کا فائدہ.. 796
آسمانوں اور زمین پر اللہ کا احاطہ.. 797
یتیم عورتوں سے انصاف اور نیکی کا حکم.. 798
شوہر اور بیوی کا آپس میں سمجھوتہ.. 799
بیویوں کے درمیان عدالت قائم کرنے کا حکم.. 800
شوہر اور بیوی کی جدائی.. 802
اللہ تعالیٰ جہان ہستی کا مالک مطلق.. 803
اللہ کی مالکیت.. 804
اللہ کا اختیار.. 804
دنیا اور آخرت کا ثواب.. 805
انصاف کرنے کی تاکید.. 806
اجمالی اور تفصیلی ایمان.. 808
اللہ مرتدوں کو ہرگز نہیں بخشتا.. 809
منافقین کیلئے دردناک عذاب.. 810
کفار سے دوستی رکھنے سے منع.. 811
اللہ کے احکام کا مذاق اڑانے والے.. 812

منافقوں کی باتیں.................................. 813
منافقین کے بعض اوصاف 815
ایمان اور کفر کے درمیان سرگردان لوگ.................................. 816
ایمان والو! کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ 816
منافقین کا ٹھکانہ دوزخ کا نچلا درجہ.................................. 817
ایمان والوں کیلئے اجر و ثواب 818
سزا کی وجہ بندوں کے اعمال ہیں.................................. 819
بری بات کا اظہار ناپسندیدہ عمل.................................. 820
اعلانیہ اور خفیہ امور سے اللہ کی آگاہی.................................. 821
اہل کتاب کے حربے.................................. 822
کافروں کے لیے عذاب.................................. 823
اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان.................................. 824
اہل کتاب کے تقاضے 825
بنی اسرائیل کی عہد شکنی.................................. 827
اہل کتاب کی عہد شکنی کی سزا.................................. 828
بنی اسرائیل کا مریمؑ پر بہتان باندھنا.................................. 829
مسیحؑ کا زندہ رہ جانا.................................. 830
عیسیٰؑ کا اللہ کی طرف اٹھایا جانا.................................. 831
موت سے پہلے اہل کتاب کا عیسیٰؑ پر ایمان 833
یہودیوں کے لیے سزا.................................. 835

یہودیوں کے درد ناک عذاب کی وجہ 836
علم میں پختہ مومنین کا اجر 837
انبیاءؑ الٰہی کا تذکرہ 838
رسولوںؑ کا تذکرہ 839
رسولوںؑ کو بھیجنے کا ہدف 840
قرآن کی حقانیت پر اللہ اور فرشتوں کی گواہی 841
راہ خدا میں رکاوٹ ڈالنے والے گمراہ 841
قرآن کے منکرین کی سزا 842
منافقین کے لیے ابدی عذاب 843
رسول اللہؐ پر ایمان لانے کا حکم 843
دین میں غلو نہ کرو 845
مسیحؑ بندہ خدا 846
مومنین اور کفار کا انجام 847
اللہ کی جانب سے واضح دلیل 848
اللہ کا سیدھا راستہ 849
کلالہ کے احکام 850

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾

"قسم ہے ان (فرشتوں) کی جو مسلسل بھیجے جاتے ہیں، پھر تیز رفتاری سے چلنے والے ہیں، پھر (صحیفوں کو) کھول دینے والے ہیں۔"

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے انسان کو پیدا فرمایا ہے اور اسے بیان کی نعمت سے نوازا۔ انتہائی شکر ہے اس ذات کا جس نے ہمارے اوپر احسان فرمایا کہ ہم قرآنی ثقافت کی سربلندی کے راستہ میں قدم بڑھائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفسیر المیزان کا چار جلدوں میں خلاصہ شائع ہوا اور اس کا عربی میں خلاصہ "مصطفیٰ شاکر" جو کہ لبنانی ہیں انہوں نے کیا اور اس عربی خلاصہ کا فارسی میں ترجمہ "فاطمہ مشایخ" نے کیا۔ ہمارے لیے جناب شیخ امین صاحب جو کہ معراج کمپنی لاہور کو سنبھالے ہوئے ہیں قرآنیات اور معارف اسلامی سے متعلق کتابیں چھاپ رہے ہیں، انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم اس خلاصہ کا اردو میں ترجمہ کردیں۔ چنانچہ ہم نے خلاصہ تفسیر المیزان کا اردو ترجمہ چوتھی جلد سے ترجمہ شروع ہوا اسکے بعد تیسری جلد کا ترجمہ مکمل کیا۔ اسکے بعد دوسری جلد کا ترجمہ کیا گیا، آج پھر مورخہ ۱۳ نومبر 2020ء بروز جمعہ بوقت پانچ بجے شام جامعہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا میں پہلی جلد کا ترجمہ شروع کر رہے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ سے دُعا ہے کہ یہ ترجمہ جلد مکمل ہو جائے تاکہ اس کے چھاپنے کے مراحل طے ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہماری اس مساعی کو اپنے بارگاہ میں قبول کرے۔

اظہار تشکر

- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے اپنی معرفت عطاء کی اور مجھے دل کا اندھا نہیں رہنے دیا۔
- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرار دیا۔
- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے امیر المومنین علی علیہ السلام اور ان کی اولاد سے آئمہ معصومین کی ولایت سے وابستگی کی نعمت عطاء کی۔
- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے میرا رزق اپنے ہاتھوں میں رکھا اور میرے رزق کو لوگوں کے سپرد نہیں کیا۔
- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے میرے گناہوں اور عیبوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈال دیا اور مجھے اپنی مخلوقات میں رسوا نہیں کیا۔
- تمام حمد ہے اللہ کے لیے جس نے مجھے مہربان والدین اور دلسوز و ہمدرد اساتذہ سے نوازا اور مجھے اپنے دین کی سمجھ بوجھ دی اور دین کی ترویج کرنے کی توفیق عطاء فرمائی۔

میرے اوپر اللہ کی ان گنت نعمات ہیں جن کا شکر بجالانا میرے بس میں نہیں۔ جن نعمات کا شمار نہیں تو پھر ان کا شکر کیسے بجالایا جائے، بس اظہار عجز ہے کہ اے اللہ! توں کریم ہے، تیرا بے پایاں فضل میرے اوپر ہے، ان سب نعمتوں کے شکر بجالانے سے عاجز اور قاصر ہوں، توں میری خطاؤں کو معاف کردے اور جو توفیقات دے دی ہیں وہ مجھ سے واپس نہ لے اور میرا خاتمہ بالخیر فرما۔

میرے والدین اور ان تمام افراد پر اپنی رحمتیں نازل فرما جن کا میری تربیت میں کردار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیقات سے عالم اسلام میں قرآن مجید کی عظیم "**تفسیر المیزان**" کے خلاصہ کا ترجمہ مکمل کیا۔ اس کام پر تین سال لگ گئے۔اس کے ترجمہ کا نام "**انتخاب تفسیر المیزان**" رکھا گیا۔ جیساکہ بیان کیا جاچکاہے کہ تفسیر المیزان عربی زبان میں عظیم انسان، عالم، عارف، فقیہ، علامہ سید محمد حسین الطباطبائیؒ کی تالیف و تصنیف ہے۔اس کا خلاصہ لبنان کے عالم دین مصطفیٰ شاکر نے عربی میں کیا اور پھر اس عربی تلخیص کا فارسی میں ترجمہ ایک عالمہ فاضلہ محترمہ فاطمہ مشایخ نے کیا اور اس کے ترجمہ کی نظر ثانی عالم فاضل محقق جناب احمد سیّاح نے کی۔

قرآنی معارف کو عام کرنے کے لیے مصباح القرآن ٹرسٹ کے زیر انتظام ادارہ المعراج نے عربی، فارسی میں لکھی گئی قرآن کی تفاسیر کو اردو زبان میں ترجمہ کرواکر شائع کرنے کا بیڑہ اٹھار کھا ہے اور ہمارے عزیز جناب شیخ امین صاحب جو سیٹھ برادران کے چشم وچراغ ہیں وہ پوری دلجمعی سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ قرآن کے ساتھ ساتھ حدیثی منابع کے تراجم کو بھی اردو زبان میں ترجمہ کروا کر شائع کرنے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں۔ان کی خواہش اور اصرار پر مجھے یہ توفیق ملی کہ میں اس عظیم تفسیر کے خلاصہ کا اردو میں ترجمہ کروں ۔اب یہ ترجمہ تیار ہو کر اشاعت کے مراحل طے کرنے کے بعد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس ترجمہ کی تکمیل اور اس کو اصل سے تطبیق دینے میں چند فضلاء نے میری معاونت کی جن میں سب سے زیادہ عالم فاضل جناب ڈاکٹر مولانا محمد نقی استوری صاحب نے

وقت دیا اور پورے ترجمہ کو بار بار پڑھا اور اصل سے اسے تطبیق دیا۔ ان کے علاوہ مرکز تحقیقات منتہائے نور کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر مولانا تصور عباس سرگانی فاضل قم، جناب مولانا یعقوب توحیدی، جناب مولانا توقیر عباس کاظمی اور ڈاکٹر محسن ہاشمی صاحب نے بھی کتاب قابل اشاعت بنانے میں حصہ ڈالا۔ کیونکہ ترجمہ کے بعد کمپوزنگ کے مراحل، پھر پروف ریڈنگ اور اصل کتاب سے ترجمہ کو تطبیق دینا یہ سب کچھ تنہا میری بساط میں نہ تھا اس لیے ان تمام فضلاء کی شراکت کسی نہ کسی حوالے سے اس کتاب کو مفید بنانے میں مفید رہی۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اس کا بڑا اجر دے۔ میں اس جگہ مرکز تحقیقات منتہائے نور کے سینئر کمپوزر جناب شاہد علی جعفری کی محنت اور کاوشوں کا ضرور تذکرہ کروں گا کہ انہوں نے نہ فقط کمپوزنگ کے کام کو انجام دیا بلکہ مجلدات کی تیاری، بڑے حروف میں قرآن مجید کی اوریجنل فائل و فونٹ کی جناب امجد علوی کے توسط سے فراہمی، قرآنی آیات کی ترتیب و ترجمہ، ہر آیت کے ساتھ اندراج، پھر ہر مجلد کا ایک سورہ قرآن سے آغاز اور ایک سورہ پر اختتام اور اس کے علاوہ جتنے بھی امور تھے انہیں بڑی محنت سے انجام دیا۔ ان کے ساتھ جناب عدیل عباس اور سید شاہد نقوی کمپوزنگ کے مراحل میں معاونت کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس عظیم کام میں جتنے افراد نے کام کیا ہے انہیں اس کا بڑا اجر دے اور اپنے کلام کی برکت سے قارئین کو بھرپور فائدہ کی توفیق دے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب مصطفیٰ محمد ﷺ اور ان کی آل پاک صلوات اللہ علیہم کے وسیلہ سے ہمارے اوپر اپنے انعامات کو جاری رکھے اور ہمیں ہر وہ کام کرنے کی مزید توفیق دے جس میں اس کی رضا ہو اور ہمیں اپنے ولی اعظم بقیتہ اللہ حضرت امام مہدی عجّ اللہ تعالیٰ فرجہ

الشریف کی عالمی اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدو جہد کرنے والے ان کے ناصران اور معاونین سے قرار دے۔ اور ہمیں قرآن پاک کے معارف عام کرنے کی توفیق کے ساتھ ساتھ قرآن واہل بیت علیہم السلام سے تمسک کرنے والوں میں برقرار رکھے۔

اللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا هٰذَا وَ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ بِحَقِّ حَبِيْبِكَ الْمُصْطَفٰى وَ عِتْرَتِهِ الطَّاهِرِيْنَ عَلَيْهِمُ السَّلَام ـ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى فَاطِمَةَ وَ اَبِيْهَا وَ بَعْلِهَا وَ بَنِيْهَا وَسِرِّ الْمُسْتَوْدَعِ فِيْهَا بِعَدَدِ مَا اَحصَاهُ عِلْمُكَ۔ وَ الْعَنْ اَعْدَائَهُمْ اَعْدَاءَ الدِّيْنِ مِنْ يَوْمِ عَدَاوَتِهِمْ اِلٰى قِيَامِ يَوْمِ الدِّيْنِ وَ بَعْدَ يَوْمِ الدِّيْنِ۔

الاحقر

سید افتخار حسین نقوی النجفی

سربراہ امام خمینی ٹرسٹ میانوالی

۱۵ جنوری ۲۰۲۲ء اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تلخیص کرنے والے کا بیان

تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے مخصوص ہیں جس نے اپنے عبد پر سچی اور گرانقدر کتابیں بلندی کی جانب سے اتاریں تاکہ بنی نوع انسان کی ترقی کی طرف ہدایت ہو۔ یہ کتابیں مؤمنین کو بشارت دیتی ہیں، مومنین جو کہ نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کے ہاں بہت اچھا بدلہ ہے۔ درود و سلام اس رسول امین پر کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انہیں پورے عالمین کے لیے رحمت ہونے کے ناطے شاہد بنایا، بشارت دینے والا، ڈرانے والا اور اللہ کی جانب دعوت دینے والا بنایا۔ انہیں روشن چراغ قرار دیا اور ان کے اہل البیت علیہم السلام پر درود و سلام کہ جن کی دوستی اور محبت کو اپنی رسالت کے اجر کے طور پر بیان کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان اہل البیت علیہم السلام کو اپنے ارادے سے ہر قسم کی پلیدی سے دُور کیا اور انہیں پاکیزہ کیا جس طرح پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ لِیُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَیۡتِ وَ یُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِیۡرًا ﴿۳۳﴾ (سورۂ احزاب آیت ۳۳)

ترجمہ: ”اللہ یہی چاہتا ہے کہ اے اس گھر والو تم سے ناپاکی دور کردے اور تمہیں خوب پاک کرے“

یعنی انہیں پاک و پاکیزہ اور طاہر بنایا ہے۔ سلام ان اصحاب باوفا پر کہ جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں موجود تھے اور بہت زیادہ مشقتیں تکالیف اٹھائیں اور آپؐ کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مصداق بنے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ تَرٰىهُمۡ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانًا ۫ سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ ۚۖۛ وَ مَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ ۚ۟ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَّ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٢٩﴾ (سورۂ فتح آیت ۲۹)

ترجمہ: ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں، تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع و سجود کر رہے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں سجدہ کا نشان ہے، یہی وصف ان کا تورات میں ہے، اور انجیل میں بھی ان کا وصف ہے، مثل اس کھیتی کے جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے قوی کر دیا پھر موٹی ہو گئی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی کسانوں کو خوش کرنے لگی تاکہ اللہ ان کی وجہ سے کفار کو غصہ دلائے، اللہ نے ان میں سے ایمان داروں اور نیک کام کرنے والوں کے لیے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔“

اسی طرح یہ مثال اصحاب پیغمبرؐ کی ہے جو کمزوری سے طاقت میں پہنچیں گے تاکہ دُنیا کے کافروں کو رام کریں اور انہیں ان کی کامیابیاں دیکھ کر غصہ آئے، خدا نے وعدہ دیا ہے کہ ان میں سے ہر وہ جو ایمان لے آئے اور نیک عمل بجالائے تو اللہ اسے معاف کرے گا اور اسے بڑا اجر اور بڑا ثواب عطا کرے گا۔ اللہ کا سلام اور اللہ کے فرشتوں کا درود و سلام اللہ کے نیک بندوں اور اس کے مقرب فرشتوں پر اور ہر اس پر درود و سلام جو قیامت کے دن تک ہدایت کے راستے پر چلے گا۔

اس تفسیر کا جائزہ لینے کے بعد چند امور واضح ہونگے، ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

اس تفسیر میں آیت کی آیت سے تفسیر کی گئی ہے یا صحیح روایت کو لیا گیا ہے جو میسر آسکی ہے۔ عام طور پر خلاصہ کو مد نظر رکھا گیا ہے اور ایک تفسیر پر اکتفاء کیا گیا ہے یا تفسیر کی بعض وجوہات میں سے کہ جو سب سے بہتر تھی اسے لکھا گیا ہے۔ آیات کی مراد کو بیان کرنے اور اس کے مفردات کی تفسیر کرنے اور ان کے معنی کو واضح کرنے اور ان سے جو مقاصد ہیں ان کو روشن کرنے کے لیے ایسا طریقہ اپنایا ہے کہ جس سے ہر سطح کے لوگوں کے لیے سمجھنا

آسان ہو۔ المیزان کی تفسیر کے بعینہٖ الفاظ کو لایا گیا ہے اور جہاں پر اختصار کا امکان نہیں تھا تو وہاں اس کے معنی کو ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کی علمی اصطلاحات سے کچھ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ جسے قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں اس سورہ سے جو مقصد ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔ معنی کو زمانہ حاضر کے ساتھ مربوط کرنے کو اپنایا گیا ہے۔ بعض آیات کی تفسیر کے متعلق جو شبہات اور سوالات عام لوگوں کے درمیان ہیں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ لفظی مسائل سے توجہ ہٹاتے ہوئے اصل معنی کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فلسفی، تاریخی، علمی اور روایتی ابحاث کو بیان نہیں کیا گیا کیونکہ اس کتاب کا ہدف خلاصہ تھا، اس کتاب میں تفصیل ہدف نہیں تھا لہٰذا ان تفصیلی ابحاث کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (سورہ آل عمران، آیت: ۱۰۳)

ترجمہ: ''اور سب مل کر اللہ کی رسی مضبوط پکڑو اور تفرقہ میں نہ پڑو''

کوشش یہ ہے کہ دُنیا کے انتہائی آخری نقطہ تک رہنے والے مسلمان اس قرآن سے اور اس الٰہی رسی سے وابستہ رہیں، اسے مضبوطی سے پکڑیں، لہٰذا اس تفسیر کا جو ہدف ہے وہ زیادہ تر یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تعلق مضبوط ہو اس الٰہی رسی کو تھامنے سے اور روزانہ ایسے افکار، نظریات اور مختلف مفادات کی وجہ سے جو کشمکش اور جھگڑے ہیں ان کو چھوڑا جائے۔ قرآن بہت سارے امور میں ایک مضبوط دستاویز ہے اور جس کو پڑھانے سے یہ اختلافی موارد سے بچا جا سکتا ہے:

۱۔ صفات الٰہی کی نگہداری

اللہ تعالیٰ احد و یگانہ ہے، صمد و بے نیاز ہے، ہر شئے کو خلق کرنے والا ہے، غالب ہے، بخشنے والا ہے، قائم ہے، قیوم ہے، روزی دینے والا ہے، عالم ہے، عادل ہے۔ اس کے سارے نام حسنیٰ ہیں، اس کی ساری صفات جمال و کمال ہیں جو اس کی شان کے لائق ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے ہر نقص سے پاک و منزہ ہے۔
وہ عاجز نہیں ہے، ظلم نہیں کرتا، ہر عیب سے دور ہے۔

۳۔ توحید خالص کی دعوت جو کہ شرک اور بت پرستی کی نجاست سے حقیقت میں پاک ہو۔

۴۔ ہر وہ شخص جو اللہ کا خلیفہ اور جانشین ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو جانشینی اور قائم مقامی کی صفات کے ساتھ ہم آہنگ کرے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا ہے۔

۵۔ اس بات کی تاکید کہ قرآن اور سنت تمام زمانوں کے لیے اور تمام جگہوں کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ زمین کے کمزور لوگوں پر احسان کرے اور انہیں زمین کے پیشوا، وارث اور حاکم بنائے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد مومنین کے لیے ہر صورت محقق ہو گی، جب ان میں وہ ساری شرائط پائی جائیں گی۔

۶۔ یہ یادآوری کہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے، دنیا دار آزمائش ہے جو بھی اچھا عمل کرے گا وہی کامیابی کی طرف بڑھے گا، یہ امتحان گاہ ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۟ۙ (سورۃ الملک، آیت: ۲)

ترجمہ: ''جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے کام اچھے ہیں اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔''

انسان کا انجام اور اس کا آخری نتیجہ اس زندگی میں جو بھی روش اپنائے گا اور جس راستے کا انتخاب کرے گا اسی کی مناسبت سے ہو گا۔ بنا بریں قرآن ہر دور میں علم، دین، قصص، تاریخ، تجارت، اخلاق، سرحدات، معروف اور منکر کے مسائل کا تعین کرتا ہے اور ان سب چیزوں کو ہمارے لیے محفوظ رکھا ہوا ہے اور ہم نے اسی سے راہنمائی لینی ہے۔ پس اے میرے رب! یہ کوشش قبول کرلے۔ میں تیرے ذکر کے وسیلہ سے، تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور تجھ سے خود تیرے وسیلہ سے سفارش اور شفاعت مانگتا ہوں، تجھ سے میں چاہتا ہوں، پس مجھے کرامت دے، بخشش دے، اپنے قرب میں جگہ دے، اپنا شکر بجالانے کی توفیق دے اور اپنی یاد کا الہام مجھے کر دے، بندگی کی شیرینی اور عبادت کی مٹھاس مجھے عطا کر دے، مجھے محبت اور اپنی دوستی کے باغات میں جزاء دے دے، مجھ سے در گزر فرمالے، اے میرے رب! جو تیری ہمسائیگی میں، تیری جناب میں تقصیر اور کوتاہی کی ہے اس کتاب کا خلاصہ کرنے کے لیے جو کچھ مجھ سے چھوٹ گیا ہے مجھے معافی دے دے۔ میرے والدین کو بخش دے۔ ان پر رحمت فرما جنہوں نے بچپن میں میری پرورش کی اور تمام مومنین جو قیامت کے دن حساب کے لیے اٹھیں گے ان سب کو معاف کر دے۔ علامہ محمد حسین طباطبائی جنہوں نے تفسیر المیزان لکھنے میں عرق ریزی کی اور محنت کی اور اتنا قیمتی سرمایہ ہمیں دے کر گئے انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھ اور اپنے بے حساب انعامات ان کو عطا کر اور جو بھی تفسیر قرآن کے راستے میں کوشش کرنے والا ہے اس پر مہربانی کر۔

(وآخردعوانا أن الحمدلله رب العالمین)

آخری دعا یہی ہے کہ ساری حمد، سارا شکر اللہ رب العالمین کے لیے مخصوص ہے۔

مؤلف خلاصہ تفسیر المیزان

کمال مصطفیٰ شاکر

فارسی مترجم کا بیان

اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے آغاز ہے ، اے رب تو کریم ہے، بندہ نواز ہے، اے رحیم ! تو راز سے آگاہ، مسکینوں کا آشنا، عاشقوں کا فریاد رس اور درماندگان کے لیے پناہ گاہ، اے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کے لیے رسول بھیجے اور انسان کے باطن میں بھی عقل جیسا رسول قرار دیا اور ظاہر میں بھی اپنے خاص بندے ، اپنے مخلص محمد مصطفیٰ ﷺ کو رسول بنا کر انسانوں میں روانہ کیا۔ میرا درود و سلام اس پر اور اس کے خاندان پر۔ رب تعالیٰ کی بے انتہاء اور بے بدل ایسی اچھی توفیق بندہ ناچیز کو میسر ہوئی کہ میں ایک ایسے کام میں ہاتھ ڈالوں کہ جو مہربان رب کے ہاں مقبول ہو اور اس کے نزدیک ابدی توشہ قرار پائے، ابدی زندگی کا سرمایہ بنے۔ اگر اس میں ریاکاری، فخر و مباہات کا شائبہ ہو تو وہ فقط میرے ناتواں کندھوں پر اس کا وبال اور بوجھ ہے کیونکہ کلام جو نور ہے اور اس خالق کے کلام کا سمجھنا جو خالق نور ہے، بے نور مجسموں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ صاحب نور مردان حق کا کام ہے۔ اے میرے رب ، میرے پروردگار میں تجھ سے مدد کی طالب ہوں۔ مجھے بلند ہمت عطا کر، ایسی نیت کہ جس میں ریا کا کوئی شائبہ نہ ہو اور وہ خالص ہو۔ یہ بات بھی ہے کہ ہماری نظر انتہائی سطحی ہے ، ایک ایسا سرمایہ جو علامہ طباطبائی جیسی بے مثال شخصیت کا اثر ہے۔ تفسیر المیزان جس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک جامع نگاہ سے قرآن کی معرفت رکھتے ہوئے آیات الٰہی کو فلسفی، اخلاقی ، تاریخی، مختلف نگاہوں کے ساتھ مورد توجہ قرار دیا ہے اور اس طرح انہوں نے ایک گہرا اور وسیع اثر کتاب کی شکل میں چھوڑا ہے۔ چند موارد پر نگاہ کرتے ہوئے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ المیزان ایسی تفسیر نہیں ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ہر ایک کے لیے قابل استفادہ ہو کیونکہ :

ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تفسیر بہت مفصل ہے اور اس کی ساری مجلدات تک ہر شخص کی رسائی مشکل ہے۔

۲۔ اس تفسیر کی علمی سطح بہت بلند ہے۔ اس سطح کو عام لوگوں کے لیے سمجھنا اور اس کی گہرائی تک پہنچنا مقدور نہیں ہے۔

۳۔ مطالب کی تفصیل اور پھیلاؤ اس حد تک ہے کہ ایک عام پڑھنے والے کے حوصلے سے باہر ہے اس کے دائرے سے باہر ہے۔

ان نکات کی وجہ سے تفسیر المیزان کے بارے میں یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ اس تفسیر سے فقط اہل تحقیق اور فضلاء ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ تو ایک بات ہے، دوسری طرف یہ بھی ہے کہ ''مَالَایُدْرَکُ کُلُّہ، لَایُتْرَکُ کُلُّہ'' اگر کُل کو پایا نہیں جا سکتا تو کُل کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ دریا کے پانی کو پورا نہیں کھینچ سکتے تو جتنی پیاس ہے اتنا پانی تو لے لو۔ پس ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اتنی اہم کتاب فقط لائبریریوں کی زینت رہے اور فقط اہل فضل اور علماء و محققین ہی اس سے استفادہ کریں۔ یہ سوچ کئی سال پہلے بندہ حقیر کی نظر میں تھی لیکن المیزان کی تفصیل اور اس کی وسعت نے مجھے اس میں وارد ہونے سے روکے رکھا۔ یہاں تک کہ اسے رب تعالیٰ کی جانب سے حسن توفیق کہیے کہ تہران میں "کتاب کی نمائش گاہ" میں مجھے کچھ عربی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا کہ ان میں ایک کتاب " مختصر تفسیر المیزان" سامنے آئی جو کمال مصطفیٰ شاکر کے قلم کا نتیجہ تھا۔ اس کتاب کو دیکھتے ہی گویا میری پرانی آرزو بر آئی اور اس نے ایک حقیقت کا روپ دھار لیا، اس کو دیکھا، ورق گردانی کی اور یہ طے کیا کہ اس کو میں لے کر اس کا فارسی ترجمہ خلاصہ کے طور پر کروں گی، اس انداز سے فارسی ترجمہ کروں گی کہ تفسیر کے

تمام چاہنے والے، تفسیر قرآن سے دلچسپی رکھنے والے اس سے فیضیاب ہو سکیں۔ لیکن جب بہت دقت کے ساتھ اس کتاب کے متن کا مطالعہ کیا تو یہ مطلب واضح ہوا کہ آقائے مصطفیٰ شاکر نے "تفسیر المیزان" کا بہت ہی زیادہ خلاصہ کر دیا ہے۔ جس وجہ سے بعض اہم مطالب رہ گئے ہیں لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ اصل المیزان کی طرف بھی رجوع کیا جائے اور اس کا بھی دقیق مطالعہ کیا جائے اور بعض ایسے موارد جن میں زیادہ اختصار تھا اس کو کامل کر دیا جائے۔ اس طرح میں نے قرآن کی اکثر آیات میں اسی روش کو اپنایا یعنی جو مطالب مصطفیٰ شاکر کی کتاب میں موجود تھے اس کا ترجمہ کیا اور جو مطالب ان کی قلم سے رہ گئے تھے لیکن اصل میزان میں موجود تھے؛ ان کا ترجمہ بھی ملا دیا اور بہت تھوڑی جگہوں پر بعض ایسے نکات جو دوسری تفاسیر میں تھے انہیں حاشیہ میں ذکر کر دیا۔ بہت تھوڑی ایسی روایات جو کتاب میں موجود تھیں لیکن شیعوں کے مزاج کے ساتھ مناسب نہیں تھی اور اصل کتاب میں بھی وہ موجود نہیں تھیں تو ان کو بھی چھوڑ دیا۔ لیکن مجموعی طور پر ہم نے امانت میں عدالت کا لحاظ رکھا اور اکثر موارد میں عربی متن کی جو کتاب ہے اس کا بعینہٖ فارسی ترجمہ کیا گیا اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے کہ مطالب کا انتخاب کیسا ہوا ہے اور یہ کہ ترجمہ المیزان کا کامل نمونہ ہے اس کے مطالب کو استاد ارجمند آقائے احمد سیاح کی خدمت میں پیش کیا اور ان کی راہنمائی سے استفادہ کیا۔

اختتام پر رب کریم سے عفو و درگزر کی درخواست ہے اور اسی طرح اساتید اور اہل فن سے درخواست ہے کہ میری اس کوشش میں کوئی کمزوری رہی ہو تو اساتید اور اہل فن

مجھے آگاہ کریں گے کیونکہ اتنی بڑی علمی کتاب کی تلخیص کرنے میں بھول چوک ضرور ہو سکتی ہے۔

اے رب تعالیٰ اپنی بے انتہاء رحمت علامہ طباطبائی، صاحب المیزان کی روح پر نثار فرما اور کمال مصطفیٰ شاکر جس نے اس کام کو آگے بڑھانے میں سعی کی اور اس عظیم تفسیر کا عربی زبان ہی میں خلاصہ کیا ان کی سعی و کوشش کو قبول فرما اور اپنی ہدایت کے راستے میں انہیں استوار اور قائم رکھ اور میری اس معمولی سی کوشش کہ میں نے اسے فارسی زبان میں منتقل کیا اسے اپنی درگاہ میں قبول فرما اور اسے تقویٰ کے راستے میں قرار دے، ہمیشہ اسی راستے پر قائم رہوں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ متقین ہی سے قبول کرتا ہے۔

﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾

والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

فاطمہ۔ مشایخ

احمد سیاح کا بیان

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ (سورۃ الحجر، آیت: ۸۷)

ترجمہ: ”اور ہم نے تمہیں سات آیتیں دیں جو (نماز میں) دہرائی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن دیا۔“

یہ کتاب تفسیر المیزان کا خلاصہ ہے جسے لبنان کے فضلاء میں سے کمال مصطفیٰ شاکر نے علامہ طباطبائی کی مفصل تفسیر کا کیا ہے۔ ایک فاضلہ اور تعلیم یافتہ خاتون نے عربی سے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ترجمے کا متن میرے سامنے پڑھا گیا اور اس کا جائزہ لیا گیا اور جہاں پر کتاب کے متن میں موجود مطالب تفسیر المیزان کے اصل سے یا دیگر منابع سے مختلف تھے اور حاشیہ میں ذکر ہوئے تھے اسے حاشیہ میں ذکر کیا گیا۔ میں اُمید رکھتا ہوں کہ صاحبان امر کی توجہات کے سائے میں بالخصوص حضرت ابن الحسن علیہ السلام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف، کوئی مطلب اگر رہ گیا ہے تو وہ اُن کی توجہات سے نہ رہا ہو اور ظواہر کا جائزہ لیتے ہوئے قرآن کے جو بے انتہاء باطن ہیں اس سے ایک گوشہ کو حاصل کر سکے ہوں کیونکہ معتبر روایت ہے قرآن کریم کے سات باطن ہیں اور صحیح تاویل اور توجیہ ان کے پاس ہے جو قرآن کے مخاطب ہیں اور اس سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام ہیں کہ وہی قرآن کے اصل مخاطب ہیں اور ہم عام مسلمان قرآنی حقائق سے بہت تھوڑا استفادہ کر سکتے ہیں۔ عام مسلمان فقط قرآن کے ظواہر کو سمجھ سکتے ہیں اور انہی ظواہر میں بھی ان کے درمیان اختلاف ہے۔ بندہ ناچیز نے قرآن کے بے انتہا سمندر سے ایک قطرے کے عنوان سے مشکل آیات سے جو ایک موئید ہے اور حدیث مشہور ثقلین کی حامل ہے، میں نے اسے اپنے مقدمہ میں قرار دیا ہے اور اس کے اطراف میں تھوڑی سی گفتگو کروں گا۔

پہلا ترجمہ جو اکثر تفاسیر میں آیا ہے یہ سورہ حجر کی آیت ۸۷ کے بارے میں: ''اے رسول گرامی بتحقیق ہم نے تجھے دو سے سات دیئے ہیں اور قرآن عظیم دیا ہے''۔

ا۔ قرآن کریم کی ۱۱۴ مبارک سورتوں میں سے سورہ حمد اہم ترین سورہ ہے جس سے کتاب کو کھولا جاتا ہے آغاز ہے کتاب کا۔ قرآن سورہ حمد کے بغیر عظیم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے بغیر ناقص ہے۔ امام باقر علیہ السلام سے تفسیر صافی میں آیا ہے کہ قرآن عظیم یہی قرآن ہے جو ان دو جلدوں میں لکھا ہوا ہے۔

۲۔ آیہ مذکور میں '' سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ '' آیا ہے لیکن سورہ حمد کا نام سبع الثانی ہے۔

۳۔ صحیح روایت میں ہے کہ نحن مثانی، ہم مثانی ہیں۔

۴۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور آپؐ کی دختر گرامی اور آپؐ کے بارہ جانشین عطیہ الٰہی ہیں جو خلیفہ حقیقی اور قرآن کو بیان کرنے والے ہیں اور یہی ذوات گرامی سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ ہیں۔

۵۔ چودہ معصومین علیہم السلام سات ناموں میں مشترک ہیں۔ محمد، علی، فاطمہ، حسن، حسین، جعفر، موسیٰ علیہم السلام۔

یہ ایک آیت اور اس کا سادہ ترجمہ ہے جس سے پانچ نکات استفادہ کیئے گئے ہیں۔

اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ آیات کے باطن کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں دقت چاہیے لیکن وہی بات ہے کہ جب سب نہیں پا سکتے تو جو جتنا لے سکتا ہے اس کو نہ چھوڑا جائے۔

احمد سیاح ۱۴۲۰ ہجری

سورة الفاتحہ (مکی)

(کل آیات: ۷)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۱

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۲

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۳

بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝۴

جزا کے دن کا مالک۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝۵

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝۶

ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝۷

مقصد

اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اپنے ذاتی کمال کے وسیلے سے اور اپنے افعال کے وسیلے سے جو اس سے ظاہر ہوتے ہیں، تمجید کی ہے کہ وہی عالمین کا رب ہے، وہی بخشنے والا ہے، وہی پورے عوالم پر غالب ہے۔ یہ سورہ اختصار کے باوجود تمام عقائد، معاملات، اجتماعی امور، اخلاقیات سب کو شامل ہے اور اس میں دین کے اصول توحید، معاد، نبوت اور ہدایت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

بسم اللہ کی افادیت واہمیت

کلام کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام سے کیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام برکت والا ہے۔ اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات سے ہی ہر شئے کا آغاز ہے اور یہ ایک ادب ہے کہ جب گفتار اور آپس میں بندے بات کریں تو مؤدب ہوں اور اس کا لحاظ رکھیں اور اللہ کے نام سے آغاز کریں تاکہ ان کا عمل بے ثمر اور باطل نہ ہو کیونکہ ہر عمل جس میں اللہ کا نام نہ ہو وہ باطل اور بے نتیجہ ہے۔ پس جو بھی عمل یا کسی کام کی جو مقدار اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو وہی درگاہ الٰہی میں قبول ہے اور اگر غیر خدا کے لیے ہوگا تو اللہ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کل امر ذی بال لم یبدا فیه باسم الله فهو ابتر

”ہر وہ امر جس کی کوئی اہمیت ہے اگر وہ اللہ کے نام سے آغاز نہ ہوگا تو وہ ناقص، بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔“

قرآن کا ہدف ہدایت ہے، لہٰذا ہر سورہ کا آغاز بسم اللہ سے ہے اور اس بسم اللہ کا ربط اور تعلق اسی سورہ کے ساتھ ہے جو بعد میں شروع ہو رہی ہے۔ پس ہدایت اللہ کے نام سے ہے جو بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہی خدا ہے جو تمام بندوں کا مرجع اور ماویٰ ہے، وہی بخشنے والا

ہے، وہ اپنے بندوں پر رحمت نازل کرتا ہے چاہے مؤمن ہے چاہے کافر ہے۔ اور خاص رحمت مومنین کے لیے ہے جو اس کی رحیمیت ہے۔ آخرت میں نیک بختی اور سعادت مومنین کے لیے ہے اور وہی رب تعالیٰ کی ہمسائیگی اور سائے میں ہونگے۔

پس بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اللہ کا کلام ہے اور خدا اپنے بندے کی نیابت میں کہہ رہا ہے تاکہ عبودیت کے اظہار کے مقام میں اپنے بندوں کو عبودیت کا طریقہ تعلیم دے۔ تاکہ عبد کے اعمال میں اس کی بندگی کا اظہار اس کی عبودیت کی روش کے مطابق متجلی ہو۔ اسم مشتق ہے، "سمہ" سے جس کا معنی ہوتا ہے علامت، یا "سمو" سے ہے، جس کا معنی رفعت اور بلندی ہے۔ دوسرا معنی صحیح تر ہے۔ لفظ جلالہ "اللہ" کی اصل الہ ہے جو کہ (الہ) کے مادہ سے نکلا ہے جس کا مطلب پرستش ہے یا پھر اس کا مادہ (ولہ) ہے جو حیرن ہونے کے معنی میں ہے۔ کیونکہ عقل اللہ کے بارے میں حیران اور متحیر ہے۔ پس لفظ جلالہ "اللہ" اسم ہے اس ذات مقدس کے لیے جو ازلی ہے، ابدی ہے، تمام صفات کمالیہ، جمالیہ کی جامع ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کو اپنی جانب ہدایت فرماتا ہے۔

"اَلرَّحۡمٰن" مبالغہ کا صیغہ ہے اور کثرت پر دلالت کرتا ہے، یعنی رحمت کا بہت زیادہ ہونا "رَحِیۡم" صفت مشبہ ہے جو رحمت کے دوام اور بقاء پر دلالت کرتا ہے۔ رحمٰن اس صفت پر دلالت کرتی ہے جو سارے بندوں کو شامل ہے چاہے وہ مؤمن ہوں یا کافر۔ لیکن رحیم والی صفت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خداوند کی خاص رحمت مومنین کے لیے ہے، جو دائمی ہے، یہ رحمت ثابت اور باقی ہے یہ آخرت میں مومنین کو عطا ہو گی۔

حمد کا بیان

"اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ" حمد اس ستائش اور ثناء کو کہتے ہیں جو ارادے اور اختیار کے ساتھ انجام دئے جانے والے نیک عمل کے مقابلے ہوتی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہ خبر دی

ہے کہ اس نے جو کچھ خلق فرمایا ہے وہ کسی اجبار یا قہر کی بناء پر نہیں ہے بلکہ وہ واحد القہار ہے ، یعنی کسی نے اللہ کو خلق کرنے پر مجبور نہیں کروایا۔ سورہ الرعد، آیت ۱۶: اللہ واحد بھی ہے قہار بھی ہے، اس نے جو کچھ خلق کیا ہے علم اور اختیار سے اور ہر چیز کو بہترین طریقہ پر خلق کیا ہے، جو اس کے لیے ممکن تھا اس شئے کے لیے اسے اچھا بنایا جائے۔ ”جس نے ہر شئے کی خلقت کو خوبصورت ترین بنایا ہے، اس سے زیادہ خوبصورت وہ نہیں بن سکتی جو اللہ نے بنائی ہے“۔ (سورہ سجدہ آیت ۷)

کوئی مخلوق نہیں مگر وہ اللہ کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے خوبصورت ہے ، کیونکہ ہر حسن اور زیبائی اللہ ہی کی تخلیق کردہ ہے۔ پس اللہ کی مخلوق اس کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے حَسِین ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سارے اسماء زیبا اور خوبصورت ہیں اور سارے افعال جمیل ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ پس حمد کی جنس اللہ کے ساتھ ہی مخصوص ہے، ہر حمد اللہ کے لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں ہے، وہ اللہ جس کی ذات پاک و منزہ ہے۔ اس نے بندے کو اپنی تعریف خود تعلیم دی ہے، تلقین کیا ہے کہ وہ کس طرح اللہ کی حمد بجالائے اور مقام بندگی میں کس طرح اس کا لحاظ رکھے۔ اس لحاظ سے حمد توصیف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توصیف کی ہے کہ وہ تمام وصف کرنے والوں کی توصیف سے منزہ اور برتر ہے۔ اللہ کی ذات ہر اس چیز سے جس سے وہ وصف بیان کرتے ہیں منزہ ہے۔

سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾ (سورۃ الصّٰٓفّٰت، آیت: ۱۵۹)

ترجمہ: ”اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو وہ بناتے ہیں۔“

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡهِنَّ ؕ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ کَانَ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۴﴾ (سورۂ اسراء آیت: ۴۴)

"ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور ایسی کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ بردبار بخشنے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی حمد کو تسبیح کے ساتھ ملایا ہے کیونکہ اللہ کے سواء کوئی بھی موجود اللہ کی صفات جمالیہ، اسماء اور اللہ کی صفات کمالیہ کااحاطہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جو بھی وصف کرے گا اس کا احاطہ کرے گا اور اس کا احاطہ کرے گا تو اسے محدود کر دے گا۔ موصوف، بیان شدہ وصف کے ساتھ محدود ہو جائے گا جبکہ اللہ تعالیٰ کسی حد میں محدود نہیں ہے۔ پس ہماری طرف سے حمد اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک ہم پہلے اللہ کو ہر حد، ہر محدودیت اور ہمارے ناقص فہم کے اندازے سے منزہ نہ کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے خالص بندوں کی نیابت میں اپنی حمد کو ان کی زبان سے بیان کیا ہے اور ان کے وصف کرنے کو خود اپنا وصف قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اے میرے پروردگار! میں تیری ستائش نہیں کر سکتا۔ میں اس طرح تیری ستائش کرتا ہوں جس طرح تو نے خود اپنی ذات کی تعریف فرمائی ہے۔

اللہ کی ربوبیت کا بیان

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "رب" سے مالک مراد ہے جو اپنے مملوک کے امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔[1] بندے کا قیام اور اس کی زندگی اور اس کے تمام حالات سے متعلق سب کا مالک اللہ ہے۔ انسان کے اجزا خود اس کے ہیں، ہاتھ پاؤں، کان، قدرت، قوت سب انسان کے وجود سے وابستہ ہیں، لیکن وہ مستقل نہیں ہیں۔ خداوند نے ان اعضاء میں انسان کو تصرف اور دخل اندازی کا اختیار دیا ہے۔ اس کے لیے ایک راستہ بنایا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے بہشت میں داخل ہو۔ تمام مخلوقات کا حقیقی قوام اور ان کی موجودگی ذات الٰہی سے ہے۔ ہر گز وہ اللہ کی مشیت اور ارادے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ خداوند کی مالکیت حقیقی ہے، اعتباری اور قراردادی نہیں ہے۔ اور اللہ کی مالکیت ہر گز عوالم اور جہانوں سے جدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ختم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس میں وقفہ آتا ہے۔

"**عالمین**" عالَم کی جمع ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جس کے بارے میں علم حاصل کرنا ممکن ہو۔ یہ کلمہ تمام موجودات کو شامل ہے اور ان میں سے ہر ایک کو بھی عالم کہا جاسکتا ہے۔ نیز ہر نوع کو بھی عالَم کہا سکتا ہے۔ جیسے عالَم نباتات، عالَم حیواانات، عالَم انسان۔ اسی طرح عالَم کواکب۔ ہر نوع کی جو صنف ہے اس کو بھی عالَم کہتے ہیں جیسے عالَم عرب، عجمی دنیا، انسانوں کی دنیا، جنات کی دنیا۔ اللہ تعالیٰ تمام عوالَم کا رب ہے اور سب کی تدبیر کرنے والا ہے۔ تمام عوالَم کے لیے نظام دیا ہے اور ہر عالَم اللہ کے نظام کے تحت چل رہا ہے۔

---

[1] - رب، عام طور پر پرورش کرنے والا، تربیت کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

اللہ کی رحمانیت ورحیمیت

"الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝" ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دو صفتیں ہیں۔ خداوند دنیا میں رحمان ہے، اور آخرت میں رحیم ہے۔ ہر دو صفتیں اللہ کے فعل جمیل پر ستائش ہیں۔ کبھی تو فعل جمیل کی ستائش اس حوالے سے ہوتی ہے کہ خود فاعل کی زیبائی اور حسن کا ادراک کرے یا فاعل کی صفات کی زیبائی اور حسن کو سمجھ کر اور کبھی اس کا مقام اور مرتبہ اور کبھی اس سے شوق اور اشتیاق، کبھی اس سے ڈر۔ ان تمام پہلوؤں سے اللہ کی ذات رحمانیت ورحیمیت کے وصف سے متصف ہے اور وہی لائق تعریف ہے۔ سب تعریفیں ہر حوالہ اور ہر عنوان سے اسی کے لیے ہیں۔ رحمٰن ورحیم کا فرق پہلے بیان کر آئے ہیں۔

یوم حساب کا مالک

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝" مُلک زمان سے منسوب ہے۔ "مٰلِكِ" وہ ہے جس کے ہاتھ میں کسی قوم کا نظام اور ان کے اُمور کی تدبیر ہو۔ خدا وہ ہے جو روز جزاء کا مالک ہے جس کی خود اللہ نے اپنی طرف نسبت دی ہے۔ وہ فیصلہ کا مالک ہے۔ یہ معنی ہوگا "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝" پڑھیں۔ اور اگر "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝" پڑھیں تو ملک، خلقت اور ایجاد اس کے لوازمات میں سے ہے یعنی قیومیت الٰہی، اللہ تعالیٰ "مُلك" کا مالک ہے کیونکہ اسی کا نفوذ کارفرما ہے۔ پس خداوند تبارک و تعالیٰ مَلِك ہے یعنی بخشش کی قدرت کا مالک اللہ ہے اور روکنے کا مالک بھی اللہ ہے۔ دین کے دن کا مالک اللہ ہے۔ دین سے جزاء اور بدلہ مراد ہے۔ تمام اعمال کا جس دن بدلہ دیا جائے گا اس دن کا مالک اللہ ہے۔ جو رب العالمین ہے، جس کے لیے ساری حمد ہے۔

اللہ ہی کی الوہیت و عبادت

"اِیَّاكَ نَعْبُدُ" عبد، مخلوق کو کہتے ہیں خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان۔ عبادت کا معنی یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کی مملوکیت کے مقام میں قرار دے۔ اسی لیے عبادت، استکبار کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝٦٠ (سورۂ غافر، آیت: ٦٠)

"بے شک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں عنقریب وہ ذلیل ہو کر دوزخ میں داخل ہوں گے"۔

عبادت شرک سے منافات نہیں رکھتی بلکہ کبھی شرک کے ساتھ بھی محقق ہو جاتی ہے جیسا ایک غلام کے چند افراد مالک ہوں۔ یا جیسا کہ مشہور ہے انسان متعدد خداؤں کی عبادت کرے، یہ شرک ہے خدا نے شریک قرار دینے کو ممکن قرار دیا ہے، عبادت میں شریک ہو سکتا ہے اسی لیے منع کیا ہے کہ عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ کیونکہ اگر عبادت میں شریک بنانا ممکن نہ ہوتا تو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝١١٠ "(سورۂ کہف آیت: ١١٠)"اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے"۔

شرک کے مصادیق میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اللہ کی پرستش کرے لیکن اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے، اللہ کی پرستش کرے لیکن خدا کے علاوہ دوسرے عوامل کو جزوی یا کلی طور پر عبودیت کے مقام پر قرار دے۔

اس لیے اللہ نے فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾ (سورہ یوسف، آیت: ۱۰۶)

ترجمہ: ''اور ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں۔''

حقِ عبودیت

حق عبودیت مطلق ہے یعنی اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے۔ ساری مخلوقات علی الاطلاق اور بغیر قید و شرط کے اللہ کی مملوک ہیں۔ پس ربوبیت منحصر ہے مالکیت میں اور معبود ہونے میں، خلق منحصر ہے عبودیت اور بندگی میں، مخلوق کے لیے عبودیت کے علاوہ کوئی اور شان ہے ہی نہیں اسی لیے فرمایا: ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ''۔ ''اِيَّاكَ'' مفعول ہے اسے مقدم رکھا ہے کہ ہم فقط تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی عبادت اس جملے میں مطلق اور نامحدود ہے۔

واجب ہے کہ معبود حاضر موجود کی عبادت کی جائے۔ اللہ کا حضور مطلق ہے لہٰذا بندے کی شان بھی یہ ہے کہ وہ عبادت کے مقام میں غفلت نہ کرے، حاضر اور موجود رہے۔ اسی لیے صیغہ مخاطب سے استفادہ ہوا ہے کہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تجھ کا خطاب اسی کو کیا جاتا ہے جو موجود اور حاضر ہے۔ لہٰذا عبادت کا ہدف خدا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے اور اگر عبادت غیر خدا کی ہو گی تو عبادت شمار نہیں ہو گی۔

اگر کوئی خداوند تبارک و تعالیٰ کی عبادت بہشت کی لالچ یا دوزخ کے ڈر سے کرے تو اگرچہ عبادت اپنی ذات میں پسندیدہ عمل ہے، لیکن اس قسم کی عبادت اخلاص اور غیر خدا سے مطلق انقطاع سے منافات رکھتی ہے لہٰذا متکلم مع الغیر، یعنی جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، یہ اس لیے کہ نفس کو عبادت کے مقام پر سرکوب کیا جائے، ''مَیں'' نہ کہا جائے، کہا گیا ہے کہ ہم عبادت کرتے ہیں یعنی یہاں پر بھی خود بینی نہیں ہونی چاہیے، اپنی ذات مدنظر نہ ہو۔ جب انسان عبادت کر رہا ہے تو فناء ہو کر کرے کیونکہ اس مقام میں فردیت، انا اور استقلال مقام

بندگی کے ساتھ منافی ہیں۔ انسان بندگی کے معاملے میں اپنی عبادت کو ناچیز دیکھے، لہٰذا جمع کا صیغہ لایا گیا ہے تاکہ اور افراد کو شامل کرکے مخلص بندگان کے وجود کی برکت اسے حاصل ہو جائے اور اس طرح اس کی عبادت قبول ہو جائے۔

اللہ سے استعانت و مدد چاہنا

"اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝" یعنی جس عبادت کی نسبت ہم اپنی طرف دے رہے ہیں اسی عبادت میں بھی تجھ سے مدد لیتے ہیں کیونکہ ہمارا اپنا استقلال ہے ہی نہیں، ہم بے حیثیت ہیں۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ان دونوں جملوں کا معنی یہ ہے کہ ہماری عبادت خالصانہ ہے، اس میں ریا کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ ایاک کا تکرار اسی لیے کیا گیا ہے کہ ایسی مخلصانہ عبادت بھی تیری مدد کے بغیر نہیں ہے، تیری مدد سے ہی ہم تیری عبادت کر رہے ہیں، ہمارے پاس کوئی طاقت و قوت نہیں ہے، ہماری اپنی کوئی استقلالی حیثیت نہیں ہے۔ ان آیات میں ہمیں تعلیم دیا گیا ہے کہ اگرچہ ہر کام میں اللہ سے مدد لینا ہے لیکن اللہ کی عبادت خالصانہ کرنے میں اللہ کی مدد ضروری ہے۔ اس سے اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر عمل اللہ کی مدد و اعانت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اللہ ہی سب کا مددگار اور سرپرست ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

ہدایت کے بارے بیان

"ہدایت" یعنی سیدھے راستے کی راہنمائی۔ "صراط" راہ یا سبیل کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ راستہ ایک نہیں بلکہ متعدد ہیں تو اس جگہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کا راستہ ایک ہی ہے، اسے صراط مستقیم کہا جاتا ہے۔ باقی جو راستے ہیں وہ متعدد ہیں وہ راستے اللہ کے نہیں ہیں۔ اللہ کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ صراط مستقیم ہے۔ اس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہے۔

صراط مستقیم کی خصوصیت

پھر اس صراط کی خود تفصیل بتادی کہ

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ [1]

ان کا راستہ جو طالب ہدایت ہیں، جن کی عبادت اپنے رب کے لیے خالص تھی اور تو نے ان پر انعام کیا اور انہیں بلند مقام عطا کیا۔ مؤمنین الٰہی آیات کے ذریعہ اس راستے پر آنا چاہتے ہیں۔ تکبر نہیں کرتے اور پستی کی طرف نہیں جاتے؛ وہ راستہ جو غضب الٰہی کا موجب ہے جیسے یہودیوں پر غضب آیا، جیسے:

وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝۸۱ (سورۂ طہ)

ترجمہ: ''اور جس پر میرا غضب نازل ہوا سو وہ گڑھے میں جا گرا''۔

وہ راستہ جو گمراہوں کا ہے وہ پھر ہدایت میں نہیں آتے اور وہی ضالّون یعنی انہوں نے اپنا راستہ گم کیا ہوا ہے۔ مغضوب وہ ہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے اور وہ یہودی ہیں اور جنہوں نے شرک اپنایا، وہ نصاریٰ ہیں اور وہ ضلالت پر ہیں۔ شرک گمراہی اور ظلم ہے۔ پس صراط مستقیم ایسا راستہ ہے جو گمراہ کرنے والا نہیں ہے وہ صحیح راستہ ہے، اس میں ظلم نہیں ہے، شرک نہیں ہے، انحراف نہیں ہے اور اس کے باطن میں کفر اور شرک نہیں ہے اور نہ ہی ظاہر میں۔ جو صراط مستقیم پر ہیں وہ اپنے جوارح میں معصیت نہیں کرتے، عبادت میں کوتاہی نہیں کرتے۔ علمی اور عملی توحید یہی ہے، توحید نظری اور توحید عملی، اس کی کوئی تیسری شق ہے ہی نہیں۔ حق کو چھوڑو تو بس گمراہی ہی گمراہی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے راہ مستقیم کی تلاش کرنے والوں کو بہت ساری نعمتیں دی ہیں لیکن ان تمام نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کی سب سے

---

[1] ۔ علامہ طباطبائی نے سورہ نساء کی آیت: ۶۹ کو مد نظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے انعام کئے ہوئے لوگوں کو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین قرار دیا ہے۔

عظیم نعمت صراط مستقیم ہے۔ مختلف راستے خدا سے دُور کرتے ہیں اور متعدد راستوں میں فقط ایک ہی راستہ ہے جو صراط مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے:

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (سورۂ عنکبوت، آیت: ۶۹)

”اور جنہوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم انہیں ضرور اپنی راہیں سمجھا دیں گے، اور بے شک اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے“

صراط اور سبیل کا فرق

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ”الصراط“ کی نسبت اپنی مخلوقات میں سے کسی کی طرف نہیں دی بلکہ جہاں مخلوق کی طرف نسبت دینی ہو وہاں ”سبل“ کا لفظ استعمال کیا ہے، ”سبل“ وہ راستے ہیں جو انبیاء کے نہیں ہیں۔ پس صراط، شرک کا راستہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی شرک کے ساتھ ہم نشین ہے۔ ”صراط“ کئی نہیں ہو سکتے، ”صراط“ ایک ہے، سبیل کئی ہو سکتے ہیں اور ان میں گمراہی اور ایمان اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا سبیل شرک کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے لیکن صراط شرک کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا ہے۔ عبادت وہی ہے جو صراط مستقیم ہے۔ دین، راہ مستقیم ہے اور صراط کا کلمہ روشن راستہ، واضح راستہ ہے اور یہ (ص، ر اور ط) سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے نگلنا۔ کیونکہ روشن راستہ اپنے اوپر چلنے والوں کو گویا نگل رہا ہے اور انہیں ہضم کر رہا ہے جس کے نتیجے میں اس پر چلنے والے دائیں بائیں منحرف نہیں ہو سکتے ہیں۔ پس راہ مستقیم ان کی حفاظت کرتا ہے اور یہی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔

"الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ﴿٧﴾" اس کا خاص معنی بھی کیا گیا ہے کہ جو ولایت آئمہ علیہم السّلام کا انکار کرتے ہیں یا ان پر سب کرتے ہیں یا اہل غلو ہیں یا ان کے حق میں زیادہ روی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا؛ اے علی علیہ السّلام تم ہی صراط مستقیم ہو۔ آئمہ اہل البیت علیہم السّلام کو بھی صراط مستقیم کہا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی صراط مستقیم ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ یہ ذوات مقدسہ، اللہ تعالیٰ کی پہچان ہیں اور اللہ کے راستے کا نشان ہیں۔ جو ان کا راستہ ہے وہی اللہ کا راستہ ہے۔ ان کی اتباع سے ہی انسان صراط مستقیم پر چل سکتا ہے۔ یہ ذواتِ مقدسہ صراط مستقیم کی پہچان ہیں۔ اس لیے ان پر صراطِ مستقیم کا لفظ بولا گیا ہے)۔ (اردو مترجم)

سورۃ البقرۃ (مدنی)

کل آیات: 286

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورہ کے مطالب

اس سورہ میں آگاہی دینا ہے کہ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحان اللہ تعالیٰ اور اس کے جتنے نمائندے ہیں، جتنے انبیاء ہیں ان پر ایمان لے آئیں، کسی پیغمبر کی نفی نہ کریں اور یہ کہ حضور پاک ﷺ پر اللہ نے قرآن کریم نازل کیا، اور پھر جو اس سے استفادہ کرنے والے ہیں ان کا تذکرہ ہے، منافقین کا ذکر ہے، کافروں کا ذکر ہے، سازشیوں کا حوالہ ہے اور راہ مستقیم کی راہنمائی ہے اور قبلہ تبدیل کرنے کے احکام ہیں، حج کے احکام ہیں اور دیگر اسلامی قوانین اس میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ مفصل سورہ ہے اور اس میں گویا کہ مسلمانوں کے لیے پورا پروگرام دیا گیا ہے۔

الف، لام، میم، یہ تین حروف ہیں کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس میں کوئی ابہام اور تردید نہیں ہے۔ یہ متقین اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾

ترجمہ: ال مٓ۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾

ترجمہ: ”یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی بھی شک نہیں، پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے“۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

ترجمہ: ''جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

ترجمہ: اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ پر، اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا، اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

ترجمہ: ''وہی لوگ اپنے رب کے راستہ پر ہیں، اور وہی نجات پانے والے ہیں۔''

حروف مقطعات

(الف، لام، میم) یہ حروف مقطعات ہیں یعنی حروف کو توڑ توڑ کر لایا گیا ہے۔ ان کا ایک معنی تو مجموعی طور پر یہی ہے کہ جو کچھ اس سورہ میں ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے اور ان میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت والی آیات انہی حروف سے تشکیل پائی ہیں جو اعلیٰ مطالب پر مشتمل ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ الف ایک نام کی طرف اشارہ ہے، لام دوسرے نام کی طرف اشارہ ہے، میم تیسرے نام کی طرف اشارہ ہے۔ مجموعہ بھی اشارہ ہے ایک اسم کی طرف۔ حروف مقطعات کے بارے میں اور بھی تفصیل آئے گی [کل قرآن میں چودہ حروف مقطعات ہیں۔ ان سے اگر تکرار ہونے والے

حروف کو حذف کر دیا جائے تو ایک با معنی جملہ بنتا ہے: ''صراط علی حق نمسکہ'' علیؑ کا راستہ حق ہے جس کو ہم تھامتے ہیں، جس کو ہم مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔

قرآن کا تعارف

''ذلک الکتاب'' کتاب ''الف لام'' کے ساتھ الکتاب کہا گیا ہے اور اس سے مراد قرآن ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں احکام الٰہی، تمام معارف اور معلومات موجود ہیں اور انسانوں کی ہدایت کے لیے اخلاقی مواعظ اور نصائح ہیں، عقلی دلیلیں ہیں اور انسان کی راہنمائی کی گئی ہے کہ اس کی سعادت اور خوشبختی کس میں ہے اور انسان کے تمام حالات میں اللہ کے نظام کی طرف راہنمائی کی گئی ہے کہ کس طرح انسان منظم اور مربوط پروگرام پر چل کر ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے۔

''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' یعنی یہ ایسی کتاب ہے، کہ اس میں کچھ بھی باطل نہیں ہے جیسا کہ سورہ صافات کی آیت: ۴۲ میں بھی ہے کہ اس کتاب کے سامنے اور پیچھے کوئی بھی باطل اور غلط اور غیر صحیح بات نہیں ہے۔ جو کچھ اس کتاب میں ہے وہ حق پر مبنی ہے اور حقیقت پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے علوم برہانی اور عقلی معارف ہیں اور اس میں بیان شدہ مطالب بغیر عقلی دلیل اور بغیر برہان اور ثبوت کے نہیں ہیں اور اس میں کوئی تغیر نہیں آسکتا، اس میں تحریف نہیں آسکتی۔ اس کے علوم کے مقدمات سب کے سب یقینیات سے ہیں، ان میں توہم نہیں ہے اور نہ ہی ان میں کسی قسم کا شک اور شبہ باقی رہ جاتا ہے، نہ ہی وہ خیال پردازی ہے۔ نہ ہی ماضی کے قصے کہانیاں ہیں۔ اس میں جو کچھ ہے وہ حقائق ہیں اور انسان سازی کے لیے مفید ہیں۔ اس میں جو بھی ہے حق ہے کچھ بھی باطل نہیں۔ الکتاب سے مراد قرآن ہے اور اختصار کے ساتھ اس کا تعارف کروایا گیا ہے۔

تقویٰ اپنانے والے

" هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ " یہ قرآن کا وصف ہے کہ وہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔ متقین تقویٰ اپنانے والوں کو کہتے ہیں۔اور تقویٰ ایسی صفت ہے جو انسان کے ایمان کے تمام مراتب کو جمع کرتا ہے۔ تقویٰ کا مطلب اللہ کے اوامر اور نواہی کی رعایت کرنا ہے۔

ان آیات میں متقین کی پانچ صفات بتائی گئی ہیں:۔

۱۔ غیب پر ایمان رکھنا۔

۲۔ نماز قائم کرنا جو کہ عبودیت اور عبد ہونے کا مظہر ہے۔

۳۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے روزی دی ہے اس سے خرچ کرنا (یہ زکوٰۃ کا مظہر بھی ہے اور اجتماعی ذمہ داریوں کا بیان بھی ہے (نماز بندے کا اپنے رب اور خالق اور مالک سے رابطہ ہے اور انفاق اللہ کی مخلوق اور بندوں سے انسان کا رابطہ ہے)

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر جو کچھ اتارا ہے اس پر ایمان لانا۔

۵۔ عالم آخرت پر یقین اور ایمان رکھنا۔

متقین ہی وہ ہیں کہ جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت کے لباس کو زیب تن کیے ہوئے ہیں اور وہ ان صفات سے متصف ہیں جنہیں ہم نے بیان کیا۔ لہٰذا صاحبان تقویٰ کے پاس دو قسم کی ہدایتیں ہیں:

۱۔ پہلی ہدایت یہ ہے کہ متقی ہوئے ہیں۔

2 ۔ پھر دوسری ہدایت بھی ان کے پاس ہے وہ یہ کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان کے تقویٰ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو کرامت عطا فرمائی ہے۔

پہلی ہدایت ،ہدایت فطری ہے اور دوسری ہدایت قرآن کے وسیلہ سے ملی ہے۔ یہ دونوں ہدایتیں گمراہی اور بھٹکنے کے مدمقابل ہیں یعنی گمراہی کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلی گمراہی یہ ہے

کہ انسان خبیث اور بری صفات اپنا لے جس کی وجہ سے وہ گمراہوں میں شامل ہو جائے اور دوسری گمراہی یہ ہے کہ اس کی ضلالت اور پستی جو پہلی گمراہی کو بہت زیادہ مضبوط کر دیتی ہے۔ پہلی گمراہی خود انسان کی طرف منسوب ہے اور دوسری گمراہی اللہ کی جانب سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی کا انتظام کیا، اس کے لیے کتاب بھیجی، اس میں احکام و قوانین دیئے ہیں، جب انسان ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو فطری ہدایت سے انحراف کی وجہ سے وہ فطری گمراہی میں جا گرتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۰ میں ہے:

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

”ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر اللہ نے اِن کی بیماری اور بڑھادی "

تو پھر اللہ نے ان کی بیماری میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود ہی فطری ہدایت کو چھوڑا ہے تو سورہ بقرہ کی آیت ۲۶ میں ہے: ”اللہ اس (قرآن) سے بہت سوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے اور وہ اس کے ذریعے صرف بداعمال لوگوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے“۔

تقویٰ کا معنی

”تقویٰ“ وقی کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے خود کو بچانا۔ جس طرح انسان اپنے ظاہری بدن اور جسم کو سردی اور گرمی سے مخصوص لباس پہن کر یا دیگر انتظام کر کے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح انسان کا معنوی سلسلہ ہے۔ اس نے کمال کی جانب جانا ہے تو اس میں ہر اس چیز کو وہ چھوڑتا ہے، ہر اس کام سے بچتا ہے جو اسے پستی کی طرف لے جائے اور اسکی بربادی کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے تقویٰ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ جو اللہ نے کرنے کا

حکم دیا ہے اس کو کیا جائے اور جس سے روکا ہے اس سے رکا جائے۔ اللہ کے فرائض اور واجبات کو انجام دیا جائے اور اللہ کے حرام کو چھوڑا جائے۔

غیب پر ایمان

جب انسان کے اعضاء و جوارح اس طرح عمل کریں گے جس کا اقرار کیا ہے، جب انسان اسی کے تحت اپنے اعضاء و جوارح کو استعمال میں لائے گا تو وہ شک اور ریب سے محفوظ رہے گا کیونکہ شکوک و شبہات اعتقاد کو فاسد کر دیتے ہیں۔

ایمان کے مراتب

ایمان کے بہت سارے درجات ہیں۔ غیب کے اوپر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو ظاہر نہیں ہے یعنی سامنے نہیں ہے، حواس خمسہ سے اسے سمجھا نہیں جا سکتا اور محسوسات میں نہیں آتا اور تنہا عقل سلیم اور خالص فکر اور سوچ کے وسیلے سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے۔ تو مومنین و متقین کی شان یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب جیسے قیامت کا دن، جیسے خود اللہ تعالیٰ کی ذات کہ حاضر ہونے کے باوجود وہ ہمارے محسوسات میں نہیں آتی ہم اسے آنکھ سے دیکھ نہیں سکتے۔ البتہ دل کی آنکھ سے اس کی عظمت کو جانا جا سکتا ہے۔ مومنین اور متقین کی صفت ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو بھی غیب کی خبریں دی ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے مثلاً موت کے بارے میں اور موت کے بعد قبر میں سوال و جواب کے بارے میں پھر میدان محشر میں حاضری، پھر حساب و کتاب، ترازو لگنا، جنت و جہنم جانا، یہ سب وہ چیزیں ہیں جنہیں ہم اپنے حواس خمسہ سے درک نہیں کر سکتے، متقین وہ ہیں جو ان سب پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ صادق اور امین نے ان کے بارے میں خبر دی ہے اور اللہ کے کلام میں اسکو بیان کیا گیا ہے۔

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

مومنین اور متقین کی صفت یہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں اور نماز طہارت اور پاکیزگی کے بعد بجالاتے ہیں۔ دو نمازوں کے درمیان جو کچھ مادی پردے آچکے ہوتے ہیں، تاریکیاں آچکی ہوتی ہیں، دُنیا کے کاموں میں لگا ہوتا ہے پھر اگلی نماز آجاتی ہے تو اس سے وہ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں، نماز انسان کے روحانی تذکیہ کا سبب بنتی ہے اور انسان اس کے ذریعے اللہ سے متصل ہو جاتا ہے۔ نماز اللہ کے قریب ہونے کا موثر ترین اور بہترین وسیلہ ہے۔ نماز مومن کی معراج ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

متقین، اللہ کے حضور عبودیت کا مظہر کامل یعنی نماز بجالاتے ہیں اور حاجت مندوں اور مساکین سے متعلق اجتماعی امور کو انجام دیتے ہیں کیونکہ حاجتمند اور مساکین اللہ کے عیال ہیں ان سب کی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ نے جو مال دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں، جو واجب مالیات ہیں انہیں ادا کرتے ہیں اس سے بڑھ کر بھی دیتے ہیں۔ اس بارے بہت ساری آیات میں حوالہ آئے گا کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کیا، ان پر خصوصی توجہ دی ہے۔ فقط نماز پڑھنے سے انسان متقی نہیں بنے گا بلکہ نماز کے ساتھ ساتھ کچھ اجتماعی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرنا پڑے گا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں جسے اللہ نے اتارا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ پر جو نازل ہوا ہے، قرآن پر ایمان ہے اور حضور پاک ﷺ سے پہلے جتنے انبیاءؑ آئے ہیں اور ان پر جو کتابیں نازل ہوئی ہیں ان پر بھی ان کا ایمان ہے۔ حضور پاک ﷺ پر ایمان لانا باقی انبیاءؑ پر ایمان لانے سے الگ نہیں سوچا جا سکتا۔ کسی ایک پیغمبر کو نہ ماننا گویا کہ سب کو نہیں

ماننا، کسی ایک کتاب کا انکار کرنا گویا کہ سب کتابوں کا انکار کرنا ہے۔ آخری کو ماننا اور پہلووں کو نہ ماننا گویا سب کا انکار ہے، آخری کو نہ ماننا اور پہلوں کو ماننا بھی سب کا انکار شمار ہوتا ہے۔

متقین کی صفت یہ ہے کہ آخرت پر انہیں یقین کامل ہے۔ ذرہ برابر انہیں آخرت کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ ایمان کی بلند ترین منزل ہے اور ایمان کا کمال ہے اور یقین کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کو بھولتے نہیں ہیں، اس کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ ایک دن حساب ہونا ہے اور روز جزا ہے۔ آخرت، غفلت، بھٹکنے، گمراہ ہونے اور سیدھے راستے سے پھر جانے سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ جب آخرت پر یقین ہو گا تو انسان تقویٰ کی طرف ہی پلٹے گا اور انسان کو ہلاکت سے بچائے گا۔ سورہ ص، آیت: ۲۶ میں ہے کہ جو اللہ کے راستے سے بھٹکتے ہیں تو ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے اور یہ عذاب اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے یوم حساب کو بھلا دیا ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ

جیسا کہ بیان کیا گیا ان آیات میں متقین کی پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔ یہ اللہ کی جانب سے ہدایت پر ہیں اور ہدایت بھی اللہ کی جانب سے ہی ہوتی ہے اگر اس کی نسبت کسی اور کی جانب دی جاتی مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ہدایت دی، قرآن سے ہدایت ملی، یا امام معصومؑ کی جانب سے ہدایت ملی یا کسی عالم کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ اس عالم نے میری ہدایت کر دی تو یہ مجازاً ہوتا ہے۔ حقیقی ہدایت اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ یہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ یہی لوگ کامیاب ہیں اور حقیقی کامیابی متقین کے لیے ہے جن کو اللہ کی طرف سے ہدایت ہوئی ہے اور وہ سیدھے راستے پر آئے ہیں۔ فطری ہدایت کے ساتھ ساتھ اُن کو جو اللہ کی جانب سے ہدایت اور راہنمائی ملی ہے کہ زندگی کیسے گزارنی ہے تو اس پر وہ قائم ہیں اور یہی کامیابی ہے۔

رسول اللہؐ کی جانب سے ڈرانے کا عمل

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ
لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾

ترجمہ: ”بے شک جو لوگ انکار کر چکے ہیں، برابر ہے انہیں تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

قرآن میں کفر پانچ معنی میں آیا ہے:۔

ا۔ اللہ کی ربوبیت کا انکار کرنا

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اللہ پر عقیدہ نہیں ہے، بہشت اور جہنم کو نہیں مانتے، قبر میں سوال وجواب کو نہیں مانتے، حساب وکتاب کو نہیں مانتے۔ یہ اللہ کے نظام کے انکاری ہیں۔

۲۔ معرفت رکھتے ہوئے انکار کرنا

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی جانب سے دی جانے والی دعوت صحیح ہے، اس کے بارے میں یقین رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود مادی اور دنیاوی مفادات کی خاطر ان پر ایمان نہیں لاتے اور کفر اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے کفر اختیار کرتے ہیں کہ ایمان لانا ان کے مادی مفادات کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ سورہ نمل کی آیت ۱۴ میں ہے: ”انہوں نے انکار کیا جبکہ ان کے باطن اور نفوس اس کا یقین رکھتے تھے“۔

۳۔ نعمتوں کا کفران

یعنی اللہ نے جو نعمات عطا کی ہیں ان کا شکر بجا نہ لانا۔ سورہ نمل کی آیت ۴۰ کے ذیل میں نبی پاک ﷺ کا بیان نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”یہ تو میرے پروردگار کا فضل ہے تا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آزمائش کرے کہ میں شکر بجالاتا ہوں یا کفر کرتا ہوں“۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل نہ کرنا

اللہ کے دستورات اور اللہ کے قوانین پر عمل نہ کرنا اور معصیت کرنا، نافرمانی، گناہ کا ارتکاب، یہ بھی کفر کی ایک قسم ہے۔

۵۔ کفر برائت کے معنی میں

کفر کا ایک معنی برائت اور لاتعلّقی کا اظہار کرنا بھی ہے۔ ایمان سے لاتعلق ہونا، مومنین سے لاتعلق ہونا۔

رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ نے فرمایا کہ میری جانب سے ڈرانا، خبردار کرنا، یہ دونوں چیزیں کافروں کے لیے فرق نہیں کرتیں۔ یہ وہ کافر ہیں کہ ان کے دلوں میں کفر بیٹھ چکا ہے اور جڑ پکڑ چکا ہے۔

یہ وہی لوگ تھے جن کے پاس مشرکین کی سرداری تھی، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ کفر کی پانچوں قسمیں ان پر صادق آتی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو کفر کی سب اقسام میں داخل ہیں ان کے بارے اس لیے کہا جارہا ہے کہ یہ ہدایت فطری کے انکاری ہوئے ہیں تو پھر اگلی ہدایت تشریعی ہے اس کا بھی انہوں نے انکار ہی کرنا تھا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ٘ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۠ ۝۷

ترجمہ: ’’اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے‘‘۔

فطری ہدایت سے انحراف کا نتیجہ

اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر لگانے کو اپنی طرف نسبت دی ہے اور آنکھوں اور کان پر جو پردہ ہے اس کی نسبت خود اُن لوگوں کی طرف دی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ دل کی ہدایت فطری تھی تو انہوں نے اپنی بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر اللہ کا تو ایک نظام ہے کہ جب ایک چیز سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو وہ اپنا اثر چھوڑ دے گی اور اس فطری ہدایت سے عدم توجہی کا اثر ان کو بھگتنا ہی ہے۔ البتہ ان کے کان اور آنکھ تو سب کو نظر آ رہے ہیں اس پر اللہ نے تو پٹی نہیں باندھی، اللہ تعالیٰ نے سننے کے لیے کان دیئے ہیں اور دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ ایک چیز جو نظر آ رہی ہے اور انسان اس سے خود آنکھ بند کر لے اور دیکھتے ہوئے بھی یہ کہے کہ میں نے نہیں دیکھا اور سنتے ہوئے بھی کہے کہ میں نے نہیں سنا ۔ اسی لیے اللہ نے اسے اپنی جانب نسبت نہیں دی کیونکہ اللہ نے کسی کے کان اور آنکھ کو بند نہیں کیا، ان کے پاس سننے اور دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ البتہ ان کی آنکھوں میں پردہ پڑا ہوا ہے اور یہ پردہ انہوں نے خود ہی ڈال دیا ہے۔ یعنی اس صلاحیت کو رکھتے ہوئے اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ لہٰذا کفر ایک دفعہ خود ان کی اپنی طرف سے ہے کہ وہ حجاب اور پردہ ہے جو انہوں نے اپنی آنکھوں پر ڈالا ہے جس کی وجہ سے حق کو نہیں دیکھتے پھر اس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے گویا کہ سزا کے طور پر ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔

کافروں کیلئے دو حجاب

کفار کے لیے ان کے گناہ اور فسق و فجور کے سبب دو حجاب ہیں: ایک حجاب خود ان کی اپنی طرف سے ہے اور دوسرا حجاب اللہ کی جانب سے ہے۔ البتہ اللہ کی جانب سے جو حجاب ہے وہ بھی بلاسبب نہیں ہے؛ اس کا سبب خود ان لوگوں نے مہیا کیا ہے۔ کیونکہ جیسا سبب ہوگا ویسا اس کا اثر ہونا ہے اور وہ اثر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ لہٰذا ایمان کی طرح اُن

کے کفر کے بھی مراتب ہیں۔ بعض کا کفر شدید ہے، بعض کا کفر ضعیف اور کمزور ہے۔ پھر ہر ایک کے اثرات بھی مختلف ہیں۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے یعنی اُن کے اعمال کی وجہ سے ان کے لیے عذاب ہے۔ کیونکہ انہوں نے فیض الٰہی کو چھوڑ دیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔ جب انہوں نے انکار کیا تو پھر اس انکار کا نتیجہ بھی انہیں بھگتنا ہوگا، وہ اس سے بچ نہیں سکتے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا ہُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾

ترجمہ: ”اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان دار نہیں ہیں“۔

منافقین کی صفات

اس آیت میں منافقوں کی حالت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ یہ اسلامی معاشرے میں شامل ہونے کے مفادات تو حاصل کر لیتے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں کہ ان کی جان بھی محفوظ اور مال بھی محفوظ، اور ظاہری اسلام کا اعلان کرنے سے ان کو دیگر فوائد بھی مل رہے ہوتے ہیں لیکن اللہ فرما رہا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں، ایمان نہیں لائے اور ان کے باطن میں کفر بھرا ہے۔ بہت جلد انہیں اس جرم کی سزا ملے گی یہ دوزخ کی آگ میں جلیں گے۔ یہ اپنے منافقانہ رویہ کی سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ بعد والی آیات میں منافقوں کی صفات بیان کی ہیں۔

یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ؕ﴿۹﴾

ترجمہ: " اللہ اور ایمان داروں کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور نہیں سمجھتے"

دھوکے باز

"خدعہ" مکاری کرنے اور دھوکہ دینے کو کہتے ہیں۔ منافقین زبان پر کلمہ توحید جاری کرکے اور پھر اندر سے ایمان نہیں لاتے تو اس طرح وہ مکاری کرتے ہیں، سازشی ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ انہوں نے اللہ کو اور مومنین کو دھوکہ دیا ہے اور اس طرح بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، اسلام کے دائرے میں رہ کر تمام منافع حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور یہ جو ان کی سازش ہے اس کا خمیازہ خود انہوں نے ہی بھگتنا ہے۔ اللہ ان کے اعمال سے بھی آگاہ ہے اور باطن سے بھی واقف ہے لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے کہ جو کچھ انہوں نے اپنے دل کے اندر اور باطن میں قرار دے رکھا ہے اس سے رب تعالیٰ آگاہ ہے۔ مومنین کو تو دھوکہ دے سکتے ہیں کہ ان کے اندر کی بات سے واقف نہیں ہیں لیکن اللہ کو اور اللہ کے رسول کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ پھر اس کی سزا انہیں ضرور ملے گی۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۞

ترجمہ: "ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر اللہ نے اِن کی بیماری بڑھا دی، اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔"

بدنیت بیمار دل

اس آیت میں منافقین کے دل کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ ان کا دل بدنیت ہے، ان کی سوچ اچھائی پر مبنی نہیں ہے، حق کو ٹھکرا رہے ہیں اور اُن کے دل حق کو سمجھنے میں بیمار ہیں۔ جیسے ایک بندہ بیمار ہوتا ہے تو اس کا چکھنے کا ذائقہ ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح ان کے دل بیمار ہیں یہ حق کا ادراک ہی نہیں کرتے، سمجھ ہی نہیں رہے۔ جب ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کی بیماری میں اور اضافہ کر دیا۔ یعنی انہوں نے خود اپنے آپ کو بیمار کیا اور وہ دھوکہ کی بیماری تھی کہ اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان بیمار دلوں کے اندھے پن کو اور بڑھا دیا۔ یہ اُن کے لیے دنیاوی عذاب ہے۔ آخرت کا عذاب اس سے شدید تر ہے۔ اسی لیے فرمایا ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے، اس لیے کہ وہ جھٹلاتے تھے یعنی ان کی فاسد نیت، ان کی دروغ گوئی، ایمان کو ظاہر کرنا لیکن دل سے ایمان نہ لانا اور مومنین کو دھوکہ دینا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی جو سوچ تھی اس حوالے سے ان کے لیے سخت سزا ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: ''اور جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں''۔

فتنہ پرور اور فسادی

ہر دور اور ہر معاشرے کے مفسدوں، فتنہ پروروں اور منافقوں کی عادت رہی ہے کہ وہ حد اعتدال سے نکل جاتے ہیں اور اللہ کے اوامر اور احکام میں ہر قسم کی تحریف کرتے ہیں اور اللہ نے جو طریقہ بتایا ہے اس سے دور ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کی سعادت اور

خوش بختی کے لیے جو نظام قرار دیا ہے اس پر عمل نہیں کرتے اور جس ہدف اور مقصد کے لیے انہیں خلق کیا گیا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی ذمہ داریوں کے نظام کو معطل کر دیتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد مت پھیلاؤ، جب انہیں فساد سے روکا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ فساد سے رک جائیں اور اپنی اصلاح کریں بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، ہم فسادی نہیں ہیں حالانکہ ان کے اعمال اس پر گواہی دے رہے ہوتے ہیں کہ وہ سب سے بڑے فسادی ہیں؛ وہ اپنی ہٹ دھرمی کی بناء پر کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ منافق کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: ”خبردار بے شک وہی لوگ فسادی ہیں لیکن نہیں سمجھتے“۔

بے اعتبار

ان منافقوں کے بارے مومنین سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی جو ڈھٹائی ہے کہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کر رہے ہیں، ہم تو معاشرے کی بہتری چاہتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آؤ، یہ سب سے بڑے فسادی ہیں، یہ فساد میں غرق ہیں لیکن اس قدر منحرف ہو چکے ہیں کہ اپنے فساد کا شعور ہی نہیں رکھتے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی ان حرکتوں سے کوئی واقف نہیں ہے لہٰذا وہ اصلاح کا دعویٰ کر کے لوگوں میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے لیے گڑھا کھود رہے ہیں اور اپنی تباہی کے اسباب مہیا کر رہے ہیں لیکن انہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ وہ خود فسادی ہیں اور اس فساد کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ مومنین کو بتایا جارہا ہے کہ منافقین بے اعتبار ہیں۔ان کی کسی بات پر اعتبار نہ کرو۔انہیں اپنے لیے خطرہ جانو۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: ''اور جب انہیں کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں، خبردار وہی بے وقوف ہیں لیکن نہیں جانتے''۔

تکبر کرنے والے

جب پیغمبر اکرم ﷺ ان سے کہتے ہیں کہ اللہ کے احکام کے سامنے تسلیم ہو جاؤ جس طرح باقی لوگ تسلیم ہیں۔ اور ایمان لے آؤ تو یہ بہت ڈھٹائی کے ساتھ مومنین کو نادان اور بے عقل سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا تعلق بڑے طبقہ سے ہے، ہم ان سے بالاتر ہیں، یہ جو آپ کے ہمراہ ہیں یہ کمزور ذہن والے ہیں، ان کی سوچ ہم سے کمتر ہے اور یہ بے وقوف اور بے عقل ہیں اس لیے وہ آپ کے گرد جمع ہیں، یہ پست ترین ہیں۔ حالانکہ منافقین خود ہی احمق ہیں، بے وقوف ہیں، بے عقل ہیں کہ ایمان کی نعمت سے خود کو محروم کیا ہے۔ یہ منافقین رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو رد کرتے ہیں اور اپنے نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے ذہن میں یہ بات بٹھاتے ہیں کہ ہم بھی اسی طرح کریں جیسے یہ سارے کر رہے ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ فقراء جنہوں نے اپنے آپ کو مومن بنایا ہوا ہے ہم ان کی طرح کیوں بنیں؟ ان کے ساتھ کیوں اٹھیں بیٹھیں؟ یہ تو نادان اور بے عقل ہیں، پستی میں ہیں۔ حالانکہ منافقین خود پستی میں ہیں، خود گرے ہوئے ہیں، خود بے عقل ہیں۔ لیکن اپنی اس بے عقلی اور بے حیثیت ہونے کو جانتے نہیں ہیں اس لیے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا تعلق متکبرین سے ہے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: ''اور جب ایمانداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف ہنسی کرنے والے ہیں''۔

دو غلے

منافقین کی ایک صفت یہ ہے کہ جب وہ مومنوں کے درمیان ہوتے ہیں تو وہاں اپنے ایمان کا بڑا زور دار طریقہ سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم تو اسلامی معاشرے کا حصہ ہیں، ہم تو مومن ہیں، ہم بھی آپ کی طرح ہیں لیکن جب مومنوں سے دور ہوتے ہیں اور شیاطین یعنی کافروں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے بڑوں سے کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے ہیں اور ہم نے انہیں بے وقوف بنایا ہوا ہے۔ ہم تو آپ کے ساتھی ہیں اور وہاں رہ کر آپ کی بات کریں گے خاص کر یہودیوں کو جا کر کہتے ہیں جن کے یہودیوں کے ساتھ روابطہ تھے۔ ہم تو آپ سے بالکل جدا بھی نہیں ہوں گے مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہوں گے، جب ضرورت پڑے گی ہم آپ کا ساتھ دیں گے، ہم تو ان کا مذاق اور ٹھٹھہ اڑاتے ہیں اور انہیں بے وقوف بناتے ہیں۔اللہ تعالیٰ مومنین کو بتارہاہے کہ یہ دوغلے ہیں، ان کے ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: ''اللہ ان سے ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی گمراہی میں حیران رہیں''۔

منافقین کا انجام

اللہ ان منافقوں کے رویہ کے بارے میں فرما رہا ہے کہ وہ تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ مومنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں بے وقوف بناتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے لیے سزا رکھ دی ہے اور جو انہوں نے انحراف کیا ہے، اللہ انہیں اسی انحراف میں اور مدد دیتا ہے کہ اس میں پڑے رہیں اور اسی منافقت سے نہ نکلیں اور سرکشی میں ہی رہیں ان کی سرکشی اور بڑھتی جاتی ہے اور وہ اسی میں سرگرداں رہتے ہیں، جس غلط راستے پر چلے ہیں اسی پر باقی رہتے ہیں، ہدایت ان کو نہیں ملتی اور اس کا انجام ان کے لیے جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی سو ان کی تجارت نے نفع نہ دیا اور ہدایت پانے والے نہ ہوئے''۔

منافقین کیلئے خسارے کا سودا

اس آیت میں منافقوں کی حالت کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ نے ان کی ہدایت کا انتظام کیا تھا تو انہوں نے ہدایت لینے کی بجائے اپنے لیے بھٹکنے کو پسند کیا، صحیح راستے سے انحراف کر لیا، جب صحیح راستے سے انحراف کر لیا اور ایمان کے بدلے میں کفر اور گمراہی کو اپنا لیا تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے جو کروگے وہی بھروگے۔ ان کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ اگر کوئی فائدہ ملا بھی تو وہ ظاہری اور وقتی تھا مگر انہیں ہمیشہ کے نقصان میں ڈال دیا اور وہ گمراہی میں پوری طرح ڈوبتے چلے گئے اور پھر ہدایت نہ پاسکے۔ اسے انہوں نے اپنے لیے

خود انتخاب کیا اور جو صحیح راستہ تھا اس کو چھوڑ دیا اور بھٹکنے والے راہ پر چلے جو ان کو جہنم کی طرف لے گیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے اس غلط راستے کے لیے اپنے اعضاء و جوارح سے بھی مدد لی اور ان کو بھی اسی غلط سلسلے میں استعمال میں لائے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾

ترجمہ: ”انکی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اسکے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے انکی روشنی بجھا دی اور انہیں اندھیروں میں چھوڑا کہ کچھ نہیں دیکھتے“۔

منافقین بھٹکے ہوئے، دربدر

اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کی حالت کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو اندھیری جگہ پر موجود ہے جہاں اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا، وہ راستہ تلاش کرنے کے لیے آگ جلاتا ہے اور آگ جلا کر سمجھتا ہے اندھیرا چھٹ جائے گا، اس کا راستہ روشن ہو جائے گا لیکن جب وہ آگ جلا لیتا ہے تو خدا اس آگ کی روشنی ختم کر دیتا ہے، اس کو روشنی نہیں ملتی بلکہ وہ تاریکی میں ہی باقی رہتا ہے۔ دو تاریکیاں اس کے لیے ہیں ایک تاریکی شروع میں تھی جو حیرت تھی اور وہ اندھیرے میں سرگرداں تھا اور دوسری تاریکی جو ظاہری اسباب تھے آگ کی صورت میں جس سے وہ روشنی لے سکتا تھا وہ بھی ختم ہو گئی۔ منافق بھی اسی شخص کی طرح ہے، جب مرے گا تو دو تاریکیوں میں ہو گا یعنی انہوں نے آگ جلائی لیکن جب اس کا نور ان پر پڑا تو اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اور وہ اس کی تلاش میں تھے۔ اسی وقت جس نور کو انہوں نے چاہا تو اللہ تعالیٰ نے وہ نور ان سے لے لیا کیونکہ خود انہوں نے اس کا سبب فراہم کیا تھا اور وہ اب تاریکی

میں ہی غرق ہیں کہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تو یہ تشبیہ دی گئی ہے کہ نور ہدایت ان کے پاس آیا اور انہوں نے بظاہر اسلام کو قبول کیا۔

یہ منافقوں کی حالت ہے کہ جسے مثال دے کر سمجھایا گیا ہے کہ جو شخص تاریکی سے نکلنے کے لیے آگ روشن کرتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اس سے میں تاریکی سے راستہ نکال لوں گا لیکن وہ روشنی ختم ہو جاتی ہے، آگ بجھ جاتی ہے اور تاریکی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ منافقین کی مثال بھی اسی طرح ہے کہ اللہ نے ہدایت کا نور ان کے لیے عطا فرمایا اور یہ بظاہر تو اسلام میں داخل ہوئے لیکن وہ ایسے ہی ہے جیسے انہوں نے آگ روشن کی ہو لیکن ان کی منافقت نے وہ روشنی و نور ختم کر دیا اور وہ حیرت و پریشانی اور گمراہی میں باقی رہے۔

صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ۙ﴿۱۸﴾

ترجمہ: ''بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے''۔

منافقین اندھے، بہرے گونگے

اس آیت میں منافقوں کی صفات کی مزید وضاحت بیان کی گئی ہے کہ ان کی مثال تو ایسے ہے کہ جب حق کی بات کی جا رہی ہوتی ہے تو گویا اس شخص کی مانند ہیں کہ جو بہرا ہو اور ساتھ بیٹھے ہوئے بندے کی آواز بھی نہیں سنتا۔ یہ کان رکھتے ہوئے سنی ہوئی بات کو ان سنی کر دیتے ہیں۔ یہ گونگے ہیں جیسے گونگا دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن وہ بات نہیں کر سکتا تو یہ سب باتیں سن رہے ہوتے ہیں، حقائق انہیں نظر آ رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے دل کی منافقت اور دل کے تاریک پن نے انہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ حق کی خاطر کچھ بولنے میں قادر نہیں رہتے، کچھ بھی نہیں بولتے۔ اسی وجہ سے ان کی حالت یہ ہے کہ یہ حق کی طرف نہیں پلٹتے اور نور ہدایت کی طرف نہیں جاتے کیونکہ انہوں نے اپنے حواس کے استعمال کو خود ہی چھوڑ دیا ہے اور اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو آنکھیں دی ہیں کہ انسان غلط اور

صحیح کو دیکھے اور راستے میں جو کانٹے ہیں اس پر پاؤں نہ رکھے۔ کان اس لیے دئے ہیں تاکہ اچھی اور بری بات کو سنیں اور جو صحیح ہے اس کو اپنائیں اور جو حق ہے اس کے بارے میں بولیں لیکن جب یہ حق سننے کے لیے تیار نہیں۔ انہیں ماضی کی اقوام کے اوپر آنے والے عذاب کے بارے میں معلوم ہے۔ اس کے باوجود یہ حق کے راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ ایسے افراد ہیں جن کو حق نظر ہی نہیں آرہا ہوتا اور بات بھی حق کی نہیں کرتے تو پھر یہ اسی حالت میں رہیں گے اور بھٹکے ہوئے رہیں گے۔ ان کو کہیں سے کوئی نجات نہ ملے گی اور نہ ہی یہ اللہ کی رحمت کے سائے میں ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹

ترجمہ: ''یا جیسا کہ آسمان سے بارش ہو جس میں اندھیرے اور گرج اور بجلی ہو، اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب سے موت کے ڈر سے دیتے ہوں، اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے''۔

کافروں کی حالت

اس آیت میں منافقین کے حالت بتانے کے لیے ایک اور مثال دی گئی ہے۔ ''صیب'' زوردار اور موسلادھار بارش کو کہتے ہیں۔ جب اس طرح بارش برس رہی ہوتی ہے ، گھنے بادل ہوتے ہیں، پوری تاریکی چھا جاتی ہے، ہر طرف سے گرج اور چمک اور دھڑکا ہوتا ہے تو وہ اس سے اس قدر خوفزدہ ہوتے ہیں کہ کہیں موت ہی نہ آجائے۔ کانوں کے پردے نہ پھٹ جائیں کانوں میں انگلیاں ڈال دیتے ہیں کہ ہم موت سے بچ جائیں گے لیکن انہیں پتہ

نہیں کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے اعمال کا احاطہ رکھتا ہے اور اللہ کی ہی حکومت ہے، بارش بھی اللہ برسا رہا ہے تاریکی بھی اسی کے حکم سے ہے۔ موت نے جب آنا ہے تو کافر کانوں میں انگلیاں گھسیڑ کر موت سے نہیں بچ سکتے، موت تو پھر بھی انہیں آئے گی۔ یہ ان کی حالت ہے کہ جب حق سنتے ہیں تو حق کی آواز کو نہ سننے کے لیے اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں اور سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں شاید موت نہیں آئے گی لیکن موت نے تو ہر صورت آنا ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۲۰

ترجمہ: ''قریب ہے کہ بجلی ان کے آنکھیں اچک لے، جب ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا ہوتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں، اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں لے جائے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

منافقین فرار کی جستجو میں

یہ منافقین بارش اور اندھیرے سے رہائی اور فرار کی جستجو میں رہتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو انہیں کچھ نظر نہیں آرہا ہوتا اور وہ کسی چیز کی تمیز نہیں کر رہے ہوتے ایسے عالم میں آسمان سے بجلی چمکتی ہے تو اس چمک سے استفادہ کرتے ہیں اور ایک لحظہ کے لیے جو بجلی کا نور آسمان سے آیا ہے جو دائمی نہیں ہے اس کو دیکھ کر آگے بڑھتے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ چمک ختم ہوتی ہے تو پھر رک جاتے ہیں۔

اس مثال کی طرح منافقین ایمان حقیقی تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہوں نے جو ایمان کا اظہار کیا اور کلمہ پڑھا اس سے نتیجہ نہیں لے سکتے۔ یہ خطاء اور لغزش میں گھر چکے ہیں، خداوند

اسی وجہ سے انہیں رسوا کرے گا۔ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ چاہتا تو پہلے دن سے ہی انہیں رسوا کر دیتا تاکہ یہ مسلمانوں کو دھوکہ نہ دیں۔ جس طرح بیابان میں جو شخص چل رہا ہو اور اندھیرا چھا جائے، بارش برس رہی ہو، اسے راستہ نظر نہ آرہا ہو تھوڑی سے روشنی آئی اور اس پر چل دیا اور جب روشنی ختم ہو گئی تو رک گیا۔ یہ جو منافق ہیں انہوں نے اسلام کی روشنی میں قدم بڑھایا، لیکن جب قدم بڑھایا تو پھر وہیں پر رک گئے اور ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچے۔ یہ اس نفاق کی حالت میں مومنین کو جب دیکھتے ہیں تو اس وقت ان میں اضطراب اور پریشانی ہوتی ہے اور ان کے دل مومنین کے ایمان کو برداشت نہیں کر سکتے اور منتظر ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کافروں کے پاس پلٹ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان منافقوں کے حالات سے پہلے ہی آگاہ ہے اور انہیں رسوا کر رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو رسوا کرنے سے عاجز نہیں ہے۔ پہلے دن ان پر عذاب نہیں آتا تاکہ ان کو موقع دیا جائے اور یہ اپنی اس گمراہی کے عمل میں اور آگے بڑھ جائیں اور ان کو ان کے کیئے کی سخت ترین سزا دی جائے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: ''اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور انہیں جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ''۔

تمام انسانوں کے لیے دعوت

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی دعوت سب انسانوں کے لیے ہے اور سب کو کہا جارہا ہے کہ وہ متقین کے ساتھ ملحق ہو جائیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے جو ہدایت کا راستہ ہے اس پر آجائیں۔ کافروں کی صفات بیان کر دی گئیں کہ ان

کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے، منافقوں کی صفات بیان کر دی گئیں کہ وہ بیمار دل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے۔ اب یہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ اللہ ہی ہے جس نے سب کو خلق کیا ہے، جو خالق ہے تو وہی مالک بھی ہے۔ جو مالک ہے تو بات اسی کی چلے گی، جو رب ہے اسی کی اطاعت ہو گی، جس کے قوانین ہیں اسی کے راستے پر چلنا ہو گا۔ خدا ہی نے تمہیں خلق کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی اسی نے خلق کیا ہے، اسی لیے اللہ کی اطاعت میں آؤ گے، عبودیت کا لباس زیب تن کرو گے تو تم متقی ہو جاؤ گے اور متقین کی صف میں آجاؤ گے اور متقین کے لیے جو انعامات ہیں وہ تمہیں بھی ملیں گے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: ''جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اُتارا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل نکالے، سو کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو''۔

اللہ کے انعامات کا تقاضا

اس جگہ اللہ نے اپنے انعامات انسان کو بتائے ہیں کہ اے انسان جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو خلق کیا ہے تو اس طرح یہ تمہارے لیے اللہ کا انعام ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا ہے اور زمین تمہارے اختیار میں دی ہے اور آسمان کا نیلگوں شامیانہ تمہارے اختیار میں ہے۔ سورج، چاند، ستارے سب اس زمین پر اپنی روشنی ڈال رہے ہیں، اللہ کی طرف سے بارش آتی ہے زمین میں اس کا پانی جاتا ہے اور پھر چشمے نکلتے

ہیں اور انگور اگتے ہیں، نباتات اگتے ہیں، پھل، اجناس سب اگتے ہیں، پانی بھی اللہ کا، زمین سے جو کچھ اگتا ہے وہ بھی اللہ کا دیا ہوا ہے۔ جب ایسا ہے کہ تمہارا خالق بھی اللہ، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے انعامات دیے، تمہاری روزی کا انتظام کیا اور تمہارے لیے سکون کا انتظام کیا، تمہارے کنٹرول میں زمین و آسمان کا اختیار دیا کہ اس سے فائدہ اٹھاؤ تو ایک کائناتی نظام اور سسٹم بنایا تو پھر کیوں اللہ تعالیٰ کے نظیر بناتے ہو، شریک بناتے ہو، ایسا مت کرو اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ جب تمہیں اس بات کا پتہ ہے کہ خالق اللہ ہے، تو جو خالق ہے وہی مالک ہے، جو مالک ہے وہی رب ہے، وہی رازق ہے، جو رازق ہے اسی کا قانون چلے گا۔ جو رب ہے اسی کی اطاعت کرنی ہو گی۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ۖ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾

ترجمہ: ''اور اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ، اور اللہ کے سوا جس قدر تمہارے حمایتی ہوں بلالو اگر تم سچے ہو''۔

قرآن کی حقانیت کا بیان

اس آیت میں قرآن کی حقانیت کو بیان کیا جارہا ہے اور چیلنج کیا جارہا ہے کہ یہ قرآن معجزہ ہے، یہ انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ یہی حروف تہجی ہیں جنہیں تم استعمال کرتے ہو اور جب سے تم عربی زبان کے جملے بناتے ہو، یہ بھی اسی سے بنا ہے اگر یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے نہیں ہے، آسمانی کتاب نہیں ہے تو پھر ایسا ہے اس جیسی ایک سورہ بنا کر لے آؤ، تم بھی تو یہی حروف استعمال کرتے ہو۔

کئی دفعہ قرآن کے مد مقابل لانے کا کہا گیا ہے تو فصاحت و بلاغت جو کفار میں مشہور تھی اس کو عرب اپنے لیے عزت اور وقار سمجھتے تھے، ان سے یہ کہا گیا کہ قرآن کی آیات جو ہیں یہ بھی تو ان ہی حروف سے بنی ہیں، اگر قرآن غیب سے آگاہی دے رہا ہے، قرآن علم کی بات کررہا ہے، معارف دے رہا ہے اور اس میں کہیں اختلاف بھی نہیں ہے، کہیں فرق بھی نہیں ہے، فصاحت و بلاغت کی سند اس کی اعلیٰ سطح پر ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت ساری اور جہات اور پہلو ہیں جن میں کوئی اس کی مانند نہیں ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی مانند ایک سورہ بنا کر لے آؤ اور خود اکیلے کیوں ہو، اپنے ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لو لیکن جان لو کہ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو، جب ایسا نہیں کر سکتے ہو تو قرآن کو قبول کرلو کہ یہ غیب سے ہے اور اس کے قوانین اور فرمودات کو پلے باندھو اور ان پر عمل پیرا ہو۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴

ترجمہ: ''بھلا اگر ایسا نہ کر سکو، اور ہر گز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

قرآن کی حقانیت کو تسلیم نہ کرنے کی سزا

پچھلی آیت میں چیلنج کیا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو قرآن کی ایک سورہ کی مانند بنا کر لے آؤ۔ اب اس آیت میں خود ہی اللہ نے ان کی ناتوانی کو بھی بیان کر دیا کہ سچ یہ ہے کہ تم قرآن جیسا کچھ بھی نہیں بنا کر لا سکتے حتیٰ کہ اس قرآن کی ایک سورہ جیسی سورہ بھی نہیں بنا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بتایا کہ جب تم قرآن کی مانند کچھ لا نہیں سکتے ہو اور اپنے آپ کو بڑا بلیغ و فصیح قرار دیتے ہو اور عرب دُنیا میں اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر کرتے ہو اور قرآن جیسی ایک سورہ

لانے سے عاجز ہو تو یہ طے ہو گیا کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے۔ جب اللہ کی جانب سے ہے تو پھر اس کو تسلیم کرلو، قبول کرلو اور اپنے آپ کو اس آگ سے بچاؤ۔ اللہ یہاں پر آگ کا خوف دلا رہا ہے۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے بندوں پر کہ اس آگ سے بچو، اس آگ کا ایندھن لکڑی نہیں، انسان ہوں گے۔ نافرمان انسان اور پتھر ایندھن ہوں گے، جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کی پرستش کریں گے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے انہیں وہاں پر جلایا جائے گا۔

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

ترجمہ: ''اوران لوگوں کو خوشخبری دے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کے لیے باغ ہیں ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جب انہیں وہاں کا کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا، اور انہیں ہم شکل پھل دیئے جائیں گے، اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ عورتیں ہوں گی، اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے''۔

مومنین کے لیے بشارت

اس آیت میں مومنین کے لیے بشارت ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ایمان، ایمان کے بعد عمل صالح چونکہ ایمان اور عمل صالح دونوں آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ جو ایمان لائے اور عمل بھی کیا ہے (کیونکہ ایمان دل سے اعتقاد اور

اعضاء و جوارح سے عمل کا نام ہے) تو انہیں بہشت کی بشارت دو جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ جب بہشت میں انہیں کوئی میوہ دیا جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے بھی یہی میوہ دیا گیا تھا حالانکہ اس کے مشابہہ دیا گیا تھا، وہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ بہشت میں ان کے لیے پاک و پاکیزہ ازواج بھی ہیں جن میں نجاست نہیں ہے، خلقی، ظاہری، باطنی کسی قسم کی آلودگی ان میں نہیں ہوگی اور یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔[1]

کیونکہ بہشتی نعمتیں، دُنیاوی نعمتوں اور پھل و میوہ جات کی مانند ہی ہوں گے، اس لیے بہشتی سمجھے گا کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو پہلے ہم کھاتے تھے۔ لیکن جب ان کا ذائقہ چکھے گا تو اسے سمجھ آجائے گی کہ شکل وہی ہے مگر اس کا ذائقہ مختلف ہے اور اس کی تاثیر بھی اور ہے۔ دُنیا میں جو کھاتے تھے اسکا اثر بھی خارج کرنا پڑتا تھا گندگی بھی ہوتی تھی۔ بہشت کھانوں میں گندگی کا اثر نہ ہوگا، وہاں تو پاک و پاکیزہ ازواج ہوں گی اور وہاں تو ہر شئے طاہر و مطہر ہوگی اور نجاست نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی ہر شئے ہضم بھی ہو جائے گی اور اخراج بھی نہیں ہوگی۔ اس بناء پر یہ مشابہہ تو ہیں لیکن وہی نہیں ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَةً فَمَا فَوۡقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ

[1]۔ بہشت والے آخرت میں اس بات کو پالیں گے کہ جو انہوں نے اعمال صالحہ بجالائے تھے جو ان کے اچھے اخلاقیات تھے جو عبادات انہوں نے دُنیا میں انجام دی تھیں اسی جنس سے بہشتی نعمات ہیں۔ در حقیقت جو ان کے اچھے اعمال تھے وہی مجسم ہو کر بہشتی نعمتیں تجلی کریں گی اور وہی ظاہر ہوں گی۔ قرآن نے جیسا کہ واضح کیا ہے کہ جہنم کافروں کو گھیر لے گی اور کافر اس دُنیا میں بھی دوزخ میں گرفتار ہیں۔ بہشتی دُنیا میں بھی بہشت میں ہیں ان کے اندر اطمینان کی کیفیت ہے، لیکن کافر ہر وقت پریشان رہتے ہیں۔

مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے، سو جو لوگ مومن ہیں وہ اسے اپنے رب کی طرف سے صحیح جانتے ہیں اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں اللہ کا اس مثال سے کیا مطلب ہے، اللہ اس مثال سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے ہدایت کرتا ہے، اور اس سے گمراہ تو بدکاروں ہی کو کیا کرتا ہے''۔

اللہ کا مثالیں دینے سے مقصد

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مثالیں دی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مثالیں کس لیے دیتا ہے؟ اللہ فرما رہا ہے کہ اللہ اپنی کمترین اور چھوٹی سی مخلوق کی مثال دے رہا ہے جیسے مچھر ہے بلکہ مچھر سے بھی کمتر کی مثال دے سکتا ہے۔ کافر ان مثالوں کو دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ یہ مثالیں کیوں دے رہا ہے، اس کا کیا فائدہ ہے؟ مومن تو یہ مثالیں دیکھ کر کہتے ہیں جو کچھ اللہ نے بیان کیا ہے یہ برحق ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ ہماری ہدایت اور راہنمائی کے لیے دیا ہے جبکہ کافر اپنی گمراہی، گناہ اور فسق کے نتیجہ میں منہ چڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان مثالوں کا کیا فائدہ؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان مثالوں کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ دُنیا کی زندگی اور دنیا کا عمل عارضی ہے اور جب دُنیا کے سارے اسباب منقطع ہو جائیں گے، حجاب ہٹ جائیں گے تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ یہ مثالیں عبرت کے لیے تھیں۔

مثال کا تعلق حجم سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق اس کی کیفیت سے ہے۔[1] ان مثالوں سے بہت سارے گمراہ ہوتے ہیں اور بہت سارے ہدایت پاتے ہیں۔ یہ تو اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس مثال سے کیا درس لیتا ہے کیا عبرت لیتا ہے۔ جو پہلے سے ہدایت یافتہ ہیں ان کے سامنے جب یہ مثال آتی ہے تو ان کی ہدایت اور رشد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو پہلے سے ہی بھٹکے ہوئے ہیں جب ان کے سامنے یہ مثال بیان ہوتی ہے تو اس مثال کو سن کر بجائے اس کے کہ ہدایت پر آجائیں وہ اور بھٹک جاتے ہیں وَ الَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّ اٰتٰىهُمۡ تَقۡوٰىهُمۡ ﴿۱۷﴾ "اور جو راستہ پر آ گئے ہیں اللہ انہیں اور زیادہ ہدایت دیتا اور انہیں پرہیزگاری عطا کرتا ہے" (سورہ محمد، آیت: ۱۷)

جو ہدایت پا چکے ہیں ان کے لیے یہ مثالیں مزید ہدایت کا سبب بنتی ہیں اور جو گمراہ ہیں اپنے گناہوں کے نتیجے میں انہوں نے اللہ کے اوامر اور نواہی جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے نظام کی حمایت کے لیے قرار دیئے ہیں اور اس کو بہترین نظام دیا تاکہ وہ اس دُنیا میں بھی امن اور سکون سے رہے اور اس پر عمل پیرا ہو کر اپنی آخرت سنوارے جو اس کے مطابق نہیں چلے اب جو اسباب خود انہوں نے اپنی بے ایمانی اور بے عملی کے نتیجے میں مہیا کیے ہیں تو ان کو اس کے مطابق سزا بھگتنا ہوگی۔ ان کی نافرمانی اور گناہ سبب بنے ہیں کہ وہ بھٹکے رہیں اور بھٹکے ہوئے راستے پر باقی رہیں۔

الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِهٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ
بِهٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

---

[1] ۔ جب ایک چھوٹا سا مچھر چھوٹی سے مخلوق ہے، اس میں اتنی طاقت اور قدرت اللہ نے رکھ دی ہے، جو لوگ کیڑوں مکوڑوں کے بارے میں آگاہی رکھتے ہیں جو حیات کے بارے جانتے ہیں وہ اس چھوٹی سی مخلوق کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے بنایا ہے اور کیا کیا اس میں صلاحیتیں رکھی ہیں، وہ اس کی تخلیق کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

ترجمہ: ''جو اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے توڑتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں، وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

اللہ کے ساتھ کیا گیا عہد توڑنا

یہاں فاسقوں کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ فاسق کون ہیں؟ یہ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے عہد و پیمان کو توڑ دیا۔ پہلے انہوں نے مضبوط عہد و پیمان باندھا تھا کہ وہ اللہ کی مالکیت کو قبول کریں گے، اس کی خالقیت، ربوبیت کو مانیں گے اور اللہ کے راستے پر رہیں گے لیکن انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ یہ عالم ذر کی طرف اشارہ ہے جو دنیاوی حیات سے پہلے کا عالَم تھا، جہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے یہ مضبوط میثاق لیا تھا۔اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ نے وہاں پر فرمایا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ''کہ اے مخلوق کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' (سورہ اعراف، آیت: ۱۷۲) تو سب نے کہا جی ہاں! توں ہمارا رب ہے۔

خدا نے جس کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو یہ توڑتے ہیں اور یہ پیوند ان کے اعمال اور تکلیف شرعی جو اللہ کی جانب سے ان پر ذمہ داری ہے اس میں یہ رخنہ ڈالتے ہیں اور اپنے اعمال اور عقیدے کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں۔ایمانی اور انسانی برادری کا پاس نہیں رکھتے اور خونریزی، کشت وخون اور قتل و غارت گری کے ذریعے زمین میں فساد بپا کرتے ہیں اور اللہ کے امر سے نکل جانا ہی فساد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری دی ہے اس میں اعتدال ہے اس میں عدل اور انصاف کا پہلو ہے، نظام الٰہی کو تبدیل کرنا، صراط مستقیم سے منحرف ہونا یہی سب سے بڑا فساد ہے۔ انسان کے بدن کے اعضاء کو اس راستے پر استعمال کرنا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں نہیں

بنایا، اس عمل کو انجام دینے والے گناہگار اور فسادی ہیں۔ پھر یہ جو فساد کرنے والے ہیں جو اصلی راستے سے بھٹک گئے ہیں اور اللہ کے احکام کی پیروی نہیں کرتے، اللہ نے ان کے لیے زندگی گزارنے کا جو سسٹم بنایا ہے اس کو چھوڑتے ہیں تو پھر اللہ کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور نہیں کرتا اور نہ ہی گناہ چھوڑنے پر مجبور کرتا ہے۔ سب کو بتا دیا نافرمانی کروگے تو یہ سزا ہوگی، اطاعت کروگے تو یہ فائدہ ہوگا۔ اطاعت گزار کے لیے ثواب ہے اور گناہگار کے لیے سزا ہے۔ دونوں کا حساب ہوگا اور ظلم وزیادتی کی مذمت ہوئی ہے۔

اسی طرح مشہور ہے کہ آپ کوئی عمل کریں اور اس کے لیے آپ کے پاس کوئی وجہ نہیں ہو تو یہ عقل بھی کہتی ہے کہ ایسی بات ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ میں نے تو انسان کو اختیار دیا تھا اس نے خود صحیح راستہ کا انتخاب نہیں کیا اس کی سزا اس نے بھگتنی ہے اس سے وہ بچ نہیں سکے گا۔[1] لیکن اللہ کی مشیت اسباب کی تاثیر کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق اسباب ہے لیکن اس سبب کا انتخاب وہ شخص خود کر رہا ہے جب خود کر رہا ہے تو اس کا نتیجہ بھی اسے خود بھگتنا ہوگا۔ اگر کوئی شخص آگ میں پاؤں رکھے گا تو آگ تو اسے جلائے گی۔ آگ کی جلانے کی تاثیر تو اللہ نے رکھی ہے وہ بندے نے تو نہیں رکھی لیکن بندے نے خود آگ میں پاؤں رکھا ہے، جب خود پاؤں آگ میں رکھا ہے تو یہ بھی کہا جائے گا کہ اللہ نے اسے جلایا ہے، اللہ کی مشیت ایسی تھی؛ اگر مشیت ایسی تھی تو آگ کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ تاثیر کرے اور جلائے۔ البتہ اللہ تعالیٰ معجزے کے طور پر اس کی تاثیر ختم کر سکتا ہے جیسے آتش نمرود کو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے لیے ختم کر دیا تھا۔

---

[1] ۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ برائی اور فحاشی کا حکم دیتا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے اور اگر کوئی یہ خیال کرے کہ خیر اور شر اللہ کی مشیت کے بغیر وجود میں آتے ہیں تو اس نے اللہ کی غالبیت اور اللہ کی حکومت اور اللہ کا جو دائرہ اختیار ہے اس کو محدود کیا ہے۔ کیونکہ کوئی چیز اللہ کی مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''تم اللہ کا کیونکر انکار کر سکتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے پھر تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے''

نعمت وجود وحیات کا کفران کیوں؟

یہاں پر ایک واضح چیز جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ تم تو کچھ بھی نہیں تھے، کس نے تمہیں وجود عطا کیا؟ کس نے تمہیں زندگی دی؟ زمین و آسمان کو کس نے تمہارے اختیار میں دیا اور تمہیں زمین کی مالکیت عطا کی؟ فرشتے تمہارے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور تمہارے بابا آدمؑ کو بہشت میں کس نے ٹھہرایا اور پھر آدمؑ کے لیے توبہ کا دروازہ کس نے کھولا؟ کس نے انسانوں کو عبادت اور اپنی ہدایت کی کرامت عطا کی؟ اور کس نے ان کی زندگی کی تمام مصلحتوں اور مفادات کو دیا تا کہ وہ حقیقی سعادت کو پہنچ سکیں؟

تو کس طرح تم اس رب کی مخالفت کرتے ہو اور کفر اختیار کرتے ہو؟ کیا اللہ تمہیں عدم سے وجود میں نہیں لایا اور وجود میں لانے کے بعد دنیا میں ایک گندے نطفے سے خلق کیا اور خوبصورت بنایا؟ اور پھر تمہیں مار دے گا یعنی موت ہر ایک کو آنی ہے اور مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ پھر زندہ کرے گا۔ جب تم پہلے کچھ نہیں تھے تو اس نے زندگی دی اب جب مارے گا تو دوبارہ زندگی وہی عطا کرے گا اور اسی کے پاس پلٹائے جاؤ گے۔ قیامت کے دن سب نے خدا کے پاس جانا ہے اور وہاں پر اعمال کا حساب ہونا ہے، احتساب ہونا ہے ہر ایک کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا ہے جیسا کہ سورہ غافر کی آیت ۱۷ میں ہے: اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا

كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ؀ ''آج کے دن ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے گا، آج کچھ ظلم نہ ہوگا، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ؀

''اللہ وہ ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں سات آسمان بنایا، اور وہ ہر چیز جانتا ہے''۔

اللہ کی انعامات سے آسمانوں اور زمین کی خلقت

یہاں پر اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کا تذکرہ کر رہا ہے کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں خلق کیا ہے اور تمہارے لیے زمین کا بچھونا بنایا ہے، زمین کو تمہارے اختیار میں دیا ہے کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی کھیتی باڑی کرو، صنعت لگاؤ اس میں تصرف کرو اس میں چھپے ہوئے خزانوں سے استفادہ کرو تاکہ اسے اپنے لیے وسعت دو۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کا شامیانہ تانا ہے اس میں انسان کے لیے بے حساب فوائد رکھے ہیں اور اللہ ہی ہے جو اس پر قادر ہے۔ ساری مخلوقات اللہ کی ہیں اور اس نے یہ عظیم خلقت بنائی ہے، انسان کو زمین میں اپنی قائم مقامی عطاء کی ہے اور زمین کی آبادکاری کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی وہ اس انسان کے لیے خلق کی ہے نظام ہستی کو بنایا ہے تاکہ انسان خدا کی قائم مقامی کا عنوان اپنے لیے قرار دے سکے۔

جب ایسا ہے تو اس سے بالاتر اور کیا شرف ہو سکتا ہے؟ انسان کے لیے سعادت مند زندگی وہی ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے تحت ہو، اللہ کے قوانین کے تابع ہو۔ خدا نے اسے حیات طیبہ دی ہے، اچھی زندگی دی ہے، اچھی زندگی کے وسائل دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کو نہیں مانتا تو پھر اپنے لیے نقصان اٹھاتا ہے۔ سات آسمان سے مراد سات مرتبے

بھی ہیں اور سات حصے بھی اور ایک دوسرے کے اوپر ان کو اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا ہے اس کی مزید تفصیل بڑی تفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہیں تو پھر انسان اللہ کا کفر کیوں کرے، اللہ پر ایمان کیوں نہ لائے؟

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں، فرشتوں نے کہا کیا تو زمین میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو فساد پھیلائے اور خون بہائے حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں، فرمایا میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔

حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت

اس جگہ جو گفتار ہے یہ ایک قسم کی اللہ کی جانب سے آواز خلق ہوئی ہے اور ایک قسم کی ایجاد ہے، اس آواز میں اپنی مخلوقات (فرشتوں) سے یہ کہا گیا جو انسان سے پہلے موجود تھے اور اللہ کی جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں فرشتے فضیلت اور شان رکھتے تھے، وہ اللہ کی تسبیح اور تقدیس میں مصروف رہتے تھے اور ایک حد تک ان کے لیے آگاہی بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک آواز خلق کی اور تمام نے سنی اور اللہ نے فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں۔ فرشتوں نے اللہ کے اس فرمان سے یہ سمجھا کہ یہ کام خونریزی اور فساد پھیلانے کا سبب ہوگا کیونکہ اُنہوں نے یہ جانا تھا کہ بشر مادی ہے، اس میں غضبانی اور شہوانی قوات ہیں اور زمین میں ٹکراؤ ہے، اس کی جہات محدود ہیں تو اجتماعی زندگی جب متحقق ہوگی اور زمین پر ایک اجتماعی

نظام کے وسیلے سے زندگی کو ترتیب دیا جائے گا تو آپس کے مفادات جب ٹکرائیں گے تو اس کے نتیجے میں فساد ہو گا خونریزی ہو گی۔

انہوں نے اس طرح کے مقدمات بنا کر یہ کہا کہ مقام خلافت تحقق نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ اس خلیفہ میں اس کی تمام وجودی خصوصیات نمائش گر ہوں جو اسے خلیفہ بنا رہا ہے اور جب خداوند تبارک وتعالیٰ اسے خلیفہ بنا رہا ہے تو اس میں تمام اسماء الحسنیٰ والی صفات بھی ہوں گی وہ ہر نقص سے پاک ہو گا ہر شر سے، فساد سے بھی پاک ہو گا۔ زمین پر جو اللہ کا خلیفہ ہو گا اس کے لیے مادی اثرات بالکل نہیں ہوں گے لہٰذا یہ خاک سے تیار شدہ فسادی انسان کس طرح اللہ کا خلیفہ بن سکتا ہے؟ خاک کہاں اور خدا کہاں؟ یعنی فرشتوں نے یہ سمجھا کہ خلیفہ تو وہ ہو سکتا ہے جو اللہ کی تمام صفات کا مظہر ہو اور اس میں کوئی نقص نہ ہو، جبکہ جس کو زمین اور خاک سے بنایا جا رہا ہے اور زمین میں جب سکونت اختیار کرے گا تو اجتماعی نظام میں اس کے مفادات ٹکرائیں گے، جب مفادات ٹکرائیں گے تو فساد ہو گا تو وہ کس طرح خلیفہ بن سکتا ہے؟

اس لیے انہوں نے کہا کہ ایسے کو خلیفہ بنایا ہے جو فساد کرے گا۔ ان کے لیے اس کی حقیقت معلوم نہیں تھی، ان کے ذہن میں جو بات آئی تھی وہ کہہ دی۔ انہوں نے اس خلش کو ختم کرنے کے لیے اللہ سے سوال کر دیا تھا، نہ کہ ان کی طرف سے اعتراض تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم حمد و تسبیح بجا لا رہے ہیں، تیری تقدیس کر رہے ہیں، تجھے مقدس جانتے ہیں۔ زمین پر خلیفہ جائے گا تو مادی چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ فساد اور خونریزی ہو گی۔ فرشتے اس حوالے سے زیادہ لیاقت رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے جانشین اور اللہ کے قائم مقام بنیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سوال کا ایک اجمالی جواب دیا کہ اللہ کی زمین پر جانشینی اور خلافت سے مراد یہ نہیں کہ جو پہلے ساکن تھے وہ ان کا قائم مقام ہو گا۔ یہ مقام آدمؑ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ مقام آدمؑ کے فرزندوں میں بھی موجود ہو گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس سوال کی نفی نہیں کی، یہ نہیں کہا کہ وہ فساد نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی بات

کی تائید کی کہ ایسا ہے، فساد بھی ہوگا خونریزی بھی ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اس امر میں جو مصلحت میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو، اس میں اسرار ہیں، اللہ کی جانب سے ذمہ داریاں ہیں جنہیں صرف وہی اللہ کا خلیفہ ہی برداشت کرے گا، فرشتے برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی طاقت میں وہ چیزیں نہیں ہیں۔

ابن کثیر نے امام حسن علیہ السلام سے یہ بات نقل کی ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر جنات ساکن تھے جو فساد اور خونریزی کرتے تھے تو فرشتوں نے جو بات کہی تو وہ جنات کی زندگی کے دوران جو کچھ ہوتا رہا اس طرف اشارہ تھا۔

قرطبیؒ نے بھی استدلال کیا ہے یہ آیت اور اس جیسی اور آیات یہ بتا رہی ہیں کہ خلیفہ کا تقرر کرنا ضروری ہے۔ یعنی حاکم بنانا ضروری ہے تاکہ مظالم میں، شکایات میں، حدود اور سزاؤں کے نفاذ میں اپنے سارے معاملات کا جائزہ لینے میں، جھگڑے نپٹانے میں لوگ اس کی طرف رجوع کر سکیں۔ امام کا وجود فصل الخطاب ہو یعنی جو اس کا فیصلہ ہو وہ حتمی ہو۔ یہ ایسا امر ہے جو محقق نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ایسا خلیفہ موجود ہو جس کا فیصلہ حتمی ہو، اس کی بات حرف آخر ہو۔ لہٰذا امامت نص قرآن سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ اہل سنت کے ایک گروہ نے اس مطلب کو بیان کیا ہے۔ اس آیت سے امام معصوم کا اللہ کی طرف سے حضور پاک ﷺ کا قائم مقام ہونا ثابت ہوتا ہے کہ ہر زمانے کے لیے ایک ایسا امام چاہیے کہ جب اس تک بات پہنچے تو ان کی بات حتمی ہو۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٣١

"اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اسماء کی تعلیم دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آدمؑ کے اندر حقائق کو سمجھنے کی طاقت اور قدرت ایجاد کر دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے سوال رکھ دیا کہ یہ اسماء ہیں، ان اسماء کے مصادیق بتا دو۔ اس سے لگ رہا ہے جن اسماء کا حوالہ دیا گیا ہے یا مصادیق و مسمات تھے وہ زندہ اور ذی شعور موجود تھے۔[1] جو غیب کے پردے کے پیچھے تھے اور اس کے جاننے کی نوعیت اس طرح نہیں ہے جو ہم موجودات کے اسماء کے بارے میں جانتے ہیں یا علم رکھتے ہیں، اس قسم سے نہیں تھا۔ آدمؑ کا جو علم تھا وہ اسماء کے علم کو جاننے کی حقیقت سے تھا یعنی یہ ایک قسم کا علم حضوری وجدانی تھا نہ کہ نظری و کسبی، فرشتے اس علم سے ناآشنا تھے اس لیے کہ وہ علم ان سے غایب تھا۔

اسماء کی تعلیم سے مراد انسان میں علم کا ایجاد کرنا اس حیثیت سے کہ اگر اسے کسی راستے کی راہنمائی دی جائے تو وہ انسان کے لیے میسر ہو اور وہ اس عطا کردہ قوت کے ذریعہ اس کو منصہ شہود پر لے آئے اور یہ انسان کے لیے شرافت ہے۔ اگر یہ علم، علم حصولی کی قسم سے ہوتا تو یہ آدمؑ کے لیے کوئی شرف نہیں تھا کیونکہ علم حصولی تو فرشتوں کے لیے بھی تھا۔ بلکہ ایک قسم کی طاقت اور صلاحیت تھی جسے علم حضوری اور علم لدنی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آدمؑ اس علم حقیقی کے ذریعے ان اسماء سے آگاہ ہوئے جو مقام خلافت کی لیاقت رکھتے تھے۔ اور نہ فقط ان کے بارے خبر دی بلکہ اُن کی پوری شناخت حضوراً پائی اور ان کے لیے مشاہدہ حضوری حاصل ہوا۔ اسی لیے فرشتوں نے ان اسماء کی بہ نسبت اپنے علم کی نفی کی۔ لہٰذا وہ اسماء جو پیش ہوئے وہ موجودات زندہ عاقل تھے اور خدا کے ہاں محفوظ اور موجود تھے اور ان کے لیے مراتب اور

---

[1] - اہل البیت علیہم السلام کی روایات میں آیا ہے کہ وہ اسماء خمسہ طیبہ کے نام تھے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ، علی المرتضیٰ علیہ السلام، فاطمۃ الزہرا سیدۃ النساء سلام اللہ علیہا، حسن علیہ السلام، حسین علیہ السلام۔

درجات تھے۔ جیسا کہ سورہ حجر کی آیت :۲۱ میں ہے وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۱﴾ ”اور ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور ہم صرف اسے معین مقدار پر نازل کرتے ہیں“۔

یہ ایسا علم تھا جس کی صلاحیت آدمؑ کو دی گئی تھی اور یہ قدرت انسان کے اندر رکھ دی گئی تھی اور اسی عطا کردہ قدرت کے ذریعہ انسان کے اندر صحیح اور غلط کی تمیز اور تشخیص کا مادہ پیدا ہوا۔ اُن شخصیات اور ذوات مقدسہ کے حوالے سے جب پوچھا گیا تو ایسا ادراک اور سمجھ حضرت آدمؑ کو تھی اور اس علم الٰہی سے جو انہیں عطا ہوا تھا وہ ان ذوات کی معرفت حاصل کر سکے۔ جبکہ یہ چیز فرشتوں کے پاس نہیں تھی۔ اللہ کی عطا کردہ صلاحیت نے حضرت آدمؑ کو اس قابل بنادیا کہ وہ ان ذوی العقول، مقدس ذوات کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔ جبکہ فرشتوں کے پاس ایسی صلاحیت موجود نہ تھی۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾

”انہوں نے کہا تو پاک ہے، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے، بے شک تو بڑے علم والا حکمت والا ہے“۔

فرشتوں کا اظہار لاعلمی

فرشتوں نے جو وضاحت مانگی تھی وہ انہیں حاصل ہو گئی اور یہاں انہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ گویا ان کی محدود معلومات اور محدود صلاحیت کا اعتراف تھا کہ ان میں وہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ایک چیز سے آگے دوسری چیز کا پتہ لگا سکیں اور اللہ کی تقدیس اور تسبیح بھی بیان کی اور یہ بھی کہا کہ تو ہی علیم ہے تو ہی حکیم ہے۔ حکمت تو ہی جانتا ہے اور یہ تیرا خاصا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عاجزی کا اعتراف کیا۔ البتہ ان کے سوال کرنے کا مقصد اس فیصلے کے متعلق وضاحت مانگنا تھا،

اس کا مقصد اللہ کے فیصلے پر اعتراض کرنا نہیں تھا۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں تو یہی تھا کہ جو موجود خاک نشین ہو گا تو وہاں ٹکراؤ ہے اور اس نظام میں ہر شخص اپنا مفاد چاہے گا، جس کا نتیجہ اختلاف اور آپس کی لڑائی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا قائم مقام ایسی مخلوق ہونی چاہیے جو نقص سے پاک ہو۔

اللہ نے فرمایا جو چیز میں اس مخلوق کے حوالے کرنے والا ہوں وہ تم اٹھا ہی نہیں سکتے، اور تمہاری برداشت میں نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک آزمائش رکھ دی، مخلوقات تو پہلے موجود تھیں وہ ذی شعور بھی تھے صاحب عقل بھی تھے۔ حضرت آدمؑ نے ان کی معرفت اللہ کی دی ہوئی صلاحیت سے حاصل کرلی، جو فرشتے نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان حجابوں کو عبور کرنا فرشتوں کے بس میں نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ صلاحیت نہیں دی تھی۔ ہر فرشتہ اتنا ہی بیان کر سکتا ہے جتنا علم اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہے۔ جبکہ انسان کو اللہ نے جو صلاحیت دی ہے وہ اپنی اس صلاحیت کو استعمال کرکے بلندیاں طے کر سکتا ہے۔ اپنے اختیار و ارادے سے ان مراتب کو حاصل کر سکتا ہے۔ جبکہ فرشتوں میں ایسی بات نہیں ان کا اتنا ہی کام ہے جتنا ان کے ذمہ لگایا گیا ہے وہ اس سے اِدھر اُدھر نہیں جاتے۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

”فرمایا اے آدم ان چیزوں کے نام بتادو، پھر جب آدم نے انہیں اُن کے نام بتادیئے فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہوں“۔

علم الٰہی کی وسعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو تم ظاہر کرتے ہو اور جسے تم چھپاتے ہو میں سب سے آگاہ ہوں۔ میں نے تم سے نہیں کہا کہ میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں۔ کیونکہ جو محدود ہے اس کا محدود ہونا رکاوٹ بنتا ہے کہ وہ اپنی حدود سے ماوراء کسی چیز کو جان سکے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ لامحدود ہے، لامتناہی ہے لہٰذا کسی بھی چیز کا علم اس کے دائرے سے مخفی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اسے بھی جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور اسے بھی جسے تم چھپاتے ہو۔

غیب دو قسم کا ہے: ایک غیب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا غیب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں تاکہ دونوں غیب کو اللہ بیان کر دے۔ ایک غیب وہ ہے جو اسی عالم ارضی اور عالم سماوی میں ہے اور ایک غیب وہ ہے جو ان سے بھی باہر ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو تو اس میں یہ بات تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت اور اسے اپنا قائم مقام اور خلیفہ بنانے کا فیصلہ فرمایا ہے، اس میں راز ہے اور وہ راز چھپے ہوئے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں اس کا تذکرہ موجود ہے کہ ابلیس نے سجدے سے انکار کر دیا اور اس نے تکبر اختیار کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ لہٰذا ابلیس کی خلقت آدمؑ کی ایجاد سے پہلے تھی اور اس کا سجدہ نہ کرنا اور مخالفت کرنا اس کی باطنی کیفیت تھی اور باطن میں اس نے اپنا کفر چھپایا ہوا تھا اس کا انکار اس وجہ سے تھا۔ اس لیے خداوند تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ باطنی مخالفت جسے ظاہر نہیں کیا جاتا میں اس کو بھی جانتا ہوں۔

حضرت آدمؑ نے جو اسماء اللہ سے وصول کئے تھے یعنی اللہ کی جانب سے آدمؑ کو جو جاننے کی صلاحیت عطا ہوئی اس صلاحیت کے نتیجے میں آدمؑ نے وہ اسماء جو مشخص شخصیات کے

تھے، جو عاقل اور باشعور تھے جب ان کے بارے میں سوال ہوا تو آدمؑ کو اللہ کی جانب سے علم عطا ہوا تھا تو اسی علم کی روشنی میں آدمؑ نے ان ہستیوں کا تعارف کروا دیا۔ یہ صلاحیت انسان میں رکھ دی گئی کہ جب اس کے سامنے کوئی چیز آئے تو وہ چند چیزوں کو آپس میں ملا کر اس سے نتیجہ نکال سکے کہ جسے وہ دیکھے تو اسے دیکھ کر اس کی اصلیت تک پہنچ جائے۔ یہ صلاحیت فرشتوں میں نہیں تھی کیونکہ فرشتوں کے پاس بس اتنا ہی علم تھا جتنا ان کو دیا گیا اس سے آگے وہ کچھ بتا نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کا علم محدود تھا۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مخلوق بنا رہا تھا جس میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ دو معلوم چیزوں کو جوڑ کر تیسری چیز کے متعلق جان سکتا ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ٭ۗ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا''۔

ابلیس کا حضرت آدمؑ کے سجدہ سے انکار

عبادت یہ ہے کہ عبد اپنے آپ کو عبودیت اور بندگی کے مقام میں قرار دے اور اطاعت میں یہ ثابت کرے کہ وہ اللہ یا اپنے مولا کا عبد ہے۔ عبادت مولا کے تمام امور میں اس کے آقا ہونے کو ظاہر کرنا ہے اور یہ اظہار جس قدر شدید ہو گا اسی قدر عبودیت اور عبد ہونے کی منزل شدید تر ہو گی۔ عبودیت کے واضح ترین مظاہر میں سے ایک سجدہ کرنا ہے۔ جب فرشتوں کی بات کی وضاحت ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو سارے فرشتے آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے جبکہ ابلیس نے انکار کر دیا۔ ابلیس کا انکار اس کے عبد ہونے کے منافی تھا؛ اس طرح اس نے اپنا باطنی کفر ظاہر کیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے

دھتکارا گیا۔ آدمؑ کا سجدہ در حقیقت آدمؑ ہی کا سجدہ تھا، یہ نہیں ہے کہ آدمؑ کو قبلہ بنایا گیا ہو جس طرح کعبہ قبلہ ہے۔ اس کے بارے میں کافی تفصیلی ابحاث ہیں جو تفسیر کی تفصیلی کتابوں میں ذکر ہوئی ہیں۔

وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵

"اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں جا کر رہو اور اس میں جو چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور اس درخت کے نزدیک نہ جاؤ پھر ظالموں میں سے ہو جاؤ گے"۔

آدمؑ و حواؑ کی جنت میں سکونت

یہ تو طے تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین میں زندگی گزارنے کے لیے خلق کیا گیا تھا تاکہ وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ قرار پائے اور زمین میں اس کا قیام ہی یہی برتری تھی جو فرشتوں پر ثابت ہوئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تعظیم و تکریم کے لیے فرشتوں کو آدمؑ کا سجدہ کرنے کا حکم دیا، آدمؑ کو فرشتوں نے سجدہ کیا اور آدمؑ کو ایک عرصہ کے لیے بہشت میں داخل کر دیا گیا اور ساتھ ہی ایک درخت کی طرف اشارہ کیا اور اس درخت سے کھانے سے منع کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ اگر اس درخت سے کھاؤ گے تو بدی اور ناپسندیدہ چیز ظاہر ہو جائے گی اور اس طرح تمہارا زمین پر نزول ہو جائے گا۔

یہ امر آدمؑ کی اولاد کے لیے ایک بڑا سبق اور بڑی دلیل تھی۔ شیطان نے بنی آدمؑ کے باپ کو بہشت میں دھوکہ دیا اور اسے وہاں سے نکالا۔ حضرت آدمؑ کی مانند وہ ہمیشہ آدمؑ کی اولاد کو دین سے نکالنے اور اسے دھوکہ دینے اور انہیں اغوا کرنے کے درپے ہے تاکہ وہ

بہشت میں نہ جا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی اولاد کو زمین میں اپنا قائمقام قرار دیا۔ جب تک یہ انسان اللہ کا قائمقام ہے تو قائمقامی اور جانشینی کے جو فرائض اور واجبات ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو زمین میں رہنے کے واسطے نظام ایجاد کیا ہے، بنی آدم پر لازم ہے کہ اپنی شائستگی دکھائے اور زمین میں رہ کر اس پر عمل کرے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا نظام اسے لکھوا دیا اور اس نظام کو اس نے زمین پر نافذ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے وسیلے سے اسے اس نظام کی تعلیم دی ہے۔ جو بھی اللہ کے اس دیئے ہوئے نظام کا انکار کرے، کفر کرے، کوتاہی کرے تو اسے اللہ کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جس نے اسے زمین کی خلافت عطا کی ہے وہ اس کا احتساب کرے گا اور اس سے سوال ہوگا۔ لہٰذا جانشینی اور خلیفہ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ الٰہی صفات کو حاصل کرلے، ترقی کی منازل طے کرے اور حیوانی اور نفسانی خواہشات کے آگے نہ جھکے۔

زمین میں اللہ کی جانشینی بہت سخت اور مشکل کام اور بڑی سخت ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور حوا دونوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اس جنت میں جہاں پر اللہ نے ان کو وارد کیا تھا اطمینان اور آسودگی کے ساتھ رہیں اور جو چاہیں جہاں چاہیں کھائیں، پئیں، فقط ایک درخت سے منع کر دیا تھا کہ اس کے قریب نہ جائیں یعنی اس کے قریب جانے سے منع کیا۔ اور کہا کہ اس کے قریب جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ یہ جو کہا کہ اس درخت کے قریب نہ جاؤ تو یہ منع کرنے میں تاکید ہے یعنی اس کے قریب جانے سے منع کیا چہ جائیکہ اس کے پھل کو توڑیں اور کھائیں، کیونکہ اس کے قریب جانا ہی رنج اور سختیوں کا باعث ہوگا۔ اس درخت کے قریب جانا انسان کا اپنے رب تعالیٰ کو بھول جانے اور اس سے غافل ہونے کے مترادف تھا۔

سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝۱۱۸

"یہاں جو تم کھاؤ گے تو اس میں تمہیں بھوک لگے گی نہ ننگے ہو گے"

سورہ طہٰ کی آیت ۱۲۴ میں یہ بتایا گیا کہ :

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

"اور جو میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کی زندگی بھی تنگ ہو گی اور اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمؑ سے اس درخت سے دُوری اور جدائی کا عہد و پیمان لیا گیا تھا لیکن وہ اس پر قائم نہ رہ سکے، جو عہد لیا گیا تھا وہ اسے بھول گئے۔ جس کے نتیجے میں وہ دُنیا کے رنج اور مشکلات میں گھر گئے۔ پھر اپنی اس غفلت کی توبہ کے ساتھ تلافی کی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے چوکنا کیا تھا اور یہ فرمادیا تھا کہ اگر اس درخت کے قریب جاؤ گے تو نقصان اٹھاؤ گے چہ جائے کہ اس سے کچھ کھا لیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اس طرح تم زیادتی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ کیونکہ مادی زندگی میں تھکاوٹ ہے، تکالیف ہیں، جیسے بھوک ہے، ننگا پن ہے، رنج ہے پیاس ہے، یہ سب بھگتو گے۔

یہ ظلم حقیقت میں اپنی ذات پر ظلم تھا، معصیت اصطلاحی نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے یہاں جو نہی فرمائی وہ نہی ارشادی تھی۔ یعنی ایک ایسے کام سے روکا گیا کہ وہ اس سے رک جاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ یہ نہی مولوی نہیں تھی کہ اس کے انجام پر اللہ کی ناراضگی اور سخت سزا ہو گی اور وہ ارتکاب گناہ شمار ہو گا۔ نہی ارشادی کی مخالفت گناہ شمار نہیں ہوتا۔ پس نہی ارشادی کی مخالفت کے نتیجے میں وہ جس بہشت میں گئے تھے وہ ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔[1] یہاں پر ان سے غفلت ہوئی، جو ان کے لیے بہتر تھا اسے چھوڑ بیٹھے کیونکہ اگر وہیں پر رہتے تو پھر ان کو کسی قسم کی تکالیف نہ ہوتیں جو کہ مادی زندگی میں انہیں جھیلنا

---

[1] ۔ نہی مولوی کی مخالفت کی سزا ہے اور سزا یہ ہوتی ہے کہ جو فرض چھوٹا ہے اس کی تلافی ہو جو توبہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور نہی ارشادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مکلّف کو اس کے لیے جو چیز بہتر ہے اس کی جانب راہنمائی کی جائے۔

پڑیں۔ پھر حضرت آدم اور اماں حوا دونوں نے توبہ کی اور ان کی توبہ قبول ہوئی۔ لیکن ان کی توبہ کے نتیجے میں انہیں واپس بہشت میں نہیں بھیجا گیا۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نہی ارشادی تھی کیونکہ اگر نہی مولوی ہوتی تو جس حرام کام کا ارتکاب کیا تھا، جب اس سے معافی مانگ لی جائے تو وہ گناہ ختم ہو جاتا ہے اور معافی ملنے کے نتیجے میں جو چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہیں وہ اسے واپس مل جاتی ہیں اور اللہ اس کے گناہ کو مٹا دیتا ہے، لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں پر جو نہی تھی وہ ایک بہتری سے عبارت تھی اس میں ایک راہنمائی دی گئی تھی، غفلت کی وجہ سے وہ ان سے چھوٹ گئی، جو خیر و برکت وہاں پر تھی اب وہ خیر و برکت دُنیا کی سختیاں جھیلنے کے بعد انہیں ملیں گی۔

اس سے یہ بات بھی سمجھنی چاہیے کہ ایسا نہیں ہے کہ اماں حواؑ نے آدمؑ کو دھوکہ دیا ہو یا اماں حواؑ حضرت آدمؑ کے دھوکہ کھانے کے سبب بنی ہوں، نہیں ایسا نہیں! دونوں سے لاپرواہی ہوئی تھی دونوں نے غفلت کی اور دونوں اس درخت کے قریب گئے اور وہاں سے کچھ کھایا۔ لہٰذا ابلیس نے دونوں کو بہکایا اور جو لالچ دی وہ یہ تھی کہ اگر اس درخت سے کچھ کھا لیا تو پھر تم اس جنت میں ہمیشہ رہوگے۔ یہ درخت، درخت حیات ہے۔ اس کی تفصیل اگلی آیت میں بیان کی جائے گی کہ کس طرح ابلیس نے دونوں کو ایک منع شدہ کام کے ارتکاب پر ابھارا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۞٣٦

”پھر شیطان نے ان کو وہاں سے ڈگمگایا پھر انہیں اس عزت و راحت سے نکالا کہ جس میں وہ موجود تھے، اور ہم نے کہا تم سب اترو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور سامان ایک وقت معین تک“۔

آدمؑ و حواؑ کا زمین پر اتارا جانا

شیطان نے انہیں دھوکہ دیا اور وسوسے سے انہیں فریفتہ کیا اور جو نعمتیں تھیں ،خوشحال زندگی تھی ، نعمتوں کی فراوانی تھی، آسودگی تھی ان سے انہیں نکالا۔ جب وہ غفلت کا شکار ہوئے تو اللہ نے کہا کہ جاؤ زمیں میں اُتر جاؤ، مادی دُنیا میں ، مادی دُنیا ٹکراؤ کا گھر ہے، ایک دوسرے پر رحمت و شفقت کی جگہ نہیں ہے، ایک عرصہ تک تم نے وہیں پر رہنا ہے اور معین مدت تک وہاں سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس طرح بہشت میں انسان کے بابا حضرت آدمؑ اور اماں حوا کو جو کرامت وآسودگی ملی تھی اس سے دُنیا میں آگئے اور وہ جو پرور دگار کی ہمسائیگی، قرب اور منزلت تھی اس سے نیچے آگئے اور مادی عالم میں اُتر آئے۔ اس مقام و مرتبہ سے سقوط کیا، انھوں نے فنا ہونے والی حیات ، درد، تکلیف ، رنج، مصائب کو اپنے اختیار اور اپنے میلان سے اختیار کیا؛ پھر جب وہ اللہ کی طرف واپس پلٹیں گے تو اللہ انہیں سعادت و کمال دے گا۔

اگر اللہ کی جانب رجوع نہیں گیا، اسی زمین میں خود کو گاڑھ لیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی میں لگ گئے اور اللہ کی نعمت کا کفران کیا تو پھر گویا کہ انھوں نے اپنے آپ کو جلانے والی جہنم اور ہلاکت کے لائق بنالیا اور اپنے لیے بدترین جگہ کا انتخاب کرلیا۔ پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہو گا لیکن یہ ان کے اپنے اختیار اور انتخاب سے ہی ہو گا۔ یہاں پر یہ واضح ہوا کہ شیطان نے دونوں کو دھوکہ دیا، یہ نہیں ہے کہ پہلے اماں حواؑ کو دھوکہ دیا اور پھر حواؑ نے آدمؑ کو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابلیس بھی پہلے اس جگہ پر موجود تھا جہاں آدمؑ تھے لہٰذا ان دونوں کو دھوکہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم تینوں نکل جاؤ اور زمین پر چلے جاؤ۔ تینوں زمین پر آگئے، ظاہر ہے ابلیس اور انسان جو دو افراد پر مشتمل تھے، انسان کا پہلا گھرانہ تھا پہلا یونٹ تھا یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ان کی نسل ہونی ہے تو ان کے لیے بھی یہی پیغام ہے۔

یہاں پر سبق ہے کہ اگر دُنیا میں رہ کر غفلت کروگے، اللہ کے دیئے گئے اصولوں کے مطابق زندگی نہیں گزاروگے اور اللہ پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور اگر اللہ کی اطاعت کروگے، شیطان کی باتوں میں نہیں آؤگے، خواہشات نفسانی کی مخالفت کروگے، اپنے آپ کو اس حالت میں اللہ کے حضور لے جاؤگے کہ اس کے احکامات کی پیروی کی ہو گی تو اللہ تمہیں ابدی طور پر جنت کا ٹھکانہ عطا کرے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جنت، ابدی جنت نہ تھی کیونکہ ابدی جنت میں شیطان کا داخلہ ممنوع ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں جوایک دفعہ جاتا ہے پھر اس نے اس سے واپس نہیں آنا۔ لہٰذا یہ جنت، جنت ابدی نہ تھی بلکہ کوئی اور جگہ تھی جہاں پر انسان اور شیطان اکٹھے رہتے تھے۔ حضرت آدمؑ اور حوا کو پتہ تھا کہ ایک ابدی جنت ہے جس میں فناء نہیں، اس نے ہمیشہ باقی رہنا ہے، اسی بقاء کے حصول کی لالچ میں وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے اور اس خوبصورت اور آرام دہ مقام سے نیچے آگئے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

''پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کیے پھر اللہ نے اسکی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے''۔

حضرت آدمؑ کی توبہ کا قبول ہونا

''القاء'' یا ''تلقّی'' کا معنی تلقین کے وسیلہ سے سیکھنا، یعنی کسی دوسرے کی بات کو سن کر اس سے مطلب لے لینا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات کو سمجھنے کے ساتھ اسے صحیح طریقہ سے دریافت کرلیا جائے۔ آدمؑ کو توبہ کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ دو قسم کی ہے: ایک توبہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے وسیلہ سے بندے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ توبہ کی دوسری قسم میں بندہ استغفار کے

وسیلہ سے اور معصیت کو ترک کرنے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرتا ہے۔ اللہ کی جانب سے توبہ، بندے کی توبہ کی قبولیت ہے۔ اور بندہ کی توبہ دو توبہ کے درمیان گھری ہوئی ہے، ایک اپنے پروردگار کی طرف سے جیسا کہ سورہ توبہ کی آیت : ۱۱۸ میں ہے:

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۚ

"اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف توبہ کی تاکہ وہ توبہ کریں"۔

یہ جملہ کہ آدمؑ نے اللہ تعالیٰ سے اسماء وصول کئے، ایسے کلمات کہ جب کوئی گناہگار گناہ کے وقت کوئی کام کر بیٹھتا ہے تو وہ کلمات اس کے لیے مفید ہوں۔ پروردگار سے کلمات وصول کرنا اور سیکھنا ان اسماء کے ساتھ مربوط ہے، آدمؑ نے جب اللہ کے امر کی مخالفت کی اور زمین پر اُتر آیا تو اسی اترنے کی جگہ پر باقی رہتا اور ہلاک ہو جاتا۔ اپنی سابقہ سعادت کی طرف واپس پلٹنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو تکلیف اور تھکاوٹ میں ڈالنا تھا، بہر حال اپنے نفس پر ظلم کیا تھا اور اسی طرح ہی اپنے اس عمل سے وہ سعادت کے راستے میں جا سکتا تھا اور کمال کی راہ پر پہنچ سکتا تھا۔ اگر یہ عمل نہ کرتے اور زمین پر نازل نہ ہوتے تو ذلت اور مسکنت اور اپنے قصور کی جانب متوجہ نہ ہوتے اور توبہ کی جو لذت ہے اسے وصول نہ کر پاتے۔ سعادت اور کمال کی منازل نصیب نہ ہوتیں اور مادی تکالیف اور رنج اور مصائب کو جھیلے بغیر رب العالمین کی ہمسائیگی میں راحت و آرام اور سکون نصیب نہ ہوتا۔ توبہ کے ذریعے اللہ نے ہدایت کی ایک راہ کھولی اور یہی راہ ہدایت ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں انسان کے لیے قانون کے طور پر بنا دیا ہے۔

آدم کا زمین پر آنا ایک تکوینی امر تھا اور یہاں آنے کے لیے درخت ممنوعہ کے قریب جانا ضروری تھا۔ جس طرح زہر کھانے یا آگ میں جلنے کا نتیجہ قتل ہونا ہے یا نماز چھوڑنا آتش

جہنم میں جانے کا لازمی نتیجہ ہے تو یہ بھی اسی طرح ہوا۔ اللہ بخشنے والا ہے اور اپنی مغفرت کے وسیلہ سے اللہ اپنے بندے کی طرف پلٹتا ہے وہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ [1]

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

''ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے نیچے اتر جاؤ، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے پس جو میری ہدایت پر چلیں گے ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ کی ہدایت پر چلنا

جب آدمؑ کے لیے زمین پر اترنے کا حکم صادر ہوا تو انسان اور شیطان زمین پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے قرار پائے۔ یہ پہلا فرمان تھا جو آدمؑ اور اس کی اولاد کے لیے بطور قانون اور ضابطہ صادر ہوا اور دین کا خلاصہ دو جملوں میں بیان ہوا۔ پہلی بات یہ تھی کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی اولاد کو عبودیت کی ہدایت فرمائی تاکہ ان کی زمین میں گزرنے والی زندگی آسمانی و معنوی زندگی دونوں سے ہم آہنگ ہو۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ایک دفعہ توبہ سے پہلے نیچے آنے کا حکم دیا گیا اور ایک دفعہ توبہ کے بعد۔ اس کا راز یہ ہے کہ آدم نے

---

[1] - روایات میں ہے کہ وہ اسماء جن کے وسیلہ سے آدمؑ کی توبہ اور ان کا رجوع الی اللہ قبول ہوا اور اللہ تعالیٰ سے جن کلمات کو حضرت آدمؑ نے وصول کیا تھا یہ وصولی براہ راست تھی یا جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ تھی وہ پنجتن پاک علیہم السلام کے اسماء طیبہ تھے۔

جب درخت ممنوعہ سے تناول کیا تو وہ جو ارشادی نہی تھی اس کی خلاف ورزی کے حوالے سے یہ اللہ کا حتمی فیصلہ تھا کہ وہ آسمان سے اور بہشت سے زمین پر آجائے۔

پھر زمین پر جب آدمؑ نے اپنی غلطی کی توبہ کر لی تو اللہ کا دوسرا فیصلہ ان کے بارے میں قانون کی شکل میں صادر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس توبہ کی وجہ سے زمین کی زندگی جو کہ بہت ہی مشکلات والی زندگی ہے، اس کو طیب و طاہر بنا دیا اور زمینی زندگی میں عبودیت اور عبد ہونے کے طریقے بتا دیئے۔ ایک ایسی زندگی جو زمینی اور آسمانی زندگی کے ساتھ مخلوط ہو، اس کے لیے ماحول بنایا۔ جب آدمؑ توبہ کر رہے تھے اس وقت وہ بہشت میں ہی تھے اگرچہ ان کا مقام اور مرتبہ کمتر ہو گیا تھا، ان کی پہلے والی موقعیت نہیں رہی تھی۔ اس لیے آدمؑ کی توبہ ان دو حبوط یعنی جو قرب کا مقام تھا اس سے نیچے آنا اور پھر دوسرا حبوط زمین پر اترنے کے درمیان واقع ہوئی۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہدایت نے انسان کو اطمینان اور سرور پہنچایا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا آتش جہنم میں ہمیشہ رہنے کا سبب قرار پایا۔ پس انسان جو اللہ کی جانب سے خلافت کا حقدار بنا یعنی اسے خلافت عطا ہوئی تو اللہ کی جانب سے اس کا معیار ہدایت قبول کرنا اور اللہ کے بنائے ہوئے طریقے کی پیروی کرنا اور دینی روش پر چلنا اور باقی غیر الٰہی راستوں اور طریقوں کو چھوڑنا قرار پایا۔ ہدایت کے روشن اور واضح راستے کو طے کرنے سے انسان دُنیا اور آخرت کی سعادت پالے گا اور اللہ اسے ہر قسم کے خوف اور ڈر سے محفوظ کر دے گا۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے وہی دوزخی ہوں گے، جو اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

اللہ کی آیات کا انکار کرنے کا انجام

اللہ تعالیٰ کا کفر کرنا، اللہ کی بتائی ہوئی روش میں تبدیلی اور اللہ کے قوانین اور احکام کو تسلیم نہ کرنا، ایسا جرم ہے جس کے نتیجے میں آتش جہنم نصیب ہو گی۔ لہٰذا جانشینی کا جو رابطہ ہے وہ دو دائروں میں ہے۔ جو اللہ کی ہدایت اور راہنمائی کے مطابق رہے گا، اللہ کے بتائے ہوئے قوانین پر چلے گا، صراط مستقیم پر رہے گا تو اس کے لیے ہمیشہ کا سکون اور جنت میں واپسی ہے اور وہ جنت الفردوس کی نعمتوں میں ہو گا۔ جس شخص نے زمین پر رہ کر اللہ کے بتائے ہوئے قوانین وضوابط اور اللہ کا طے کردہ راستے کی مخالفت کی، اللہ کی نشانیاں، ہدایت دینے والے اللہ کے نمائندوں اور ان کو عطا شدہ معجزات یا ان کی دعوت کو جھٹلائے اور یہ سمجھے کہ میں آزاد ہوں اور غفلت میں چلا جائے گا تو پھر گویا کہ اس نے اللہ کی قائمقامی کے فرائض انجام نہیں دیئے۔ لہٰذا اس کا ٹھکانہ جہنم ہو گا وہ جہنم کا ایندھن بنے گا اور وہ وہاں ہمیشہ رہے گا۔

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

”اے بنی اسرائیل میرے احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے اور تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرا کرو“۔

بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا انجام

بنی اسرائیل کفر و عصیان کا بڑا نمونہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے پیمان شکنی کی، اللہ کے بتائے ہوئے راستوں کا انکار کیا، تمام نعمتوں کا کفران کیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنی نعمتیں یاد دلا رہا ہے کہ میں نے تمہارے لیے نعمتیں دیں، فرعون سے نجات دلائی، سمندر میں راستے بنائے، فرعون غرق ہوا اس کی سپاہ غرق ہوئی۔ کوہ طور میں جو

وعدہ دیا گیا اس کا قصہ بیان کیا، گوسالہ پرستی میں لگ گئے اور اس کے بعد کے حالات، پھر بنی اسرائیل کی توبہ قبول کرلی گئی۔ پھر کہا گیا کہ تم اپنے نفس کو ذبح کرو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر اللہ سے ملاقات کے لیے گئے، بجلی گری اور سب مر گئے لیکن پھر اللہ تبارک و تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور وہ سب زندہ ہوئے۔ یہ سب اور دیگر بے حساب نعمتیں جو بنی اسرائیل کو عطا ہوئیں، مَن و سلویٰ اترا، بھنے ہوئے پرندے آتے رہے لیکن ان تمام نعمتوں کے باوجود یہ اللہ کے راستے سے بھٹکے ہی رہے اور اللہ کی نافرمانی پر ڈٹے رہے، اللہ کے ساتھ میثاق باندھا پھر اس کو توڑتے رہے، کوئی برائی ایسی نہیں تھی جو انہوں نے انجام نہ دی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ، ان کی گمراہی، ان کے دل کی قساوت، دُنیاپرستی مادیات سے ان کا لگاؤ، سب کو یاد دلایا اور فرمایا کہ جو کچھ میرے ساتھ تمہارا عہد و پیمان تھا اس کی نگہداری کرو اور وہ پیمان یہ تھا کہ جب اللہ کی وحدانیت کو قبول کیا ہے تو پھر اسی پر عمل کرو۔ اللہ کے پیغمبر نے جو تمہیں دعوت دی ہے اور جو راستہ بتایا ہے اسی پر چلو۔ اگر تم ایسا کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو وعدہ دے رکھا اسے پورا کرے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا اس عہد و پیمان کو پورا کرنا ہے اور اللہ کے راستے کو چھوڑنا بدعہدی ہے۔ پھر اللہ نے واضح کہہ دیا کہ تمہیں کسی اور سے فکر مند نہیں ہونا چاہئے نہ ہی کسی اور کی پرواہ کرنی چاہیئے۔ میرے غضب سے ڈرو، میری نافرمانی کی سخت سزا ہے اور عہد توڑنے کا تمہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور اس کی سزا تمہیں ملے گی۔ جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے جو اللہ کی زمین پر رہ کر اللہ کے قوانین کے مطابق زندگی نہیں گزاریں گے تو ان کے لیے آتش جہنم ہے۔

وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ص

وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۡ وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾

''اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی، تصدیق کرتی ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے، اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو، اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اور مجھ ہی سے ڈرو''۔

بنی اسرائیل کے لیے فرمان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کرکے کہا ہے کہ جو کتاب میں نے اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمائی ہے؛ تم اس پر ایمان لے آؤ کیونکہ یہ کتاب حقیقی توریت کی بھی تصدیق کر رہی ہے جو تحریف سے محفوظ ہے۔ دین خدا ایک ہے جو تمہارے پاس آیا تھا وہ بھی اسلام تھا، جو اب ہے وہ بھی اسلام ہے۔ یہ قرآن اس کتاب کی تصدیق کر رہا ہے جو تمہارے پاس آئی ہے۔ خدا کا دین ایک ہے البتہ اس کی کامل شکل آخری دور میں آئی ہے اور یہ تمام الٰہی پیغامات کا تسلسل ہے نہ کہ ان کا مد مقابل ہے۔

سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں آیا ہے:

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا وَّالَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ . . . .

''ہم نے تمہارے لیے قانون اور دین قرار دیا ہے جو نوح اور باقی پیغمبروں کے لیے بھی تھا اور اسی کو ہم نے آپ کے لیے وحی کیا ہے....''۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ تمام انبیاء کو دیا ہوا اللہ کا قانون ایک ہی ہے۔ البتہ ہر عصر کے حالات کے مطابق اس میں کچھ اضافات ہوئے ہیں اور آخری دین اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اللہ کے قوانین کی پابندی کرو۔ پھر ان کی توجہ اس کمزوری کی جانب دلائی گئی کہ دُنیاوی مال کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس نے فنا ہو جانا ہے، اس کی خاطر اللہ کے احکام

میں تحریف مت کرو۔ کیونکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اللہ کے کلام کی قدر و قیمت کے مقابلے میں یہ سب ناچیز اور معمولی چیزیں ہیں۔

یہ آیت یہودی علماء کی مذمت میں اتری ہے جو اپنا عہدہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنا عہدہ بچانے کے لیے، اپنے مفاد کی خاطر اللہ کے احکام کو حکمرانوں کی مرضی کے مطابق تبدیل کر دیتے تھے اور انہیں خوش رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی غلط راہنمائی کرکے ان سے فائدے اٹھاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں متوجہ کیا ہے کہ دین کسی کا پیشہ نہیں ہے اور نہ ہی ایک سند ہے بلکہ ایمان اور عقیدہ ہے اور ترقی بخش ہے۔ لہٰذا اللہ نے فرمایا تمہیں میرا لحاظ رکھنا چاہیئے، میری پرواہ کرنی چاہیے اور میں نے ہی یہ نظام و قانون بنایا ہے۔ پہلے بھی اسی طرح کا ایک قانون تمہیں توریت کی شکل میں دیا تھا، ابھی اس کی ترقی یافتہ شکل قرآن کی صورت میں دی ہے، اس پر ایمان لے آؤ۔ اگر ایمان نہیں لائیں گے تو اس کی سزا پہلے ہی بتادی ہے کہ جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں ان کے لیے آتش جہنم ہے۔

وَ لَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾

''اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو''۔

حق و باطل کو ملانا

یہاں پر بھی یہودی علماء کو واضح خطاب کیا گیا ہے کہ تمہیں تو پتہ ہے کہ حق کیا ہے۔ اس کے باوجود تم حق پر پردہ ڈال رہے ہو۔ ایسا مت کرو، باطل کو حق بنا کر مت پیش کرو۔ کیونکہ تمہیں پتہ ہے کہ محمد ﷺ کی رسالت، ان کی پیغمبری اور اسلام دینِ حق ہے جس کے بارے توریت میں پہلے ہی تمہیں خبر دی جا چکی ہے۔ لیکن یہ لوگ اپنے ذاتی مفادات، امتیازات جو ان کو تمغے ملے ہوئے تھے ان کی حفاظت کی خاطر اس حق کا انکار کر رہے ہیں اور باطل کو حق کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ توریت میں تحریف بھی اپنے ذاتی مفادات کی خاطر

کی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علماء یہود کے لیے واضح کیا ہے کہ جس چیز کا تمہیں پتہ ہے کہ حق ہے، اس سے انکار نہ کرو اس کے انکار کا نتیجہ تمہارے لیے جہنم کے سوا کچھ نہ ہو گا جس کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا ہے۔

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾

"اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

"کیا لوگوں کو تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیوں نہیں سمجھتے"۔

نماز اور زکات کا فریضہ

پہلے نماز کے قیام کا حکم دیا گیا اور بتایا گیا کہ نماز ایک اہم فریضہ ہے، یہ عبودیت کا مظہر ہے، جب ایمان اور حق کے دائرے میں آ گئے تو پھر اللہ کی عبادت بجالانا ہو گی اور اللہ کی طرف سے جو فرائض ہیں ان کو انجام دینا ہو گا۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جو بندے کو اللہ سے جوڑتی ہے، یہ عبودیت کا مظہر کامل ہے۔ عبادت کا دوسرا پہلو جو سوسائٹی سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے جو مال دیا ہے، جو روزی دی ہے جیسا کہ شروع کی آیات میں اس کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال سے زکوٰۃ ادا کرو۔ تیسری بات نماز جماعت کے حوالے سے ہے کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یعنی نماز جماعت کی اہمیت بھی اسی آیت میں بیان کی گئی ہے۔

پھر انسان کی ایک خاصیت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ عام طور پر انسان دوسرے کو تو نصیحت کرتا ہے اور اپنے بارے سوچتا ہی نہیں۔ یہاں پر یہ خطاب یہودی علماء کو ہے جنہوں نے دین کو پیشہ قرار دے رکھا تھا، عقیدہ اور ایمان کو زبان پر جاری کرتے تھے اور ان کے دل میں عقیدہ اور ایمان نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ لوگوں کو نیکی کی نصیحت کرتے اور نیک عمل کی تلقین کرتے لیکن خود ایسا نہیں کرتے۔ جبکہ عقلی طور پر یہ بدیہی اور واضح امر ہے کہ جو شخص دوسروں کو خیر اور اچھائی کرنے کی نصیحت کرتا ہے تو پہلے خود اس کو اس کا پابند ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر یہ کام اچھا ہے تو خود اس کے لیے بھی اچھا ہونا چاہئے؛ ایسا نہیں ہے کہ کوئی کام خود اس کے لیے اچھا نہ ہو اور دوسروں کے لیے خیر اور اچھائی ہو۔ لہٰذا اس آیت میں ان کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ تمہیں عقل و سمجھ نہیں ہے؟ ایسا کیوں کرتے ہو؟ یہ واضح بات ہے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

''اور صبر کرنے اور نماز پڑھنے سے مدد لیا کرو، اور بے شک وہ (نماز) مشکل ہے مگر (سوائے) ان پر جو عاجزی کرنے والے ہیں''۔

نماز اور صبر سے مدد طلب کرنا

اصل بات یہ ہے کہ انسان اکیلا کسی کام کو انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق ہے اور وہی اس کو مدد فراہم کر سکتا ہے، الٰہی مدد کے بغیر استقامت نہیں آسکتی۔ صبر اور نماز دو ایسے کام ہیں جن سے انسان کو مدد مل سکتی ہے۔ صبر یعنی ہر بڑی مشکل میں بے حوصلہ نہ ہونا اور اسے معمولی سمجھنا اور نماز یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنا جو کہ دین کا ستون ہے۔ اگر نماز ہو تو پھر دین قائم رہتا ہے، اگر نماز نہ ہو تو دین ہی منہدم ہو جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ بڑے بڑے فرائض انجام دینے کے وقت دشواری اور مشکلات میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو کیونکہ جب آپ میں حوصلہ

ہوگا تو پھر واجبات اور فرائض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کریں گے اور اس میں تھکاوٹ بھی محسوس نہیں کریں گے۔

نماز کے بارے بتایا کہ یہ ایک سنگین اور دشوار عمل ہے کہ انسان پابندی کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے حضور پیش کرے۔ لیکن نماز ان لوگوں کے لیے سکون کا سبب ہے جو خشوع والے ہیں جو متواضع ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کے ہاں ذلیل و خوار سمجھتے ہیں، جن کے دل اللہ کے خوف سے کانپ رہے ہوتے ہیں اور ان کے اعضاء و جوارح پر خشوع و خضوع کے آثار ہوتے ہیں، ان کے لیے نماز کا فریضہ ادا کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ دنیا کے معاملات اور مادی مفادات میں غرق متکبرین کے لیے یہ فریضہ ادا کرنا بھاری ہے۔

خشوع و خضوع کا لفظ عام طور پر دل کے متاثر ہونے پر بولا جاتا ہے یعنی ان کے دل کے اندر تاثر اور خوف کی کیفیت موجود ہے۔ خضوع سے اعضاء و جوارح کا جھکاؤ مراد ہے۔ امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے کوئی بڑا واقع پیش آجاتا تو فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور اسی آیت کو تلاوت کرتے:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۴۵)

یہاں پر نماز کی اہمیت بتائی گئی ہے۔[1] ظاہر ہے روزہ انسان کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور پہنچاتا ہے۔ اور ایسی عبادت ہے کہ جو رب تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہوتی ہے اور اس میں ریاکاری اور دکھاوا کا عنصر بھی کمتر ہوتا ہے اور معین وقت میں ان چیزوں کا استعمال بھی اپنے لیے حرام کر لیتا ہے جو عام حالات میں جائز ہوتا ہے۔ اور معین وقت پر جا کر افطار کرتا ہے۔ یہ دونوں عمل اللہ کے حضور پیش ہونے کے لیے بہترین اعمال ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ روزہ آتش جہنم سے ڈھال ہے۔

---

[1] ۔ بعض مفسرین نے اس آیت میں صبر سے روزہ مراد لیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

”جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ضرور اپنے رب سے ملنا ہے اور ہمیں اس کے پاس لوٹ کر جانا ہے“۔

اللہ کے پاس پلٹ کر جانا

یہاں پر ”ظن“ سے عقیدہ اور یقین مراد ہے، گمان مراد نہیں ہے۔ کیونکہ ظن گمان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب انسان حتمی نظریہ کو اپنا لیتا ہے اور حقیقت کے بارے میں اسے علم ہوتا ہے تو انسان معاد پر یقین کر لیتا ہے اور قیامت پر یقین سے ہی اس میں استقامت آجاتی ہے۔ اور یہی عقیدہ حق بندگی اور فرائض کی ادائیگی کے لیے اسے آمادہ اور تیار کرتا ہے اور قیامت کے دن اسے کہا جائے گا کہ پڑھو اپنی کتاب اور وہ کہے گا کہ مجھے تو یقین تھا کہ میں پروردگار کی ملاقات کے لیے آؤں گا۔

اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾ (سورہ الحاقہ، آیت: ۱۹)

ترجمہ: ”بے شک میں سمجھتا تھا کہ میں اپنا حساب دیکھوں گا۔“

یہاں پر ظن کا لفظ استعمال کر کے گویا اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ پروردگار کی جانب توجہ دلانے اور واجبات کی انجام دہی میں ظن بھی کافی ہوتا ہے۔ اگر انسان احتمال دے کہ یہ عمل مجھے خدا کے پاس لے جائے گا تو ایسے احتمال پر بھی اسے عمل کرنا چاہیے۔ جہاں فائدے کا احتمال ہو فطری طور پر انسان اس فائدے کے لیے چل پڑتا ہے اور جہاں پر نقصان کا احتمال ہو تو اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان موارد میں یقین اور علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں پر باطنی عقیدہ اور ایمان مراد لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لفظ جہاں احتمال اور گمان کے لیے استعمال ہوتا ہے وہاں پر یقین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا یہ دونوں باتیں مراد لی جا سکتی ہیں۔ یعنی اگر کسی کو یقین نہ بھی آئے تو خالی احتمال ہی کافی ہے کہ اگر میں نے اللہ

کے بتائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کی تو مجھے سزا ملے گی اس سزا سے بچنے کے لیے بھی اسے اقدام کرنا چاہیے اور جہاں اس سے سوال ہو کہ قیامت بھی ہے تو قیامت میں حساب کتاب بھی ہونا ہے تو اس کے لیے اسے چاہیے کہ وہ عمل کرے اس طریقے پر چلے جو اللہ نے بتایا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

"اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دی تھیں اور میں نے تمہیں جہان پر فضیلت دی تھی"۔

بنی اسرائیل کے لیے یاددہانی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو دی جانے والی ایک اور بڑی نعمت کا ذکر کر رہا ہے۔ اے بنی اسرائیل میں نے تمہیں بہت ساری نعمتیں دی ہیں، تم کو باقی انسانوں پر برتری دی، تمہارے لیے پیغمبر بھیجے، تمہاری ہدایت کی، تمہیں ہلاکت سے نجات دی۔ برتری دینے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے درمیان پیغمبری اور خلافت بہت لمبا عرصہ رہی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی، اپنے انبیاء کی نافرمانی کی، اللہ کے انبیاء کا قتل کیا اور خداوند تبارک کے قانون کی مخالفت شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب اترا، اللہ کی لعنت ان پر آئی، وہ ذلت، رسوائی اور بے چارگی میں مبتلا ہوئے۔ اس دور میں بھی اگر کوئی اللہ کی نعمتوں کا مذاق اڑائے اور شکر بجا نہ لائے، نعمتوں کا غلط استعمال کرے تو اس پر بھی لعنت اور اللہ کا غضب ہے۔

وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ ان کے لیے کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ اس کی طرف سے بدلہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی''۔

ایسا دن جس میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا

یہاں پر ''واتقوا'' کا مطلب ہے بچو، اس عذاب کو اپنے سے دُور کرو، جس دن ہر شخص اکیلا حساب کے لیے پیش ہو گا۔ اس دن دنیاوی سلطنت اور بادشاہی میزان اور معیار نہیں ہے وہاں پر جو جرم کیا ہے اس کی سزا ملے گی، جو اچھا کام کیا ہے تو اس کا اجر و ثواب ملے گا۔ دُنیا میں تو حاکم، قاضی، بعض دفعہ رحم کر جاتا ہے، رشوت لے لیتا ہے، کوئی ضامن بن جاتا ہے، دوسرے افراد آ کر مددگار بن جاتے ہیں، رشتہ دار آ جاتے ہیں اور حکم اور فیصلہ تبدیل ہو جاتا ہے اور سزا میں کمی ہو جاتی ہے۔ قیامت کے دن ایسا کچھ بھی نہیں ہونا، آگاہ رہو کہ اس دن تمام دنیاوی اسباب ختم ہو چکے ہوں گے، دُنیا والے اسباب دنیا میں کام آسکتے ہیں آخرت میں نہیں۔ آخرت میں انسان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہو گا، اس کے اختیار میں کچھ نہ ہو گا۔ قیامت میں ذاتی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ سارے مادی اسباب جو خالق کی طرف سے دنیا میں انسان کو ملے ہوئے تھے وہ اپنی تاثیر چھوڑ دیں گے، وہ معطل ہوں گے بے کار اور ناکارہ ہوں گے۔ ظالم، گناہگار اور نافرمان کا نہ کوئی سفارشی ہو گا نہ کوئی یاور اور مددگار ہو گا۔

جیسا کہ سورہ غافر کی آیت ۱۸ میں ہے:

وَ اَنۡذِرۡهُمۡ یَوۡمَ الۡاٰزِفَۃِ اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ کٰظِمِیۡنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ حَمِیۡمٍ وَّ لَا شَفِیۡعٍ یُّطَاعُ ﴿ؕ۱۸﴾

"اور انہیں قریب آنے والی (مصیبت) کے دن سے ڈرا جب کہ غم کے مارے کلیجے منہ کو آرہے ہوں گے، ظالموں کا کوئی حمایتی نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے"۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کہ دُنیا میں جو معصیت کی ہے آخرت میں اس کا فدیہ نہیں دیا جاسکتا، نہ ہی دیت وہاں ہو گی اور نہ وہاں بدلہ دیا جاسکے گا۔ وہاں کوئی مدد نہیں ملے گی کیونکہ وہاں عدل الٰہی کا محکمہ ہو گا اور عدل الٰہی ہی انسان کو اس کے کیے ہوئے اعمال کی روشنی میں اس کے بارے فیصلہ دے گا تو جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے، اللہ کی نعمتوں کا غلط استعمال کیا ہے، ناشکری کی ہے، اللہ کے قوانین کی مخالفت کی ہے، اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے، اللہ کے انبیاء کی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے تو ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔ اس سے بچانے والا کوئی بھی نہیں ہو گا۔

وَ اِذۡ نَجَّیۡنٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَسُوۡمُوۡنَکُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ یُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَکُمۡ وَ یَسۡتَحۡیُوۡنَ نِسَآءَکُمۡ ؕ وَ فِیۡ ذٰلِکُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَظِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

"اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی، وہ تمہیں بری طرح عذاب دیا کرتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی"۔

وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِکُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَیۡنٰکُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

"اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا پھر تمہیں تو بچا لیا اور تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو ڈبو دیا"۔

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱

"اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑا بنا لیا، حالانکہ تم ظالم تھے"۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲

"پھر اس کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو"۔

بنی اسرائیل پر اللہ کے انعامات اور ان کی نافرمانیاں

آیت ۴۹ سے لے کر ۵۲ تک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے ہوئے دو احسانات کی یاد دلائی ہے۔ پہلا احسان یہ ہے کہ انہیں آل فرعون سے نجات دلائی۔ آل فرعون کے مظالم کے بارے میں بیان کیا کہ وہ تین قسم کے مظالم ان پر ڈھاتے تھے، ایک تو انہیں شکنجے دیتے تھے، سخت سزائیں دیتے تھے، مارتے پیٹتے تھے۔ ان پر فرعونیوں کا دوسرا عذاب یہ تھا کہ ان کے لڑکے جب پیدا ہوتے تھے تو وہ انہیں ذبح کر دیتے تھے اور ان کی لڑکیوں کو اپنے استعمال کے لیے باقی رکھتے تھے۔ یہ سارا سلسلہ چل رہا تھا اور یہ ان کے لیے ایک قسم کا بڑا امتحان اور آزمائش تھی۔ اللہ نے تمہیں اس مصیبت سے نجات دلائی اور جب موسیٰ علیہ السلام تمہیں لے کر فرعونیوں کے علاقے سے نکل کھڑے ہوئے اور جب تمہارے پیچھے فرعون اپنے لشکر کے ہمراہ تمہیں پکڑنے کی غرض سے دوڑا تو آگے سمندر آگیا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اپنا دوسرا انعام یاد دلا رہا ہے کہ کس طرح ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی، ہم نے تمہارے لیے سمندر کو چیرا اور اس میں راستے بنا دیئے اور تم ان راستوں سے باہر خشکی میں آگئے اور پیچھے اسی راستے میں فرعون اور اس کے لشکری بھی چل پڑے اور تمہیں بڑا خوف آیا کہ کہیں وہ ابھی باہر خشکی پر نہ پہنچ جائیں، تمہارے دل گھبرا گئے لیکن ہم نے تمہارے اوپر احسان کیا کہ وسط سمندر میں فرعون اور اس کے لشکریوں کو غرق کر دیا۔ یہ ایک بڑا انعام تھا جس کا تذکرہ اللہ تبارک و تعالیٰ کیا۔ کہا کہ ان کے غرق ہونے کے منظر کو تم سب دیکھ رہے تھے۔ایسا نہیں ہے کہ یہ تمہاری نظروں کے سامنے نہ ہو۔ فرعونیوں سے نجات دینے کا منظر اور اس کا طریقہ کار بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات ان سے کہی ہے وہ بھی اللہ کا ان پر احسان ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مناجات کے لیے اپنے پاس بلایا اور دس راتیں اور بڑھا دیں۔ گویا موسیٰ علیہ السلام کا چلہ پورا ہوا اور بنی اسرائیل سے کہا کہ جب موسیٰ علیہ السلام واپس تیس رات بعد نہ آیا تو تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس آیا تو دیکھا کہ تم بچھڑے کی پوجا کر رہے ہو تو تم نے ظلم اور زیادتی کی ہے۔ پھر جب موسیٰؑ نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کر دی اور معافی کا اعلان ہوا تو یہ بھی تمہارے اوپر ہمارا احسان ہے، تمہیں اس لیے معاف کر دیا گیا تاکہ شکر گذار بنو۔ یہ ہماری نعمت تمہارے اوپر آئی۔

وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور قانون فیصل دیا تاکہ تم ہدایت پاؤ''۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بے شک تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، سو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو پھر اپنے آپ کو قتل کرو، تمہارے لیے تمہارے خالق کے نزدیک یہی بہتر ہے، پھر اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہی بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے"۔

بنی اسرائیل کا جرم اور موسیٰؑ کیلئے کتاب ہدایت

اس آیت میں بنی اسرائیل نے جو جرم کیا اس کا تذکرہ ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کتاب لے کر واپس آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم بچھڑے کی پوجا کر رہی ہے۔ سامری نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کے راستے پر لگا دیا ہے اور یوں انہوں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی نافرمانی کر لی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے مخلوق کو عدم سے ایجاد کیا ہے اور وجود دیا ہے اور خاک سے انسان کو پیدا کیا ہے اور اللہ نے کہا ہے کہ اپنے خالق کی طرف رجوع کرو۔ ظاہر ہے نطفہ بھی تو خاک سے تیار ہوتا ہے، غذا کھاتا ہے، خون بنتا ہے، نطفہ بنتا ہے اور اسے رحم میں داخل کرتا ہے اور انسان بن کر نکلتا ہے۔

بنی اسرائیل کی اس نافرمانی پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم دیا یعنی جو گوسالہ پرست تھے وہ گناہگار تھے، نافرمان تھے اور یہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم بھی ان کی آزمائش کے لیے تھا لیکن خدا نے قتل ہونے سے پہلے سارے گناہگاروں کی توبہ قبول کی۔ یہاں جو کہا کہ "بَارِئِكُمْ" اس میں خدا اپنی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان

کے دلوں میں اس پیار کو ابھارا جائے کیونکہ گوسالہ پرستی کے ذریعے انہوں نے ایک برے فعل کا ارتکاب کیا تھا اور اس کا کفارہ یہ تھا کہ ان کو قتل کیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کرلیا اور قتل کا حکم اٹھالیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت کی نشانی تھی یعنی جنہوں نے بت پرستی کی، گوسالہ پرستی کی ان کو قتل کیا جانا تھا، جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی تھی، گویا کہ ان کے لیے یہ سزا تھی کہ انہوں نے ان سے دشمنی کیوں نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا کہ قتل کا حکم ان سے اٹھالیا۔

یہاں پر گناہ کرنے کی نسبت سب کی طرف دی گئی ہے جبکہ ایک تعداد نے گناہ کیا تھا اور جرم کچھ افراد کی طرف سے صادر ہوا تھا لیکن قوم تو ایک تھی، کچھ وہ تھے جو ان کے اس عمل پر راضی رہے، کیونکہ ان میں کلی طور پر وحدت موجود تھی اس لیے چند افراد کے عمل کو سب کی طرف نسبت دی گئی ہے، اگرچہ سارے گوسالہ پرست نہیں ہوئے تھے اور سب نے انبیاءؑ کو قتل نہیں کیا تھا لیکن وہ ان کے جرم میں اس لیے شریک قرار پائے کہ وہ ان کے جرم پر خاموش رہے۔ اور کچھ وہ تھے جو راضی بھی تھے۔ پس یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کرلیا قبل اس کے کہ سب گناہگار قتل ہوں۔ یہ امر امتحان کے لیے تھا۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم دیا گیا اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو وہ حکم اٹھالیا گیا، یہاں بھی اسی طرح ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تیرا یقین نہیں کریں گے جب تک کہ روبرو اللہ کو دیکھ نہ لیں، تب تمہیں بجلی نے دیکھتے ہی دیکھتے آلیا"۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

''پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد زندہ کر اٹھایا تاکہ تم شکر کرو''۔

اللہ کو ظاہر بظاہر دیکھنے کی خواہش کا انجام

ان دو آیات میں دو واقعات کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام اور احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تو اللہ پر ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ آپ اللہ کی ملاقات کے لیے ہمیں بھی ساتھ لے جاو۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ آپ خود جاتے ہو وہاں پر اللہ سے ملاقات کر کے آجاتے ہو ہمیں آکر بیان کرتے ہو ہم ظاہر بظاہر اللہ کو دیکھیں گے تو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے۔

ان کی اس غلط بات پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر گئے اور ظاہر ہے محدود حواس رکھنے والے اس ذات کا کیسے مشاہدہ کر سکتے ہیں جو لامتناہی اور لامحدود ہے۔ پس جب وہاں پر آ گئے اور اللہ کے دیدار کا ارادہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی درخواست اللہ کے حضور پیش کر دی تو آسمان سے عذاب کی بجلی گری اور سارے مر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو ہوش آیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ سے درخواست کی کہ یہ تو راکھ ہو گئے ہیں، اب میں کس منہ سے قوم کے پاس واپس جاؤں گا، ان سے غلطی ہوئی ہے آپ انہیں معافی دے دیں۔ تو اللہ یاد دلا رہا ہے کہ پھر تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا گیا اور یہ زندگی اس لیے دی تھی کہ تم نے ہلاکت کے اس سارے منظر کا مشاہدہ کیا تھا اور دیکھا تھا کہ کس طرح تم نے غلط بات کا تقاضا کیا اور کس طرح تمہارے اوپر بجلی کی چمک آئی اور تم ہلاک ہو گئے۔ لیکن اپنے پیارے موسیٰ کی درخواست قبول کر لی اور یہ اس لیے کہ شاید تم شکر گذار بن جاؤ اور اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو دی جانے والی ایک

ایک نعمت کو یاد دلا رہا ہے اور یہی کہنا چاہتا ہے کہ اپنے رب کی اطاعت میں آجاؤ، شکر گذار بن جاؤ۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

"اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر مَن و سلویٰ اُتارا، جو کچھ ہم نے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں اِن میں سے کھاؤ، اور انُہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے"۔

بنی اسرائیل پر بادل کا سایہ اور من و سلویٰ

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دی جانے والی ایک اور نعمت کا تذکرہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ وادی سینا میں دربدر تھے دھوپ میں جھلس رہے تھے اور پریشانی میں تھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیارے موسیٰ کی دعا قبول کی اور بادل ان کے اوپر سائے کے لیے آگئے جہاں پر پانی، گھاس یا درختوں کا نام و نشان بھی نہ تھا وہاں پر اللہ نے بادلوں کے ذریعے چھاوں فراہم کردیا ہے۔ ان پر مَن و سلویٰ اتارا۔ مَن سے مراد ذائقہ دار شہد کی مانند قطرے گرتے تھے اور ان کو یہ کھاتے تھے۔ سلویٰ بھنے ہوئے پرندے، یہ کہا کہ ہم نے تمہیں طیب اور طاہر روزی دی اسے کھاؤ فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن انہوں نے پھر نافرمانی کی اس نعمت کی قدر نہیں کی پھر یہ کہنے لگے کہ ہمیں تو کچھ اور چیزیں دیں ہم تو تھک گئے یہ کھا کھا کر۔ اللہ نے فرمایا تم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اس کا نقصان خود ان ہی کو پہنچا۔ تو یہاں بھی اللہ نے بنی اسرائیل پر اپنے انعام کا تذکرہ کیا ہے۔

وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَ سَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾

"اور جب ہم نے کہا اس شہر میں داخل ہو جاؤ پھر اس میں جہاں سے چاہو بے تکلفی سے کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ بخش دے، تو ہم تمہارے قصور معاف کر دیں گے، اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے"۔

فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ع

"پھر ظالموں نے بدل ڈالا کلمہ سوائے اس کے جو انہیں کہا گیا تھا، سو ہم نے ان ظالموں پر اُن کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کیا"۔

الٰہی انعامات کی ناشکری پر سزا

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے ایک اور احسان کا تذکرہ کیا ہے۔ جب وہ مصر سے نکلے تو دربدر تھے، ان سے کہا گیا کہ شہر عمالقہ میں داخل ہو جاو؛ کہا گیا کہ تم اس شہر میں آجاؤ اور خوشحال زندگی گزارو، وہاں نعمتیں بہت زیادہ ہیں لیکن اس شہر میں جو داخلے کا دروازہ تھا اس سے گزرنے کے لیے ایک شرط رکھ دی کیونکہ یہ خطا پر خطا کر رہے تھے تو اللہ نے ان کی مشکل حل کی اور دربدر جو صحراء میں پھر رہے تھے ان سے کہا اس شہر میں چلے جاؤ وہاں مزے سے رہو۔ البتہ جب داخل ہو تو وہاں "حطۃ" کہو کہ ہمارے گناہوں کو گرا دو۔ لفظ حطۃ بولنا تھا تو اللہ نے یہ فرمایا کہ جب یہ کہتے ہوئے داخل ہوں گے اور سر جھکاتے ہوئے تواضع کے ساتھ

انکساری کے ساتھ یہ لفظ بولتے جاؤ گے تو ہم پھر تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ لیکن انہوں نے پھر نافرمانی کی اور پھر اکڑ گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

۔۔۔فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (سورہ مائدہ، آیت: ۲۴)

''سو تو اور تیرا رب جائے اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔

اسی وقت اگر چلے جاتے جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا تو اسی وقت انہیں امن وسکون مل جاتا، انہوں نے نافرمانی کی اور چالیس سال دربدر پھرتے رہے اور حضرت یوشع بن نون آئے اور انہوں نے یہ شہر فتح کیا اور پھر وہ داخل ہوئے۔ تو یہاں پر اللہ کی جانب سے جو سہولت مہیا کی گئی اس کا انہوں نے انکار کیا۔ اللہ نے کہا تھا کہ "حطۃ" کہہ کر جاؤ لیکن انہوں نے ظلم کیا اور گناہ کیا اس لفظ کو نہیں بولا بلکہ اس لفظ کو الٹا بولا تو پھر اس کی وجہ سے آسمان سے گندگی اتری اور عذاب اترا اور اس عذاب کی وجہ یہ تھی کہ عبودیت کی جو روش تھی اس کو انہوں نے چھوڑ دیا، گناہ کے مرتکب ہوئے۔ گناہ پر اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ جب نافرمانی کرو گے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلو گے تو دنیا میں ہی عذاب آسکتا ہے، آخرت کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔ لیکن جو نیکوکار ہیں، اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں تو اللہ ان کے اس عمل میں اور برکت دیتا ہے اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝۶۰

''پھر جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنے عصا کو پتھر پر مار، سو اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے ہر قوم نے اپنا گھاٹ پہچان لیا، اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے کھاؤ پیو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو''۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم کے لیے پانی کی فراوانی

یہاں پر ایک اور نعمت کا تذکرہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ پانی نہیں تھا، پیاس تھی، پریشانی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی اور پانی طلب کیا، اللہ نے کہا کہ تیرے پاس جو عصا ہے اس کو چٹان پر مارو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے چٹان پر مارا تو اس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، سب میں پانی تھا۔ آپ نے کہا اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرو، اللہ کے احکام کی نافرمانی مت کرو، گناہ مت کرو، اللہ کے فرائض ادا کرو، اللہ کے فرائض کا مذاق نہ اڑاؤ۔ یہ پانی ہے کیونکہ بنی اسرائیل بارہ قبیلے تھے تو ہر قبیلے کے لیے الگ چشمہ پھوٹا اور ہر ایک کو اپنے چشمے کا پتہ تھا۔ ان قبیلے والوں نے اس پانی کو اپنے لیے استعمال کرنا تھا اس کی انہیں کھلی اجازت دی گئی۔ لیکن انہوں نے اس کی بھی قدر نہ کی، حکم یہ تھا کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، اللہ کی نافرمانی نہ کرو، اللہ روزی دے رہا ہے اس کا شکر بجالاؤ نہ کہ اللہ کی نافرمانیاں کرو۔

وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّکَ یُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوۡمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا فَاِنَّ لَکُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ ؕ وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡهِمُ الذِّلَّةُ وَ الۡمَسۡکَنَةُ ٭ وَ بَآءُوۡ

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے سو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا مانگ کہ وہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار میں سے ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز پیدا کر دے، کہا کیا تم اس چیز کو لینا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے بدلہ اُس کے جو بہتر ہے، کسی شہر میں اُترو بے شک جو تم مانگتے ہو تمہیں ملے گا، اور ان پر ذلت اور محتاجی ڈال دی گئ اور انہوں نے غضب الٰہیٰ کمایا، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے''۔

اللہ کی نعمت کا کفران

اس آیت میں بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ خدا کی جانب سے ان پر مَن و سلویٰ اترتا تھا تو بجائے اس کے کہ وہ اس نعمت کا شکر کرتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں کہ ہم تو ایک قسم کا کھانا کھا کر تھک گئے ہیں ہمارے لیے زمین سے سبزیاں اگنی چاہئیں، ہمیں تو دال چاہیے، سبزی جات چاہیے، ککڑیاں چاہئیں، لہسن چاہیے، مسور کی دال چاہیے، پیاز چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بات سن کر کہا عجیب لوگ ہو، تمہارے لیے بھنے ہوئے پرندے بغیر تکلیف کے مل جاتے ہیں، میٹھا مل جاتا ہے، اس اعلیٰ ترین نعمت کو چھوڑ کر کمتر چیز مانگ رہے ہو جس کو خود ہی بوؤ گے خود ہی کاٹو گے خود ہی پکاؤ گے۔ یہ تو عجیب ہے تم بہتر کو چھوڑ کر کمتر کو لے رہے ہو۔

بہر حال ان کی اس درخواست پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے اجازت مانگی اور انہیں کہا ٹھیک ہے تم اس پستی میں آگئے ہو تو جاؤ اس شہر میں، دُنیاوی پستی میں غرق ہو جاؤ۔ مصر میں جاؤ اور وہیں سے فائدہ اٹھاؤ۔ جو چیزیں تم مانگ رہے ہو یہ ساری چیزیں تمہیں ملیں گی۔ اس طرح ذلت اور رسوائی ان کا مقدر ہوئی۔ یہ ذلت و پستی ان کی اپنی کمائی ہوئی تھی۔ اور اللہ کی طرف سے ان پر غضب آگیا جو غضب پہلے بھی آیا تھا اسی میں پھر مبتلا ہو گئے۔ اس پستی اور ذلت کی وجہ وہ ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا تھا، اللہ کی نشانیوں کو جھٹلاتے تھے، اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے اور یہ اس قوم کے بدترین اعمال تھے۔ انہوں نے اس ظلم اور زیادتی میں حد سے تجاوز کیا اور اس طرح اللہ کے غضب میں گرفتار ہوئے اور پھر ان کا کفر اور نبیوں کا قتل سبب بنا کہ توبہ کے بعد پھر غضب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور اس کا انجام دُنیا میں بھی ذلت و خوارگی کی شکل میں انہیں نصیب ہوا اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

”جو کوئی مسلمان اور یہودی اور نصرانی اور صابئ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام بھی کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے ہاں موجود ہے اور ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔

اللہ پر ایمان لانے والوں کا حال

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے، یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے اور صابئی وہ قوم ہے جو اللہ، بعض انبیاء اور قیامت پر ایمان رکھتے تھے لیکن انکا عقیدہ تھا کہ کچھ ستارے ہیں جو خیر اور شر میں اثر رکھتے ہیں، ایک ستارہ شر کا ہے اور ایک خیر کا ہے۔[1]

یہاں پر اللہ نے فرمایا ہے کہ ان میں سے جو بھی ایمان لے آئے، ظاہر ہے جو ایمان لاتا ہے تو اسے مومن کہا جاتا ہے اور وہ مومن یہودی، نصاریٰ، صابئی، پھر عذاب سے بچ جائیں گے۔ کرامت اور سعادت کا اصل معیار اللہ پر سچا ایمان اور قیامت پر ایمان اور نیک عمل ہے۔ تو سعادت و کرامت کا دارومدار عبودیت پر ہے۔ رستگاری اور کامیابی کا تعلق انسان کے باطن اور حقیقت سے ہے، ظاہر سے نہیں ہے۔ پس جنہوں نے بتوں کی پوجا نہیں کی اور اللہ کے احکام اور اللہ کے بتائے ہوئے قوانین اور نظام کو تبدیل نہیں کیا، عذیر یا مسیح کو اللہ کا بیٹا نہیں کہا، اور ستاروں کو خیر اور شر میں موثر نہیں جانا اور اللہ کی عبادت کی ہے، آخرت پر یقین ہے تو ان کے لیے اُخروی اجر اور ثواب ہے۔

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ وَ رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ ؕ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾

”اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہِ طور بلند کیا، جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوط پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ“۔

---

[1] ۔ بعض کا کہنا ہے کہ صابئی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں یا وہ لوگ ہیں جو ”تعمید“ دین مسیحیت کا خاص غسل انجام دینے والے مراد ہیں۔

الٰہی وعدہ کی یاددہانی

یہاں پر بنی اسرائیل کو ایک وعدہ یاد دلایا جارہا ہے کہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم توریت میں درج احکام اور قوانین کی پابندی کروگے۔ کوہ طور اللہ کی عظمت اور قدرت کا نظارہ ان کو دکھانے کے لیے اُٹھا اور ان کے اوپر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس میں البتہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر جبر کیا جائے کہ وہ توریت پر عمل کریں، اللہ کی نشانی اور اللہ کی آیات دکھانے کے بعد تم سے عہد لیا گیا تھا کہ اللہ کا عقیدہ رکھو، اللہ کے بتائے ہوئے احکام کی پابندی کرو، اللہ سے جو عہد و پیمان باندھا ہے اس کو مت توڑو اور جو قوانین ہم نے توریت میں بیان کئے ہیں ان کو مت بھولو۔ یہ سارا اس لیے کیا گیا کہ جو لوگ ان امور کے عواقب اور ان کے انجام سے جاہل تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سب کچھ وضاحت کے ساتھ بیان کردیا تاکہ وہ متقی ہو جائیں۔ اللہ کو تو معلوم ہے کہ ان کا انجام کیا ہے۔ ان سے یہ اُمید ہے کہ وہ ان سب حقائق کو جاننے کے بعد جو ان کے سامنے رکھے گئے ہیں اور ان کو یہ سارے انعامات دیئے گئے ہیں اسی طرح پہلے سے ان کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کا شفقت بھرا رویہ رہا ہے ان سب کو سامنے رکھ کر وہ نیک بن جائیں۔ اللہ کے غضب سے خود کو بچالیں، متقی ہو جائیں۔

ثُمَّ تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ‌ۚ فَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَكُنۡتُمۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿٦٤﴾

”پھر تم اس کے بعد پھر گئے، سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم تباہ ہو جاتے“۔

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـئِيۡنَ‌ۚ ﴿٦٥﴾

''اور بے شک تمہیں وہ لوگ بھی معلوم ہیں جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی پھر ہم نے ان سے کہا تم ذلیل بندر ہو جاؤ''۔

وعدہ دینے کے بعد پھر جانا

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان کیا ہے کہ دیکھیں تمہیں کہا گیا تھا کہ جو تمہارے ساتھ عہد و پیمان باندھا ہے اس کو مت توڑنا اور تورات میں جو احکام ہیں ان کی پیروی کرنا لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے ہمارے بتائے ہوئے احکام کی پیروی نہیں کی اور عہد و پیمان کو توڑ دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جیسے ہی تم نے عہد و پیمان توڑا تمہیں فوراً سخت سزا ملتی لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت رہی، اگر یہ رحمت نہ ہوتی تو تم اس عہد اور پیمان شکنی کے نتیجے میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے لیکن تمہاری یہ ہٹ دھرمیاں جاری رہیں۔

پھر جب تم سے کہا گیا کہ ہفتہ کے دن تم نے مچھلیوں کا شکار نہیں کرنا تو تم نے پھر نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پامال کیا۔ انہوں نے سازش کی اور گڑھے کھود دیئے جن میں ہفتے والے دن بھی پانی آجاتا تھا تو ساتھ مچھلیاں بھی ادھر آجاتی تھیں، اتوار والے دن شام کو وہ ناکوں کو بند کر دیتے تھے، مچھلیاں اسی گڑھے میں رہ جاتی تھیں، اتوار والے دن وہ مچھلیوں کا شکار کر لیتے تھے یہ انہوں نے ایک نیا حیلہ اور چارہ اپنے لیے ڈھونڈا تھا اور اس طرح انہوں نے ہفتے کے دن کا احترام جسے اللہ نے قرار دیا تھا اس کو بھلا دیا۔ ہفتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے امتحان تھا کیونکہ باقی ۶ دنوں میں مچھلیاں کنارے پر نہیں آتی تھیں اور ہفتے والے دن آجاتی تھیں تو انہوں نے ان کو پکڑنے کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی اس نافرمانی پر انہیں دنیا میں ہی بہت سخت سزا دی اور یہ کہا کہ تم بندر بن جاؤ۔ بھٹکے ہوئے ذلت والے، پستی والے۔ کیونکہ انہوں نے انسان ہوتے ہوئے حیوانی اعمال کئے اور پستی کی جانب خود گئے ان کی اصلیت حیوانیت تھی جس قسم کا باطن وہ رکھتے تھے، جو

شرارت انہوں نے کی تھی اسی عمل کی مناسبت سے انہیں بندروں کی شکل میں مسخ کیا گیا۔ ہفتہ والے دن شکار کی ممانعت پر انہوں نے حکم خدا کو پامال کرنے کے لیے جو حیلہ بازی اور سازش سے کام لیا یہ ان کے اس عمل کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے سزا تھی جو انہیں بھگتنا پڑی۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

"پھر ہم نے اس واقعہ کو اس زمانہ کے لوگوں کے لیے اور ان سے پچھلوں کے لیے عبرت، اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت بنا دیا"۔

عبرت وتذکر کے لیے واقعات کا بیان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مسخ کرنے کی وجہ بتائی ہے۔"نکال" توہین آمیز عمل کو کہتے ہیں۔ جب ایک کے ساتھ ایسا عمل ہو تو پھر دوسروں کے لیے وہ عبرت بنے۔ متقین وہ ہوتے ہیں کہ جو اللہ کی حدود اور اللہ کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ انہوں نے کیونکہ پابندی نہیں کی تھی تو ان کو بندروں میں بدل دیا گیا اور جو باقی لوگ تھے ان کے لیے بھی عبرت تھی جو بعد میں آنے والے ہیں ان کے لیے بھی عبرت ہے اور جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہیں ان کے لیے بھی عبرت ہے کہ ان سب پر یہ بات واضح ہوئی کہ جب اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ دُنیا میں بھی اسے سزا دیتا ہے اور پھر آخرت میں تو ان کے لیے اس کا سخت ترین عذاب ہوگا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہوگی۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، انہوں نے کہا کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے، کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ جاہلوں میں سے ہوں"۔

قتل کا واقعہ اور اسکے بارے تحقیق کا عمل

اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہ مشہور واقعہ ذکر ہوا ہے جس کی وجہ سے اس سورہ کا نام بھی سورہ بقرہ رکھا گیا۔ ہوا یوں کہ بنی اسرائیل کا ایک بندہ قتل ہو گیا اس کا قاتل نہیں مل رہا تھا۔ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے کہا گائے ذبح کرو، گائے کے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول کو مارا جائے گا اس طرح قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ آیات میں بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی بیان ہوئی ہے کہ وہ ہر بات میں سوال کرتے تھے، وضاحتیں مانگتے تھے، بے ہودہ سوال کرتے تھے اور اللہ کے اوامر میں ابہام پیدا کرتے تھے، انبیاء کے بیان میں شک کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں اہانت اور رب تعالیٰ کے مقام کو معمولی جاننا تھا۔

اس لیے انہوں نے کہا کہ آپ نے جو ہمیں جو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو اپنے رب سے چاہو، یعنی یہ نہیں کہا کہ ہمارے رب سے چاہو، یہ بھی ان کا اہانت والا انداز تھا۔ اپنے رب سے چاہو کہ ہمارے لیے یہ گائے مشتبہ ہو گئی ہے یعنی امر الٰہی ہمیں سمجھ نہیں آرہا کہ اللہ کیا چاہ رہا ہے، یہ خاص گائے ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے چاہی ہے؟ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً اور بغیر قید و شرط کے ایک مادہ گائے کے ذبح کرنے کا کہا تھا۔ تو انہوں نے پیغمبر کی طرف جہالت کی نسبت دے دی اور خود ہی بے وجہ سوالات گھڑنے شروع کر دیئے اور پیغمبر کی توہین کرتے ہوئے کہا کہ تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو۔ گویا کہ اس امر کے بالکل منکر ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاوں۔ اور

پھر انہوں نے کہا کہ اب تم حق بات کہہ رہے ہو جو کچھ کہہ رہے تھے وہ باطل تھا اور یہ باطل کی نسبت جو ہے گویا کہ اللہ کے بیان کی طرف دے رہے تھے اور نبوی تبلیغ کو غلط قرار دے رہے تھے۔ تو پیغمبرؐ سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل کے جو خصائص ہیں وہ اس طرح ہیں اور ان میں اطاعت کا مادہ موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ بات سنتے تھے، ان میں سرپیچی اور استکبار اور غرور تھا اور وہ یہ کہتے تھے کہ ہم قابل مذمت تقلید نہیں کریں گے اور فقط اس پر ایمان لائیں گے جس کو ہم دیکھیں گے اور جس کو ہم محسوس کریں گے، محسوسات کو معقولات پر ترجیح دیتے تھے۔ سورہ بقرہ آیت ۵۵ میں ہے: ''ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ اللہ کو ظاہر بظاہر دیکھیں''۔

یعنی اپنے پیغمبر کو کہا کہ خدا کو دکھاؤ، نہیں دکھاؤ گے تو ہم عبادت نہیں کریں گے۔ پھر پیغمبر سے کہا ہمارے لیے معبود قرار دو تاکہ ہم اس کی عبادت کریں۔

قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

(سورہ اعراف، آیت ۱۳۸)

''کہا اے موسیٰ! ہمیں بھی ایک ایسا معبود بنا دے جیسے ان کے معبود ہیں، فرمایا بے شک تم لوگ جاہل ہو''۔

ان کا خیال تھا کہ انسان ہر بات کو بغیر دلیل کے قبول نہ کرے۔ اگرچہ اپنی جگہ پر بات تو صحیح ہے کہ دلیل مانگی جائے لیکن یہ وضاحت طلبی اور گائے کے اوصاف طلب کرنا یہ ان کی طرف سے ایک قسم کی ہٹ دھرمی اور اللہ کے حکم کو تسلیم کرنے سے فرار تھا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

''انہوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے معلوم کر کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بچہ اس کے درمیان ہے، پس کر ڈالو جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے''۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾

''انہوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے چاہو کہ ہمیں بتائے اس کا رنگ کیسا ہے، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ زرد گائے رنگ کی ہے اس کا رنگ خوب گہرا ہے، دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے''۔

یعنی ساری وضاحتوں کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نصیحت کی کہ سوال نہ کرنا لیکن وہ پھر بھی باز نہ آئے اور پھر سوال کر ڈالا اور پھر کہا کہ اس کا رنگ بتاؤ۔ یعنی وہ جدل اور ہٹ دھرمی میں لگے ہوئے تھے اور بار بار سوال کئے جا رہے تھے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

''انہوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے چاہو کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کس قسم کی ہے کیونکہ وہ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور پتہ لگا لیں گے''۔

انہوں نے اپنی اس ہٹ دھرمی کو جاری رکھا اور اسی پر اکتفاء نہیں کیا اور بظاہر یہ کہا کہ ہم ہدایت چاہ رہے ہیں تاکہ ہمیں راہنمائی مل جائے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

''موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے محنت کرنے والی نہیں جو زمین کو جوتتی ہو یا کھیتی کو پانی دیتی ہو، بے عیب ہے اس میں کوئی داغ نہیں، انہوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی، پھر انہوں نے اسے ذبح کر دیا اور وہ کرنے والے تو نہیں تھے''۔

گائے کے ذبح کرنے کا مسئلہ

اتنے سارے سوال کرنے کے بعد پھر سوال کر ڈالا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ دیکھیں وہ ایک ایسی گائے ہے کہ جو ہل جوتنے والی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے بلکہ وہ صحیح وسالم ہے۔ اس پر کوئی کام کرنے کے نشان وغیرہ نہیں ہیں۔ ایسا تھا کہ اتنے سارے بیانات کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے اب آپ نے تفصیل بتادی ہے اب تم صحیح بات لے کر آئے ہو اور مجبوراًاس حکم کے آگے تسلیم ہوئے اور گائے ذبح کی، حالانکہ وہ گائے ذبح کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

بہر حال بہت ہی مشکل سے گائے تلاش کرنا شروع کی۔ اور وہ ایک جوان کے پاس ملی اور جس کی قیمت یہ قرار پائی کہ اس کے چمڑے کو سونے سے بھر دیا جائے گا۔ اگر لوگ پہلے حکم پر عمل کرتے تو یہ مسئلہ ایک سادہ گائے کے ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا تھا۔ لیکن ان کی

ہٹ دھرمی اور ضد بازی کا نتیجہ نکلا کہ ایک مہنگی گائے خریدی گئی اور اس کو ذبح کرکے قتل کا معمہ حل کیا گیا۔

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾

''اور جب تم ایک شخص قتل کرکے اس میں جھگڑنے لگے، اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس چیز کو جسے تم چھپاتے تھے''۔

قتل چھپانے کی سازش

ایک بندہ قتل ہو گیا اور ہر جماعت اس کا قتل دوسرے گروہ پر ڈال رہی تھی اور خون اگلے کی گردن پر پھینک رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم جس چیز کو چھپا رہے ہو اور ایک دوسرے پر تہمت لگا رہے ہو، اللہ خود ہی اس کو آشکار کر دے گا۔ پھر یہ گائے ذبح کرنے کی بات کہی گئی۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰی ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

''پھر ہم نے کہا اس مردہ پر اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا، اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو''۔

قاتل کی نشاندہی

ان سے کہا گیا کہ گائے ذبح کرکے گائے کے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول کے جسم پر مارو۔ وہ مردہ زندہ ہو جائے گا اور اس سے تمہیں پتہ چل جائے گا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی قدرت سے کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اس طرح معلوم کیا گیا کہ قاتل کون ہے۔

یہ بھی بنی اسرائیل کی ایک آزمائش تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس امتحان کے ذریعے ان کی ہٹ دھرمی کو ظاہر کر دیا اور ان کو سمجھا دیا کہ اللہ مُردوں کو اس طرح زندہ کر سکتا ہے۔ مردہ گائے کے جسم کا ایک ٹکڑا مردہ انسان پر مارا جاتا ہے اور وہ انسان زندہ ہو جاتا ہے اور وہ پھر بتاتا ہے کہ مجھے کس نے قتل کیا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا کہ وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت، اور بعض پتھر تو ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو پھٹتے ہیں پھر ان سے پانی نکلتا ہے، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں''۔

بنی اسرائیل پتھر دل

پچھلی آیات میں بنی اسرائیل کے حالات ذکر ہو چکے ہیں۔ ان پر اللہ نے کتنی نعمتیں نازل کیں، لیکن وہ ان نعمتوں کے باوجود کس طرح نافرمانی کرتے رہے، کس طرح دُنیا میں ان کو سزا ملی۔ اس آیت میں بھی انہی کو خطاب ہے کہ یہ سارے واقعات کے بعد بھی تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ بلکہ پتھروں میں تو کچھ ایسے پتھر بھی ہیں جن سے گھاس بھی نکلتی ہے۔ لیکن ان کے دلوں کی قساوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان سے

کوئی خیر کی توقع نہیں ہے۔ حق بات تمہارے دل پر اثر ہی نہیں کرتی۔ تم پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو، نہ تو حق کے مطابق بات کرتے ہو اور نہ ہی بات سنتے ہو اور نہ ہی حق کو جگہ دیتے ہو۔ جبکہ پتھروں میں سے کچھ ایسے ہیں جیسے کوہ طور کے پاس گئے تھے کہ اللہ کو دیکھیں اور وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پتھروں میں زلزلہ آیا اور وہ پتھر وہاں سے گرنے لگے۔ یعنی پہاڑوں سے یہ جو پتھر گرتے ہیں جیسے کوہ طور اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے سروں پر آکر کھڑا ہوا یا زلزلہ کی وجہ سے پہاڑ پھٹتے ہیں، یا آتش فشاں ہوتا ہے۔

یہ سب اسباب کے تابع ہیں اور اللہ کے اختیار اور امر سے یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔

یہ تکوینی طور پر اپنے پروردگار کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور اس کی عبادت میں ہیں، اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۱۱۶ میں ہے کہ: كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ "سارے اس کی عبادت میں ہیں" جبکہ بنی اسرائیل کے دلوں کی حالت یہ ہے کہ پتھروں سے بھی بدتر، سخت تر ہیں کہ ان میں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ خدا کا ترس ہے اور جتنی بھی آیات دیکھی ہیں، جتنے بھی انعامات ان کو ملے ہیں، انہوں نے توبہ کی ہے اللہ نے توبہ قبول کر کے انعام کیا۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں حق کو جگہ دینے کی سکت ہی نہیں۔ یہ جو بھی عمل کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ یہ پتھر دل ہیں، بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں کہ ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔

گائے کا قصہ

تفسیر عیاشی میں حضرت ابو الحسن علیہ السلام سے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا جس کو اس کے رشتہ داروں نے قتل کیا اور پھر انہوں نے بنی اسرائیل کی قوم کے بڑوں کے راستے میں اس کی لاش چھوڑ دی اور پھر خود ہی اس قتل کے انتقام کے بہانے خون ریزی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آکر کہا کہ

اس قوم نے اس شخص کو قتل کیا ہے۔ ہمیں بتاؤ کہ اس قوم کے کس فرد نے قتل کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ گائے لے آؤ۔ انہوں نے کہا ہمارا مذاق اڑاتے ہو؟ پیغمبر نے کہا میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں والی بات کروں، مسخرہ کرنے والا بنوں۔ اسی مرحلے میں ایک معمولی گائے اگر لے آتے تو وہی کافی تھی۔ لیکن ان کی لجاجت اور سخت گیری اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ نے ان کے لیے سخت شرائط رکھی۔ اور گائے کی تمام قیود و شرائط بیان کر دیں۔ پھر وہ گائے فقط ایک ایسے جوان کے پاس موجود پائی کہ جس نے کہا میں تو اسے نہیں بیچتا، مگر یہ کہ اس کی کھال کو سونے سے بھر دو تو پھر ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ مجبور ہوئے اور وہ گائے اس سے خرید لی۔ اسے ذبح کیا گیا اور ذبح کرنے کے بعد گائے کی دُم کو مردہ کے بدن پر مارا، مردہ زندہ ہو گیا۔ مردے نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے میرے چچازاد نے قتل کیا ہے، میرے قتل کی تہمت کسی اور پر مت لگاؤ۔ اس طرح قاتل کی شناخت ہو گئی۔

بنی اسرائیل کے جوان کا قصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ اس گائے کا مالک جوان کا قصہ کیا ہے؟ تو انہوں نے پوچھا کیا قصہ ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جوان بنی اسرائیل سے ہے، اپنے باپ پر بہت مہربان تھا۔ ایک دن کوئی جنس اس نے خریدی، جب گھر آیا تا کہ پیسے گھر سے لے جائے اور وہ جنس جو اس نے خریدی ہے اس کے پیسے ادا کرے۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بابا چادر اوڑھ کر سویا ہوا ہے اور پیسوں کی چابی بابا کے سر کے نیچے رکھی تھی۔ اس جوان نے مہربانی اور احسان کی خاطر وہ جو سودا کیا تھا اس سودے کو ترک کر دیا۔ جب اس کا باپ نیند سے بیدار ہوا تو باپ کو سارا واقعہ بتایا، باپ نے کہا بہت اچھا کیا اور اس کے بدلے میں والد نے اسے یہ گائے عطا کر دی۔ تو اس نیک کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کو جو حکم دیا گیا تھا کہ قاتل معلوم کرنے کے لیے گائے ذبح کرو تو انہوں نے عام گائے

ذبح نہ کی، جو اوصاف بتائے گئے تھے وہ گائے فقط اسی جوان کی جائے میں تھے۔ اس طرح جوان کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ ایک نیکی کا بدلہ کس قدر اللہ نے اس کو دیا۔

اس قصہ میں یہ پیغام ہے کہ جو باپ کا احترام کرتا ہے، جو باپ کی قدر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ اسی دُنیا میں بھی کس انداز سے دیتا ہے۔ والدین کے احترام کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان سے اُف تک نہ کہو۔ بنی اسرائیل کے اس جوان کو کس طرح اللہ نے نیکی کا بدلہ دیا۔ بنی اسرائیل نے ہٹ دھرمی کی، ضد بازی میں لگے رہے اور اللہ کے فرمان سے سرپیچی کرتے رہے تو آخر کار جس چیز کو چھپانا چاہتے تھے ان کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ گائے کی دُم مارنے سے مردہ زندہ ہو جائے گا۔

اس میں ایک تو یہ سمجھا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد پھر زندہ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ جب ایک مری ہوئی گائے کی دُم کو ایک مردے پر مارا جاتا ہے تو مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کو نہ تو کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی تبصرہ کر سکتا ہے۔ اس کی قدرت لامتناہی ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے پھر وہی موت دیتا ہے، پھر مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور پھر حساب کتاب کے لیے لے آتا ہے۔ اس سب میں عبرت ہے۔ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا قصہ بار بار بتایا جا رہا ہے تا کہ انسانوں میں اس قسم کی دین سے دوری، دین سے نفرت اور دین کی خلاف ورزی کا جو مزاج ہے اس سے روکا جائے اور انسان ان واقعات سے عبرت پکڑ لے۔ اسی لیے حضرت موسیٰؑ کی قوم کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کو سن کر عبرت لیں اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کریں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

"کیا تمہیں اُمید ہے کہ یہود تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک ایسا گروہ بھی گزرا ہے جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اسے سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر بدل ڈالتا تھا"۔

یہودیوں کا پرانا رویہ

یہاں پر خطاب رسول اللہ ﷺ اور مومنین کو ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے کلام کو سن کر، اس کو جان کر، حقائق کو سمجھ کر پھر حقائق کو چھپا لیتے ہیں، پیغمبر ﷺ سے کہا گیا کہ بنی اسرائیل اور یہودیوں کی یہ راہ و رسم پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ اب آپ چاہ رہے ہو کہ وہ تمہاری بات مان جائیں اور ایمان لے آئیں؟ اگر وہ تمہارے اوپر ایمان نہ لائیں اور تمہاری باتوں کو جھٹلائیں تو اس پر تعجب نہ کرو۔ کیونکہ یہ ان کا پرانا شیوہ ہے، ایسی بات جس کا یقین ہوتا ہے پھر بھی اس کا انکار کر دینا، ہر دور کے یہودی علماء کی روش رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی لمبی چوڑی توجیہات کرتے تھے، جن کی ان اوامر کے ساتھ نسبت بھی نہ تھی تاکہ لوگوں کو اُن اوامر سے جو اللہ کی مراد اور مقصود ہے اس سے دور رکھیں۔ یہ کام وہ جہالت کی وجہ سے نہیں کرتے تھے بلکہ خواہشات نفسانی اور اپنے فاسد اور غلط مقاصد کی خاطر انجام دیا کرتے تھے۔ یہاں پر کہا جا رہا ہے کہ اس دور کے یعنی حضور پاک ﷺ کے زمانے کے یہودیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں اور بات نہیں مانتے تو یہ ان کا پرانا شیوہ ہے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ قَالُوۡۤا اَتُحَدِّثُوۡنَهُمۡ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیۡکُمۡ لِیُحَآجُّوۡکُمۡ بِهٖ عِنۡدَ رَبِّکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۷۶﴾

''اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لے آئے ہیں، اور جب وہ ایک دوسرے کے پاس علیحدہ ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم انہیں وہ راز بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولے ہیں تا کہ وہ اس سے تمہیں تمہارے رب کے روبرو الزام دیں، کیا تم نہیں سمجھتے''۔

یہودیوں کی منافقت

یہودی خود کو مومن کہلاتے تھے تاکہ طعنہ زنی،اذیت اور قتل سے خود کو محفوظ کرلیں، ان کا مال محفوظ ہو جائے۔ وہ اب بھی جانتے ہوئے حق کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور اپنی نیتوں کو اللہ سے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔

بات دراصل یہ تھی کہ توریت میں جو بشارتیں تھیں یا پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کی تصدیق کے بارے میں جو اطلاعات عام لوگوں کے پاس تھیں، یہودی عوام انہیں مسلمانوں کو جا کر بتاتے تھے۔ کیونکہ حضور پاک ﷺ کے آنے سے پہلے یہی یہود کے علماء اپنی عوام کو ساری باتیں بتاتے تھے تو وہ مسلمانوں کو جا کر بیان کرتے تھے جس پر ان کے سربراہ اور بڑے علماء عوام کو ان کاموں سے روکتے تھے اور انہیں کہتے تھے کہ یہ خود ایک فتح اور کامیابی ہے جو اللہ نے مسلمانوں کو دی ہے۔ اس پر مزید ان بشارتوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہو جن کے وسیلہ سے وہ ہمارے خلاف دلیل قائم کریں گے اور اسے بطور ثبوت پیش کریں گے اور یہ سب سے بڑی بدبختی ہے اور انجام بھی اس کا بدبختی کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ انہوں نے حق کو چھپایا ہوا تھا اور رسول پاک ﷺ کی رسالت اور نبوت کا احترام نہیں کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ رسول اللہ کو ان بشارتوں کی اطلاع نہیں ہے۔ یہ ان کی جہالت کی انتہاء تھی جو وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف نسبت دیتے تھے کہ اللہ اور رسولؐ ان مخفی باتوں سے واقف نہیں ہیں۔ لہٰذا اللہ نے واضح کر دیا کہ تم غلطی پر ہو۔

أَوَلَا يَعۡلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعۡلِنُونَ ﴿٧٧﴾

"کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں"۔

اللہ کا علم مطلق

مخلوقات کا علم ظاہر سے متعلق ہوتا ہے، انہیں باطن کے بارے کچھ خبر نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا علم اس کے برعکس ہے۔ اللہ کا علم ظاہر و باطن دونوں حالتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ انسان کا علم زمانی اور مکانی قیود میں گھرا ہوا ہے، ایسا علم جو زمانی اور مکانی قیود میں گھرا ہوتا ہے وہ علم مصنوع ہے یعنی حاصل کیا ہوا علم، بنایا ہوا، مگر علمِ صانع حقیقی علم ہوتا ہے، اسے غیب اور ظاہر و باطن کا حقیقی علم ہے۔ یعنی جس نے بنایا ہے وہ تو حقیقت سے آگاہ ہے۔

بنی اسرائیل اصل میں مادہ پرست تھے اور مادی اسباب اور قوانین کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتے تھے اور یہی طرز تفکر تمام مادہ پرستوں کا ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کی مانند اللہ کا نفوذ اور اس کے ارادہ اور فیصلے اسی طرح اس کے قانون اور تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی تاثیر کا انکار کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل اللہ کا انکار نہیں کرتے تھے لیکن اللہ کے لیے مادی اوصاف کے قائل تھے جن کا نتیجہ انکار خدا کی صورت میں نکلتا تھا۔ وہ کہتے تھے " يَدُ ٱللَّهِ مَغۡلُولَةٌ " (سورہ مائدہ آیت ٦٤) "کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے"۔ یعنی وہ ایک ایسی حکمرانی کے خواہاں تھے جو بلاشرط اور لامحدود ہو تاکہ اپنی خواہشات کے مطابق لوگوں کے لیے قانون بنائیں۔

وَمِنۡهُمۡ أُمِّيُّونَ لَا يَعۡلَمُونَ ٱلۡكِتَٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنۡ هُمۡ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾

"اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں جو کتاب نہیں جانتے، سوائے جھوٹی آرزوؤں کے، اور وہ محض اٹکل پچو باتیں بناتے ہیں"۔

علم کے بغیر خواہشات کی پیروی

اُمی، اُم سے ہے، وہ جو کہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتا، ماں سے تربیت لی ہے۔ اور امانی، اُمنیہ کی جمع ہے جس کا معنی ہوتا ہے جھوٹ، باطل، غیر حقیقی باتیں۔ بنی اسرائیل دو قسم کے لوگ تھے؛ کچھ تو پڑھے لکھے تھے اور سازشی تھے۔ انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کی اور حقائق کو تبدیل کیا، اس میں اپنی مرضی کی باتیں داخل کیں جو مطالب ان کی آزادی پر پابندی لگاتے تھے ان کو ختم کیا۔ ان کا ایک گروہ ان پڑھوں کا تھا جو ان خرافات اور غیر حقیقی باتوں کو آسمانی مطالب کے عنوان سے قبول کر بیٹھا تھا اور ان کے پاس یہودیت سے متعلق سوائے ظن و گمان اور خیالی باتوں کے اور کچھ نہ تھا اور ان کی آرزو تھی کہ اس عقیدہ کے ساتھ وہ عذاب سے آزادی پائیں اور خیال کرتے تھے کہ وہ ایسا گروہ ہیں جن کو اللہ معاف کر دے گا اور وہی ایسی قوم ہیں جن کو اللہ نے باقی اقوام پر چن لیا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿٧٩﴾

”سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ روپیہ کمائیں، پھر افسوس ہے ان کے ہاتھوں کے لکھنے پر اور افسوس ہے ان کی کمائی پر“۔

اللہ پر افتراء اور جھوٹ باندھنا

" وَیۡلٌ " ہلاکت اور عذاب کے معنی میں ہے۔ اسی طرح غم واندوہ، خواری اور پستی کے معنی میں بھی آتا ہے، نیز یہ لفظ ان چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے جن سے انسان کو سخت چوکنا رہنا چاہیے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ خود سے کتاب لکھتے ہیں اور خود سے گڑھ کر تحریر کرتے ہیں اور انہیں اللہ سے منسوب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں۔ اور اس سے اپنے لیے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ وہ کتاب اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ ان کے ہاتھ سے لکھے گئے پر وائے ہے، عذاب ہے یعنی یہ پوری بنی اسرائیل قوم کے لیے ہے چاہے وہ ان پڑھ ہوں یا ان کے علماء۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے یہ فقط علماء کے لیے ہو جنہوں نے کتاب کو تحریر کیا، اپنی مرضی کی باتیں گڑھیں، دھوکہ دیا اور غلط باتوں کو اللہ کی جانب نسبت دی۔ اس پر بھی وائے ہے جسے انہوں نے کسب کیا ہے یعنی اس تحریف کے ذریعے انہوں نے جو کچھ کمایا ہے۔

وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ؕ قُلۡ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا فَلَنۡ يُّخۡلِفَ اللّٰهُ عَهۡدَهٗۤ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞ ۸۰

"اور کہتے ہیں ہمیں سوائے چند گنتی کے دنوں کے آگ نہیں چھوئے گی، کہہ دو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ ہرگز اللہ اپنے عہد کا خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے"۔

بنی اسرائیل کا جنتی ہونے کا دعویٰ

بنی اسرائیل کہا کرتے تھے کہ ہم ہی برتر ہیں۔ اگر ہم کوتاہیوں کی وجہ سے آگ میں ڈالے بھی گئے تو تھوڑی دیر وہاں رہیں گے، پھر ہمیں وہاں سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں

داخل کر دیا جائے گا، اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔ ان کے اس عقیدے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو کہا گیا ہے یہ جو کہہ رہے ہیں تو کیا اللہ کا لکھا ہوا ہے ان کے پاس موجود ہے، کیا اللہ نے ان سے کوئی وعدہ کیا ہوا ہے اور اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا جس پر انہیں اطمینان آیا ہوا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے، یہ خدا کی جانب غلط نسبت دیتے ہیں، خدا کے بارے میں جرأت کرتے ہیں اور اس پر افتراء باندھتے ہیں۔ کہاں ہے وہ عہد و پیمان جو انہوں نے اللہ سے لے رکھا ہے کہ ان کو بخش دیا جائے گا؟ ایک تو وہ جھوٹ بولتے ہیں اور دوسرا جہالت کی بنیاد پر اللہ کی طرف غلط نسبت دیتے ہیں۔ اس طرح اللہ کے عذاب کو چند برابر کرتے ہیں۔

یہاں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ کی طرف کوئی غلط نسبت نہ دی جائے اور جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو اس کی نسبت اللہ کی طرف مت دو جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ اللہ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اسی طرح حضور پاک ﷺ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کی جانب جھوٹی نسبت نہیں دینا چاہیے۔ عام طور پر بھی جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نمائندوں کی طرف جھوٹی نسبت دینا اور ان کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سب سے بڑا جھوٹ اور افتراء ہے اور اس کا عذاب چند برابر ہوگا۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٨١

"ہاں جس نے کوئی گناہ کیا اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لیا سو وہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

گناہوں کا نتیجہ

اس آیت میں گناہوں کے نتیجے کو بیان کیا جا رہا ہے۔" خَطِيْٓئَة "برے اعمال کو تسلسل کے ساتھ بغیر استغفار اور توبہ کے انجام دینے سے پیدا ہونے والی حالت کو کہا جاتا ہے۔ جب گناہ کے بعد انسان کو یہ حالت گھیر لیتی ہے تو پھر اس کی نجات اور ہدایت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اور جب گناہوں کی وجہ سے ہدایت کے راستے بند ہو جائیں اور گناہ اپنی پوری قوت کے ساتھ، اپنے اثرات اس کے اوپر ڈال دے تو پھر اس کا نتیجہ ہمیشہ کی آگ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ حق تعالیٰ کے سامنے نہیں جھکے، حق کو قبول نہیں کیا، گناہ سے سے دُور نہیں رہے، توبہ بھی نہیں کی تو پھر ان کی حالت مشرکوں اور کافروں جیسی ہو گی۔ ان کے لیے جہنم کی آگ ہے جس سے ان کا نکلنا ممکن ہی نہیں ہے، وہ اپنے کیئے کی سزا بھگتیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہی بہشتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

ایمان لانے والوں کیلئے نوید

اس آیت میں ان کے بارے میں بتایا گیا ہے جو شرک نہیں کرتے، کفر نہیں کرتے، اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اللہ کی دعوت کو قبول کرتے ہیں، اللہ کی نشانیوں کو نہیں جھٹلاتے۔ پھر جب ایمان لاتے ہیں تو ایمان کا تقاضا بھی پورا کرتے ہیں، نیک اعمال بجالاتے ہیں۔ انہیں نیک اعمال کی حالت نصیب ہو گی، وہ جنت میں جائیں گے، جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔ جنت میں ہمیشہ رہنے کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

"اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے اچھا سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، پھر سوائے چند آدمیوں کے تم میں سے سب منہ موڑ کر پھر گئے"۔

بنی اسرائیل سے لیا گیا عہد و پیمان

اس آیت میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا تھا کہ ان کے پاس کتاب بھیجی گئی، انبیاء آئے ان کو جن اعمال کے بارے کہا گیا ان کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے عہد شکنی کی، عہد و پیمان کا توحید سے آغاز ہو رہا ہے اور پھر عبادات جو اس سے متفرع ہیں ان کا تذکرہ ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں بالترتیب بتایا گیا ہے، اللہ جو خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے، رب ہے اسی کی اطاعت کرنی ہے، کسی اور کی اطاعت نہیں کی جا سکتی فقط وہی ذات اس لائق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت سے روکا گیا ہے " لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ " "نہیں کرتے ہو تم پرستش سوائے اللہ کے"۔ اس جگہ جملہ خبری لایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ منع کرنے والے کو اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس چیز سے روک رہا ہے اس سے یہ

رکیں گے نہیں۔ دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کرو، والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ یہ سب سے اہم ہے اور اس کے بعد بالترتیب بتایا گیا ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان سے اچھا تعلق رکھو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بڑے اختصار کے ساتھ ان پر حجت تمام کی گئی ہے۔ لیکن انہوں نے خاندانی نظام کو توڑ ڈالا اور ہر جگہ جو دینی بنیادیں تھیں انہیں ہلا کر رکھ دیا۔

اسلام میں خاندان کا سسٹم برقرار رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، رشتہ داروں سے تعلق رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، اس سے عمر بڑھتی ہے، روزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر یتیموں اور کم عمروں کا خیال رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جن کا کوئی مددگار نہیں، اسی طرح مساکین اور فقراء جو معاشرے کا پسماندہ طبقہ ہے بھوک اور افلاس کا شکار ہیں، جن کے پاس نظام زندگی چلانے کے اخراجات نہیں ہیں ان کے ساتھ بھی بھلائی کرنی چاہیے۔ یہ لوگ معاشرے کا کمزور طبقہ ہے ان سے بھلائی اور احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ سوسائٹی میں حُسنِ معاشرت کا حکم ہے۔ مومن ہو یا کافر، معاشرے کے ہر فرد سے اچھا سلوک اپناؤ۔ اسلام میں اس کی بہت زیادہ تاکید ہے کہ آپ کا رویہ اٹھنا بیٹھنا، تعلق داری، ہمسائیگی میں آپ کی زبان نرم ہو، گالم گلوچ نہ ہو، غصے والی نہ ہو بلکہ اچھی بات کرو، معاشرے میں رہتے ہوئے اخلاق سے پیش آؤ۔ البتہ یہ حکم جہاد سے ہٹ کر ہے۔ تنبیہ کی جارہی ہے کہ جس سوسائٹی میں رہتے ہو اس میں سب انسان ہیں، مسلمان بھی ہیں غیر مسلم بھی ہیں ایسی صورت میں اخلاق کی پاسداری ضروری ہے۔ لوگ آپ کے اخلاقی رویوں سے متاثر ہوں۔ خود حضور پاک ﷺ کی سیرت ہمارے سامنے ہے کہ کافر، جاہل، ان پڑھ، ہٹ دھرم اور ضدی، جنگوں میں گھرے ہوئے قاتلوں اور ظالموں کے درمیان اس قدر آپ کے اخلاق کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کا بدترین دشمن بھی آپ کے اخلاق پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ ہمارے لیے درس ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے دو عبادتوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے: ایک نماز کا جو بندگی کا مظہر ہے اور دوسری زکوٰۃ کا۔ نماز کا تعلق انسان کے معنویات اور اللہ سے ہے اور زکوٰۃ کا تعلق انسانی معاشرے اور سوسائٹی سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے واقعیت کو بیان کر دیا کہ تم کو تو ایسا ہونا چاہیے تھا اور یہی تمہارے لیے حکم تھا لیکن جو زمینی حقائق ہیں وہ اس کے بر عکس ہیں۔ تم نے یہ عہد توڑ ڈالا اور اس سے منہ موڑ لیا اور نہ تو توحید پرست رہے نہ والدین کا احترام کیا۔ خاندانی سسٹم کو توڑا، یتیموں اور مساکین کا خیال نہیں رکھا اور حُسنِ معاشرت کا بھی خیال نہ رکھا، اخلاق بھی انکا ٹھیک نہیں رہا اور نماز بھی قائم نہیں کی، اللہ سے ربط اور تعلق توڑ لیا، عبودیت کے تقاضے پورے نہیں کئے۔ اسی طرح معاشرہ اور سوسائٹی کے حقوق، اللہ کے دئے ہوئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ بھی نہیں کیا۔ مالیات و واجبات ادا نہیں کئے، اس کے دینے سے گریز کیا؛ یہ تمہاری حالت ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو جلاوطن کرنا پھر تم نے اقرار کیا اور تم خود گواہ ہو''۔

بنی اسرائیل کی نافرمانی

بنی قریظہ اور اوس قبائل نے اسی طرح سے بنی قینقاع اور بنی نضیر نے خزرج کے ساتھ ایک معاہدہ اور پیمان باندھ لیا کہ وہ مل کر دوسرے گروہ کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ اس معاہدے پر انہوں نے قسم اٹھائی تھی اگرچہ یہ معاہدہ الٰہی میثاق اور عہد کے تحت تو حرام تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ عہد و پیمان باندھا تھا، یہ اقدام ٹھیک نہیں تھا کیونکہ اس میں

شریعت کی خلاف ورزی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ و جدل پر اکٹھے ہوں۔ لیکن انہوں نے اس عہد کو بھی توڑا، ایک دوسرے کو گھروں سے نکالا، ان کے اموال لوٹے، ان کی لڑکیوں کو کنیز بنالیا اور جو اللہ کا میثاق اور عہد تھا وہ تو جنگ سے روکتا تھا اور جب جنگ ختم ہو جاتی تو قیدیوں کا فدیہ لے کر ایک دوسرے کو آزاد کرتے۔

توریت میں بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو غلام مت بناؤ، اگر کوئی اسیر پکڑو تو اس کو آزاد کر دو اور اس کے بدلہ میں کچھ نہ لو۔ وہ سب جانتے تھے کہ ہمارے لیے حکم الٰہی ایسا ہے۔ لیکن انہوں نے الٰہی حکم کو توڑ ڈالا اور ان تمام برے اعمال کا ارتکاب کیا جن اعمال سے اللہ نے انہیں روکا تھا۔ انہوں نے ان تمام اعمال کو انجام دیا جن سے انہیں منع کیا گیا تھا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

''پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور ایک جماعت کو اپنے میں سے ان کے گھروں میں سے نکالتے ہو ان پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو ان کا تاوان دیتے ہو حالانکہ تم پر ان کا نکالنا بھی

حرام تھا، کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو، پھر جو تم میں سے ایسا کرے اس کی یہی سزا ہے کہ دنیا میں ذلیل ہو اور قیامت کے دن بھی سخت عذاب میں دھکیلے جائیں، اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو"۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

"یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلہ خریدا، سو ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی"۔

بعض احکام کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا

یہ آیت ایک طرح سے پچھلی آیت کی وضاحت ہے جس میں بیان ہوا تھا کہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ آپس میں خون نہیں بہائیں گے، ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہیں نکالیں گے۔ یہ سب کو پتہ تھا سب اس بارے جانتے تھے۔ تو اللہ فرما رہا ہے تم نے آپس میں جنگ و جدل کیا، قتل و غارت کی، ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو ان کے گھروں سے نکالا اور یہ کام کرکے تم نے گناہ پر ایک دوسرے کی مدد کی۔ تم لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے، ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان باندھا اور ایک فریق دوسرے فریق پر چڑھ دوڑا اور پھر جنگ کے نتیجے میں اسیر پکڑ لیے، ان کو غلام بنایا اور ان کو چھوڑنے کے لیے فدیہ مانگا اور انہیں گھروں سے بھی نکالا۔ جبکہ گھروں سے نکالنا حرام تھا اور قیدیوں کے بارے میں حکم تھا کہ جب کوئی قیدی بنائے تو اس کا فدیہ نہ لے۔ ان سب امور کو انجام دے کر انہوں نے اللہ سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالا۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تم کیسے لوگ ہو؟ اللہ کے بیان کردہ احکام میں سے جو اللہ کی کتاب میں درج ہیں، کچھ کو لے لیتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو! تم نے فدیہ کا حکم اور قانون تو لے لیا لیکن گھروں سے نکالنا کے حرامت کے حکم کو چھوڑ دیا جبکہ دونوں حکم اللہ کی جانب سے تھے اور خدا کی کتاب میں یہ بات آئی تھی۔ اب اس کے نتیجے میں ذلت اور خواری تمہارے لیے ہے اور اللہ نے بہت سارے موارد پر انہی نافرمانیوں کے نتیجے میں تمہیں خوار کیا اور دُنیا میں تو یہ ذلت تمہارے نصیب ہے لیکن جو کچھ تم نے کیا ہے اس کا نتیجہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی صورت میں ہو گا۔ اس عذاب سے تم نہیں بچ سکو گے اور تمہیں یہ پتہ ہونا چاہیے کہ جو تم اللہ کے پیمان کو، اللہ کے ساتھ کیئے گئے عہد کو توڑتے ہو اور اپنے فاسد اعمال کے ذریعے مخالفت کرتے ہو تو اللہ تمہارے ان اعمال سے غافل نہیں ہے وہ تمہارے سارے کاموں سے آگاہ ہے۔

آخرت پر دنیا کی ترجیح

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے دُنیا کی زندگی کو پسند کیا، دُنیا کی زندگی لے کر آخرت کی زندگی کو گنوا دیا اور یہ بہت ہی گھاٹے کا سودا کیا۔ کیونکہ جب دنیا میں رہ کر دین کی مخالفت کی جائے گی، آسمانی کتاب کی مخالفت کی جائے گی، اللہ کے ساتھ باندھا ہوا میثاق توڑا جائے گا تو پھر اس کا نتیجہ معلوم ہے کہ وہ عذاب الٰہی کی شکل میں ہو گا اور ایسا عذاب جو ان سے ختم بھی نہیں ہو گا اور اس میں کمی بھی واقع نہیں ہو گی کیونکہ انہوں نے اللہ کے میثاق اور اللہ کی کتاب سے خیانت کی، خود اللہ سے خیانت کی اور دُنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر چن لیا۔ تو کوئی بھی نہیں ہے جو ان کو آخرت کے عذاب سے بچا سکے اور ان کی مدد کر سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی طرف انہیں متوجہ کیا گیا اور بتایا گیا کہ

یہ تمہارا انجام ہوگا۔ اور یہ سارے واقعات بیان کر کے جو مسلمان نہیں ہو رہے تھے ان کو بھی سمجھایا گیا کہ تمہارا حشر بھی وہی ہونا ہے جو بنی اسرائیل کا ہوا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ٘ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْۚ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ٘ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد بھی پے در پے رسول بھیجتے رہے، اور ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں دیں اور رُوح القدس سے اس کی تائید کی، کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ حکم لایا جسے تمہارے دل نہیں چاہتے تھے تو تم اکڑ بیٹھے، پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کیا"۔

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

"اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے لعنت کی ہے، سو بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں"۔

رسولوں پر ایمان نہ لانا

اس جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دے کر بھیجا اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ بند نہیں کیا، ان کے بعد بھی رسول آتے رہے

۔یہ لوگ پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے اور پھر ان کے آباؤ و اجداد منکر اور کافر ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام روشن نشانیاں لے کر آئے اور روح القدس سے ان کی تائید بھی ہوئی لیکن انہوں نے ہر اس پیغمبر کو جھٹلا دیا جو ایسی باتیں لے کر آیا جو ان کے مزاج کے خلاف تھیں اور ان کی خواہشات نفسانی کے برعکس تھیں۔ انہوں نے ان پیغمبروں کو جھٹلایا ان کی بات کو نہیں مانا جبکہ انہیں پتہ تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔

ان میں سے کچھ تو وہ تھے جنہوں نے بعض نبیوں کی تکذیب کی، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلا دیا اور حضرت محمد ﷺ کو جھٹلایا۔ اور کچھ کو قتل کیا جیسے حضرت زکریاؑ کو قتل کیا، حضرت یحییٰؑ کو قتل کیا۔ یہ بنی اسرائیل کے رویے تھے جس کو اللہ نے بیان کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب ان سے کہا گیا کہ تم ایمان لاؤ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے دلوں پر حجاب ہے، ان پر پردہ پڑا ہوا ہے یہ دل لفافے میں لپٹے ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں اس بات کے سننے کی تاب ہی نہیں تھی جس کی طرف انہیں دعوت دی جا رہی تھی اور کوئی بھی نئی دعوت ان کے دلوں میں اثر نہیں کرتی تھی۔

یہ بات اللہ تعالیٰ نے اس لیے کہی کہ پیغمبر اکرم ﷺ اور مومنین کو پتہ چل جائے کہ بنی اسرائیل اس قسم کے لوگ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے نبیوں کو انہوں نے نہیں مانا کچھ کو قتل کر دیا اور کچھ کو روشن نشانیوں کے باوجود جھٹلایا۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے جھٹلایا۔ اسی طرح آپؐ کو بھی یہ جھٹلا رہے ہیں اور ان کے دل پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فیصلہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت اور اپنی ہدایت سے دُور رکھے گا۔ ان میں سے بہت تھوڑے ہی ایمان لائیں گے جیسے عبد اللہ بن سلام اور اس کا ایک دوست پیغمبر اسلام پر ایمان لے آئے۔ رسول خدا ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ان کے ایمان لانے کی زیادہ اُمید نہ رکھیں۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ وَ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَی الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۫ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۸۹﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کتاب آئی جو تصدیق کرتی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے، اور اس سے پہلے وہ کفار پر فتح مانگا کرتے تھے، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آئی جسے انہوں نے پہچان لیا تو اس کا انکار کیا، سو کافروں پر اللہ کی لعنت ہے''۔

سابقہ آسمانی کتابوں میں قرآن کی تصدیق

آیت کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ جس کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد قرآن ہے۔ قرآن کی تائید توریت میں موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ ان کی طرف ایسی کتاب آئی جس کی تصدیق اس کتاب میں ہو چکی تھی جو ان کے پاس موجود تھی۔ ان کے پاس توریت تھی جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی ہجرت، بعثت، فتح اور کافروں پر ان کے غلبہ ان سب باتوں کا تذکرہ موجود تھا۔ یہ لوگ اس انتظار میں تھے کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ آئیں گے اور وہ کتاب بھی ساتھ لائیں گے تو اس وقت وہ سارے کافروں پر غالب آجائیں گے۔ لیکن جب پیغمبر اکرم ﷺ آگئے، کتاب آگئی تو پھر انہوں نے ظلم و زیادتی اور حسد کرتے ہوئے کافر ہوئے اور کہا کہ اس پیغمبر نے تو ہم میں سے ہونا تھا اور جب ہم میں سے نہیں آیا تو یہ وہ نہیں ہے۔ حالانکہ انہیں پتہ تھا کہ یہ وہی ہیں اور وہ جاننے کے باوجود گمراہ ہوئے۔

ابن عباس سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودی حضور پاک ﷺ کی بعثت سے پہلے ان کی تلاش میں لگے ہوئے تھے کہ وہ پیغمبر مبعوث ہو جائیں تاکہ کافروں پر غلبہ حاصل کریں اور کافروں پر کامیاب ہوں اور وہ بیان کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ایک اُمی

پیغمبر کو بھیجے گا اور ان کے وسیلے سے ہماری مدد کرے گا اور ہم مکہ اور دوسرے شہروں کے کافروں پر غالب آجائیں گے۔ لیکن جب حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ ان کی آمد کے لیے دعا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے اے اللہ! بحق رسول اُمی۔ اے اللہ رسول اُمی کے حق کا واسطہ ہمیں کافروں پر غلبہ دے، کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ اور جب وہی ہستی آگئی تو پھر انکار کر بیٹھے اور اس طرح اپنی ہلاکت میں غوطہ ور ہو گئے۔ اس بات کو سورہ حجر کی آیت ۷۲ میں اللہ نے بیان کیا ہے: لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ ''تیری جان کی قسم ہے وہ اپنی مستی میں اندھے ہو رہے تھے''۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

''انہوں نے اپنی جانوں کو بہت ہی بری چیز کے لیے بیچ ڈالا، یہ کہ اللہ کی نازل کی ہوئی چیزوں کا اس ضد میں آ کر انکار کرنے لگے کہ وہ اپنے فضل کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں نازل کر دیتا ہے، سو غضب پر غضب میں آ گئے، اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے''۔

بنی اسرائیل کی نفسانی خواہشات کی پیروی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس فیصلے کی نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اپنی نفسانی خواہشات کے اسیر ہوئے اور حق کو جانتے ہوئے اس کا انکار کیا۔ یہ فیصلہ کرکے انہوں نے بڑا نقصان اٹھایا کیونکہ توریت میں اس کے بارے میں ذکر ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور حسد کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ یہ حسد اور کفر ان کے

ابتدائی کفر پر مزید اضافہ ہوا اور اس طرح ان کا کفر چند در چند ہوا تو خدا کا غضب بھی ان پر چند در چند ہوا۔ ایک دفعہ تو وہ توریت کے کافر ہوئے تھے جو اللہ کے غضب کا سبب بنا تھا۔ دوسری مرتبہ انہوں نے قرآن کے اترنے پر حسد کیا اس وجہ سے ان پر دوبارہ غضب ہوا۔ اس طرح غضب الٰہی ان کے لیے چند در چند ہوا اور کافروں کے لیے جو تکبر کرتے ہیں، دُنیا میں بڑے بنتے ہیں تو قیامت کے دن ان کے لیے سخت، ذلت آمیز اور خوار کرنے والا عذاب ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں ہم تو اسی کو مانتے ہیں جو ہم پر اترا ہے اور اسے نہیں مانتے ہیں جو اس کے سوا ہے، حالانکہ وہ حق ہے اور تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے، کہہ دو پھر تم کیوں اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے“۔

بنی اسرائیل کی بہانہ تراشیوں کا جواب

اس آیت میں ان کی ایک اور بہانہ تراشی کی جانب اشارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر جو کتاب آئی ہے ہم تو اس پر ایمان لاچکے ہیں، اب ہم اگلی کتاب پر ایمان کیوں لائیں؟ حالانکہ توریت کے بعد جو کتاب آئی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل تھی اور پھر حضرت محمد ﷺ کا قرآن یہ دونوں آسمانی کتابیں توریت کی تائید کرتی تھیں۔ قرآن نے توریت کی تائید کی تو انہوں نے قرآن کا انکار کیا۔ حقیقت میں انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کا انکار کرکے خود توریت کا انکار کیا۔

پھر وہ جو کہتے ہیں کہ ہم توریت پر ایمان لا چکے ہیں۔ توریت میں تو کہا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنا ہے، حضرت محمد ﷺ نے آنا ہے تو گویا انہوں نے توریت کی بات کو نہیں مانا۔ پھر ان سے پوچھا جائے کہ اگر تم سچے ہو اور توریت پر ایمان رکھتے ہو تو ذرا اس کا جواب دو۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم نے اللہ کے انبیاءؑ کو قتل کیوں کیا؟ کیوں بچھڑا پرستی کی؟ کیوں اللہ کے میثاق اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی۔ جیسے سورہ بقرہ کی آیت ۹۳ میں ہے کہ ہم نے سن لیا اور پھر نافرمانی بھی کی تو یہ جو تمہارے ایمان کے مظاہر ہیں اس میں کفر کی آمیزش ہے، کفر ملا ہوا، ایمان تمہیں فائدہ نہیں دے سکتا بلکہ اس کا نتیجہ تمہیں دُنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب تمہارے انتظار میں ہوگا۔

وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر آیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو بنالیا، اور تم ظالم تھے"۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْاؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَاۗ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہِ طور کو اٹھایا کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور سنو، انہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں، اور

ان کے دلوں میں کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت رچ گئی تھی، کہہ دو اگر تم ایمان دار ہو تو تمہارا ایمان تمہیں بہت ہی برا حکم دے رہا ہے"۔

بنی اسرائیل کا موسیٰؑ کے معجزات کا انکار

یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو روشن دلائل لے کر تمہارے پاس آئے اور تمہیں ہدایت دی۔ لیکن تمہاری حالت تو یہ تھی (بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی اور نافرمانیوں کو بیان کیا جارہا ہے) کہ موسیٰ علیہ السلام جو چند دن کے لیے اللہ کے پیغامات لینے کے لیے گئے تو تم نے اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی کہ وہ طے شدہ دس دن سے زیادہ تیس دنوں تک وہاں پر رہ گئے تو تم سے اس بارے صبر نہ ہوا۔ اس طرح تم نے نافرمانی کی۔ کیا یہ رویہ تمہارے مومن ہونے کے موافق ہے؟ کیا مومن اس طرح ہوتے ہیں؟

پھر فرمایا کہ تم سے تو یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ جب پہاڑ اٹھ کر تمہارے سروں کے اوپر آگیا تو تمہارے بڑوں نے کہا ہم نے اب سن لیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر آشکار دلائل اور روشن نشانیوں کے باوجود تم نے نافرمانی کی اور اللہ کا جو میثاق تھا اس کی پابندی نہیں کی۔ کیونکہ تمہارے دلوں میں کفر گھر کر چکا تھا، تم اس بچھڑے سے اتنی محبت کرنے لگے تھے کہ اس کے گرد گھوم رہے تھے، کچھ اور ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ اللہ اپنے رسول سے کہہ رہا ہے کہ ان سے یہ سارے سوالات کرو اور ان کو بتاؤ، ان سے پوچھو کہ انبیاءؑ کا قتل کرنا، موسیٰؑ کی بات کا انکار کرنا، کوہ طور جو تمہارے اوپر آ کھڑا ہوا اور پھر تم سے عہد لیا گیا کہ نافرمانی نہ کرو گے پھر تمہارا نافرمانی کرنا ان ساری نافرمانیوں کے باوجود تم کیسے کہتے ہو کہ ہم توریت پر ایمان لائے اور ہم مومن ہیں؟ اگر تم نے ایمان لایا ہوتا تو توریت کی کسی بات کو تو مانتے ،اس کی ایک بات پر تو عمل کیا ہوتا؟ انبیاءؑ کو تم نے قتل کیا، موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا تم

نے انکار کیا، تکبر تم نے کیا، جس جس بات سے اللہ نے روکا اسی بات کا تم نے ارتکاب کیا، تو تم کیسے مومن ہو؟ گویا ان کے ساتھ استہزاء کیا جا رہا ہے کہ تمہارا یہ کیسا ایمان ہے؟ ان حوالوں سے یہودیوں کی باتوں کا جواب دیا گیا ہے کہ تم جھوٹے ہو، غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

''کہہ دو اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر خصوصیت کے ساتھ سوائے اور لوگوں کے فقط تمہارے ہی لیے ہے تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو''۔

بنی اسرائیل کے دعویٰ کا جواب

یہاں پر یہودیوں کے خود ساختہ عقیدے کو دہرایا جا رہا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم تو جنتی ہیں اگر جہنم میں گئے بھی تو بس چند دن کے لیے جائیں گے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (سورہ بقرہ، آیت ۸۰)

''چند روز کے علاوہ ہم عذاب میں نہیں ہوں گے''۔

انہوں نے کہا کہ گوسالہ کی جو عبادت ہم نے کی ہے، اگر ٹھیک نہ بھی ہو تو اس پر سزا ملے گی لیکن یہ سزا چند دن کی ہو گی، اس کے بعد ہم پھر جنت میں ہی چلے جائیں گے۔ جو کچھ ہمارے اوپر نازل ہوا ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ آخرت میں ان کی نجات حتمی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ان کے اس جھوٹ کو آشکار کر رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا کہ ان سے ذرا پوچھ لو اگر تمہیں

حتمی یقین ہے کہ قیامت میں تم نے نجات پانی ہے اور وہ اخروی سعادت تمہارے لیے ہے اور اللہ کے اذن کے ساتھ بغیر کسی عذاب اور خواری کے تم ہی جنت میں جاؤ گے اور باقی لوگ بے بہرہ رہیں گے اور تمہارا دین صحیح ہے اور باقی سارے ادیان باطل ہیں تو پھر اچھی بات ہے تم موت کی تمنا کرو تاکہ جلد ہی اخروی سعادت کو پہنچ جاؤ۔ اس دُنیا میں کیوں دھکے کھا رہے ہو اور یہ امر فطری ہے کہ جب انسان کو پتہ ہو کہ ایک طرف مشکلات ہیں اور دوسری طرف ایسی جگہ ہے جہاں پر آرام ہے تو وہ وہاں پر ہی جاتا ہے۔ جب آخرت میں آسائش اور آرام ہے اور رنج و تکلیف نہیں ہے تو پھر اسی کا انتخاب کرو۔ وہاں پر ہی چلے جاؤ، موت کی تمنا کرو کیونکہ مرنے کے بعد ہی وہاں جانا ہے تاکہ وہاں پر ابدی آسائش اور ہمیشہ کے آرام میں رہو۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

''وہ کبھی بھی اس کی ہرگز آرزو نہیں کریں گے ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔

بداعمالیوں کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کی اس بات کا جواب دے دیا کہ یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ کیونکہ ان کے اعمال ان کو معلوم ہیں اور ان اعمال کی سزا کا بھی انہیں پتہ ہے۔ وہ نبیوں کے قتل، موسیٰؑ کا کفر کرنا، میثاق کو توڑنا، گوسالہ پرستی کرنا جیسے برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بات مان کر اور پھر اس کا انکار کر دینا اور جس کو جانتے تھے اس پر عمل نہ کرنا یہ چیزیں انہوں نے اپنی آخرت کے لیے بھیجی ہوئی ہیں۔ تو انہیں پتہ ہے کہ وہ آخرت میں بے بہرہ اور بے نصیب ہوں گے اور اگر موت کو طلب کریں اور اس جہان کی زندگی چلی جائیں تو وہاں تو ان کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے۔ دنیا کی زندگی بھی چلی گئی آخرت میں بھی ان کے لیے خسارہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے اعمال ایسے ہیں، پس وہ موت

کی آرزو کیسے کریں۔ انسان کے اعمال اس کے باطن پر بہترین دلیل ہیں۔ برے اعمال انسان کے خبث باطن کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان اعمال کو انجام دینے والے اللہ سے ملاقات کا میلان اور موت کی تمنا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ موت کے بعد انہیں کیا کچھ بھگتنا پڑے گا۔

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور آپ انہیں زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے، اور ان سے بھی جو مشرک ہیں، ہر ایک ان میں سے چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار برس عمر ملے، اور اسے عمر کا ملنا عذاب سے بچانے والا نہیں، اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں"۔

لمبی عمر کی آرزو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہودیوں کے مزاج اور ان کی طبیعت کو بیان کر رہا ہے کہ یہ موت کی آرزو ہرگز نہیں کریں گے، یہ حریص ہیں کہ اسی دُنیائے فانی میں باقی رہیں۔ دنیا کی حقارت اور پستی کو بتانے کے لیے حیات کو نکرہ لایا گیا ہے۔ یہ لوگ اُس حیات طیبہ اور سعادت مندانہ زندگی کے طالب نہیں ہیں، یہ اپنے شرک کی وجہ اسی پستی پر ہی راضی ہیں بلکہ مشرکین سے زیادہ اس دنیاوی زندگی کے حریص ہیں اور اسی دنیا میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مشرکین کا اللہ اور روز جزاء پر عقیدہ نہیں ہے۔ جبکہ ان کا اللہ پر اور روز جزا پر عقیدہ ہے پھر بھی ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اسے ہزار سال زندگی مل جائے۔ حالانکہ ہزار سالہ زندگی بھی انہیں عذاب سے نہیں بچا سکے گی، آخر انہوں نے رب تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا

ہے اور وہاں اپنے برے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال سے آگاہ ہے، بصیر ہے، جانتا ہے اور وہاں انہیں ان کے اعمال کی سزا ملے گی۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

''کہہ دو جو کوئی جبرائیل کا دشمن ہو، سواسی نے اتارا ہے وہ قرآن اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر، ان کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے ہیں اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے''۔

جبرئیل امین سے دشمنی

حضرت جبرئیلؑ جو کچھ لے کر آتا ہے وہ اپنی جانب سے نہیں لاتا، اللہ کے دستور اور اللہ کی اجازت سے لاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو قرآن وہ لے آیا ہے وہ پہلی آسمانی کتابوں کی تائید کر رہا ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ قرآن پر ایمان نہ لایا جائے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قرآن ان کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے جو ایمان لائے ہیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن بشارت ہے اور ایک عقلمند انسان کسی ہدایت اور بشارت سے فقط اسلیے چشم پوشی نہیں کرتا کہ اس کو ہمارا دشمن لے کر آیا ہے۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے جو رسول آئے وہ تو اپنی طرف سے کچھ عمل نہیں کرتے۔ جبرئیلؑ میکائیل اور باقی فرشتے اللہ کے اوامر کی اطاعت میں ہیں، جو بھی اللہ اور اللہ کے فرشتوں سے دشمنی کرتا ہے در حقیقت وہ خود اللہ سے دشمنی کر رہا ہوتا ہے۔

قرآن ان موارد کی جو ان کی کتاب میں آئے ہیں موافقت کرتا ہے اور اس کا کوئی معنی نہیں کہ انسان ایک چیز پر ایمان لائے اور ایک چیز پر ایمان نہ لائے۔ یعنی جو چیز ان کی مرضی کی

نہ ہو اس کو قبول نہ کریں اور جو چیز ان کی مرضی کی ہو اسے قبول کریں۔ قرآن ہدایت ہے اور ہدایت تو نعمت ہے اور کوئی عقلمند نعمت کو رد نہیں کرتا۔ قرآن انسان کی عقل کے مطابق بشارت دے رہا ہے۔ بشارت اگر کوئی دشمن بھی آکر دے تو بھی ماننا چاہیے۔ پس ان کے پاس کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ اس بات کا انکار کریں اور اسے نہ مانیں۔ اور یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

"جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو، تو بیشک اللہ بھی ان کافروں کا دشمن ہے"۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

"اور ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں اتاری ہیں، اور ان سے انکاری نہیں مگر فاسق۔"

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"کیا جب کبھی انہوں نے کوئی عہد باندھا تو اسے ان میں سے ایک جماعت نے پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے"۔

فرشتوں اور پیغمبروں کا انکار اللہ سے دشمنی

ان آیات میں ان لوگوں کی سرزنش کی گئی ہے جو کہتے ہیں کہ ہم فرشتوں کو نہیں مانتے اور جبرئیلؑ کے دشمن ہیں۔ایسے لوگوں کو پتہ چلنا چاہیے کہ فرشتے اللہ کے نیک بندے ہیں، جیسا کہ سورہ تحریم کی آیت ۶ میں آیا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے، جو اللہ کا حکم ہوتا ہے اسے بجالاتے ہیں لہٰذا وہ اللہ کی طرف سے مامور ہیں۔

ان سے دشمنی کرنا یا اللہ کے پیغمبروں سے دشمنی کرنا حقیقت میں اللہ سے دشمنی کرنا ہوتا ہے۔ اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ جب کافر اللہ کی بات نہیں مانتے تو انہیں اللہ کی دشمنی نصیب ہوگی۔اللہ کا انکار کرنے والے کافر ہیں اسی لیے مخاطب کا صیغہ استعمال نہیں ہوا تاکہ ان کی سرزنش زیادہ ہو کہ تمہیں اس لائق ہی نہیں سمجھا گیا کہ اللہ کا خطاب تمہیں ہو۔ تم انتہائی پست ہو، خبیث ہو اور حق ظاہر کرنے کی طاقت تم میں نہیں ہے، تم میں حق بات تسلیم کرنے کی جرأت نہیں ہے اور تم تو حق کو جانتے ہوئے چھوڑ دیتے ہو۔ ضمیر ''ہم'' اسم ظاہر کے لیے استعمال ہوتی ہے اس کی بجائے کافر لایا گیا ہے تاکہ حکم کی وجہ معلوم ہو کہ اللہ تمہارا دشمن اس لیے ہے کہ تم کافر ہوئے ہو اور خدا کافروں کا دشمن ہے۔

پھر یہ بتادیا گیا کہ اے میرے رسول! اُن کا جو انکار ہے وہ ان کے فسق وگناہ کی وجہ سے ہے اگر ان کی فطرت سلیم ہوتی اور وہ اپنی فطرت پر ہوتے تو وہ قرآن کی آیات پر ایمان لے آتے،انہوں نے قرآن کی آیات پر ایمان نہیں لایا اس کو چھوڑ دیا اور عہد الٰہی کو رد کر دیا، اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے پیمانوں کو نہیں مانا تو یہ ایسے لوگوں کا عمل ہے جن میں ایمان لانے کی ہمت اور قوت نہیں ہے۔ کیونکہ ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان اپنے عہد کا پابند ہو، جو پیمان باندھتا ہے اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔ جو عہد و پیمان کے پابند نہیں ہیں وہ کس طرح ایمان لاسکتے ہیں؟ لہٰذا رسول پاک ﷺ کو ان کی اصلیت بیان کی گئی کہ یہ اس قابل

نہیں ہیں یعنی ان میں صلاحیت ہی ختم ہو چکی ہے ان کے گناہوں کی وجہ سے، فسق کی وجہ سے اور ان کا فسق مانع بنا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول آیا جو اس کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے تو اہلِ کتاب کی ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے ایسا پھینکا کہ گویا اسے جانتے ہی نہیں''۔

اللہ کی کتاب قرآن کا انکار کرنا

اس جگہ رسول سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں۔ آپؐ پر جو کتاب نازل ہوئی وہ قرآن مجید ہے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ پیغمبر ﷺ جو کچھ لے کر آئے ہیں اس میں توریت کے برحق مطالب کی تصدیق کی گئی ہے۔ لیکن بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے یہودیوں نے اللہ کی کتاب کا انکار کیا، اس پر عمل کرنے کو ترک کر دیا اور اسے تسلیم نہیں کیا۔ گویا کہ قرآن کی صداقت اور توریت کی صداقت سے وہ بالکل ناآشنا ہیں، وہ اپنے عمل کے انجام سے بھی بے خبر ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا، انہیں پتہ تھا کہ توریت میں جو کچھ معارف بیان ہوئے ہیں اُن کو جھٹلانا اور ان کے مطابق عمل نہ کرنے کا نتیجہ عذاب الٰہی کی شکل میں ہو گا اور قرآن جو تصدیق کر رہا تھا توریت کے مطالب حقہ کی، تو انہیں اس کی بھی خبر تھی، انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ توریت میں رسول کی آمد کا ذکر ہوا ہے۔ بلکہ وہ تو یثرب کے بارے میں بھی جانتے تھے کہ یہاں پر وہ رسول آئیں گے۔ اس لیے دور دراز سے آ کر انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی ہوئی تھی اور وہ رسول

عربی کی انتظار میں تھے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو گئی اور مکہ ہی میں ان کو پتہ چل گیا تھا کہ یہی وہ رسول ہیں جن کی خبریں توریت میں ہیں۔ پھر جب وہ مدینہ میں تشریف لے آئے اور یثرب کو مدینۃ الرسول کا نام ملا تو حسد کی وجہ سے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا اور حضور پاک ﷺ کی تصدیق نہیں کی۔

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى یَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ۫ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

”اور انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت پڑھتے تھے، اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا لیکن شیطانوں نے ہی کفر کیا لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، اور اس (چیز) کی بھی جو شہر بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا، اور وہ کسی کو نہ سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، توں کافر نہ بن، پس ان سے وہ بات سیکھتے تھے جس سے خاوند اور بیوی

میں جدائی ڈالیں، حالانکہ وہ اس سے کسی کو اللہ کے حکم کے سوا کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، اور سیکھتے تھے وہ جو ان کو نقصان دیتی تھی اور نہ کہ نفع، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جس نے جادو کو خریدا اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں، اور وہ چیز بہت بری ہے جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچا، کاش وہ جانتے"۔

جادو کی تعلیم اور اس کا غلط استعمال

اس جگہ یہودیوں کی شرارتوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں مفسرین نے بڑا اختلاف کیا ہے "اتَّبَعُوْا" کہ انہوں نے پیروی کی اس سے مراد کون ہیں؟

کیا وہ یہودی ہیں جو سلیمان کے زمانے میں تھے یا وہ یہودی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے یا سارے یہودی مراد ہیں؟

اسی طرح "تَتْلُوْا" کیا یہ شیاطین کی پیروی کرنے کے معنی میں ہے؟ یا تلاوت کرنے کے معنی میں ہے؟ یا جھٹلانے کے معنی میں ہے؟

تیسری بات: شیاطین سے مقصود اور منظور کیا ہے، جنات ہیں، انسان ہیں یا دونوں۔

چوتھی بات: "عَلٰی" یہاں پر "فِیْ" کے معنی ہے؟ یعنی سلیمان کے زمانے میں، "عَلٰی" کو "فِیْ" کے معنی میں لیں یا اس کے اپنے معنی میں رکھیں کہ سلیمان کے زمانے پر۔ جن وانس کے شیاطین مل کر سلیمان کی طرف کفر کی نسبت دیتے تھے اور یہ نسبت دے کر یہ خود کافر ہو گئے۔ یا تو اس لیے کافر ہوئے کہ سلیمان پیغمبر تھے ان کی طرف کفر کی نسبت دی یا اس لیے کافر تھے کہ لوگوں کے لیے جادو اور سحر کا فن نکال کر ان کو بتایا۔

" کَفَرُوۡا " کے معنی "سحر و" یعنی کَفَرُوۡا سحر وا کے معنی میں استعمال ہوا ہے، انہوں نے جادو کی تعلیم دی یا جادو نکالا۔ چھپا ہوا تھا تو اس کو نکال کر لوگوں کو بتایا۔

چھٹی بات یہ ہے کہ ان شیاطین نے باقاعدہ لوگوں کو سحر و جادو کی تعلیم دی یا ان کو سلیمان کے تخت کے نیچے جو چیزیں چھپی ہوئی تھیں ان کے نکالنے کا راستہ بتایا کہ وہ وہاں سے نکال کر لے آئیں۔

ساتویں بات یہ ہے کہ یہ جو " وَمَآ اُنۡزِلَ " جو اتارا گیا یہ "ما تتلوا" پر عطف ہے یا یہاں پر جو "ما" آیا ہے یہ "ماء" موصولہ ہے اور سحر کے لفظ پر عطف ہے۔ یعنی جو کچھ ان دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا یہ وہی لوگوں کو سکھاتے تھے اور واؤ عطف کے لیے نہیں بلکہ نئے کلام کے شروع کے لیے ہے۔ اور اس کا ربط پہلے جملے سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی جادو دو فرشتوں پر نہیں اُتارا گیا۔ ہاروت و ماروت دو معصوم فرشتے ہیں جیسا کہ باقی فرشتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔

آٹھویں بات یہ ہے کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "انزال" یعنی اتارنے کا عمل آسمان سے ہوا جبکہ بعض کہتے ہیں "انزال" یعنی زمین کی بلندیوں سے یہ بات نیچے آئی۔ زمین کی اونچی جگہیں مراد ہیں۔

نوواں اختلاف، بعض مفسرین کہتے ہیں یہ دو فرشتے نہیں تھے بلکہ ہاروت و ماروت بادشاہ تھے۔ "ملک" یہاں پر نیک کے معنی میں ہے یا اپنی نیکی ظاہر کرتے تھے۔

دسواں: بابل کے لفظ میں بھی اختلاف ہے کیا اس سے عراق والا بابل مراد ہے یا دماوند کا بابُل مراد ہے؟ یا نصیبین سے لیا گیا ہے جس سے رأس العین تک کا علاقہ مراد ہے؟ جو کہ شام کا علاقہ ہے۔

یہ جو دو فرشتے تھے یا بادشاہ تھے یا نیک لوگ تھے یہ لوگوں کو جب اس علم کی تعلیم دیتے تو کہتے تھے کہ ناجائز اور حرام کاموں میں ان کو استعمال میں نہ لانا۔

گیارہواں اختلاف: " مَا يُعَلِّمٰنِ " کاظاہری معنی تو یہی ہے کہ جو وہ تعلیم دیتے تھے یاآگاہ کرنے کے معنی میں ہے خبر دیتے تھے۔

بارہواں اختلاف: " فَلَا تَكْفُرْ " اس کا معنی یہ ہے کہ سحر اور جادو کا عمل کرکے کفر نہ اپناؤ۔ یااس کے سیکھنے کے ذریعے یااس کو استعمال میں لانے کے ذریعے۔

تیرہواں اختلاف یہ ہے کہ " مِنْهُمَا "میں ان دو سے مراد ہاروت اور ماروت ہیں یا مِنْهُمَا، یعنی سحر و کفر؟ یا لوگ مراد ہیں، دوفرشتے جو ان کو تعلیم دے رہے تھے اور سحر اور جادو سے منع بھی کر رہے تھے تو انہوں نے ان کی اس بات کو نہ مانا اور بیوی اور شوہر کے درمیان جدائی کاکام شروع کر دیا۔

چودہواں اختلاف اس جملہ میں ہے کہ سحر و جادو کے ذریعے بیوی اور شوہر میں دشمنی ایجاد کرتے تھے یا ان دونوں میں سے ایک کو دھوکہ دیتے تھے اور کفر و شرک پر آمادہ کر دیتے تھے تاکہ ان کے درمیان دینی اختلاف پیدا ہو جائے یا چغل خوری کے ذریعے ان کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے۔ یہ سب قرآن کے عجائب میں سے ہیں۔ اگر ان سارے اختلافات کو شمار کیا جائے جو تفاسیر میں آئے ہیں اور جو احتمالات دیئے گئے ہیں ان سب کو سامنے رکھیں تو بارہ لاکھ ساٹھ ہزار احتمال پیدا ہوتے ہیں جو سارے اس ایک آیت میں اکٹھے ہیں لیکن اس کے باوجود اس آیت کی فصاحت و بلاغت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

سحر کے ذریعے آزمائش و امتحان

بہر حال یہ آیت ظاہر میں جو بیان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ جادو کی تعلیم اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے واسطے آزمائش اور امتحان تھی اور کوئی بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کے اذن اور ارادے سے۔ یعنی ہر عمل کا ایک اثر ہے اور اس عمل کا اثر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے، ہر سبب کی ایک تاثیر ہے، تاثیر اللہ نے رکھی ہے لیکن اس سبب کو اختیار کرنے والا

انسان ہوتا ہے۔ جیسا سبب اختیار کرے گا ویسا اس کا اثر ہو گا۔ سحر بھی اسی طرح ہے، سحر یعنی جادو کرنے کا ایک طریقہ ہے جو بھی اس طریقہ کو استعمال میں لائے گا اس کا نتیجہ ہو گا، وہ نتیجہ کیونکہ اللہ نے رکھا ہے لیکن اس کا استعمال خود وہ شخص کرتا ہے اپنے اختیار سے۔ جب ایسا کرے گا تو پھر اس کا اثر تو ہونا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اللہ کے اذن سے یعنی اللہ کا جو تکوینی ارادہ ہے وہ وہاں پر موثر ہوتا ہے اس کے بغیر کسی چیز کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ سحر بھی اللہ کے نظامِ کلی اور جو قضاء کا سسٹم ہے اسی کے تحت ہی ہے۔

سحر نقصان دینے والی چیز ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو بھی پتہ تھا کہ وہ جو سحر کرتے تھے کہ سحر کی خریداری اور سحر کی فروخت یعنی جادو کرنا اور جادو کے ذریعے سے پیسے کمانا، اس عمل کے اجتماعی مفاسد ہیں۔ جنہوں نے یہ پیشہ اختیار کیا انہوں نے اپنے اس عمل کے ذریعے معاشرے میں فساد اور سوسائٹی میں خلل ڈالا، جادو ایسا علم ہے جو اپنے عالم کو صراط مستقیم کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ اس کو جہالت کی طرف لے جاتا ہے اور اسے سیدھے راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔

اس آیت میں بھی یہودیوں کے خصائص اور ان کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے درمیان سحر و جادو کا استعمال معروف تھا۔ وہ اس کی نسبت سلیمان نبی علیہ السلام کی طرف دیتے تھے یا دو فرشتوں کی طرف نسبت دیتے تھے۔ ایک تحریف شدہ حکایت اور کہانی کے ذریعے سحر و جادو کو حضرت سلیمان یا فرشتوں سے جوڑتے تھے، تحریف یہودیوں کا دیرینہ اور قدیمی شیوہ رہا ہے وہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس اتنی عجیب و غریب اور بڑی سلطنت موجود تھی اس کا حصول سحر اور جادو کے ذریعہ ممکن ہوا تھا۔ جبکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ سحر، اللہ کا کفر ہے اور کس طرح ممکن ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے جادو کے عمل سے اپنی سلطنت کو چلایا ہو؟ سحر عالَم کے نظام میں معمولی و طبیعی وضعیت کے خلاف

دست اندازی کرنا اور اس میں تصرف کرنا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ سلیمان علیہ السلام جو معصوم پیغمبر ہیں وہ ایسے عمل کا ارتکاب کریں جس میں کفر ملا ہوا ہو؟

قرآن نے اس تہمت کی حضرت سلیمان علیہ السلام سے نفی کی ہے اور کہا ہے کہ یہودیوں نے تہمت لگائی، افتراء باندھا، "اتبعوا" سے مراد سلیمان علیہ السلام کے بعد کے یہودی ہیں اور "تتلوا" کا معنی جھٹلانا ہے کیونکہ تتلوا حرف علیٰ کے ساتھ متعدی ہوا ہے۔ شیاطین سے جنات کا ایک گروہ مراد ہے جو سلیمان علیہ السلام کے کنٹرول میں تھا اور ان کے تحت کام کرتا تھا، یہودی ان کی پیروی کرتے تھے۔

ہاروت وماروت کا جادو کی تعلیم دینا

سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین نے جادو کیا، وہ سحر جوان شیاطین کے سحر کو توڑ کے لیے دو فرشتوں ہاروت وماروت کے ذریعے الہام کے ذریعے نازل کیا گیا تھا، وہ کسی کو سحر کی تعلیم نہیں دیتے تھے مگر تعلیم دینے سے پہلے ان کو سحر کے نقصانات بتاتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ وہ اسے استعمال میں نہ لائیں اور یہ بھی کہا کہ ہم تمہارے لیے امتحان اور آزمائش ہیں۔ اور اس کو استعمال میں لاکر کافر نہ ہوں۔ اس کی تعلیم اس لیے دیتے تھے تاکہ شیاطین کی طرف سے جو تعلیم دی گئی ہے ضرورت پڑے تو اس کا توڑ کر سکیں۔ جبکہ ان یہودیوں نے فرشتوں سے فقط سحر کا وہ حصہ سیکھ لیا کہ جس سے بیوی اور شوہر میں جدائی ڈال سکیں۔ سحر اللہ کے اذن کے بغیر اثر نہیں رکھتا، جو بھی جادو اور جادوگر کے پیچھے چلے اور ان سے استفادہ کرنا چاہے تو آخرت میں اس کے لیے کوئی بہرہ نہیں ہوگا اور یہ خود یہودیوں کو بھی

پتہ تھا کہ یہ ایسا عمل ہے جس کے نتیجے میں آخرت میں انہیں سوائے عذاب کے اور نقصان کے کچھ بھی نصیب نہیں ہو گا۔[1]

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٣

"اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو البتہ اللہ کے ہاں کا اجر ان کے لیے بہتر تھا، کاش وہ جانتے"۔

اللہ کا اجر و ثواب

یہودی خرافات کے پیچھے دوڑنے اور شیاطین کی باتوں میں لگنے کی بجائے ایمان اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ اگر یہ سحر کے ذریعے کفر اختیار نہ کرتے اور عمل کے معاملے میں کافرانہ برتاو نہ کرتے تو وہ اللہ کو مان رہے تھے، عمل میں اس عقیدے کے خلاف جاتے تھے جیسے جادو کرنا اور زکوۃ ادا نہ کرنا وغیرہ یہ عملی کفر ہے یعنی زکوۃ کے فریضے کا قائل ہونا اور پھر زکوۃ ادا نہ کرنا۔ خدا فرمار ہا ہے کہ اللہ کے ہاں جو ثواب ہے وہ ان منافع سے زیادہ ہے جو سحر اور کفر اختیار کرکے یہ لوگ کماتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٠٤

---

[1] ۔ تفسیر المیزان میں ان تمام احتمالات کو لایا گیا ہے اور اس کی جمع بندی کی گئی ہے اور اس کا خلاصہ ہم نے یہاں بیان کیا ہے۔ (مترجم)

''اے ایمان والو رَاعِنَا نہ کہو اور ''اُنْظُرْنَا'' کہو اور سنا کرو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

مومنوں کے لیے خصوصی فرمان

یہاں پر مومنوں سے خطاب ہے اور یہ خطاب ۸۴ مرتبہ تکرار ہوا ہے۔اس خطاب میں مومنین کے احترام کو ملحوظ رکھا گیا ہے، خاص کر جو ایمان میں سابقین ہیں۔اس آیت میں مومنین کو لفظ'' رَاعِنَا'' کہنے سے روکا گیا ہے ۔'' اُنْظُرْنَا'' کا معنی ہے ہمیں مہلت دیں، ہمیں تھوڑا وقت دیں۔ جبکہ ''رَاعِنَا'' کا معنی یہودیوں کے نزدیک سنو خدا تمہیں گونگا کرے، بنتا تھا۔ جبکہ مسلمان " رَاعِنَا" کہہ کر اس سے مراد یہ لیتے تھے کہ ہمارا کچھ خیال کرو یا ہمارا لحاظ کرو یعنی تھوڑا ٹھہر جاؤ کہ ہم بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔ تو پیغمبر اکرم ﷺ سے عرض کرتے تھے کہ تھوڑا آہستہ گفتگو کرو، اللہ تعالیٰ نے مومنین کو " رَاعِنَا" کہنے سے منع کیا کیونکہ اس سے یہودی دوسرا معنی مراد لیتے تھے اس کو سامنے رکھا ہے اور کہا کہ یہ لفظ یہودیوں کے ہاں ایک اور معنی میں مراد لیا جاتا ہے اس لیے تم یہ لفظ استعمال نہ کرو بلکہ اس کے بدلے میں " اُنْظُرْنَا" کا لفظ استعمال کرو۔

یہاں کافروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دیئے ہوئے دستور سے سرپیچی کرتے ہیں۔ '' وَاسْمَعُوْا'' کا خطاب بھی مومنوں سے ہے کہ اس بات کو سنو، اس پر عمل کرو۔ کافر وہ ہیں جو اللہ کی بات کو سنتے بھی نہیں ہیں اور انکار کرتے ہیں، اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں لفظ کفر اس مورد میں بھی استعمال ہوا ہے جہاں کسی کی ذمہ داری ہوتی ہے اگر وہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اس کو بھی کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو کافر وہی ہیں جو اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کو اپنے عمل کے ذریعے چھوڑتے ہیں اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

"اہل کتاب کے کافر اور مشرک نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھی اچھی بات نازل ہو، اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے"۔

رسول اللہؐ سے اہل کتاب کی دشمنی کی وجہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود، نصاریٰ اور مشرکین مکہ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی کی وجہ بتائی ہے کہ کیوں یہ لوگ ایمان قبول نہیں کرتے؟ کیوں تیری رسالت کا انکار کرتے ہیں؟ خدا ان کی اس ناپسندیدگی کو مومنین کے لیے خیر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ان کا بخل سوائے مسخرہ کے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ جس چیز کے وہ مالک نہیں تھے اس میں وہ بخل کر رہے تھے اور یہ تو اس بات پر ناخوش تھے کہ یہ خیر اور بہتری مومنوں کے لیے کیوں ہے؟ اللہ جس کو چاہے اپنی رحمت کا امتیاز دے۔ مالک اللہ ہے نہ کہ یہود و نصاریٰ و اہل کتاب اور مشرکین و کافر۔ خدا بہتر سمجھتا ہے کہ اپنی رحمت کا سزاوار کس کو قرار دیتا ہے، اللہ کے فضل کے لیے نہ کوئی حد ہے اور نہ ہی اس کی خیر کثیر کی کوئی انتہاء ہے۔ ان کی نفرت اور ان کا حسد اس لیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے مومنوں کو خیر اور بہتری پہنچ رہی ہے۔ یہ باتیں ان کو پسند نہیں تھیں اور وہ اس کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے، حسد کرتے تھے کہ یہ سب خیر اور اچھائیاں مومنوں کو کیوں مل رہی ہیں اس بارے میں اللہ نے فرمایا تم کون ہوتے ہو، خیر کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جسے چاہے خیر عطاء کرے۔ اس کی خیر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

''ہم جو کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر لاتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

آیت کے نسخ ہونے کی حکمت

اس آیت میں نسخ کی بات ہوئی ہے۔ نسخ کا معنی کسی شئے کو ختم کر دینا ہے۔ فقہی اصطلاح میں اس سے مراد ایک ایسا حکم یا قانون جو محدود وقت کے لیے ہو جب اس کا وقت ختم ہو جائے تو اس کی جگہ نیا حکم یا قانون آجاتا ہے جس سے سابقہ محدود وقت کے لیے وضع شدہ حکم ختم ہو جاتا ہے۔ وہ آیت جو سابقہ حکم کے لیے نازل ہوئی تھی وہ ختم نہیں ہوتی بلکہ اس آیت میں بیان شدہ حکم کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے، وہ قانون یا حکم ایک حالت سے وابستہ تھا، جب وہ حالت ختم ہو گئی تو وہ حکم ختم ہو گیا۔ وہ آیت اس حکم کی تنسیخ کے لیے بطور نشانی اور علامت ہے ۔ کوئی آیت ہو تو اس کی حیثیت اور جہات تبدیل ہو جائیں یا قرآن کا بعض حصہ آیت ہے ،نشانی ہے، علامت ہے، معجزہ ہے۔ اس لحاظ سے کہ انسان اس جیسا لانے سے عاجز ہے۔ احکام ،فرائض اور تکالیف اس لحاظ سے آیت ہیں کہ عمل کا وسیلہ ہیں اور ان کے ذریعے ہی انسان کے لیے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ پورے عالم کے موجودات بھی آیت ہیں، اس اعتبار سے کہ اپنے وجود سے خالق کے اسمائے حسنیٰ کو بیان کر رہے ہیں اور اس کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم آیت کو بھولتے نہیں یعنی اسے مٹا دینا، اس کی یاد ختم کر دینا۔ تو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے ہم ایک آیت کو مکمل طور پر ختم نہیں کرتے اور نہ ہی اسے تمہارے دلوں سے محو کرتے ہیں مگر یہ کہ ایک بہتر آیت یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔ خیر شئے موجود کے

کمال میں ہے یا حکم جو جعل ہوا جسے قرار دیا گیا اس میں ہے پس اس صورت میں ایک موجود خیر ہونے کے حوالے سے دوسرے کی مانند ہو، یا اس سے بہتر ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔ کسی حکم کے نسخ کرنے میں پانچ نکتے پیش نظر ہوتے ہیں:۔

۱۔ نسخ فقط شرعی احکام سے مربوط نہیں بلکہ موجودات میں بھی ہے۔ ایک نشانی پہلے ہے پھر وہ نشانی چلی جاتی ہے تو وہ نشانی دلوں سے محو نہیں ہوتی بلکہ اس سے بہتر ایک اور نشانی آجاتی ہے۔

۲۔ نسخ میں ہمیشہ دو طرف ہوتے ہیں، ایک ناسخ ہوتا ہے ایک منسوخ۔

۳۔ ناسخ کے اندر منسوخ کا کمال اور منسوخ کی مصلحت موجود ہوتی ہے۔

۴۔ ناسخ شکل میں منسوخ کے ساتھ منافات نہیں رکھتا اور نہ ہی مصلحت کے لحاظ سے۔

۵۔ ناسخ اور منسوخ کے درمیان ان کی منافات لفظ کے ظہور کے منعقد ہونے اور وجود میں آنے کے بعد ہے اور اس منافات کو دُور کرنے والی وہی مصلحت اور حکمت ہوتی ہے جس کے تحت اس پہلے حکم کو نسخ کیا گیا ہے۔ وہ حکمت دونوں میں موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت مطلقہ کے ذریعے اپنی آیات میں دخل اندازی اور تصرف کر سکتا ہے۔ اس کی قدرت کو کوئی چیز محدود نہیں کر سکتی۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

”کیا تم نہیں جانتے اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے نہ مددگار“۔

اللہ کی مالکیت اور یاوری

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خطاب کیا ہے کہ وہ یہودیوں کے دھوکہ میں نہ آئیں اور وہ جو ان کو ڈراتے رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جو شبہات ہیں اس کا جواب پہلے ہی دے دیا ہے کہ ممکن ہے کسی آیت کے حکم کے نسخ پر یہودی آکر شرارت کریں۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اللہ تمام ہستی اور وجود کا مالک ہے، وہ اپنے ملک میں جیسے تصرف کرنا چاہے جیسے دخل دینا چاہے دے سکتا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ انسان کی صلاح اور بہتری اور خیر کس میں ہے ۔ وہی ہے جو اپنی رحمت اپنے بندوں پر اتارتا ہے اور وہی اللہ ہی ہے جو تمہارے سارے امور کی سرپرستی کرتا ہے۔ تمہاری زندگی کے تمام پہلو اسی کی تدبیر کے تحت ہیں ، اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو تمہاری مدد کرسکے اور تمہارے امور کے بارے میں بہتر سوچ سکے یا مصلحت سے آگاہ ہو۔ لہٰذا جو کچھ تمہارے اوپر نازل ہوا ہے اس کی مخالفت جب تک نہیں کروگے تو اللہ کی مدد تمہارے لیے آتی رہے گی، اگر اللہ کے بیان کردہ امور کی مخالفت کروگے تو اللہ کی مدد تمہارے لیے نہیں ہوگی اور اللہ کے سواء کوئی تمہاری مدد کر بھی نہیں سکتا۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۱۰۸

''کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے، اور جو کوئی ایمان کے عوض کفر کو بدل لے سو وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہوا''۔

رسول اللہ ﷺ سے سوالات کرنا

یہاں پر مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ تم پیغمبر اسلام ﷺ سے معمول کے اسباب سے ہٹ کر جو معجزات دیکھ رہے ہو کیا اس پر سوالات کرو گے؟ جس طرح موسیٰؑ سے یہودی سوالات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں اللہ کا دیدار کرواؤ اور دوسرے معجزے طلب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مومنوں سے کہہ رہا ہے کہ راہ مستقیم پر برقرار رہو، ایمان لانے کے بعد کفر مت اختیار کرو اور جو ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف جاتا ہے تو گویا کہ اس نے راہ مستقیم کو گم کر دیا ہے۔ تم بنی اسرائیل کی طرح راہ راست سے مت بھٹک جاو۔ یعنی مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کے رویے کو نہ اپنائیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

"اکثر اہل کتاب تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، اپنے اندر کے حسد کی وجہ سے، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے، سو معاف کرو اور درگزر کرو جب تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

یہودیوں کی سازشیں

نقل ہوا ہے کہ کچھ لوگ تھے جن میں حی بن اخطب اور اس کے اطرافی تھے یہ لوگ بہت ہی متعصب یہودی تھے، وہ بیٹھ کر روزانہ منصوبہ بندی کرتے تھے۔ وہ خود تو گمراہ تھے ہی، وہ چاہتے تھے کہ جو ایمان لا چکے ہیں ان کو کسی طرح گمراہ کریں۔ ان کے دل میں حسد تھا

اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ ایمان کی دولت سے کیوں مالا مال ہیں۔ اسلام کی حقانیت اور حضور پاک ﷺ کی رسالت کی حقانیت کو وہ اچھی طرح جانتے تھے لیکن بغض، کینہ اور حسد ان کو مجبور کرتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں یہ منصوبہ بندی کریں، سازشیں کریں۔

اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ آپ ان کے ساتھ کینہ اور بغض نہ رکھیں، اور ان کی برائی کا جواب شر سے نہ دیں۔ یہ آیت جنگ اور قتل و قتال کا حکم آنے سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ پھر جب جنگ کا حکم آگیا تو اس آیت کا حکم منسوخ ہوگیا۔ اسی لیے کہا گیا کہ یہ اس وقت تک ہے کہ جب تک اللہ کا نیا حکم نہ آجائے۔ اور وہ نیا حکم جہاد اور کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کا تھا۔ یہ اشارہ بھی آگیا کہ اللہ کی جانب سے بہت جلد ان کے بارے میں ضابطہ آئے گا اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ اللہ نے اپنی قدرت مطلقہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ قادر مطلق ہے، وہی فیصلہ کرنے والا ہے اور اسی نے ہی حکم دینا ہے اور وہ جب چاہے گا تو نیا حکم جاری کرے گا۔ فی الحال یہ ہے کہ شر کا جواب شر سے نہ دیں، انہیں یہ منصوبہ بندی کرنے دیں، ان کی سازشوں کا توڑ خود اللہ تبارک و تعالیٰ کرے گا اور یہ سازشیں خود ان کی طرف پلٹ جائیں گی۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

”اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو، اور جو کچھ نیکی سے اپنے واسطے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے، بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے“۔

نمازاور زکات کافریضہ

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ نماز کا تعلق اللہ اور بندے سے ہے۔ نماز بندگی اور عبودیت کا اعلیٰ مظہر ہے جبکہ زکوٰۃ کا تعلق معاشرہ اور اجتماعیت سے ہے کہ انسان کا تعلق اپنی سوسائٹی سے ہو۔ خیر ہر اچھے عمل کو کہتے ہیں اس لیے کہا گیا ہے کہ اچھے اعمال اللہ کے پاس بھیجو تاکہ ان اعمال کا تمہیں اجر و ثواب ملے۔

وَ قَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور کہتے ہیں کہ سوائے یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی جنت میں ہرگز داخل نہ ہوگا، یہ ان کے ڈھکوسلے ہیں کہہ دو اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو''۔

یہودیوں اور نصرانیوں کا غلط دعویٰ

یہاں پر یہودیوں اور نصرانیوں کے خیالات کو بیان کیا گیا ہے اور یہ سارے اعتراضات اور سرزنش یہودیوں کی طرف متوجہ تھی جو کچھ یہودیوں کے بارے میں ہے وہی چیزیں نصرانیوں کے بارے میں بھی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے ہی جنت میں جانا ہے۔ اس بارے پہلے بھی آچکا ہے کہ یہودی اگر اپنی بات میں سچے ہیں تو موت کی تمنا کریں۔ جب وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم نے ہی جنت میں جانا ہے تو پھر جنت جانے کے لیے موت آئے گی تو پھر جنت میں جاؤ گے نا، تو پھر موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ جو اعمال آگے بھیج چکے ہیں ان کا رزلٹ کیا ملنا ہے۔ یہی بات نصرانیوں کے لیے ہے۔ یہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ یہ جھوٹا دعویٰ ہے اس کی دلیل و ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔

بَلٰی ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

”ہاں جس نے اپنا منہ اللہ کے سامنے جھکا دیا اور وہ نیکوکار بھی ہو تو اس کے لیے اس کا بدلہ اس کے رب کے ہاں ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔

اللہ کے آگے تسلیم ہونا سعادت کی ضمانت

جس کا عقیدہ توحید والا ہے، اور عمل بھی اسی کے مطابق ہو تو وہ اللہ کے اوامر اور نواہی کے سامنے تسلیم ہے۔ جس کا عقیدہ صحیح ہو اور عمل بھی اس درست عقیدے کے مطابق ہو اور نیک ہو تو پھر اس کے لیے سعادت ہے۔ سعادت ایمان اور عبودیت کی حقیقت سے مربوط ہے۔ یہ فقط نام نہیں ہے؛ یعنی یہودی ہونا یا مسیحی ہونا یا مسلمان ہونے سے انسان سعادت نہیں پا سکتا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ پورے اعمال اور عقائد کو دیکھتا ہے اور ساتھ یہ بھی دیکھتا ہے کہ کس نے کیا عمل کیا ہے۔ جس نے عقیدے کا اعلان کیا؛ تو پھر اس اعلان کا پاس بھی رکھا یا اس کو بھول گیا۔ یاد رکھو کہ خدا اپنے فضل سے اور بھی دیتا ہے، شادمانی اور خوشحالی کے وسائل دیتا ہے ایسا امن دیتا ہے جس کے بعد خوف نہیں ہوتا، کوئی حزن نہیں ہوتا، کوئی غم نہیں ہوتا۔

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ ٹھیک راہ پر نہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی راہِ حق پر نہیں ہیں حالانکہ وہ سب کتاب پڑھتے ہیں، ایسی ہی باتیں وہ لوگ بھی کہتے ہیں جو بے علم ہیں، پھر اللہ قیامت کے دن ان باتوں کا کہ جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں خود فیصلہ کرے گا''۔

یہودیوں اور نصرانیوں کا ایک دوسرے کو جھٹلانا

مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے اور یہودی اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ یہودی کہتے تھے ہم اللہ کے محبوب ہیں، مسیحی کہتے تھے ہم اللہ کے محبوب ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی رَد کرتے تھے۔ یہودی نصرانیوں سے کہتے تھے کہ تم ٹھیک نہیں ہو، ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ نصرانی یہودیوں سے کہتے تھے کہ تم ٹھیک نہیں ہو ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ حالانکہ دونوں اہل کتاب تھے۔

ان کو چاہیے تو یہ تھا کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس میں تحریف نہ کرتے اس پر عمل کرتے۔ انہوں نے حق کو نہیں لیا اور ناحق کو لے لیا۔ مشرکین بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ یہودی، نصرانی، مسلمان ان کا کوئی دین اور آئین درست نہیں ہے اور ان کے پاس کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ حالانکہ نہ تو وہ کتاب کے بارے کچھ جانتے تھے اور نہ ہی انہوں نے کچھ معلومات لے رکھی تھیں، وہ بلاوجہ اختلاف کر رہے تھے۔ واضح نشانیوں کو دیکھنے کے بعد دعوت الٰہی کو رد کر رہے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ قیامت کے دن حق کو باطل

سے جدا کرے گا اور یہ جو ایک دوسرے کے اوپر افتراء باندھتے تھے اور ایک دوسرے کو جھوٹا کہتے تھے ان کے بارے اللہ فیصلہ دے گا۔

پیغام

اس میں پیغام یہ ہے کہ انسان حق پر چلے اور اپنی ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈالے، بغیر دلیل اور ثبوت کے کسی کو نہ جھٹلائے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

"اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے کی ممانعت کردی اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کی، ایسے لوگوں کا حق نہیں ہے کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے"۔

اللہ کے ذکر سے منع کرنے والے

اس آیت میں کفار مکہ جو ہجرت سے پہلے حضور پاک ﷺ کے لیے مساجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے رکاوٹ بنتے تھے ان کا حوالہ دے کر کہا گیا کہ مکہ میں اللہ کی یاد کرنے سے روکتے تھے، اللہ کے حضور سجدے سے روکتے تھے، ذکر خدا میں مانع تھے۔ مساجد یعنی عبادت کی جگہوں کو ویران کرتے تھے یا انہیں گرا دیتے تھے، خراب کرتے تھے تاکہ لوگ وہاں پر شعائر الٰہی قائم نہ کریں۔ ایسے لوگوں کو مساجد میں وارد نہیں ہونا چاہیے۔ مساجد میں وہ

لوگ آتے ہیں جن کے دل ایمان سے آباد ہوتے ہیں اور ایمان نے ان کے دلوں کو نورانی کیا ہوتا ہے۔ جو لوگ مساجد کی ویرانی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں وہ مستحق نہیں ہیں کہ مساجد میں آکر پناہ لیں۔ وہ تو اس حالت میں رہیں کہ ان کو ڈر ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ ہم محفوظ نہیں ہیں۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلیل و خوار کریں اور قیامت کے دن بڑا عذاب ان کے لیے ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے مقابلے میں جنگ کی، شعائر الٰہی سے روکا۔ یہ بات کفار مکہ کے لیے ہے۔ لیکن اس میں تمام مسلمانوں کے لیے بھی پیغام ہے کہ مسجد ،اللہ کی ہے تو مسجد میں اللہ کا ذکر ہونا ہے، مسجد امن کی جگہ ہے اس کی نسبت کعبۃ اللہ سے ہے۔ جہاں بھی مسجد بن جاتی ہے تو مسجد میں ذکر الٰہی سے روکنا شرعاً جرم ہے۔ جو مساجد خراب کرتے ہیں، ویران کرتے ہیں وہ مجرم ہیں۔ مومنین کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ برا سلوک کریں اور ان کو دُنیا میں ذلیل و رسوا کریں، اور ان کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے کہ انہوں نے دُنیا میں اللہ کے ذکر سے روکا اور اللہ کے مقابلے میں آ گئے۔

پیغام

اللہ کے ذکر سے نہ روکا جائے۔ وہ مقامات جہاں پر اللہ کا ذکر ہوتا ہے ان کی تالہ بندی نہ کی جائے۔ مساجد اللہ کے ذکر کی جگہ ہیں، مساجد میں ذکر الٰہی سے نہ روکا جائے۔ مساجد امن کے لیے ہیں مساجد کو بے امن نہ کیا جائے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

”اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، سو تم جدھر بھی رُخ کرو ادھر ہی اللہ کا رُخ ہے، بے شک اللہ وسعت والا جاننے والا ہے“۔

اللہ ہر سمت میں ہے

اس آیت میں سلطنت الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حکومت کے دائرہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پوری کائنات مِلکِ خدا ہے۔ اللہ کا سب پر تسلط ہے اور ان کے آثار پر بھی، وہ سب کے سب حقیقت میں اللہ کے لیے ہیں۔ انسان کی جو مالکیت ہے وہ اعتباری ہے، وقتی ہے اور اللہ کی طرف سے عطاء شدہ ہے، ان کی اپنی ذات نے ان چیزوں کو تیار نہیں کیا۔ اگر وہ ہاتھ کی کمائی ہے تو ہاتھ اللہ کے دیئے ہوئے ہیں، اگر زمین سے کچھ چیز حاصل کی ہوئی ہے تو زمین اللہ کی ہے۔ اللہ نے قانون بنایا ہے کہ جو کمائے گا تو وہ اس کا مالک کہلائے گا یعنی یہ مالکیت اعتبار شدہ ہے۔ اس کا اثر اور منفعت اس کے ساتھ متعلق ہے، خود وہ اصل شئے اس کی نہیں ہے جس سے وہ وجود میں آئی ہے، وجود دینے والا اللہ تعالیٰ ہے، اللہ ہے کہ جو ہر لحاظ سے ہر پہلو سے تمام اشیاء پر تسلط رکھتا ہے۔ اس لیے جس سمت بھی رخ کرو تو گویا اللہ کی ہی طرف رخ کیا ہے۔ کیونکہ ہر سمت اللہ کی ہے اور جس طرف عبادت کرنے والا توجہ کر لے تو اللہ ہی کی طرف اس نے رخ کیا ہے۔ اللہ وسعت دینے والا ہے، اللہ کا ہی ہر جگہ احاطہ ہے، اللہ تمہارے مقاصد سے آگاہ ہے۔ اللہ انسان کی طرح نہیں ہے کہ ایک طرف توجہ کرنے کے لیے ایک جہت چاہیے، کیونکہ وہ مادی موجود ہے۔ مادی موجود کو جگہ کی ضرورت ہے۔ اللہ خالق مادیات ہے وہ جگہ سمت اور جہت سے ماوریٰ ہے۔ اس کی ذات لامتناہی ہے۔ ہر سمت اللہ کی ہے۔ ہر جہت اللہ کی ہے۔ اللہ ہر جگہ ہے۔ جہاں چاہو، جس طرف چاہو اللہ کو یاد کرلو۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور کہتے ہیں اللہ نے بیٹا بنایا ہے، حالانکہ وہ پاک ہے، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے، سب اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

اللہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے

یہاں یہود و نصاریٰ کی بات ہو رہی ہے۔ انہوں نے اپنے پیغمبر کی بزرگی اور اس کے احترام کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اور واقعیت کا ارادہ کرتے ہوئے ایسی بے بنیاد بات کہی تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کو ٹھکرا دیا ہے کہ وہ غلط کہتے ہیں۔ یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے تو اللہ نے فرمایا کہ اللہ کی ذات منزہ ہے اس قسم کی باتوں سے کیونکہ فرزند اپنے باپ کی مثل ہوتا ہے، اس کی مانند ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ خلق اور ایجاد میں اسباب کے وسیلے کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ جب اس کا فیصلہ ہوتا ہے کسی چیز کے بارے میں تو جب کہتا ہے ہو جا تو وہ شئے موجود ہو جاتی ہے۔ بلکہ ہو جا کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، اللہ کا ارادہ ہی اس شئے کے وجود میں آنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کا امر تدریجی نہیں ہے۔ خدا تمثل اور تدریج سے پاک و منزہ ہے جو کہ بیٹا بنانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ بے ہودہ خیالات رب تعالیٰ کی قدسیت اور اس کی شان کے خلاف ہیں۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ جتنی بھی اللہ کی مخلوقات ہیں یہ سب اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہیں، اللہ کے فرمان کے تابع ہیں اور خود کو اللہ کے حضور ذلیل و خوار اور ناچیز قرار دیتے ہیں۔ انسان نے اپنے اختیار سے اللہ کی عبادت کرنی ہے ورنہ انسان کے علاوہ ہر شئے اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ کائنات کی تمام اشیاء کو جس کام کے لیے اللہ نے بنایا ہے اسی کام کو انجام دے رہے ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

"آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور جب کوئی چیز کرنا چاہتا ہے تو صرف یہی کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، سو وہ ہو جاتی ہے"۔

اللہ کی بے پایان قدرت اور احاطہ علمی

"بدیع" ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کی کوئی مانند نہ ہو، ایسا مانند جس کو ذہن جان سکے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق بنائی ہے لیکن اس کا پہلے سے کوئی شبیہ یا مانند موجود نہیں تھا کہ اس کو سامنے رکھ کر بنایا ہو بلکہ پہلے پہل ہر شئے کو اللہ نے بغیر سابقہ کسی نمونے کے خلق کیا ہے اور ہر شئے کی موجودیت اللہ کے ارادے سے وابستہ ہے۔ جب اللہ کا ارادہ تکوینی ہو جاتا ہے کہ فلاں شئے ہو، تو وہ ہو جاتی ہے اس میں کوئی مرحلہ نہیں ہوتا ہے کہ طے کرنا ہے۔ ہر شئے کی موجودیت اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت ہے۔ انسان کو اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے مقدمات چاہیے ہوتے ہیں۔ اللہ کے ہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نمونہ ڈھونڈتا ہے، یا ذہن میں پہلے چیز بناتا ہے اور اس کا ظاہر میں خاکہ تیار کرتا ہے اور اس کے مطابق شئے تیار کرتا ہے لیکن اس تصور اور تصدیق کی اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا ارادہ ہی شئے کے موجود ہونے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ درمیان میں کوئی اور وسیلہ ہے ہی نہیں۔ اللہ کا ہر شئے پر احاطہ ہے اور وہ ہر شئے کا خالق ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور بے علم کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا یا ہمارے پاس اس کی کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہیں، ان کے دل ایک جیسے ہیں، یقین کرنے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں بیان کر چکے ہیں''۔

اللہ کے بارے غلط خیالات

یہاں ''الذین لا یعلمون'' سے مشرکین مراد ہیں۔ مشرکین کہتے تھے کہ اللہ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا؟ البتہ اس آیت میں اہل کتاب کو کافر اور مشرکوں کے ساتھ ملحق کیا گیا ہے کیونکہ فکر اور عمل میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ وہ ادراک اور عقیدے میں بھی ایک دوسرے سے شبہات رکھتے ہیں اور ان کی سوچ بھی ایک جیسی ہے۔ اس حساب سے یہودی، مشرکوں سے برتر نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک جیسے ہیں۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جو بات مشرکین کہہ رہے ہیں تم سے پہلے یہی باتیں موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہودیوں نے کہی تھیں، نصرانیوں نے اپنے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا، اب کافر اور مشرکین وہی بات پیغمبر اسلامؐ سے کہہ رہے ہیں۔ ان سب کا طرز فکر اور سوچ کا انداز ایک جیسا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حق کو قبول نہیں کرنا۔ جبکہ اللہ کی جانب سے واضح اور روشن نشانیاں اور آیات آئی ہوئی ہیں۔ البتہ روشن نشانیوں اور آیات کو دیکھ کر وہی ایمان لاتے ہیں جو یقین کی منزل پر فائز ہوئے ہیں۔ جن میں یقین نہیں ہے وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ کیونکہ ان آیات اور معجزات کا مصداق یقینی ہے۔ لیکن اس یقینی امر سے یہ نتیجہ نہیں لیتے۔ انسان کا یقین ہی ہے جو ان

نشانیوں اور آیات کے ذریعے ان کی راہنمائی کرتا ہے اور جو اس یقین کے نتیجے کو اور مصداق کو آیات کے واضح جاننے کے باوجود بھی اس میں شک کرے تو گویا کہ اس نے یقینیات کی نفی کی ہے۔ اور یقینیات کی نفی کرنے والا کیسے ہدایت پا سکتا ہے؟ کیونکہ جتنی بھی آیات اور معجزات ہیں یہ سب یقین آور ہیں۔ کوئی بھی ایسا معجزہ نہیں ہے جس کو دیکھنے سے انسان کو یقین نہ ہو۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے عصاء پھینکا تو اژدھا بن گیا اور سارے جادوگروں کی رسیوں کو نگل گیا، جو اس فن کے ماہر تھے ان کو یقین آگیا کہ یہ بناوٹ یا کوئی آنکھوں کا دھوکہ نہیں ہے، یہ سچ مچ ہوا ہے تو اسی لیے فوراً ایمان لے آئے۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ اژدھا حقیقی اژدھا کا ہی مصداق ہے جھوٹ نہیں ہے۔

پیغام

یقینیات کے خلاف نہیں ہونا چاہیے اور جو یقینیات کو چھوڑتے ہیں، ان کے مقدر میں بھٹکنا ہی ہے۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾

''بے شک ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری سنانے کے لیے اور ڈرانے کے لیے، اور تم سے دوزخیوں کے متعلق بازپرس نہ ہو گی''۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ (سورہ بقرہ، آیت: ۶)

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ انکار کر چکے ہیں، برابر ہے انہیں تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے''

رسول اللہؐ کی ذمہ داری

یہاں پر پیغمبر اکرم ﷺ کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ پیغمبر ﷺ حق کے ساتھ آئے ہیں، حق لے کر آئے ہیں، اس حق کی بنیاد پر لوگوں کو بشارت دیں کہ جو بھی اس دعوت کو قبول کریں گے، اللہ کی توحید کو مانیں گے، اسی کے مطابق عمل کریں گے، قیامت پر ایمان لائیں گے تو پھر ان کے لیے ہمیشہ کا سکون ہے اور ڈرائیں اس سے کہ جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں گے اور دعوت کو ٹھکرائیں گے، ایمان نہیں لائیں گے، کافر ہو جائیں گے تو پھر ان کے لیے نجات نہیں ہے ان کے لیے جہنم ہے۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھیں تمہارا کام ان کو بشارت دینا اور ڈرانا ہے اور بس! ایمان لائیں نا لائیں وہ آپ کا کام نہیں ہے۔ لہٰذا جو ایمان نہ لا کر جہنم کی طرف جائیں گے تو اس کے ذمہ دار آپ نہیں ہیں۔ وہ جہنم میں وارد ہو رہے ہیں معصیت کی وجہ سے، کفر کی وجہ سے اور ان کے اپنے دل ٹیڑھے ہیں وہ حقیقت کی طرف نہیں آئے اور حق کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اسی بات کو سورہ بقرہ کی آیت ۶ میں اور انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ”وہ جو کہ کافر ہوئے ہیں آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، ان کے لیے حالت ایک ہی جیسی ہے اور وہ ایمان نہیں لائیں گے“۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

”اور تم سے یہود اور نصاریٰ ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی نہیں کروگے، کہہ دو بے شک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے، اور اگر تم نے

ان کی خواہشوں کی پیروی کی اس کے بعد جو تمہارے پاس علم آ چکا تو تمہارے لیے اللہ کے ہاں کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا"۔

یہود و نصاریٰ سے دوستی

یہود و نصاریٰ نے اپنی مرضی سے آئین بنا لیا ہے، اپنے گھڑے ہوئے نظریات کے تحت نظام حیات ترتیب دیا ہے۔ ظاہر ہے ان کا نظام اللہ کے بنائے ہوئے نظام کے بالکل مخالف ہے۔ انہوں نے اس خود ساختہ نظام کو دین کا نام دے رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ بتا دیا گیا کہ یہود و نصاریٰ کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جو کچھ انہوں نے گھڑ رکھا ہے جب تک وہ نہیں مانو گے وہ تجھ سے خوش نہیں ہوں گے نہ ہی آپ کے اس عمل سے راضی ہونگے۔ ان کو واضح بتا دو کہ جو تم کر رہے ہو وہ غلط ہے تم بھٹکے ہوئے ہو، حق راستہ وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے اور اللہ کی اطاعت ہی واجب ہے، اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا ضروری ہے۔ اور پھر ایک حکم عام بتا دیا کہ اگر تم ان کی خواہشات میں چلے جاؤ گے جبکہ تمہارے پاس علم آچکا ہے اور نفسانی خواہشات کو دین کا لباس پہنا دیا جائے تو اگرچہ اس کو آئین اور دین کہا جائے لیکن یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے آئین حقہ نہیں ہوگا اور پھر اللہ کی مدد بھی تمہارے لیے نہیں ہو گی۔ یہ ایک حکم کلی بتا دیا کہ جو بھی اللہ کی سرپرستی کو چھوڑ کر دوسرے کی سرپرستی میں آتا ہے تو اس کے لیے سوائے رسوائی کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا وہ اللہ کا پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اگر وہ ایسا کرے گا تو پھر اللہ کی دی ہوئی ذمہ داری اس سے چھین لی جائے گی۔ اس میں حضور پاک ﷺ سے یہ کہا گیا ہے، جب حضور پاک ﷺ کے لیے اجازت نہیں ہے تو پھر کسی اور کے لیے اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟

پیغام: لہٰذا ہمارے لیے جو پیغام ہے وہ یہ ہے کہ آج کے دور میں بھی مسلمان اگر یہود و نصاریٰ کو خوش کرنا چاہیں تو یہود و نصاریٰ چاہیں گے ان کی مرضی کے مطابق چلیں اللہ کے

پیغامات کو چھوڑ دیں اور اللہ کے دین کی پیروی نہ کریں۔ جب ایسا ہو گا تو پھر سوائے بربادی کے اور کچھ نہ ہو گا ذلت اور خوارگی کے اور کچھ نہ ہو گا اللہ کا نظام ہی بہتر نظام ہے، اسی نظام کو اپنانا ہے اور اس پر قائم رہنا ہے جبکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ جو ان کا دین ہے وہی دین برحق ہے، اس یقین کی حالت میں وہ نصرانی اور یہودیوں کی بات مانیں گے ان کی پیروی کریں گے تو اللہ کی مدد ان سے چھن جائے گی کوئی ان کا یاور اور مددگار نہیں ہو گا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، جو اس سے انکار کرتے ہیں وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

قرآن کے نزول کا ہدف

اس آیت میں قرآن کی بات ہو رہی ہے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی تاکہ اس میں تدبر کریں غور کریں اور جیسا ایمان لانے کا حق ہے ویسا ایمان لے آئیں، نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اسی طرح زندگی گزاریں، اسی راہ اور رسم کو اپنائیں تب تمہارا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو ایمان لائے ہیں۔ محمد ﷺ پیغمبر اُمی ہیں اگرچہ ان کی بشارت توریت اور انجیل میں دی جا چکی تھی اور توریت اور انجیل میں ان کا نام تک لکھا ہوا تھا لیکن اُنہوں نے اُن کی کتاب کو قبول نہ کیا۔ قرآن کو تسلیم نہ کیا اور ان کی رسالت کا انکار کیا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بھی قرآن کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑتا ہے اور اللہ کے بیان کردہ رسولوں کے خلاف جاتا ہے تو پھر خسارہ اس کا اپنا تیار کردہ

ہے۔ آخرت میں انہیں عذاب گھیر لے گا کیونکہ ان کے لیے تو بتا دیا تھا آخری پیغمبر کے بارے میں، اور انہوں نے سب کچھ جاننے کے باوجود انکار کیا ہے تو خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے وہ دردناک عذاب میں ہوں گے اور ایسے لوگ نقصان میں ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢٢﴾

"اے بنی اسرائیل! میرے احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے اور بے شک میں نے تمہیں سارے جہاں پر بزرگی دی تھی"۔

بنی اسرائیل پر اللہ کا احسان

پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر جو انعامات کئے ان کا تذکرہ آیا ہے۔ ایک ایک نعمت کو اللہ نے بیان کیا اور بتایا کہ تم نے ان سب نعمات کی ناشکری کی اور کفر اختیار کیا۔ یہاں پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرما رہا ہے اے بنی اسرائیل او یہودیو! ہم نے تمہیں کتنی نعمات عطا کیں تمہارے درمیان رسول کو بھیجا، تمہارے لیے کتاب بھیجی، تمہارے لیے مَن و سلویٰ بھیجا، تمہیں دوسروں پر برتری دی، کسی اور قوم میں رسول نہیں بھیجا، کسی اور قوم میں کتاب نہیں اُتاری، تمہیں فضیلت و برتری دی لیکن تم نے ان نعمات کی قدر نہیں کی۔ اس جگہ جس برتری کا ذکر ہو رہا ہے وہ برتری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہیں کئی رسول ان کے درمیان بھیجے اور ان کو یہی بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہارے درمیان رسول بھیجا، کتاب بھیجی، دوسروں پر برتری دی لیکن تم نے قدر نہیں کی۔ جب ایسا ہے تو پھر تمہیں اپنی اس ناشکری اور کفران نعمت کی سزا بھگتنا ہو گی۔

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی بھی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ وہ مدد دیے جائیں گے''۔

قیامت، اعمال کے بدلے کا دن

اس جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ حکم دے رہا ہے کہ میں نے تمہیں نعمتیں دی ہیں، اب تم اپنے آپ کو بچاؤ ہلاکت سے، تقویٰ اختیار کرو، وہ دن آنا ہے جس دن ہر شخص کو اسی عمل کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا ہوگا۔ اگر کوئی یہ چاہے گا کہ اس سے عمل کے علاوہ کچھ اور لے لیا جائے تو وہ نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی کسی اور کا عمل کسی دوسرے کے کام آئے گا۔ اسی لیے سورہ انعام کی آیت ۱۶۴ میں فرمایا: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ''کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا'' ہر شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے گا اور وہ دن ایسا ہے کہ وہاں پر کسی کی سفارش بھی کام نہیں آئے گی، اللہ پر ایمان بھی نہیں لائے اور اللہ کے احکام کی مخالفت بھی کرتے رہے اور اب چاہو کہ کوئی سفارشی آجائے، وہاں کسی کی سفارش نہیں ہو گی کوئی فائدہ نہیں دے گا تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی وہاں پر کوئی تمہاری نصرت کے لیے نہیں آئے گا۔ یہ سارے دُنیاوی اسباب قیامت کے دن منقطع ہو جائیں گے وہاں حکم اور فیصلہ اس کا چلے گا جو سارے اسباب کا خالق ہے اور تمہارا بھی خالق ہے۔

پیغام: اسی دُنیا میں اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آؤ، آخرت پر ایمان لے آؤ، اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی گزارو تاکہ قیامت کے دن آرام و سکون پا سکو۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب ابراھیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو اس نے انہیں پورا کر دیا، فرمایا بے شک میں تمہیں سب لوگوں کا پیشوا بنادوں گا، کہا اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا (البتہ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں ہوگا)''۔

ابراہیمؑ کیلئے امامت کا عہدہ

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں، اُن کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے مختلف آزمائشیں اور امتحانات کا سلسلہ جاری رکھا اس کے حوالے سے بات ہو رہی ہے۔ تاکہ ابراہیم علیہ السلام میں جو اندرونی صفات تھیں وہ ظاہر ہو جائیں اور آزمائش میں ان کی کامیابی کا پتہ چلے کچھ کلمات تھے جن کے بارے میں سوال ہوا تھا،[1] یہ کلمات کچھ اقوال، کچھ واقعات کچھ حالات، جیسے ستارے دیکھے تو ستارے دیکھ کر کہا یہ تو رب ہے، پھر کہا یہ تو ڈوب جاتا ہے پھر بتوں کو دیکھا تو بتوں کا تیاپانچا کر دیا اور کہا کہ یہ تو بے جان ہیں۔ آگ میں ڈالے گئے تو وہاں سے سرخرو ہو کر نکلے، جبرئیل علیہ السلام نے کہا میں مدد کروں تو کہا تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سارے امتحانات سے گزرتے ہیں اور جب ہجرت کی بات آئی مکہ میں اپنے نونہال بچے کو چھوڑ دے تو وہ بھی چھوڑ دیا، بچے کے ذبح کرنے کی بات آئی تو وہ بھی کر دیا یعنی ہر بات اور ہر امتحان، ہر مرحلہ کو پورا کرتے آئے، ہر

---

[1] ۔ صحیح روایات میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ان کلمات سے مراد چودہ معصومین علیہم السلام کی ولایت تھی۔ البتہ یہ اس کا باطنی معنی کہلائے گا، ظاہری معنی یہ نہیں ہے۔

واقعہ میں سرخرو ہوتے آئے۔ سارے کام انجام دینے کے بعد اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ ان کلمات کو پورا کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے ہی دی ہے، خدا نے ہی ایسے حالات بنائے جن کی وجہ سے وہ ان امتحانات میں سربلند رہے اور بڑے احسن طریقے سے ان سب کو انجام دیا۔

جب سارے امور میں کامیابی سے آگے بڑھے تو پھر اللہ تعالیٰ نے انعام دیا۔ وہ انعام یہ تھا کہ میں تجھے انسانوں کا امام بنا رہا ہوں، رسول پہلے تھے، نبی پہلے تھے، صاحب کتاب پہلے تھے تو اب امامت کا عہدہ دے دیا۔ امامت یہ ہے کہ تیرے اقوال اور تیرے افعال کی لوگ پیروی کریں کیونکہ جو امام ہوتا ہے وہ ملکوتی امور کی جانب ہدایت دیتا ہے اور اس سے یہ ملکوتی امر علیحدہ نہیں ہوتا اور امامت ایک قسم کی باطنی ولایت اور سرپرستی ہوتی ہے لوگوں پر، انسانوں پر اور ان کے اعمال پر اور انہیں مطلوب مقصد کی طرف ہدایت دینے کی صلاحیت دی جاتی ہے۔ یہ فقط راستہ دکھانا نہیں ہوتا، نبی رسول راستہ دکھاتا ہے، امام اس راستے پر چلاتا ہے اور آکر منزل تک پہنچاتا ہے۔ وہ مؤمن کو ہدایت دیتا ہے اور خدا کے پاس لے جاتا ہے۔ امام اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچائے اور ضروری ہے کہ امام اللہ کی طرف سے تائید شدہ ہو اور معصوم ہو اور کوئی بھی اخلاقی صفات میں ان سے برتر نہ ہو۔ اور امامت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے صبر، صفائے باطن، عقیدہ کی برتری، خالص بندگی اور کسی قسم کا شک اور شبہ اور شائبہ تک نہ ہو۔

ابن کثیر نے مجاہد سے نقل کیا ہے، مجاہد اہل سنت کے ہاں تفسیر کے حوالے سے بڑے معتبر ہیں، وہ کہتا ہے: "امام ظالم نہیں ہو سکتا کہ اس کی پیروی کی جائے، للذا ظالم امام ہو ہی نہیں سکتا" قرآن نے سورہ یونس کی آیت ۳۵ میں اسی مطلب کو اس انداز سے بیان کیا ہے: قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ

یُّھْدٰی ؕ" تواب جو صحیح راستہ بتلائے اس کی بات ماننی چاہیے یا اس کی جو خود راہ نہ پائے جب کوئی اور اسے راہ بتلائے "۔

امامت ظالموں کے لیے نہیں

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت کا عہدہ ملا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جرأت ہوئی اور اللہ سے کہا کہ یا اللہ میری اولاد میں بھی امامت رکھ دے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑھاپے کا زمانہ ہے اس وقت آپ کی اولاد بھی تھی، اسماعیل علیہ السلام بھی بڑے ہو چکے تھے اسحاق بھی اور ان کی اولاد بھی۔ لیکن اللہ کے ہاں عقیدتی اور ایمانی رابطہ معتبر ہے، نسبی قرابت اور تعلق داری اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ امامت ایک خاص عہدہ ہے جو عمل شعور، صلاحیت، ایمان سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا گیا کہ دعا تمہاری قبول ہے۔ لیکن اس عہدہ کو لینے کے لیے تمہاری اولاد ہونا اور نسبی قرابت داری کافی نہیں ہے بلکہ دوسری صلاحیتیں بھی ہونی چاہیے، اسی لیے اللہ نے فرمادیا کہ "امامت کا الٰہی عہدہ ظالموں کے لیے ممنوع ہے" اب ظلم اور ستم ہر قسم کا ہے، اس میں شرک بھی ہے، کفر بھی ہے، معصیت بھی ہے، اپنی ذات سے زیادتی بھی ہے، اپنے ماتحتوں پر زیادتی بھی ہے۔

پس امام فقط وہ بن سکتا ہے جس نے اپنی پوری عمر معمولی اور چھوٹی سی غلطی بھی نہ کی ہو، اس سے کوئی کوتاہی نہ ہوئی ہو، نا بھول کر نا جان بوجھ کر، کوئی ظلم اس سے نہ ہوا ہو۔ چاہے امامت ہو، رسالت ہو، یا خلافت ہو، یا اُمت کی رہبری۔ اصل بات یہ ہے کہ اس سے بڑا امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے تمام امور کی سرپرستی اس کے ذمہ ہوتی ہے، لوگوں کو راہنمائی دینا اس کے ذمے ہوتا ہے، خدا تک لے جانا اس کے ذمہ ہوتا ہے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ عہدہ ایسے شخص کے پاس ہو جو خود ظالم ہو، ایسا سرپرست بنے جو خود گناہگار ہو، اللہ

اور مومنین ایسی سرپرستی پر کیسے خوش رہ سکتے ہیں؟ امام اُمت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظالم نہ ہو۔ اور امام ایسا ہو کہ جسے خود اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہو اور مسلمانوں پر جو چیز واجب ہے کہ وہ اس امام کی اتباع کریں، اس کی پیروی کریں اس کی بات کو مانیں، اس کے امر کے مطابق عمل کریں، اس سے جدا نہ ہوں کیونکہ اس سے جدائی اللہ سے انحراف ہے، توحید سے انحراف ہے۔ لہٰذا ایسے افراد جو پہلے کافر تھے اور پھر مومن بنے ان کے لیے بھی ایسا عہدہ نہیں ہو سکتا، یہ عہدہ ان کے لیے ہے جنہوں نے پوری زندگی بچپن سے لے کر آخر عمر تک نہ کوئی غلطی کی ہو نہ کوئی بھول چوک ہوئی ہو اور ہر صفت میں سب سے بالاتر ہوں۔ علم میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ ہوں۔ سب اس کے محتاج ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جس سے ہر کوئی آ کر لے۔ امام وہ نہیں ہوتا جو دوسرے سے جا کر لے۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

”اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لیے عبادت گاہ اور امن کی جگہ بنایا، (اور فرمایا) مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراھیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو“۔

کعبہ کے متعلق ابراہیمؑ کو اللہ کا حکم

اس آیت میں بیت الحرام کی حیثیت بیان کی جا رہی ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے یہ لوگوں کے رجوع کی جگہ ہے، لوگ یہاں پر آئیں اور ہر قسم کی اذیت سے محفوظ رہیں۔ اس کو

جائے امن بنایا گیا ہے، یہ قانون بنا دیا گیا کہ کعبۃ اللہ ایسا مرکز ہے کہ جہاں کوئی کسی کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ وہاں پر جو جگہ مقام ابراہیمؑ سے معروف ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے دعا کے لیے قرار دیا۔ ''صلاۃ'' کا لغوی معنی دعا اور توجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو کہہ دیا کہ وہ اس گھر کو پاک کریں تاکہ جو یہاں ٹھہر کر عبادت کرنا چاہتے ہیں، اعتکاف کرنا چاہتے ہیں، غور و فکر میں رہنا چاہتے ہیں، توجہ سے بیٹھ کر اپنے رب سے مناجات کرنا چاہتے ہیں یا وہ جو کہ رکوع و سجود میں آکر مصروف ہوتے ہیں نماز پڑھتے ہیں یا طواف کرنے کے لیے آتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مقام ابراہیمؑ پر کھڑے ہو کر دعا مانگیں اور اسماعیل اور ابراہیم علیہما لسلام کو اس گھر کی پاکیزگی اور طہارت کا حکم دیا گیا تاکہ یہاں سے ہر قسم کی غلاظت اور نجاست کو ختم کر دیا جائے اسی وجہ سے بیت اللہ کو پاک رکھنا واجب ہے۔ اسی مناسبت سے ہے کہ جب مسجد نجس ہو جائے جب تک اس سے نجاست کو دُور نہ کیا جائے وہاں پر آپ عبادت نہیں کر سکتے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک جگہ میں نجاست پڑی ہے آپ دوسری جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ لو بلکہ تمہارے اوپر فرض ہے کہ اس نجاست کو دُور کرو پھر نماز پڑھو۔ مگر یہ کہ نماز قضا ہو رہی ہو تو پہلے نماز پڑھ لینی چاہیے اور پھر مسجد کو پاک کرنا چاہیے۔ اسی آیت سے یہ حکم بھی اخذ ہو رہا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

"اور جب ابراھیم نے کہا اے میرے رب اسے امن کا شہر بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے جو کوئی ان میں سے اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے، فرمایا اور جو کافر ہوگا سو اسے بھی تھوڑا سا فائدہ پہنچاؤں گا پھر اسے دوزخ کے عذاب میں دھکیل دُوں گا، اور وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

مکہ کے بارے ابراھیمؑ کی دعاء

ابراہیم علیہ السلام نے مکہ والوں کے لیے دعا کی ہے کہ وہ امن سے رہیں، ان کو روزی ملے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول کی حالانکہ مکہ میں کافر بھی تھے مومن بھی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا روزی کے حوالے سے کافر اور مومن دونوں کو شامل تھی لیکن اپنی دعا کو مقید کیا اس سے کہ جو ان میں سے ایمان لائے یعنی مومنین کافروں کی شراکت کے بغیر میوہ جات سے فائدہ اٹھائیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی جگہ کے حوالے سے یہ دعا مانگی جہاں نہ کوئی کھیت تھا نہ کوئی سبزہ تھا، خشک پہاڑ تھے اللہ تبارک و تعالیٰ نے دعا قبول کی۔

پھر اللہ نے اعلان فرمایا کہ جو ایمان نہیں لائیں گے اور کافر ہوں گے تو چند روزہ زندگی میں روزی سے فائدہ اٹھائیں گے لیکن پھر دوزخ کے عذاب میں ڈالے جائیں گے کیونکہ اُنھوں نے میرے احکام سے سرپیچی کی ہوگی، اس وجہ سے اپنے لیے خود ہی عذاب مہیا کیا۔ اور بہت جلد وہ عذاب بھگتیں گے اور آتش جہنم میں جائیں گے۔ یہاں پر اللہ نے کافروں کے بارے بھی کہہ دیا کہ یہ روزی ہے جو کافروں کو بھی ملے گی، دنیا کی چند روزہ زندگی میں، اس روزی سے وہ فائدہ اٹھائیں گے لیکن پورا پورا فائدہ مومن کو ہوگا کہ وہ اس دُنیا میں بھی فیض پائیں گے اور آخرت میں بھی انہیں امن اور سکون کی روزی نصیب ہو گی۔ جبکہ کافروں کے لیے دنیا کی آسائش تو ملے گی لیکن آخرت میں انکے لیے سخت ترین عذاب اور ہمیشہ کی بے سکونی ہو گی۔

سورہ النساء کی آیت ۷۷ میں ہے: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۗ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا

"اور آخرت پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے، اور ایک دھاگے کے برابر بھی تم سے بے انصافی نہیں کی جائے گی" جبکہ جنہوں نے آخرت کا انکار کیا تو ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

"اور جب ابراھیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، اے ہمارے رب ہم سے قبول کر، بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعاء

"قواعد" قاعدہ کی جمع ہے، یہ عمارت کی بنیاد کو کہا جاتا ہے۔ اگر قعود کے مادہ سے اخذ کیا جائے تو اس کے معنی زمین پر بیٹھنے کے ہوتے ہیں، زمین کے نیچے سے بنیاد اٹھتی ہے اور اوپر تک چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا گھر ویران ہو چکا تھا اس لیے کعبہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے حضرت آدم علیہ السلام نے پہلے اس کی بنیاد رکھی تھی وہیں سے ان بنیادوں کو اُوپر اٹھایا گیا ، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام دونوں مل کر یہ کام کر رہے تھے کعبۃ اللہ کی بنیادیں نیچے سے اوپر اٹھا رہے تھے پتھر رکھتے ہوئے دعا کرتے جاتے تھے.بڑے خضوع و خشوع سے تعمیر کعبہ میں مصروف تھے اور دعا کر رہے تھے کہ اے اللہ تو ہمارا عمل قبول کر لے توں دعا سننے والا ہے اور توں ہی ہماری نیتوں سے آگاہ ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

"اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنا دے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا، اور ہمیں ہمارے حج کے طریقے بتا دے اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہے"۔

دعائیہ کلمات

اسلام بندگی کے جتنے بھی مراتب ہیں ان کا پہلا مرتبہ ہے جو اس لفظ سے انسان کے ذہن میں آتا ہے۔ اسلام کے بہت سارے مراتب اور درجات ہیں؛ یہاں پر جب کہا کہ ہم دونوں کو مُسلم قرار دے یعنی تسلیم کرنے والا، یعنی عبودیت اور بندگی کا اعلیٰ مرتبہ اللہ سے مانگا ہے کہ ہم تیرے آگے تسلیم رہیں، تیرے احکام کے آگے تسلیم رہیں۔ اس دعا سے یہ اظہار کر رہے ہیں کہ تیری توفیق اور مدد کے بغیر ہم اس منزل پر نہیں آسکتے اور نہ ہی عبودیت کی حقیقت کو پا سکتے ہیں انسانی کمال کے درجہ کا حصول بہت ہی مشکل ہے۔ اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں اور مقام عبودیت ہر مومن کے دل کی آواز ہونی چاہیے کہ جس حالت میں ہے وہ اس حالت سے آگے بڑھے اور اس کے لیے اللہ سے مدد مانگے کہ اللہ اس کی مدد کرے تاکہ عبودیت کے مراحل میں آگے بڑھے اور ترقی کی منازل طے کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام جب اس طرح اللہ سے درخواست کر رہے ہیں تو عام آدمی کے لیے اور زیادہ ضروری ہے۔ اس آیت سے یہ نکتہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنی اولاد کے لیے والدین کو دعا مانگنی چاہیے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے دعاء مانگی۔ ہمیں ادب سکھایا گیا ہے کہ ہماری اولاد

سے ایک اُمت مسلمہ ہو یعنی ایک ایسی اُمت ہو جو تیرے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرے اور یہ اُمت مسلمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے۔ امت مسلمہ کا نام بھی پہلی بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا۔

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام مزید دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے مناسک دکھا، "مناسک" منسک کی جمع ہے، اس کا مطلب عبادت ہے گویا یہ سمجھایا جارہا ہے کہ طلبِ کمال کے لیے عبادت بجالانا ضروری ہے۔ تاکہ عقیدے کے کمال، ایمان کا کمال حاصل ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ توبہ رجوع ہے یعنی عبودیت کے دائرے سے نکلے ہوئے انسان کا دوبارہ منزلِ عبودیت و بندگی کی جانب پلٹ آنا، اپنے رب کی تسبیح کرنا یہی تو توبہ ہے جب دو معصوم انبیاء " تُبْ عَلَيْنَا" کہتے ہیں جن سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو جو عام لوگ ہیں ان کے لیے یہی پیغام ہے کہ سرتا پا جن سے غلطیاں ہوتی ہیں کہ وہ ہر وقت کہیں "اتوب الی اللہ" اللہ کی توبہ کرتے ہیں، اللہ کی جانب پلٹتے ہیں۔ اس میں دعا کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی دی جارہی ہے کہ اللہ سے کس طرح اور کیا کیا چیزیں مانگنی ہیں۔

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

"اے ہمارے رب! اور ان میں ایک رسول انہیں میں سے بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں کتاب اور دانائی سکھائے اور انہیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے"۔

اہل مکہ سے رسول بھیجنے کی دعاء

حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے امت مسلمہ کے ساتھ ساتھ خدا سے یہ دعا بھی مانگی کہ اس امت مسلمہ کے لیے ایک رسول کو مبعوث فرمااور اس رسول کے لیے تین باتیں کہیں؛

1۔ایک تیری آیات کی تلاوت کرے۔

2۔دوسری بات کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔

3۔ تیسری بات ان کا تزکیہ کرے۔

سورہ جمعہ میں یہی پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں رسول بھیجا کہ جو ان پر کتاب پڑھتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ تو یہ وہی دعا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھی اور یہ دعا چند صدیوں کے بعد محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت سے پوری ہوئی۔ آپؐ نے اپنے دادا کے بارے میں فرمایا کہ میرے دادا کی دعا سب سے پہلے میرے حق میں قبول ہوئی کہ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اُتاری، آپؐ مکے والوں میں سے تھے اور مکہ والوں کو یہ شرف ملا کہ آخری پیغمبر ان میں سے ہوں۔ حضور پاک ﷺ نسل ابراہیمؑ سے تھے اور آپؐ کی ذریت سے ایک مسلم اُمت آئی اور مسلم اُمت کے لیے آپ کی اولاد سے ہی آخری پیغمبر آئے اور انہوں نے کتاب کی تعلیم دی، حکمت کی تعلیم دی، حکمت یعنی ہر چیز جو اس کی لیاقت اور صلاحیت ہے اس کے مطابق اسکو قرار دینا اور دانائی کی تعلیم دی اور ان پر کتاب اور اللہ کی آیات اور معجزات بیان کئے، اللہ کی آیات کی تلاوت کی، ان کا تزکیہ کیا انہیں برے اخلاق سے بچایا، انہیں دانائی کے امور سمجھائے اور انہیں نجات کا راستہ بتایا۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور کون ہے جو ملت ابراھیمی سے رُو گردانی کرے سوائے اس کے جو خود ہی احمق ہو، اور ہم نے تو اسے دنیا میں بھی بزرگی دی تھی، اور بے شک وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں سے ہوگا''۔

ملتِ ابراہیمؑ سے رو گردانی

یہاں پر ملت ابراہیم کی اہمیت بتائی جا رہی ہے۔ ملت سے مراد یہاں دین اور ابراہیمیؑ آئین ہے۔ جس پر حضور پاک ﷺ کے تمام اجداد، ننھیال اور دھدیال پابند تھے۔ کیونکہ ان میں کوئی بھی مشرک نہیں تھا، جو بھی ابراہیمؑ کی ملت اور دین سے ہٹ جائیں اور اس کے آئین کو قبول نہ کرے تو وہ احمق ہے۔ احمق وہ ہوتا ہے جو اپنے نفع و نقصان کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے اور رب تعالیٰ مہربان ہے اپنے بندوں پر، عقل انسان کو سمجھاتی ہے کہ یہ تمہارے فائدے میں ہے یا نقصان میں ہے۔ لہٰذا روایت میں عقل کی تعریف کی گئی ہے، عقل یہ ہے کہ جس کے وسیلے سے رحمان کی عبادت کی جاتی ہے اور جنت حاصل کی جاتی ہے۔ یعنی جنت میں پہنچانے والی چیز کا نام عقل ہے چونکہ عقل راہنمائی کرتی ہے کہ جو تمہارا خالق ہے مالک ہے جو تمہارا رازق ہے، وہی تمہارا رب ہے تم اسی کی اطاعت کرو۔ عقل انسان کی راہنمائی کرتی ہے یہ امام باطنی ہے۔

پھر اللہ نے فرمایا دیکھو ہم نے ابراہیمؑ کو چن لیا، اسے ہر شئے سے خالص بنایا اور وہ ہمارا خالص بندہ ہے۔ ہم نے اسے ولایت کا مقام دیا، امامت کا مقام دیا اور عبودیت کا مرتبہ دیا کیونکہ وہ بندگی اور خلوص کی انتہاء پر تھا، وہ فقط اپنے رب کے سامنے تسلیم تھا اور اب جو ان

کے رستے سے ہٹے گا گویا وہ صراط مستقیم سے ہٹ گیا اور ابراہیمؑ آخرت میں بھی صالحین سے ہے۔ انسان نے دنیا میں جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ آخرت میں پائے گا۔ صالحین یا وہ گروہ کون ہے کہ جس میں ابراہیمؑ ہوں گے تو وہ گروہ آئمہ اہل البیت علیہم السلام کا ہے۔ روایات میں آیا ہے، پیغمبر اکرم ﷺ یعنی چہاردہ معصومین علیہم السلام پر لفظ صالحین بولا گیا ہے۔ اور صالحین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہوں گے۔ ویسے صالح نیک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن اصل تو جہاں سے نیکی پھوٹتی ہے اور جو چشمۂ نیکی ہیں وہ تو انبیاء ہوتے ہیں ان میں برتر اور اعلیٰ چہاردہ معصومین علیہم السلام ہیں، ہر ایک کی خواہش ہو گی کہ ان کے سائے تلے ہو۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ یہ آخرت میں صالحین کے ساتھ ہوں گے یعنی دُنیا میں بھی اللہ کے مصطفیٰ اور چنے ہوئے تھے اور ان کی عبادت کا خلوص اللہ کے ہاں تسلیم محض ہونا اور ہر امتحان میں سرخرو ہونا، یہ سارے سبب بنے کہ اللہ نے ان کو امامت کا عہدہ بھی دے دیا اللہ کے خلیل بھی بنے اللہ کے نبی اور رسول تو تھے ہی۔

پیغام: اس میں پیغام یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے لیے عبادت کو خالص کرنا چاہیے، اس میں کسی قسم کا ریا، دکھاوا نہیں ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو آئمہ معصومین علیہم السلام کے تابع بنائیں، ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم چہاردہ معصومین علیہم السلام کے پیروکار ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہمارے لیے انعام ہے، ہمیں چاہیے کہ ان کی پیروی کریں، فقط باتوں میں مسلمان نہ بنیں، عملی طور پر مسلمان ثابت ہوں۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

"جب اسے اس کے رب نے کہا فرمانبردار ہو جا تو کہا میں جہانوں کے پروردگار کا فرمانبردار ہوں"۔

ابراہیمؑ کیلئے تسلیم ہو جانے کا فرمان

حضرت ابراہیمؑ کا چناؤ اس وقت ہوا جب پروردگار نے اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ رب العالمین کے حضور عرض کی کہ میں اسلام لے آیا۔ تو یہ جملہ تفسیر ہے اس مطلب کی جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اس میں دو انداز سے بات ہوئی ہے۔ پہلے تو تکلم تھا یعنی ہم نے اسے چن لیا، پھر وہاں سے غیب کے صیغے کی طرف آگیا کہ اس کے رب نے جب اس سے کہا؛ یہاں پر غائب کا لفظ استعمال ہوا، اس بات کی وجہ یہ ہے کہ پروردگار نے اپنے خاص لطف کے تحت خلوت میں اور رازداری کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کی۔ اس کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ میں اسلام لے آیا عالمین کے رب کے لیے۔ جبکہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ اے میرے رب میں تیرے اوپر اسلام لے آیا، تیرا اسلام لے آیا بلکہ کہا عالمین کا رب۔ تو یہ اس وجہ سے کہ ابراہیمؑ نے بندگی کے آداب کا لحاظ رکھا اور خود کو ایک متواضع اور حقیر بندہ قرار دیا اور اپنے آپ کو آزادی کے مقام پر قرار نہیں دیا اپنے رب کے سامنے حاضری کا جو ادب ہے اس کا لحاظ رکھا اور یہ کہا کہ میں اس کے آگے تسلیم ہوں جس کے سامنے سارے عالَم تسلیم ہیں ''اسلمت لرب العالمین''۔ جو عالمین کا رب ہے اس کے سامنے تسلیم ہوں۔ اسلام کے چار مرتبے ہیں یعنی چار درجے ہیں۔

پہلا درجہ: اسلام کے اوامر اور نواہی کو زبان سے شہادتین کہنے کے وسیلہ سے قبول کرلینا، چاہے دل اس بات کا موافق ہو یا مخالف۔ جیسا کہ سورہ حجرات کی آیت: ۱۴ میں آیا ہے کہ جب اعراب نے آکر کہا کہ ہم ایمان لے آئے تو کہا گیا کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ تسلیم ہوئے ہو، اسلام لائے ہو۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اس کو ظاہری اسلام کہتے ہیں یعنی زبان سے اقرار اور شہادتین (دو گواہیاں) توحید ورسالت کی زبان پر ادائیگی۔ اور تمام اوامر اور نواہی کو زبان سے قبول کرنا۔اسلام کے تمام بنیادی عقائد کا اقرار کرنا۔

دوسرا درجہ: عقائد حقہ کو دل سے تسلیم کرنا اور ان کی پیروی میں نیک اعمال بجالانا۔بہت سے مواقع پر اگرچہ خطا کا ارتکاب کر لیتے ہیں، معصیت کر لیتے ہیں؛ ان کے بارے میں سورہ حجرات کی آیت ۱۵ میں آیا ہے: "یہ وہ مومنین ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں، وہ کسی شک وتردید میں نہیں ہیں اپنی جان اور اموال سے راہ خدا میں جہاد کیا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ میں اور اپنے اعلان میں سچے ہیں"۔

تیسرا درجہ: جب انسان کا نفس ایمان کے دوسرے مرتبے سے مانوس ہو چکا اور اس کے باطن میں ایمان مستقر اور ٹھہر چکا، جگہ بنا لی اور اس نے نفس کے اندر جو حیوانی قوتیں تھیں ان کو رام کر لیا تو پھر انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرتا ہے گویا کہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور یہ اس طرح کہ اگر انسان اللہ کو نہیں دیکھ سکتا تو اللہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ اسلام کا تیسرا درجہ ہے۔

چوتھا درجہ: انسان جب بندگی اور عبودیت کے مقام کی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے تو اس وقت جب اللہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب کے حضور تسلیم محض ہوتا چلا جاتا ہے ، جو اللہ نے چاہا وہ اس سے راضی اور خوشنود ہوتا ہے اور یہ اسلام میں کمال کا مرحلہ ہے۔ سورہ یونس کی آیت ٦٢ میں بتایا گیا ہے کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ جو خدا کے اولیاء ہیں نہ ان پر خوف ہے نہ وہ اندوہ گین ہوں گے وہ ایمان لائے ہیں، ہمیشہ تقویٰ کی حالت میں رہتے ہیں"۔

یہ بڑا مقام ہے اور یہ مقام انبیاء کا، ان کے اوصیاء کا اور اولیاء اللہ کا ہے۔ پہلے تین درجے مومنین کے مراتب ہیں۔ مسلمان پہلے درجے پر ہی رک جاتا ہے ، دوسرا عمل کے میدان میں آتا ہے اور اس سے آگے بڑھتا ہے۔ اس آخری مقام کے بھی درجے ہیں۔ بندگی اور

تسلیم محض کا بلند ترین مقام جس کو مقام محمود کہا گیاہے۔ یہ وہ مقام ہے جس پر حضور پاک ﷺ اور ان کے اوصیاء معصومین اور سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا فائز ہیں۔ ظاہر ہے اس مقام پر کوئی نبی بھی نہیں پہنچا ہوا۔

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾

"اور اسی بات کی ابراھیم اور یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو بے شک اللہ نے تمہارے لیے یہ دین چن لیا سو تم ہر گز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔"

ابراہیمؑ اور یعقوبؑ کی اپنے بیٹوں کو وصیت

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت یعقوب حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے ،انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ وہ اللہ کے دیئے گئے آئین پر چلیں اور بندگی اور عبودیت کو اپنائیں۔ دین سے مراد وہی نظام ، روش اور آئین ہے جس سے انسان کی سعادت وابستہ ہے، اور وہ دین ، دینِ اسلام ہے انہوں نے اپنی اولاد سے واضح طور پر کہہ دیا کہ تمہیں موت ایسی حالت میں آئے کہ جب تم مسلمان ہو، ہمیشہ اسلام پر قائم رہو اور اسلام کی پابندی کرو۔ ان کے لیے خیر چاہا اور اس وصیت کرنے میں اخلاص موجود ہے یعنی ان کی بہتری کی آرزو ہے، اس لیے انہیں تاکید سے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ تم مرنے کے وقت کسی اور آئین کی پابندی کرتے رہو۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ میں ہے: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے ہاں جو دین ہے جو نظام ہے وہ اسلام ہے اسی اسلام پر باقی رہنا"۔

اَمۡ کُنۡتُمۡ شُھَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِیۡہِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـہَکَ وَ اِلٰـہَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰھٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾

''کیا تم حاضر تھے جب یعقوب کو موت آئی تب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے کہا ہم آپ کے اور آپ کے باپ دادا ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔''

یعقوبؑ کا اپنی اولاد سے سوال

یہ آیت بیان کر رہی ہے کہ عبادت اسلام کی روش کی بنیاد پر ہو، اسلام کے احکام کو اپنے اوپر لاگو کیا جائے۔ دین ابراہیمیؑ اسلام ہے۔ اسحاقؑ اور ان کے بعد یعقوبؑ کو اسلام وراثت میں ملا، اسی طرح حضرت اسماعیلؑ اور ان کی اولاد میں بھی یہی اسلام ہی دین تھا۔ یہ بات بطور دلیل بنی اسرائیل اور اولاد اسماعیلؑ یعنی قریش کو کہی جارہی ہے کہ ان کے پاس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اسلام کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ ان کے آباؤاجداد کا دین اسلام ہی تھا۔ وہ اسحاق کی اولاد تھے جو کہ بنی اسرائیل تھے، اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا نام تھا۔ یا وہ اسماعیلؑ کی اولاد تھے جو کہ قریش مکہ تھے؛ سب کے بزرگوں کا دین اسلام تھا، اب جب اسلام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تو وہ کیوں انکار کر رہے ہیں۔

تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

''یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے لیے ان کے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں، اور تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے''۔

ہر ایک سے اسکے اعمال بارے سوال

حضرت یعقوبؑ کی اُمت مومن تھی لیکن ان کے بعد جو لوگ فسادی آئے انہوں نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور ہدایت سے گمراہی میں چلے گئے۔ تو گمراہ ہونا ہر شخص کا اپنا فعل ہے، ہر شخص اچھے عمل کرے یا برے عمل کرے اس کے اعمال کے مطابق اسے جزا یا سزا ملے گی۔ اب بنی اسرائیل سے سوال کیا جا رہا ہے کہ جو اعمال تمہارے آباؤ اجداد نے انجام دیئے، ان کے متعلق تم سے تو نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا اور نہ ہی ان کے اعمال تمہیں کوئی فائدہ دیں گے۔ ٹھیک ہے وہ تمہارے آباؤ اجداد تھے وہ تو مومنین تھے، تم اللہ کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ چکے ہو تمہارے اعمال تو وہی ہیں جو تم کر رہے ہو، تمہیں تمہارے اعمال کی روشنی میں سزا اور جزا ملنی ہے، اگر اللہ کے آئین کے مطابق عمل کیا یعقوبؑ جس طرح وصیت کر گئے تھے اس طرح چلے تو تمہیں فائدہ ہوگا، اگر اس طرح نہیں چلے تو نقصان تمہارے کھاتے میں آئے گا۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

''اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تاکہ ہدایت پاؤ، کہہ دو بلکہ ہم تو ملت ابراھیمی پر رہیں گے جو موحد تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا''۔

مشرکین کی خواہش

دین ابراہیمؑ ہی دین حق تھا اور ان کی اولاد میں سے آنے والے انبیاء جس دین پر تھے وہی دین حق تھا جس کی وصیت یعقوبؑ نے کی تھی۔ لیکن اس کے بعد کے جو لوگ آئے انہوں نے اختلاف کیا، انحراف میں چلے گئے، خواہشات نفسانی کی پیروی کی، کچھ یہودی ہو گئے کچھ نصرانی ہو گئے۔ ابراہیمیؑ دین تو ایک تھا لیکن وہ اپنی دشمنیوں کو دین کے کھاتے میں ڈالتے گئے۔ حالانکہ یہ دُنیاوی زندگی اور زمینی زندگی ہے جس میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے شعائر و اداب کو بدلتی رہتی ہے، جھوٹے دعوے کرتے رہتے ہیں، قومی، علاقائی، دینی، تعصب پیدا ہوتا رہتا ہے، یہ چیزیں دین سے نہیں ہیں، دین میں تو پیار ہے محبت ہے۔

لہٰذا دین تو ایک ہی ہے اس میں شرک نہیں ہے اور نہ ہی گمراہی ہے، نہ ہی باطل چیزیں ہیں۔ خود انہوں نے گھڑ لیا اور انحراف کیا آئین کو تبدیل کر دیا اور گمان کرتے ہیں کہ ہم جو بھی کریں۔ سورہ کہف کی آیت ۱۰۴ میں ہے: وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۝ "وہ خیال کرتے ہیں جو کچھ ہم کرتے ہیں تو نیک کام کرتے ہیں" حالانکہ ایسا نہیں ہے! اگر اپنی مرضی کے مطابق کریں گے اور اپنی خواہشات کی پیروی کریں گے تو وہ دین نہیں ہے۔ ابراہیمؑ کا دین فطری دین ہے،۔برحق دین ہے جس میں تمہارا رجحان نہیں ہے۔ یہ الٹا جو مسلمان ہو رہے تھے ان کو کہتے تھے تم یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ۔ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے مخالف تھے وہ ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے تھے دین تو ایک ہے۔ یہ تو دین سے منحرف ہوئے ہیں اور شرک کرتے ہیں، اللہ کے بیٹے بناتے ہیں یا تو عقیدے میں شرک یا زندگی کی روش میں اپنے گھڑے ہوئے قوانین پر چلنا یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ قومیت، وطن پرستی جیسے تعصّبات یہ سب شرک کے زمرے میں آجاتے ہیں اور یہ سب اسلام

کے مقابل میں پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کی مذمت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کا دین تو ایک ہی تھا اس میں کوئی شرک نہ تھا اور فطرت کے مطابق تھا، تم نصرانی اور یہودی سمجھ رہے ہو کہ ہدایت پر ہو؟ تم ہدایت پر اگر ہوتے تو پھر ایک ہوتے نا کہ دو ہوتے۔ مشرکین کی یہ خواہش تھی کہ دوسرے سب انکی مانند ہو جائیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم کسی ایک میں ان میں سے فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔''

سب نبیوں کی فرمانبرداری

یہاں پر مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ با قاعدہ اعلان کے ساتھ، برملا طریقے سے اللہ اور تمام انبیاء پر ایمان لاؤ۔ آیت میں چند برگزیدہ انبیاء کے نام بھی لیے گئے جیسے ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کیونکہ یہ تمام انبیاء حق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ درحقیقت بنی اسرائیل کے لیے ان کے انحرافی کلمات اور جو الٹی سیدھی باتیں وہ کرتے تھے ایک طرح سے

اتمام حجت تھی۔اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے بارہ قبائل ہیں جس طرح اولاد اسماعیلؑ میں قبائل تھے۔

یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ کے سارے پیغمبر اسی دین پر رہے ہیں جو ہمارا دین ہے، ایسے پیغمبر جن کے پاس کوئی کتاب نہیں آئی ان کو بھی مانتے ہیں۔ ہم تو انبیاء میں کوئی فرق نہیں کرتے، ہم تو اللہ کے حکم کے سامنے تسلیم ہیں۔ ہمارے نزدیک سارے انبیاء اس لحاظ سے برابر ہیں کہ وہ اللہ کے پیغام کو پہنچانے آئے تھے اور اس حوالے سے ان کی بات اللہ کی بات ہو گی درحقیقت یہودیوں سے کہا جارہا ہے کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو ان تمام انبیاء پر ایمان لاؤ ۔ جبکہ تم نے ایسی تفریق کی ہوئی ہے کہ کچھ کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو۔اپنی پسند کی بات کو لے لیتے ہو اور جس میں تمہاری خواہش کے خلاف ہو رہا ہو اسے نہیں مانتے۔ جبکہ اللہ کا نبی موسیٰؑ بھی اسی دین کی تبلیغ پر مامور تھے اور دیگر تمام انبیاء بھی اسی پیغام کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں۔ اس لیے کہ دین ایک ہے اور وہی دین ہمیں سکھاتا ہے کہ اللہ کے حضور تسلیم ہو جاؤ، اللہ کی وحدانیت کو قبول کرو، شرک نہیں کرنا اور ایمان کے تقاضے پورے کرنا ہیں اور اعمال صالح بجالانے ہیں۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

"پس اگر وہ بھی ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی ہدایت پا گئے، اور اگر وہ نہ مانیں تو وہی ضد میں پڑے ہوئے ہیں، سو تمہیں ان سے اللہ کافی ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

ہدایت یافتہ ہی کامیاب ہیں

یہاں پر مسلمانوں کو بطور مثال پیش کیا گیا اور کہا کہ جو کچھ تمہارے اوپر اُتارا گیا ہے اگر وہ بھی اسی کو مان لیتے ہیں اور حضور پاک ﷺ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی ہے اسے قبول کرتے ہیں تو پھر وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ لیکن اگر وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں، تعصب کرتے ہیں افتراق میں چلے جاتے ہیں حق کے منکر ہو جاتے ہیں، رد کر دیتے ہیں اور بنیاد جھگڑے پر رکھ دیتے ہیں، دشمنی پر رکھ دیتے ہیں تو پھر ان کی ضرورت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ بہت جلد تم ان سب پر غلبہ حاصل کر لوگے۔ پھر اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور یہ نعمت اُمت اسلامیہ کے لیے حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کے پیروکاروں کو ان پر غلبہ عطا کیا جو دین اسلام سے باہر تھے اور افتراق و انتشار میں پڑے ہوئے تھے وہ سب شکست کھا گئے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

”اللہ کا رنگ، اللہ کے رنگ سے اور کس کا رنگ بہتر ہے، اور ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں“۔

اللہ کا رنگ ہی بہترین رنگ ہے

ایمان الٰہی رنگ ہے اور یہ کتنا بہترین رنگ ہے۔ یگانہ پرستی، توحید اور اس کے احکامات پر تسلیم ہونا انسان کی اصل خوبصورتی ہے۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ جبکہ یہودیت اور نصرانیت تو گروہ گروہ ہیں، فرقے ہیں، انتشار ہے، شرک ہے اور خود شرک کے دعویدار ہیں۔ یہ بد رنگی ہے، فطرت کے خلاف ہے۔ جبکہ ہم تو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اسی کے آگے جھکتے ہیں، خالص عبادت اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں، کسی کو اللہ کا شریک نہیں

بناتے۔ یہاں پر گویا یہودیوں کی سرزنش کی گئی ہے، تمہاری حالت یہ ہے کہ تم مشرک ہو۔ تمہاری حالت شرمناک اور قابل مذمت ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

''کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کی نسبت جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا رب ہے، اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل، اور ہم تو خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں''۔

سب کا رب اللہ ہے

اس آیت میں یہودیوں کے انکار اور کفر کا تذکرہ ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو قرآن کا انکار کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اللہ اپنے نبی سے فرما رہا ہے ان سے کہو کس بارے میں جھگڑا کر رہے ہو؟ اللہ کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو؟ ہمارا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی اللہ ہے۔ کیا اللہ کی ربوبیت میں تمہیں شک ہے؟ جب خدا الگ الگ نہیں ہے تو پھر یہ روشیں اور اعمال مختلف کیوں ہیں؟ کسی کی اللہ سے کوئی قرابت داری نہیں ہے، وہاں جو مقام ملنا ہے وہ تقویٰ سے ملنا ہے، عمل سے ملنا ہے۔ کوئی بھی کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں ہے، ہم تو اللہ کے لیے خالص عمل کر رہے ہیں تم جس کشمکش کی کیفیت میں ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تم اپنے اعمال کی سزا بھگتو گے، ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونگے پھر جھگڑا کس بات کا ہے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

''یا تم کہتے ہو کہ ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، کہہ دو کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو گواہی چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے، اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو تم کرتے ہو''۔

تمام انبیاءؑ کا ایک دین پر ہونا

اہل کتاب کہتے تھے تم یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ۔ تو ان کو کہا جا رہا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ حضرت اسماعیل، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام یہودی تھے یا نصرانی تھے؟ تم ان کو مسلمان نہیں سمجھتے؟ وہ تو یہودی یا نصرانی نہیں تھے وہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین اسلام پر تھے۔ تم اگر ایسا دعویٰ کرتے ہو تو تمہیں زیادہ پتہ ہے یا اللہ کو پتہ ہے۔ اللہ ان کے بارے بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم دین مبین پر تھے، اس میں کوئی شک نہیں تھا، ابراہیم مسلم تھے یہاں پر اللہ تعالیٰ یہودیوں اور نصرانیوں کے برے اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، اس سے بڑا ظالم اور کون ہو گا جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی گواہی کو چھپاتے ہیں۔ کیونکہ یہودیت اور نصرانیت ابراہیمؑ کے بعد آئی، اس سے پہلے تو کوئی ایسی بات نہ تھی اسی لیے یہودی اور نصرانی ان سے پہلے جو دین ابراہیم تھا اس کو چھپاتے ہیں۔ آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ گواہی چھپانا ظلم ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جو دین اور آئین ان سے پہلے دیا تھا یہ اس پر پردہ ڈالتے ہیں، اس دین مبین کی تعلیمات کو چھپانے کی کوشش

کرتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور پھر دین ابراہیم پر افتراء باندھتے ہیں۔ ابراہیم کا دین تو دین حنیف تھا اس میں کوئی شرک نہیں تھا اور وہ مسلمان تھے۔ اللہ کے احکام کے سامنے تسلیم تھے۔

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾

”وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے لیے ان کے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل ہیں، اور تم سے ان کے اعمال کی نسبت نہیں پوچھا جائے گا“۔

بے مقصد گفتگو کا کوئی نتیجہ نہیں

اس تفصیل اور جنجال میں پڑنا کہ فلاں شخص کس گروہ سے تھا اور کس دین پر تھا؛ اس کا کیا فائدہ ہے؟ ایسے مسائل کے بارے میں گفتگو کرو جو تمہیں کل فائدے دے۔ تمہارا عمل زیادہ اہم ہے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمہاری یہ بحث کہ ابراہیمؑ کس دین پر تھے اس کا تمہیں کیا فائدہ؟ وہ یہودی تھے یا یہودی نہیں تھے یہودیوں اور نصرانی سے کہا جارہا ہے کہ اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تم انبیاء کی زندگی کا مطالعہ کرو اگر صحیح جاننا چاہتے ہو اور اس طریقے پر آؤ جو طریقہ تمہیں نقصان سے بچائے۔ قرآن تمہیں اس بات کی دعوت دے رہا ہے بے شک تحقیق کرلو، جائزہ لے لو، اُمتوں کو دیکھ لو، انبیاء شرک کی دعوت دینے نہیں آئے تھے وہ اللہ واحد کی دعوت دینے آئے تھے اور اللہ کا دیا ہوا آئین پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی انہوں نے اس آئین پر چلنے کی تبلیغ کی تھی۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے۔ تمہاری یہ گفتگو بے مقصد اور بے نتیجہ ہے۔ ایسی بحث کا کچھ حاصل نہیں۔

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾

”بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے، کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے“۔

قبلہ کی تبدیلی کا مسئلہ

اس آیت میں ” السُّفَهَآءُ “ سے یہود اور مشرکین عرب مراد ہیں۔ ”سفاہت“ کے معنی حماقت، بے وقوفی، بے عقلی، یعنی کسی رائے میں پائیدار نہ رہنا۔ عقلی طور پر کمزوری کو سفاہت کہتے ہیں۔ مسلمان جب مکہ میں تھے تو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز ادا کرتے تھے، ہجرت کے بعد بھی چند ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ بیت المقدس ہی مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے اعلان نبوت سے قبل یہودی بیت المقدس کو اپنا قبلہ مانتے تھے۔ جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو یہودیوں نے تعجب اور حیرانگی کے عالم میں یہ اعتراض کیا، کون سی چیز سبب بنی ہے کہ مسلمانوں نے اس قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کرلیا ہے۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس حوالے سے فرمایا کہ سمت میں کوئی شرافت نہیں ہے۔ جو چیز شرافت اور کرامت کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے کہ اللہ کا انتخاب کیا ہے۔ کچھ عرصہ کے لیے اللہ نے ایک طرف کو قبلہ قرار دیا اور اپنے بندوں سے کہا اس سمت میں رخ کرکے میری عبادت بجالاؤ اور اس کے بعد کسی اور جگہ کے لیے کہہ دیا کہ اس طرف رخ کرلو، تو یہ صحیح ہے۔ یہ تو اللہ کا فیصلہ ہے، کسی اور کا فیصلہ نہیں ہے۔

تحویل قبلہ کا مسئلہ اسلام کے معارف اور حقائق کی نشر و اشاعت کے لیے بہت ہی بنیادی اور انقلابی عمل تھا جس نے یہودیوں اور نصرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو استقلالی حیثیت عطا کی۔ یہ دیکھ کر یہودیوں اور نصرانیوں کو تکلیف ہوئی اور وہ چپ نہیں بیٹھے انہوں نے اعتراض کر ڈالا۔ ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا کہ کسی سمت کا قبلہ ہونے میں کوئی شرف نہیں ہے، شرف تب بنتا ہے کہ جب اللہ کا فیصلہ ہو، اللہ کا فیصلہ جب تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے عبادت کرنے کا تھا تو اسی میں کرامت تھی لیکن جب اللہ نے تحویل قبلہ کا حکم دے دیا تو پھر رخ پھیرنے میں شرف ہے، شرف اور کرامت حکم الٰہی کی اتباع اور خدا کے فیصلے کو قبول کرنے میں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں برگزیدہ امت بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو، اور ہم نے وہ قبلہ نہیں بنایا تھا جس پر آپ پہلے تھے مگر اس لیے کہ ہم معلوم (الگ) کریں اس کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے اس سے جو الٹے پاؤں پھر جاتا ہے، اور بے شک یہ بات بھاری ہے سوائے ان کے جنہیں اللہ نے ہدایت

دی، اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے"۔

بندوں کا الٰہی امتحان

یہاں پر اُمت محمدی ﷺ کی کرامت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس امت کو ہم نے توازن اور حد وسط میں قرار دیا ہے۔ یہی توازن ہی صراط مستقیم ہے پس دائیں بائیں نہیں جانا، افراط و تفریط میں نہیں پڑنا نہ حد سے آگے بڑھنا ہے اور نہ اس طے شدہ حد سے پیچھے ہٹنا ہے۔ کیونکہ مشرکین اور بت پرست قیامت پر عقیدہ نہیں رکھتے، ان کا خدا پر بھی ایمان نہیں تھا، ان کا سارا ہم و غم زر و زیور اور دنیاوی زندگی تھی مادیت میں پوری طرح غرق تھے، معنوی اور روحانی فضائل پر ان کی توجہ نہیں تھی جبکہ نصرانیوں کا رہبانیت کی طرف میلان و رجحان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کمالات انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کے لیے قرار دیئے ہیں انہوں نے سب کو چھوڑ دیا۔ کامیاب زندگی کے لیے مادی اور روحانی دونوں پہلو درکار ہیں انہوں نے فقط روحانیت کی طرف میلان رکھا اور مادی اسباب کو علیحدہ رکھ دیا۔ اس طرح انہوں نے بھی غلط کام کیا کیونکہ اللہ نے دُنیا کو آخرت کا کھیت بنایا ہے اور اسے آخرت کو پانے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔

یہودی مشرکین کی مانند دنیا میں غرق ہوئے، نصرانیوں نے دنیا چھوڑ کر الگ تھلگ رہنے میں شرف سمجھا، سوسائٹی سے جدا ہو کر روحانیت حاصل کرنا چاہی اور مادی زندگی سے بالکل ہی بیزاری اختیار کی، لیکن اُمت اسلامی کو ان دونوں کمالات کی طرف ہدایت ملی مادی اور معنوی دونوں طرح کی سعادتوں کو جمع کیا گیا، صرف جہات میں حد اعتدال کو برقرار رکھنا ہے لہٰذا یہ اُمت متواضع اور میانہ رو اُمت ہے، یہ اُمت ساری اُمتوں پر گواہ ہے اور کامل ترین فرد نبی اسلام ﷺ سب پر گواہ ہیں۔ البتہ یہ بات اس وقت درست لگے گی جب ہم اُمت کو میزان قرار دیں نہ کہ گواہ۔ دُنیا میں لوگوں کے اعمال کے حقائق پر گواہی دینا جیسے جھکاؤ،

اطاعت یا سرپیچی، رد یا قبول، صلاح یا فساد۔ تو یہ گواہی قیامت کے دن تمام گواہوں کی طرف سے ہوگی، انسان کے بدن کے اعضاء بھی گواہی دیں گے اور جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام کریں گے اور کہیں گے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ﴿۳۰﴾ (سورہ الفرقان، آیت: ۳۰)

ترجمہ: ”اے میرے رب بے شک میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا۔“

گواہی دینے کی جو کرامت ہے یہ اولیاء کے ساتھ خاص ہے، اس اُمت کے جو طاہر اور مطہر ہیں یہ کرامت اُن کے لیے ہے،[1] نہ کہ جو اس اُمت میں گناہگار ہیں یا فاسق ہیں۔ اگرچہ پوری اُمت اسلام کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ وہ گواہی دے گی لیکن یہ فضیلت اس امت کے برگزیدہ ہستیوں کے لیے ہی مخصوص ہے، سب کے لیے نہیں ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کی فضیلت عالمین پر تھی تو وہ سب کے لیے تو نہیں تھی۔ اگرچہ معنی صحیح لگتا ہے لیکن بہتر ہے کہ ہم کہیں اُمت کے وسط ہونے کا مطلب لوگوں اور رسول کے درمیان نہ کہ افراط و تفریط کے درمیان۔ اُمت اسلامیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہے۔ پیغمبر

---

[1]۔ اکثر شیعہ تفاسیر میں یہ بات آئی ہے کہ اُمت وسط سے مراد آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں جو کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہیں اور آیت میں انہی کو خطاب کیا گیا ہے انہی کے بارے بیان کیا گیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک جو ہے اپنے اپنے زمانے میں لوگوں کے اعمال پر گواہ ہے اور لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ دو دفعہ ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئمہ اور اپنے اوصیاء کے اعمال پر گواہ ہیں۔ اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ نماز کی حالت میں جب تحویل کعبہ کا حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اس پر عمل کیا اور مکہ کیونکہ آپ کی پشت پر تھا آپ نے فوراً خود کو مکہ کی طرف موڑ لیا۔ نمازی آپ کی طرف منہ کرکے کھڑے رہے مگر حضرت علی علیہ السلام نے آپ کی پیروی کی اور اپنا رخ مکہ کی جانب موڑ لیا، کیونکہ آپ ایسی فرد تھے جو ایمان کے کمال پر فائز تھے۔

اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے دلوں میں علم اور حکمت کا علم ودیعت کیا ہے اور وہی ہے جس نے پوری امت کی تزکیہ کی خاطر قدم اٹھایا ہے۔

"اور ہم نے اس قبلہ پر جس پر تم تھے اس سے نہیں ہٹایا مگر اس لیے کہ دیکھیں رسول کی پیروی کون کرتا ہے اور کون ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے"۔

یہاں متوجہ کیا ہے کہ جب نماز کی حالت میں بیت المقدس سے رخ پھیرنے کا حکم آگیا تو دیکھنا یہ ہے کہ کون اس حکم پر عمل کرتا ہے۔ خدا اپنے پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ تم جس طرف رخ موڑو گے تمہارے ساتھ اسی طرف مڑنا ان کے ایمان کے کامل ہونے کی نشانی ہے گی، وہ تمہاری اطاعت میں ہیں۔ قبلہ کی تبدیلی ایک نامانوس امر تھا، مشکل بھی تھا۔ اس کو آسانی سے قبول بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ان کے لیے مشکل نہیں تھا جو خدا کی طرف سے ہدایت شدہ ہیں اور امر الٰہی سے متمسک ہیں، وہ اللہ کے احکام کے سامنے اپنے لیے کوئی مشکل نہیں پاتے۔ یہودیوں نے کہا کہ اگر تمہارا پہلا قبلہ باطل ہے تو آج تک جو بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھتے رہے ہو وہ بھی تو باطل ہو جائیں گی لیکن اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو کعبۃ کی طرف رخ کرنا صحیح نہیں ہے، ابھی یا بعد میں جو نماز پڑھو گے وہ باطل ہو جائے گی۔

اس بات کا جواب دیا گیا کہ یہ اس صورت میں ہوتا کہ محمد ﷺ نے اپنی طرف سے یہ بات کی ہو اور وحی آپؐ کے پاس نہ آئی ہو۔ لیکن وحی آئی ہو اور وحی کے تحت ایسا کیا ہے پھر تو یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہونا ہی اسلام ہے۔ یہودیوں کی روش یہ تھی کہ وہ اللہ کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرتے تھے اور اگر اللہ کا ایک حکم نسخ ہوتا تو اس کے لیے جنجال بپا کر دیتے، شور مچاتے، اعتراض شروع کر دیتے ان کے جواب میں خدا مسلمانوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے کہ تمہارے سارے اعمال صحیح ہیں، خدا تمہارے اوپر مہربان ہے اور مہربانی ان کے لیے ہے جو پریشان ہوتے ہیں بے چارے ہیں اور محبت عام ہے جو تمام موارد کو شامل ہے پریشانی کے موارد اور دوسرے موارد میں بھی اللہ کی محبت شامل ہے۔

قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ لَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۴﴾

"بے شک ہم آپ کے منہ کا آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، سو ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پس اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے، اور جہاں کہیں تم ہوا کرو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف پھیر لیا کرو، اور بے شک وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے، اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

حالت نماز میں مسجد الحرام کی جانب رخ کرنے کا حکم

یہودی ہر وقت طعنے دیتے تھے کہ تم ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتے ہو۔ پیغمبر اکرم ﷺ ان کے ان طعنوں سے غمگین تھے اور ہمیشہ آسمان کی طرف دیکھتے تھے کہ کب وحی آئے گی اور تبدیلی قبلہ کا حکم آئے گا۔ تاکہ تحویل قبلہ کے حکم سے آپ ﷺ کا دل خوش ہو جائے البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے احکام سے ناخوش ہیں۔ اس انتظار کی وجہ یہ تھی کہ یہودی مسلمانوں کو اذیت دیتے تھے ان کی سرزنش کرتے تھے، ان کو طعنے دیتے تھے کہ تم ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے ہو۔ اس لحاظ سے پیغمبر اکرم ﷺ قبلہ کی تبدیلی کے منتظر تھے تاکہ ان کا اپنا قبلہ ہو۔

پس اللہ کی جانب سے حکم ہوا کہ تم مسجد الحرام طرف اپنا رُخ موڑ دو، کعبہ کی طرف رُخ کرلو جہاں بھی تم ہو، یہ عبارت قبلہ کی تبدیلی کی تائید کرتی ہے کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نماز کی حالت میں تھے مسجد میں تھے اور سارے مسلمان آپ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے، جیسے ہی یہ حکم نازل ہوا آپؐ نے اپنا رخ کعبۃ اللہ کی جانب موڑ دیا اور آپ کی اقتداء میں کھڑے نمازی حیرت زدہ رہ گئے۔ مولا علی علیہ السلام نے اسی طرح رخ موڑ لیا تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ اللہ چھپی ہوئی حقیقتوں سے بھی آگاہ ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو بتا رہا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی، اللہ کے حکم سے ہوئی ہے اور اللہ ہی ہے جو اس کا اختیار رکھتا ہے، انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی زبانیں بند نہیں ہوں گی، وہ اپنے اعتراض جاری رکھیں گے۔ لیکن اللہ ان کی سازشوں سے آگاہ ہے، وہ جو مکاریاں کر رہے ہیں ان سے بھی واقف ہے اور ان کا توڑ بھی اللہ نے ہی کرنا ہے۔

وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور اگر آپ ان کے سامنے تمام دلیلیں لے آئیں جنہیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کو نہیں مانیں گے، اور نہ آپ ہی ان کے قبلہ کو ماننے والے ہیں، اور نہ ان میں کوئی دوسرے قبلہ کو ماننے والا ہے، اور اگر آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کریں گے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ چکا تو بے شک آپ بھی تب ظالموں میں سے ہوں گے۔"

بنی اسرائیل کی ضد وہٹ دھرمی

یہاں پر قرآن یہودیوں کی طبیعت اور مزاج کو بیان کر رہا ہے کہ وہ نادان یا جاہل نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جہالت کی وجہ سے وہ آپ کی پیروی نہیں کرتے؛ بلکہ وہ حق کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن عناد، نفسانی خواہشات اور دُنیاوی مفادات ہیں؛ اسی لیے وہ حق کی پیروی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتے ہوئے کہ قبلہ کا تعین اللہ کے اختیار میں ہے اپنے لیے علیحدہ قبلہ قرار دیتا ہے، یہودی بیت المقدس میں صخرہ کی طرف رخ کرتے ہیں اور نصاریٰ مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں۔

پھر رسول اکرم ﷺ کو خبردار کرکے در اصل اُمت کو سمجھایا گیا ہے، لوگ ہی آیت کے مخاطب ہیں لیکن براہ راست خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہو رہا ہے کہ جب سارے واضح دلائل موجود ہیں اور پیغمبر ﷺ کی حقانیت بھی ثابت ہو رہی ہے، اس کے باوجود اگر کوئی نفسانی خواہشات کے تحت اہل کتاب کی پیروی کرے گا، ان کے راستے کو اپنائے گا اور حق کے راستے کو چھوڑے گا تو خواہشات نفسانی کی پیروی اور حق چھوڑنے کی وجہ سے اس کا شمار ظالموں میں ہو گا۔ قرآن سمجھا رہا ہے کہ جب حقائق سامنے آجائیں تو ان حقائق کی روشنی میں اپنے لیے راستے کا تعین کرنا چاہیے، خواہشات نفسانی کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ جو خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں تو وہ بھٹکے ہوئے اور گمراہ ہیں، ان کے لیے آخرت میں عذاب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ؕ وَ اِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡہُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

"وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی تھی وہ اسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور بے شک کچھ لوگ ان میں سے حق کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں"۔

جانتے پہچانتے ہوئے حق کو چھپانا

اس آیت میں بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کیا جارہا ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے آخری پیغمبر ہونے کے بارے جانتے ہیں۔ یہ بات ان کے لیے اس قدر واضح اور عیاں ہے جیسے یہ اپنی اولاد کو جانتے ہیں۔ان کو پتہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت حق پر مبنی ہے اور آپ کی رسالت کی حقانیت کے معاملے سے واقف ہیں یہ ان کے لیے بڑے واضح امور میں سے تھا جس میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی، ان کے آنے سے پہلے سب ایک دوسرے کو بتاتے تھے اور بشارتیں دیتے تھے لیکن یہ ساری معرفت رکھنے کے باوجود جب حضور پاک ﷺ قرآن جیسے معجزہ سمیت تشریف لے آئے اور انہیں ہدایت کی طرف بلایا تو پھر انہوں نے منہ موڑ لیا،خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے لگے۔جانتے سمجھتے ہوئے حق سے انکار کیا اور حق پر پردہ ڈالا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"آپ کے رب کی طرف سے حق وہی ہے، پس شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں"۔

حق بارے شک وشبہ صحیح نہیں

یہ بات بھی پچھلی بات کی تاکید میں ہے،اس میں تشکیک اور شک و شبہ سے منع کیا گیا ہے۔ظاہر میں خطاب حضور پاک ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں یہ خطاب اُمت مسلمہ کو

ہے کہ اُمت مسلمہ کو اس بارے میں کسی قسم کا شک نہیں کرنا چاہیے اور بنی اسرائیل کی جھوٹی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور حقائق سے منحرف کرنااور شک میں ڈالنا ان کا کام ہے۔ ان کی طرف توجہ نہ کریں اور نہ ہی شک کرنے والوں میں سے بنیں۔ حق واضح ہے، حق بارے شک ڈالنا اوراس کے متعلق شبہات ایجاد کرنا صحیح نہیں ہے۔

وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر ایک کے لیے ایک طرف ہے جس طرف وہ منہ کرتا ہے، پس تم نیکیوں کی طرف دوڑو، تم جہاں کہیں بھی ہوگے تم سب کو اللہ سمیٹ کر لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اللہ کی ذات ہی ہر کام کا محور

اس آیت میں ''وِّجْهَةٌ'' سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی طرف انسان رُخ کرتا ہے، توجہ دیتا ہے۔ جیسے عبادت میں قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے، ہر جمعیت اپنے مفادات کی تحت اپنے لیے ایک مرکز قرار دیتی ہے،اس کو معتبر جانتے ہیں اور اسی کی جانب رُخ کرتے ہیں۔ اپنے معاملات اسی کی طرف لے جاتے ہیں۔ لیکن جو اللہ کی طرف سے حکم ہے یہ ایک تکوینی حکم ہے جس نے تبدیل نہیں ہونا۔ پس اس بارے میں وسوسے کرنا، جنجال اٹھانا اور فتنے کھڑے کرنا جیساکہ اہل کتاب نے ہر زمانے میں کیااور مسلمان اسلام لانے سے پہلے یہ کرتے رہے، اب مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مسلمان اس مسئلے میں اللہ کے حکم کے تحت اسی پر قائم رہیں اور اہل کتاب کی جو سازشیں ہیں ان سے چوکنے رہیں۔ بڑی تیزی سے اچھے

کاموں کی طرف آگے بڑھیں بلکہ ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کریں۔ تم جہاں کہیں بھی ہوگے، خدا قیامت کے دن سب کو ایک ہی جگہ اکٹھا کرے گا اور وہ ایسا دن ہے کہ جس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے، اس دن نے ضرور آنا ہے، وہاں پر ہر ایک کو لایا جائے گا اور ہر ایک سے حساب ہو گا، جو اس نے کیا ہے وہی اس کے سامنے ہو گا۔

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

"اور جہاں سے آپ نکلیں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کیا کریں، اور آپ کے رب کی طرف سے یہی حق بھی ہے، اور اللہ تمہارے کام سے غافل نہیں"۔

رسول اللہؐ کا پسندیدہ قبلہ

سابقہ آیت کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ تم جس قبلہ کو پسند کرتے تھے اب اسی قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مسجد الحرام کی جانب جہاں کعبۃ اللہ موجود ہے اس کی طرف اپنا رخ پھیر دو اور یہ وہی چیز ہے جو تمہاری پسند تھی۔ جو تمہارے دل کی خواہش تھی کہ تمہارا اپنا مستقل قبلہ ہونا چاہیے۔ اور پھر ساتھ یہ بتا دیا کہ جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے، اللہ اس سے واقف ہے۔ جو اللہ کا فرمان ہے وہ حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے، حق تیرے رب کی جانب سے ہی ہے کسی اور کی طرف سے نہیں آسکتا۔

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ شَطۡرَہٗ ۙ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡکُمۡ حُجَّۃٌ ٭ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ ٭ فَلَا تَخۡشَوۡہُمۡ وَ اخۡشَوۡنِیۡ ٭ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ۙ

”اور آپ جہاں کہیں سے نکلیں تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کیا کریں، اور تم بھی جہاں کہیں ہو تو اپنا منہ اس کی طرف کیا کرو تاکہ لوگوں کو تم پر کوئی الزام نہ رہے، مگر ان میں سے جو ہٹ دھرم ہیں تم بھی ان سے نہ ڈرو اور ہم سے ڈرتے رہا کرو، اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ“۔

مسجد الحرام کی جانب رُخ کرنے کا حتمی حکم

اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ ہر شہر چاہے وہ مکہ ہو یا کوئی اور شہر؛ یہ حکم ثابت اور حتمی ہے کہ عبادت کے دوران تم اپنا رخ کعبۃ کی جانب کرو۔ یہی بات پہلے جملے میں بھی آئی ہے اور اس کی تاکید اس لیے ہے کہ اس حکم اور قانون کے ثبوت پر مزید زور دیا جا رہا ہے، تاکید کی جا رہی ہے، اس کی ہمیشگی کے حوالے سے کہ ہر حال میں کعبہ کی جانب رخ کرنا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے اور اسے اسی طرح بجالانا ہے۔

اگلے جملے ”تاکہ لوگوں کی جانب سے تمہارے اوپر حجت نہ ہو مگر وہ جو کہ ان میں سے ظالم ہیں تم ان سے مت ڈرو“ میں تین باتوں کو بیان کیا گیا ہے یعنی قبلہ کا جو حکم ہے اس میں تین باتیں ہیں:۔

پہلی بات: یہودیوں نے اپنی کتابوں میں پڑھا تھا کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کا قبلہ کعبہ ہے، بیت المقدس نہیں ہے۔ اگر قبلہ تبدیل نہ ہوتا تو پھر وہ مسلمانوں سے کہتے کہ یہ پیغمبر

صحیح نہیں ہے، تمہارا دین اور تمہارا پیغمبر وہ نہیں ہے جس کے بارے توریت میں ہمیں بتایا گیا ہے۔

دوسری بات؛ اس مطلب کو جاننے کے باوجود جو ظالم ہیں وہ ہوس پرستی اور خواہشات کے تابع ہیں وہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کہ جو کچھ ان کی کتاب میں لکھا تھا کہ آخری پیغمبر ﷺ کا قبلہ کعبہ ہو گا، پھر بھی اس کا اقرار نہیں کریں گے اور حق سے منحرف ہی رہیں گے، پس ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھ سے ڈرو کہ ان کو تمہارے اوپر کوئی قدرت یا غلبہ نہیں ہے۔

تیسری بات: مسلمانوں کو بتایا گیا کہ تمہارا دین کامل ہے، اللہ نے تمہارے لیے نعمت پوری کر دی ہے، اس کا فائدہ اس لیے ہے کہ تم اللہ کی اطاعت میں آگئے ہو اس لیے اللہ کی نعمت تمہیں عطا ہوئی ہے تم ہدایت پر ہو۔

آیت کا آخری حصہ کہ اللہ کی نعمت تمہارے اوپر پوری ہو جائے گی، فتح مکہ میں یہ نعمت پوری ہوئی، ان کے بتوں کا ظاہری طور پر خاتمہ ہوا اور مسلمان فتح یاب ہوئے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

"جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

اہل مکہ پر اللہ کا انعام

یہاں پر ایک اور انعام کا تذکرہ کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں اٹھارہے تھے تو انہوں نے خدا سے ایسے رسول کی آمد کی دعا مانگی تھی جو آیات الٰہیہ کی تلاوت کرے، مکہ والوں کے نفوس کو اخلاقی رذائل جیسے تکبر، حسد، کنجوسی، زنا، خونریزی اور دیگر ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرے، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ حضور پاک ﷺ کی رسالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت سے عبارت ہے۔ آپ ﷺ نے مکہ اور خاص طور پر خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست اور پلیدی سے پاک کیا۔ ان کے بدلے اصلی معارف اور دین کی تعلیم دی۔ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت ہے۔ اس میں ذکر تھا تزکیہ کا، تعلیم کا، حکمت کا، کتاب کا۔ اسی کا یہاں ایک اور ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ کا مکہ والوں پر انعام ہے۔

فَاذْكُرُونِيٓ أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾

”پس مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو“۔

اللہ کا ذکر اور شکر کرنا

خداوند تبارک و تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ اور مسلمانوں پر احسان کیا کہ انہیں اپنی جانب سے ہدایت دی اور انہیں کمال کے بلند ترین مراحل تک پہنچایا۔ اسلام نعمت ہے اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جائے دوسروں کو یاد الٰہی کی طرف دعوت دیں، اگلا جملہ ” وَلَا تَكْفُرُونِ“ اس شکر کی تاکید ہے کہ کفران نہ کریں! پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ خداوند اس کا ہمنشین ہے، اسے یاد کرتا ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کو یاد رکھے“۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: اے فرزند آدم مجھے اپنے دل

سے یاد رکھو میں بھی اپنے پاس تمہیں یاد رکھوں گا، مجھے خلوت میں یاد کرو، میں بھی تمہیں خلوت میں یاد کروں گا۔ مجھے لوگوں کی موجودگی میں یاد کرو، میں بھی لوگوں کی جماعت اور ان کی موجودگی میں تمہیں یاد کروں گا"۔ پھر فرمایا: "جب میں یہ جان لوں کہ میرا بندہ میرے ذکر میں مصروف ہے اور بندہ نے اپنی شہوات کو روکا ہے اور میری مناجات میں غرق ہے، اگر بندہ بھول چوک یا نسیان کا شکار ہو تو میں درمیان میں آجاتا ہوں تاکہ وہ بھولے نہیں۔" پھر فرمایا: "مجھے یاد کرو! تاکہ میں بھی تمہیں اپنی نعمت دے کر یاد کروں، میری اطاعت کرو تاکہ میں نعمتوں کے وسیلہ سے احسان، کشائش اور رضوان کے ذریعے تمہیں یاد کروں"۔ جو اللہ کا ذکر کرنے والے ہیں ان کو اللہ کی طرف سے یہ انعام ملتا ہے کہ اللہ ان کا ذاکر بن جاتا ہے۔ اللہ کے ذاکر بننے کا معنی یہ ہے کہ وہ ان بندوں کو نعمتیں عطا کرتا ہے، آسائش دیتا ہے مہربانی کرتا ہے، ان پر اپنا فضل و کرم کرتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

"اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

نماز اور صبر سے مدد لینا

صبر کی قرآن میں بلند ترین اور اعلیٰ صفات کے عنوان سے تعریف کی گئی ہے اور صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ صبر بڑے اہم امور میں سے ہے۔ صبر انسان کے لیے بڑی بڑی مشکلات چھوٹی بن جانے کا سبب بنتا ہے۔ اور خدا صبر کرنے والوں کا یاور و مددگار ہے۔ نماز جس کی بہت زیادہ تاکید ہے اور قرآن میں اس کا بار بار تذکرہ آیا ہے، یہ تمام عبادتوں میں سب

سے بڑی عبادت ہے آیت میں صبر اور نماز کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ یہ نہیں کہا اللہ نمازیوں کے ساتھ ہے بلکہ یہ فرمایا اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ کیونکہ صبر کا مقام ہر ایک عمل سے بالاتر ہے؛ جب خوفناک مناظر ہوتے ہیں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، جنگیں ہوتی ہیں، باطنی خواہشات سے لڑائی ہوتی ہے، ظاہری شیاطین سے نبرد آزمائی کا مقام آتا ہے، اللہ کی اطاعت سے روکنے والے آتے ہیں، عبادت میں خلل ڈالنے والے آتے ہیں، مشکلات کے پہاڑ سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو صبر ہی وہ طاقت ہے جس کی وجہ سے انسان ڈٹ جاتا ہے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرتا ہے، صبر ہر مشکل کے حل کی چابی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ صبر کرنے والوں کی مدد کرتا ہے۔

حدیث میں ہے: ''صبر کامیابی اور کشادگی کی کنجی ہے'' جب مسلمان اللہ کے حکم کے مطابق کام کرنا چاہتے ہیں، اللہ کے قانون کا نفاذ چاہتے ہیں، اللہ کے نظام کو معاشرے میں لانا چاہتے ہیں، عدل پر مبنی حکومت بنانا چاہتے ہیں تو دشمن ان پر حملہ آور ہوتا ہے انہیں نابود کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دفاع اور جہاد کی آمادگی رکھیں اور دشمن اگر دلیل سے قانع نہ ہوں، مکالمہ سے مطمئن نہ ہوں اور مقابلے پر اُتر آئیں تو اس صورت میں اس مصیبت کے وقت دشمن کی سازشوں کے سامنے سخت صبر، برداشت، ہمت اور قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ضروت ہے۔ اسی طرح بیماری کی حالت میں، خشک سالی کی حالت میں اور جو انسان کو تکالیف مختلف مراحل میں آتی ہیں ان میں اللہ کی راہ میں صبر کرنا سب سے بڑی عبادت اور سب سے بڑا جہاد ہے۔ جہاد جو دشمن کے مقابلے میں ہے، دشمن سے دفاع کے لیے ہے اسی طرح اللہ کی اطاعت کے وقت جو تکالیف آتی ہیں عام حالات میں جو تکالیف آتی ہیں اس میں بے حوصلہ نہ ہونا اور اللہ کی نعمات کی ناشکری نہ کرنا اور صبر کے دامن کو تھامے رکھنا انسان کی بڑائی ہے۔ اس لیے صبر بہت بڑی اور اہم صفت ہے اور مومنوں کی خصوصیت ہے۔ یہ صبر ہی ہے جو انسان کو مشکلات سے نکالتا ہے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

"اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مرا ہوا نہ کہا کرو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے"۔

شہداء زندہ ہیں

مادہ پرست، نفس کے مادی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ سمجھتے ہیں موت آنے سے نفس بھی مر جائے گا اور اخروی زندگی کی نفی کرتے ہیں۔ جبکہ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ انسان کی فطرت نفس کے باقی رہنے کی قائل ہے اور انہیں یقین ہے کہ نفس سعادت اور شقاوت سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر موت کا مطلب بالکل ہی خاتمہ ہو تو فداکاری اور قربانی کا جذبہ ایک احمقانہ اقدام کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ایک شخص اپنے آپ کو دوسروں پر فدا کرے تاکہ دوسرے زندہ رہیں وہ خود موت کی وادی میں چلا جائے۔ اسی طرح دوسروں کے فائدے کے لیے یا معاشرے میں عدل و انصاف کے لیے خود کو موت کے حوالے کرے جبکہ موت کا مطلب مکمل نابودی ہو، عقل مند ایسی چیز کو فدا نہیں کرتا جس کا بدلہ اسے نہ ملے۔ لیکن بغیر کسی بدلہ لینے کے دوسروں کی زندگی کے راستے میں موت قبول کر لینا خود فوائد اور منافع سے محروم رہ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا اس سے فطرت گریزاں ہے۔

ہاں جہاں پر چھوٹی چیز گنوا کر بڑا فائدہ مل رہا ہو تو عقل اسی چھوٹی چیز کی قربانی کو گھاٹا یا خسارہ نہیں کہتی اور یہ عمل خلاف فطرت نہیں بلکہ عین فطرت ہوگا۔ یا حقیقی شرف سے قطع نظر ایک باطل اور خود ساختہ کرامت کے لیے زندگی جیسی انمول چیز کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ آج کل کے خود ساختہ آزادی کے نعروں اور دیگر مطالب جن میں حقیقی شرف نہیں ہے یہ ان لوگوں کی تفسیر ہے جو زندگی کو صرف مادی آنکھ سے دیکھتے ہیں، ان کی نظر میں

زندگی بس یہی کچھ ہے جو اس دُنیا میں ہے۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں حیات فقط یہی دُنیاوی زندگی نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنی جان دیتے ہیں، اللہ کے دین کی خاطر، اللہ کے نظام کی خاطر، اللہ کے بندگان کو شر سے بچانے کے لیے قربان ہو جاتے ہیں وہ مردہ نہیں ہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اس زندگی کو انسان کے حواس درک نہیں کر سکتے۔ شہادت کے ظاہری آثار جیسے لوگوں کے بیچ موجود نہ ہونا، دیگر جنازوں کی طرح دفن ہو جانا یہ سب تو ہوتا ہے لیکن اللہ کی رضا کے سامنے اسے ایک نئی زندگی ملتی ہے جس کو وہ شہید حاصل کرتا ہے اور اس کے لیے یہ آسان اور سہل ہوتا ہے۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ عالم برزخ جسے عالم قبر کہا جاتا ہے اس میں انسان کے لیے زندگی ہے، یہ درمیانی زندگی ہے جو موت اور قیامت کے وسط میں ہے۔ اس کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہاں پر مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے ان کو شوق دلایا گیا ہے کہ مادہ پرستوں کے خیالات میں نہ بہہ جائیں بلکہ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے مردہ نہیں ہوتے، انہیں تازہ حیات ملتی ہے، نئی زندگی ملتی ہے لیکن عام لوگ اس زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ اسلام دین فطرت ہے جس دین کو آپ نے اختیار کیا ہے اُس دین پر چلنا ہے اور اس دین کی خاطر قربان بھی ہونا ہے۔ اگر اس دین کے لیے قربان ہوگے تو پھر تمہیں ایک نئی زندگی ملے گی، تم مردہ نہیں ہوگے۔ مردہ وہ ہے جو بغیر کسی ہدف کے موت کی آغوش میں چلا جائے۔ جو ایک مقصد کی خاطر آگے بڑھ کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ دیکھتے ہوئے کہ میں اس راستے میں مارا جاؤں گا پھر بھی اس راستے پر رہتا ہے تو ایسا شخص شہید ہے اور شہید مردہ نہیں ہیں۔ شہید کی زندگی قوم کی حیات بن جاتی ہے۔

وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور اموال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو"۔

امتحان اور آزمائش کا الٰہی قانون

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لیے بشارت دی کہ موت کے بعد بھی حیات ہے اور اس حیات کے لیے سبب چاہیے وہ سبب راہ خدا میں جان دینا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہاری آزمائش ہونی ہے، امتحان ہونا ہے اس امتحان میں کون سرخرو ہو کر نکلتا ہے، کون اپنے لیے شرافت مندانہ زندگی اختیار کرتا ہے اس حوالے سے تم کو آزمایا جائے گا۔ اللہ کا خالص دین جس میں شرک نہیں جو دین حنیف ہے آزمائش سے معلوم ہوگا کہ کون سچا ہے، یہ آزمائش جنگ وجدل اور دشمنوں سے مقابلہ کی صورت میں ہو سکتی ہے ہو سکتا ہے اس میں جان چلی جائے ۔ ایسی صورت میں دیکھنا یہ ہے کہ کون صبر کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ مسلمان مال کی قربانی دیتے ہیں جان کی قربانی دیتے ہیں، جنگ میں دشمنوں کے ساتھ اپنی جان فدا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زمین پر عدل الٰہی کے نفاذ کے لیے، ظلم و جور کی حکومت ختم کرنے کے لیے اس عمل سے درحقیقت یہ اپنے لیے زندگی بنا رہے ہوتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اگر مارے جائیں، ظلم وجور کے خاتمے کے لیے ان کی جان چلی جائے تو یہ حقیقی آزادی ہے اور اس آزادی کی نعمت سے وہ بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اللہ کے احکام کے بغیر زندگی نہیں ہے، اگر زندہ رہیں اور ظلم و جور کے حکمرانوں کی اتباع میں ہوں تو پھر کیسے وہ کامیابی کی طرف آسکتے ہیں؟ اسلام کی پناہ میں ہی سعادت مندانہ زندگی ہے۔

جوان مشکلات اور تکالیف میں صبر کرتے ہیں، الٰہی امانت اور فرائض کی ادائیگی میں سستی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اپنی قائمقامی کا شرف دیا ہے اس شرف کو نہیں بھولتے اس آیت میں اور بعد والی آیت دونوں میں صبر کرنے والوں کا دو مرتبہ نام لیا گیا

ہے۔ ایک دفعہ کہا گیا صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ دوسری بار یہ کہ ہم صبر سے آزمائیں گے اور پھر اس کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ہم اللہ کی ملکیت ہیں اور مالک اپنی ملکیت میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔

پھر صبر کرنے والوں کا اجر بتایا گیا کہ ان پر اللہ کی جانب سے درود و سلام اور رحمت ہے۔ لہٰذا آیت ۱۵۶ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب کوئی تکلیف دہ چیز آجاتی ہے اور ان کے اوپر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو وہ اس مصیبت کے آتے ہوئے پریشان نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر شئے اللہ کے حکم سے قائم ہے ہر چیز کی موجودیت اللہ کے ارادے سے ہے اور سب اللہ کے محتاج ہیں اللہ کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ایجاد میں، اپنی مخلوق میں جیسے چاہے تصرف کرے۔ انسان کا کسی بھی عمل میں استقلال نہیں ہے۔ انسان کے پاس جتنی طاقتیں ہیں وہ سب اللہ کی عطا کردہ ہیں اور کون ہے جو اللہ کی رحمت اور مدد سے بے نیاز ہو، کس کو جرأت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی قدرت سے باہر قرار دے؟ پس جب انسان رب تعالیٰ کی حقیقی مالکیت کو یاد کرلے تو پھر وہ مسائل سے بالکل متاثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری اپنی مالکیت تو ہے ہی نہیں تاکہ میں اس کے چلے جانے سے ناراحت اور بے آرامی محسوس کروں۔ اس کا مالک اللہ ہے لہٰذا سورہ غافر کی آیت ۱۶ میں ہے: "قیامت کے دن یہ آواز آئے گی آج ملک کس کا ہے؟" پھر اس کا جواب آئے گا اللہ جو واحد ہے قہار ہے جو غالب ہے۔ ۱۵۷ آیت میں ان دو آیات کے حوالے سے انعام کا تذکرہ ہے۔

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶

"وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"۔

أُولَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

''یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت، اور یہی ہدایت پانے والے ہیں''۔

رحمت الٰہی اور ہدایت پانے والے

یہاں پر ''صلوات'' رحمت کے معنی میں ہے۔ لیکن رحمت کو بعد میں الگ بھی ذکر کیا گیا ہے لہٰذا یہاں صلوات کا معنی ایسی رحمت ہو گی جو بعد والی رحمت سے الگ ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی روش اور سنت یہ ہے کہ مومنوں پر رحمت کرتا ہے اور رحمت کے مقدمہ کے طور پر پہلے صلوات کا ذکر کیا ہے اور یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ انہیں جہنم میں نہیں ڈالا جائے گا، یہ اللہ کی طرف سے ایک مہربانی، فضل اور کرم ہے کہ وہ اپنے بندے کے ساتھ رحمت اور شفقت سے پیش آتا ہے۔ خدا نے یہاں پر ایک وعدہ دیا ہے کہ جو ان مصائب پر صبر کرنے والے ہیں اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ۔ ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے صلوات ہے، رحمت ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ یہی ہدایت یافتہ ہیں یعنی اللہ نے ان کو صحیح راہ کی ہدایت دے رکھی ہے، یہ بھٹکنے والے نہیں ہیں۔ خدا ہی ان پر کرم کرتا ہے، بھٹکنے سے بچالیتا ہے اور سہو ونسیان سے بھی ان کو رہنمائی دے دیتا ہے۔

إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلۡمَرۡوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِۖ فَمَنۡ حَجَّ ٱلۡبَيۡتَ أَوِ ٱعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَاۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيۡرٗا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان کے درمیان طواف کرے، اور جو کوئی اپنی خوشی سے نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر دان جاننے والا ہے“۔

مناسک حج اور طواف کعبہ

یہاں پر مناسک حج میں سے طواف کا تذکرہ کیا جارہا ہے اور اس کا حکم دیا گیا ہے۔ حج کا مطلب ہوتا ہے قصد اور ارادہ۔ سارے مسلمان جانتے ہیں کہ فقہی طور پر حج سے مراد کیا ہے۔ ”اعتمار“ زیارت کرنے کے معنی میں ہے۔ ”عمارت“ آباد کرنے کو کہتے ہیں۔ کعبہ لوگوں کے لیے زیارت گاہ بھی ہے اس لیے زیارت گاہ مراد لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ”طوع“ کے معنی اطاعت کے ہیں اور مستحبی عمل کو تطوع کہا جاتا ہے، یہ واجب عمل کے مقابلے میں آتا ہے۔ ”شاکر“ اور ”علیم“ اللہ کے دو اسماء الحسنٰی ہیں۔ آیت میں بتایا گیا کہ صفا اور مروہ اللہ کی پہچان کا وسیلہ ہیں۔

پھر حکم دیا گیا ہے کہ جو بھی بیت اللہ کا حج کرے وہ صفا و مردہ کے درمیان سعی کرے اور جو عمرہ کرتا ہے اسے بھی سعی کرنا چاہیے۔ جو کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اللہ قدیم الاحسان ہے۔ ہر احسان نیکی ہے اور اللہ ہر نیکی کرنے والے کا بدلہ اسے ثواب کی شکل میں دیتا ہے۔ جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی اعمال صالحہ اپنے بندوں کو سمجھائے ہیں اور جب بندے سے یہ نیک اعمال صادر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے بندے کے احسان کو اپنی طرف نسبت دی ہے اور کہا ہے کہ میں خود اس کے نیک عمل انجام دینے کا شکر گذار ہوں یعنی خود اللہ اپنے آپ کو شاکر کہہ رہا ہے یعنی احسان پر احسان۔ اور کہا گیا ہے مسلمانوں نے یہ گمان کیا کہ صفا و مردہ کے درمیان سعی مشرکوں کی گھڑی ہوئی ہے تو اللہ نے اس آیت میں یہ حکم نازل کرکے اس افتراء کو دور کردیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں پہاڑوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے، مسلمانوں

کوان بتوں کے درمیان سعی میں اچھی نہیں لگ رہی تھی تو اس لیے حکم ہوا کہ تم نے سعی کرنی ہے اور فتح مکہ کے بعد جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو وہ بت ہٹا دیئے گئے جیسے کعبۃ اللہ سے بتوں کو ہٹا دیا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾

''بے شک جو لوگ ان کھلی کھلی باتوں اور ہدایت کو جسے ہم نے نازل کر دیا ہے اس کے بعد بھی چھپاتے ہیں کہ ہم نے ان کو لوگوں کے لیے کتاب میں بیان کر دیا، یہی لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں''۔

احکام الٰہی چھپانے والوں پر اللہ کی لعنت

اس آیت میں دین کے احکام کا تذکرہ ہے۔ یہودیوں کے پاس حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے آنے کی بشارت موجود تھی اور اس کی باقاعدہ نشانیاں آگئیں تھیں، جو نشانیاں انہوں نے اپنی کتاب میں پڑھی تھیں اس کے باوجود کہ جو کچھ وہ اپنی کتاب میں پڑھ چکے تھے، نشانیاں دیکھ چکے تھے لیکن جب حضور پاک ﷺ نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حق کو چھپایا اور نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد ان پر پردہ ڈالا۔ یہودی علماء اپنے فاسد اور غلط منافع اور مفادات کی خاطر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے وحی اور دین کے خلاف ہو گئے۔ انہیں ان آیات اور واضح نشانیوں کو نہیں چھپانا چاہیے تھا۔ لوگوں کو دین کے معاملے میں تفرقے اور اختلاف میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا کیونکہ ان کی تو پہلے ہدایت ہو چکی تھی۔ یہ اختلافات علماء یہود کی نفسانی خواہشات کا نتیجہ تھے کہ انہوں نے

مقدس کتاب کے مطالب میں تحریف کی تا کہ ان کی اپنی خواہشات کے مطابق غلط اور فاسد حکومت قائم رہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حق چھپانے والوں پر خود بھی لعنت بھیجی ہے اور جو لعنت کرنے والے ہیں ان کی لعنت اور نفرین ہے کہ وہ دُنیا اور آخرت کی سعادت سے محروم ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾

''مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور ظاہر کر دیا پس یہی لوگ ہیں کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم والا ہوں''۔

توبہ اور اصلاح

اس جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم سابق سے جس میں تمام حق چھپانے والوں کو کلی طور پر ملعون قرار دیا تھا بعض لوگوں کو استثنا کیا ہے اور کہا ہے کہ جنہوں نے شروع شروع میں ایسا کیا لیکن بعد میں متوجہ ہوئے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اللہ کی جانب رجوع کرتے ہوئے اس بگڑی ہوئی بات کو درست کیا، اپنی اصلاح کی اور حقائق کو بیان کیا، سب کو آکر بتایا کہ ہاں ہم نے کتاب توریت میں یہ پڑھا تھا اور اصل میں یہ چیز موجود تھی اگرچہ تحریف شدہ میں یہ چیز موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ایسے لوگ جو سچے دل سے توبہ کرتے ہیں، اپنے کئے پر نادم ہوتے ہیں، غلطی کو ترک کرتے ہیں اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو خدا بخشنے والا ہے ان کے ایمان اور عمل صالح کو قبول کرے گا۔ جو کچھ ان سے

پہلے چھوٹ گیا ہے اس کی تلافی کریں گے تو خدا ان کی ہدایت کرے گا۔ وہ بڑا مہربان ہے، خدا بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

''بے شک جنہوں نے انکار کیا اور انکار ہی کی حالت میں مر بھی گئے تو ان پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں اور سب لوگوں کی بھی''۔

کافروں کا انجام

اس آیت میں ان کافروں کا انجام بتایا جارہا ہے جو اپنی دُشمنی پر قائم رہتے ہیں، واضح نشانیوں کا انکار کرتے ہیں، الٰہی دعوت کو قبول نہیں کرتے، شیطان کے راستے پر چلتے ہیں، راہ مستقیم کو چھوڑ دیتے ہیں، ان کے علماء حقائق پر پردہ ڈالتے ہیں اور ان کی بات مانتے ہیں تو ان پر اللہ کی طرف سے لعنت ہے یعنی وہ اللہ کی رحمت سے دُور رہیں گے۔ ان پر فرشتے بھی نفرین کرتے ہیں اور سارے انسانوں کی لعنت بھی ان پر ہے، یعنی جب وہ انسان قیامت کے دن موجود ہوں گے تو یہ جنہوں نے ان کو بھٹکایا ہوگا اور کفر پر آمادہ کیا ہوگا وہ بھی ان پر لعنت بھیج رہے ہوں گے۔ احکام الٰہیہ کے انکار کا نتیجہ لعنت ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ تمام فرشتوں اور انسانوں کی لعنتیں ان ہی کافروں کے لیے ہیں، یہی کافروں کا مقدر ہے۔ وہ کفر کی حالت میں مریں۔ البتہ جنہوں نے کفر کے بعد رجوع کر لیا اور دعوتِ حق کو قبول کر لیا توحید پرست ہو گئے آخرت پر ایمان لائے، رسالت کو مان لیا تو پھر اللہ مہربان ہے، توبہ کرنے والا ہے اس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہ جب وہ اپنے کئے پر

نادم ہو جائیں اور اس کی تلافی کر لیں تو اللہ بخش دیتا ہے لیکن جو کفر کی حالت میں رہیں گے وہ رحمت سے دور رہیں گے ان کے لیے ہمیشہ کی لعنت اور جہنم ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے''۔

ہمیشہ کا عذاب

لعنت کا مطلب نفرین اور رحمت سے دُوری ہے۔ یہ کوئی ایک لمحے کے لیے یا تھوڑے وقت کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے، جاودانی ہے۔ لعنت الٰہی عذاب میں بدل جائے گی اور انہیں کسی قسم کی مہلت نہیں ملے گی اور نہ ہی وہاں پر کفار کو کسی سے بات کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس مطلب کو متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ کفر کرنے والے دائمی عذاب میں رہیں گے، اس عذاب سے وہ نکل نہیں سکیں گے۔ اس دن اللہ کے عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ کفار کو نہیں ملے گا۔ چنانچہ یہ عذاب ان کا اپنا کیا دھرا ہے، جو انہوں نے کیا ہے اس کو بھگتیں گے، کیونکہ وہ اپنے باطل عقیدہ پر قائم رہے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے''۔

توحید الوہی

اس آیت میں توحید عبادی کو واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں توحید کو بار بار بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے انسان کے دل و دماغ میں یہ بیٹھ جائے کہ الوھیت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کی صفات کمالیہ جیسے علم، قدرت، حیات، خالقیت، مالکیت، رازقیت اور ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اس مقام پر غیر اللہ سے الوھیت کی نفی کی گئی ہے، کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور یہی کلمہ توحید ہے۔ وہی بخشنے والا ہے کیونکہ تمام عطایا اسی کی طرف منتہی ہوتے ہیں اور وہی مہربان ہے، رحمت اسی کی ہے، عطایا خاصہ اسی کی طرف سے ہیں۔ راہ ہدایت بھی اللہ کا عطیہ ہے اور اخروی سعادت بھی اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ اللہ کی وحدت، وحدت نوعی یا وحدت عددی یا وحدت جنسی نہیں ہے۔ یہ وحدت حقہء حقیقی ہے۔ یہاں دو کا تصور نہیں ہے جیسے گنتی شمار ہوتی ہے اس طرح یہاں کثرت کا تصور بھی نہیں ہے۔ واقعی اور حقیقی وحدت صرف اللہ کے لیے ہے۔

الوھیت اس لیے اللہ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ حقیقی خالق صرف اللہ ہے۔ جب خالق اللہ ہے تو جو جس چیز کو بناتا ہے وہی اس کا مالک بھی ہوتا ہے، لہٰذا مالک حقیقی اللہ ہے جو کسی چیز کا مالک ہوتا ہے وہی اس کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے، اس کی روزی کا انتظام بھی وہی کرتا ہے، تو جو خالق ہے مالک اور رازق ہے پھر قانون بھی اسی کا چلے گا، روزی وہ دے رہا ہے تو بات بھی اسی کی چلے گی۔ جب قانون اسی کا ہے جو مالک، رازق اور خالق ہے تو پھر اطاعت بھی اسی کی ہو گی، کسی اور کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی لیے کہا گیا "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" پس معبود وہی ہو سکتا ہے جو خالق، مالک، رازق اور رب ہے۔ یعنی یہ ایسی صفات ہیں جن کا نتیجہ توحید الوھی ہے، الوھیت میں کوئی اللہ کا شریک نہیں ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے بدلنے میں، اور جہازوں میں جو دریا میں لوگوں کی نفع دینے والی چیزیں لے کر چلتے ہیں، اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے نازل کیا ہے پھر اس سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اور اس میں ہر قسم کے چلنے والے جانور پھیلاتا ہے، اور ہواؤں کے بدلنے میں، اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان حکم کا تابع ہے، البتہ عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں"۔

صاحبان عقل کیلئے اللہ کی نشانیاں

اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا کوئی خالق اور مالک ہے جس کا قانون چل رہا ہے اور وہی مدبر بھی ہے۔ ان آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی چند مخلوقات کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ پورا عالم اللہ کی ایک ہی مخلوق ہے۔ اس عالم کے اجزا ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور تمام اجزاء اور حصے ایک نظام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں یہ متعدد ہیں، ان میں کثرت ہے لیکن ان سب کا خدا اور خالق ایک ہی ہے، شب و روز کا اختلاف، نور میں فرق، رات کا طولانی ہونا، دن کا مختصر

ہونا، دن کا طولانی ہونا رات کا مختصر ہونا، اور اسی اختلاف کی وجہ سے لوگوں کی ضروریات جیسے زراعت، کشتیوں کا دریا میں چلنا اور ان سے مربوط دوسرے کاموں کا انجام پانا۔ سورج اور چاند کی نورانیت، سورج کا ایک مدار کے تحت چلنا، ستاروں کا سورج کے گرد گھومنا یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ سمندر کے اوپر چلنے والی کشتیاں جس پر لوگ سامان اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ان کے حمل و نقل کے کام آتی ہیں۔ ایک طاقت ہے جو ان کو سمندر کے پانی میں ڈوبنے سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ بھی ایک نظام کے تحت ہے۔ خود اس پانی کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اُتارا ہے اور زمین پر رہنے والوں کے لیے زندگی کا سامان مہیا کیا ہے۔ اسی پانی سے زراعت اور کھیت تیار ہوتے ہیں، نباتات اُگتی ہے اور پیاس بجھائی جاتی ہے۔ یہی دریا سمندر کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر اسی سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں اور ان بخارات سے بادل بنتے ہیں اور ہوائیں ان بادلوں کو لیے پھرتی ہیں اور جب یہ بادل سخت ہوتے ہیں تو ان سے بارش برستی ہے، ژالہ باری بھی ہوتی ہے۔ ہوائیں ان بادلوں کو ادھر سے اُدھر لے جاتی ہیں اور اونچے پہاڑوں پر جہاں پانی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پر بارش برستی ہے۔ اسی طرح کا عمل نباتات اور درختوں میں انجام پاتا ہے، میوہ دار درخت بنتے ہیں، جن سے پھل تیار ہوتے ہیں،، لکڑی کام آتی ہے۔ زمین پر قسم قسم کے حیوانات ہیں۔

ان سب آثار کو ہر ایک دیکھ رہا ہے، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ بظاہر ان میں کثرت ہے لیکن یہ ایسی کثرت ہے جس میں ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ رابطہ ہے اور یہ سب نشانیاں ہیں کہ کوئی تو ہے جو ان سب کو کنٹرول کر رہا ہے۔ یہ سب انسان کو فائدہ پہنچا رہے ہیں اور انسان بھی اس سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ ان سے زمین کی زندگی اور رونقیں بھی ہیں۔ صاحبان عقل کے لیے جو سمجھ رکھتے ہوں سوچتے ہوں اور تفکر اور تعقل کرتے ہوں یہ سب نشانیاں ہیں۔

"العقل ما عبد به الرحمن و اکتسب به الجنان"[1] اس آیت میں اور اس سے پہلے والی آیت میں اللہ کے وجود اور اللہ کی توحید پر براہین اور دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ پہلی دلیل کائنات کا نظام، اس کی آپس میں پیوستگی اور اس کا آپس میں جڑا ہوا ہونا ہے۔ یہ سب ایک ذات کے حکم کے تحت ہیں اور ان کا خالق واحد ہے۔ یہ نظام واحد، اللہ تعالیٰ کی یگانگی اور احدیت پر دلیل ہے۔ کیونکہ اگر خالق دو ہوتے تو اس نظام میں خلل واقع ہوتا، نظام میں خلل واقع نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق اور اس کو چلانے والا اور اس کو نظم دینے والا ایک ہی ہے۔

دوسری دلیل: وحدت حقہ حقیقیہ خود اللہ کی ذات ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کو ثابت کرنے کے لیے دلیل اور برہان کا محتاج نہیں ہے، اسے مخلوقات کے ذریعے اپنی وحدانیت کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ موجودات کی دلیل اور وہ خود برہان ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ ذات باری تعالیٰ وحدت حقہ حقیقی ہے۔

تیسری دلیل: انسان محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین میں جو کچھ موجود ہے، اسے انسان کے اختیار میں دے دیا ہے تاکہ وہ دنیا اور آخرت کی سعادت کو پہنچ سکے۔ انسان اپنی احتیاج اور نیاز مند ہونے کے ذریعہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے اور اللہ کے وجود پر اور اس کی احدیت پر دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔ کون ہے جس نے انسان میں یہ ساری صلاحیتیں رکھی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات سے فائدہ اٹھائے اور اپنی ضرورتیں پوری کرے۔ اپنی دُنیا بھی آباد کرے اور اگر دُنیا میں اس طرح زندگی گزارے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نظام بنایا ہے تو پھر اس کی اُخروی زندگی بھی سنور جائے گی۔[2]

---

[1] ۔ عقل کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ عقل وہ ہے جس کے ذریعے رحمٰن کی عبادت کی جاتی ہے، جس کے ذریعے جنت حاصل کی جاتی ہے۔

[2] ۔ یہ حصہ تفسیر المیزان کے اصل سے لیا گیا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

"اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا اور شریک بنا رکھے ہیں جن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہیے، اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اور کاش دیکھتے وہ لوگ جو ظالم ہیں جب عذاب دیکھیں گے کہ سب قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

کفار کا رویہ اور آخرت میں ان کا انجام

اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہوا ہے جو واضح نشانیوں کے باوجود بھی خدا کو نہیں مانتے اور اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہیں لاتے، ان کے رویہ اور ان کی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ "ند" مثل اور نظیر کے معنی میں ہے۔ ہر عقل مند شخص بہتر اور کامل تر چیز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی بھی وہ کمتر اور پست تر کو نہیں لیتا۔ خاک کہاں اور پروردگار عالم کہاں؟ ان پر افسوس ہے کہ انہوں نے اللہ کی مخلوقات میں سے ہی اللہ کے شرکاء گھڑ لیے اور پھر انہیں شرکاء سے محبت کرنی شروع کر دی۔ ان کے فرضی شرکاء جن کی وہ عبادت کرتے ہیں خواہ وہ فرشتوں سے ہوں یا انسانوں سے یا پتھروں یا لکڑیوں کے ہوں یا سورج یا چاند ہو، ان کا خالق ان سے برتر ہے۔

کفار اس بات کے بھی معترف ہیں کہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔ جب اللہ ہر شئے کا خالق ہے تو اس کی مخلوق کو اس کا شریک کیسے بناتے ہو؟ اللہ کو ان کا محتاج کیسے بناتے ہو؟ اور ان سے ایسے پیار کر رہے ہوتے ہیں جیسے اللہ سے پیار کیا جاتا ہے حالانکہ ان کا یہ انداز صحیح نہیں ہے۔

مومنین کی اللہ سے محبت بہت شدید ہے۔ مومنین غیر خدا کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور وہ ہر قدرت اور ہر صلاحیت کو خدا کی جانب سے دیکھتے ہیں۔ مومن غیر خدا سے اس لیے دوری کرتا ہے اور اسے نہیں چاہتا کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ غیر خدا کی پیروی نہیں کرتا کیونکہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے، وہ ہمیشہ اللہ کے امر کے تابع رہتا ہے اور دین میں اخلاص رکھتا ہے، یہ مومن کی شان ہے لیکن جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے یعنی غیر اللہ کو اللہ کا شریک بنادیا ہے تو یہ ظالم ہیں، انہوں نے خدا کے شریک گھڑ لیے ہیں اور ان سے دوستی کر رکھی ہے، ان کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس عالم میں وہ فائدہ دے سکتے ہیں، ان کی تاثیر ہے اور وہ بھی کسی قسم کی طاقت اور قدرت رکھتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ آخرت میں ان کو ان کے اعمال کی کیا سزا ملنے والی ہے اور کس طرح ان کے اعمال، ان کی بدعقیدتی اور بے ایمانی اور کفر مجسم ہوگا تو انہیں اللہ کی قدرت مطلقہ کا علم ہو جاتا اور انہیں پتہ چل جاتا کہ ان کے فرضی شرکاء کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی نے ان کو دُنیا میں قدرت اور طاقت دی ہے اور وہی ہے جو سارے اسباب کا مالک ہے اور ہر سبب میں تاثیر رکھنے والا بھی وہی ہے۔ وہ چاہے تو اس تاثیر کو معطل اور بے ثمر بھی بنا سکتا ہے۔ اور ایسا کرنا اس کے لیے اس کے خلق کرنے سے آسان تر ہے۔ اس وقت کفار کو کوئی چیز شدید عذاب اور اس کے خوف سے آزاد نہیں کرسکے گی اور اس وقت انہیں سمجھ آجائے گی کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ پس یہ سوچتے کیوں نہیں ہیں، سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟ اور خداوند متعال قادر کی عبادت کیوں نہیں کرتے؟ قبل اس کے کہ آخرت میں سارے اسباب بے اثر ہو جائیں اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں۔ اب وقت ہے کہ وہ اپنے رویے کو بدل لیں اور اللہ کی وحدانیت کو قبول کرلیں، اللہ کے بتائے ہوئے نظام کے مطابق زندگی گزاریں۔

اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ ﴿۱۶۶﴾

"جب وہ لوگ بیزار ہو جائیں گے جن کی پیروی کی گئ تھی، ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی تھی، اور وہ عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے تعلقات ٹوٹ جائیں گے"۔

قیامت پیروکاروں سے بیزاری کا دن

دُنیا میں دو طرح کے لوگ تھے کچھ وہ تھے جنہوں نے دوسروں کو بھٹکایا، بہکایا اور اپنی پیروی پر آمادہ کیا، بت پرستی پر آمادہ کیا، انہیں اپنی پیروی پر آمادہ کیا اور پھر اپنی مرضی کے مطابق قانون بنایا اور انہیں اس کی پیروی کا کہا۔ دنیا میں تو یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن جب آخرت ہو گی اور عذاب آئے گا تو اس وقت جنہوں نے دوسروں کی پیروی کی تھی ان کا عذاب ان سے زیادہ ہو گا جن کی وہ پیروی کرتے تھے۔ دُنیا میں جنہوں نے اپنی پیروی کروائی تھی، اپنا نظام بنا رکھا تھا، دوسروں پر ان کا غلبہ تھا اور دوسروں کے اعمال کو اپنی طرف نسبت دیتے تھے اور کفر و سرکشی اور گناہگاری کے پیشوا تھے تو وہاں پر وہ ان کی پیروی کرنے والوں سے اظہار بیزاری کریں گے۔ پیروی کرنے والے کہیں گے دنیا میں ہمیں انہوں نے بھٹکایا تھا اس لیے ان کو زیادہ عذاب دیا جائے۔ وہ کہیں گے ہمارا تو ان سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا ہماری دعوت پر یہ خود آئے تھے۔ ہم نے مجبور نہیں کیا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے وہاں پر کفر کے پیشوا اور سرکشی کرنے والے اپنے پیروکاروں کی مدد نہیں کر سکیں گے اور وہ خود ہی عذاب میں ہوں گے اور ان کا تعلق منقطع ہو چکا ہو گا۔ وہاں پر وہ ایک دوسرے سے بیزاری کا اظہار کر دیں گے، ایک دوسرے کو چھوڑ دیں گے۔ وہ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکیں گے، وہاں تو سارے اسباب ختم ہو جائیں گے، کوئی کسی کا یاور و مددگار نہیں ہو گا، وہاں قدرت مطلقہ اللہ تعالیٰ کی ہو گی۔

وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡہُمۡ کَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا ؕ کَذٰلِکَ یُرِیۡہِمُ اللّٰہُ اَعۡمَالَہُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی تھی کہ کاش ہمیں دوبارہ جانا ہوتا تو ہم بھی ان سے بیزار ہو جاتے جیسے یہ ہم سے بیزار ہوئے ہیں، اسی طرح اللہ انہیں ان کے اعمال حسرت دلانے کے لیے دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں''۔

قیامت کے دن حسرت کا اظہار

اس آیت میں قیامت کے اس منظر کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جب پیروکار اُن سے رابطہ کریں گے جن کی وہ پیروی کرتے تھے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس پر پیروی کرنے والے کہیں گے کاش! ہم واپس دُنیا میں چلے جائیں اور وہاں پر ہم بھی ان سے اسی طرح بیزاری کا اعلان کریں جس طرح آج وہ ہم سے بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں؛ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جو دُنیا میں پروردگار کی ملاقات اور قیامت کو بھولے ہوئے تھے اور اس بات کو بھی بھول چکے تھے کہ اللہ صاحب قدرت مطلق ہے اور اللہ کے سوا پورے عالم میں کوئی موثر نہیں ہے۔ وہاں پر وہ واپس دنیا جانے کی آرزو کریں گے لیکن یہ ان کی ایک ایسی آرزو ہوگی جس نے پورا نہیں ہونا۔ وہاں پر وہ نیک اعمال کی حسرت میں ہوں گے۔ ان کو اس بات کی تکلیف ہوگی کہ وہ دنیا میں دنیا دوستی، دنیا پرستی، نفسانی خواہشات اور شہوات کی پیروی میں مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ نے جو قوات اور صلاحیتیں دی تھیں ان کو صرف دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے رہے۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر ان کے عذاب میں اور اضافہ ہوگا۔ لیکن ان کے لیے اس عذاب سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ آتش جہنم ان کے لیے جاودانی ہے، اس عذاب نے منقطع نہیں ہونا اور نہ ہی ان سے ختم ہونا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾

''اے لوگو! ان چیزوں میں سے کھاؤ جو زمین میں حلال پاکیزہ ہیں، اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا صریح دشمن ہے''۔

تمام انسانوں کیلئے خطابِ الٰہی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو خطاب کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کی نعمتیں عام اور سب کے لیے ہیں۔ مومن حلال خدا کو سمجھتا ہے اور حلال چیزوں کو کھانے کے لیے انتخاب کرتا ہے اور حرام سے بچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لیے بھی حلال اور طیب چیزوں کی اجازت دی ہے کہ وہ کھائیں لیکن وہ خدا پر افتراء باندھ کر ایسی چیزیں کھاتے ہیں جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے حالانکہ حلال چیزیں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حلال، طیب اور پاکیزہ چیزوں سے استفادہ کی اجازت سب کو دی ہے۔ ''حِل'' عمل کی آزادی کے معنی میں ہے۔ ''طیب'' ملائم کے معنی میں ہے جو طبیعت کے مطابق اور پسندیدہ، اچھا اور مطلوب ہو۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کے لیے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جو نجس اور پلید ہیں۔ اس لیے اللہ نے تمام انسانوں کو کہا کہ زمین سے تیار ہونے والی حلال، طیب اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جن میں میوہ جات، پھل اور اناج ہیں۔ حرام جانور کا گوشت مت کھاؤ، نشے والی چیزیں مت استعمال کرو اور خطوات کی پیروی نہ کرو۔ "خطوات"، خطوۃ کی جمع ہے۔ یہاں پر اس سے مراد شیطانی اقدامات ہیں یعنی شیطان کی وہ باتیں جن کے ذریعے وہ

تمہیں شرک پر آمادہ کرتا ہے، خدا سے دُور کرتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے حلال اور طیب چیزوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے لیکن شیطان ان کو حرام کھانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور جو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اس کے کھانے سے منع کرتا ہے، یہی شیطان کی پیروی ہے۔

شیطان کی پیروی سے منع

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے شیطان کے قدم پر قدم مت رکھو، شیطان کے راستے پر مت چلو۔ اے انسان! تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، تمہارے بابا آدم اور اماں حوا کو اسی نے بہترین جگہ سے نکالنے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اپنے بندوں کو ان کے دشمن کی پہچان کرواتا ہے اور یہ کہ شیطان انسان کا آشکار دشمن ہے۔ جب انسان اپنے دشمن کو پہچان لے گا تو پھر اس کے جھانسے میں نہیں آئے گا اور شیطان کی دشمنی سے وہ بچ سکے گا۔ اس طرح وہ شیطان کے مکر وفریب، دھوکہ، شر اور وسوسوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی کی اور ان کو شیطان سے بچنے کا حکم دیا کہ اس سے بچ کر رہو اس کی پیروی مت کرو۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

”وہ تو تمہیں برائی اور بے حیائی ہی کا حکم دے گا اور یہ کہ اللہ کے ذمے تم وہ باتیں لگاؤ جنہیں تم نہیں جانتے“۔

بدی کی جانب شیطان کی دعوت

اس آیت میں شیطان کے عمل، اس کا پیشہ اور جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو بیان کیا جارہا ہے۔ شیطان انسان کو بدی کی جانب بلائے گا، فحاشی کی دعوت دے گا اور وسوسے انسان کے ذہن میں ڈالے گا اور اس کو سوء یعنی ہر وہ چیز جس سے انسان کو نفرت ہو؛ اس کے مزاج کے

مطابق نہ ہو شیطان انسان کو اس برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ برائی اس کی طبع کے خلاف ہے لیکن شیطان اسے اس طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ جب برائی حد سے گزر جائے تو وہ فحاشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شیطان انسان کو پہلے برائی میں داخل کرتا ہے اس کے بعد اسے فحاشی اور بدکاری تک لے جاتا ہے۔ یہیں پر نہیں رکتا بلکہ اسے اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ بغیر علم اور بغیر ثبوت کے اختلاف، تفرقہ اور برائی میں پڑ جائے اور شیطان کی دعوت یہاں تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کی طرف ایسی نسبتیں دے جس کا اسے علم بھی نہیں ہے۔ وہ اسے برائی اور فحاشی کی دعوت دیتا ہے اور اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ بغیر علم اور بغیر ثبوت کے گفتگو کرے اور اللہ پر افتراء باندھے اور یہ سب سے بڑا جرم ہے۔ یہ شیطان کی حرکتیں ہیں لہٰذا شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس کی باتوں میں مت آؤ۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

”اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ پائی ہو“۔

آباء واجداد کی پیروی کی سرزنش

اس آیت میں مشرکین اور شیطان کی پیروی کرنے والے لوگوں کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ جب شیطان کی پیروی کرنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ بھئی تم اس پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے ایمان لے آؤ تو وہ بجائے اس کے کہ اس پر ایمان لے آئیں کہتے ہیں ہم تو اپنے آباء واجداد کے طریقہ پر چلیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تمہارے آباء و اجداد کچھ بھی نہیں

سمجھتے تھے اور وہ ہدایت پر بھی نہیں تھے پھر بھی ان ہی کی پیروی کروگے؟ یہاں پر ایک عقلی برہان بیان کیا گیا ہے کہ اندھی تقلید باطل ہے۔ تقلید کرنی ہے یا کسی کی بات ماننا ہے تو ثبوت کے ساتھ مانو۔ مشرکین کا کہنا ہے کہ ہم تو ہر حال میں چاہے ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے، دلیل ہو یا نہ ہو اپنے آباء و اجداد کی پیروی کریں گے چاہے عالم ہوں یا جاہل ہوں۔ جو علم کے بغیر عمل کرے گا، معرفت کے بغیر عمل کرے گا تو وہ راہ ہدایت سے بھٹک جائے گا اور کس طرح بھٹکے ہوئے کی پیروی کروگے اور گمراہ کی پیروی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عقائد میں تقلید صحیح نہیں ہے اور یہ تقلید ممنوع ہے۔ البتہ عقائد کے علاوہ زندگی کے دیگر امور میں ظاہر ہے انسان اس سے پوچھے گا جو جانتا ہے اور جاہل عالموں کے پاس بھی جائے گا۔ اس لیے اعمال میں تقلید ہے جبکہ عقائد میں تقلید نہیں ہے۔ عقائد میں دلیل سے بات مانی جائے گی عقائد میں بھی علماء سے رابطہ کیا جاتا ہے علماء سے دلیل مانگی جاتی ہے لیکن اعمال میں دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

”اور ان کی مثال جو کافر ہیں اس شخص کی سی ہے جو اس چیز کو پکارتا ہے جو سوائے پکار اور آواز کے نہیں سنتی، وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس وہ نہیں سمجھتے“۔

کفار حیوانوں کی مانند

کفار حیوانوں کی مانند ہیں جس طرح حیوانوں میں عقلی شعور و ادراک نہیں ہوتا اسی طرح ان میں بھی شعور اور ادراک نہیں ہے۔ جس طرح اگر چوپان اپنے جانوروں کو آواز

دے اور سیٹی مارے تو وہ اس کے الفاظ کو نہیں سمجھ سکتے، کفار بھی ان حیوانات کی مانند ہیں۔ چوپان اپنی آواز کے ذریعے اپنے ریوڑ کو پھیر دیتا ہے یا اُن کو دُور کر دیتا ہے یا انہیں اپنے قریب بلاتا ہے۔ ''دعا'' اور ''ندا'' میں یہ فرق ہے کہ ندا، دعا سے خاص تر ہے کیونکہ ندا بلند آواز سے پکارنے کو کہتے ہیں جبکہ دعا بلند بھی ہو سکتی ہے آہستہ بھی ہو سکتی ہے۔ گونگے، بہرے اور اندھوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو حق کی دعوت کو قبول نہیں کرتے، جو حق بات کو سنتے تو ہیں لیکن اس سے ہدایت نہیں لیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس آیت میں سند قلب کو استعمال کیا گیا ہے یعنی بجائے اس کے کہ کہیں پیغمبر اکرم ﷺ کی مثال چوپان کی ہے، یہ کہا گیا کہ کافروں کی مثال اُن حیوانوں کی ہے جو چوپان کی آواز کو نہیں سمجھ سکتے۔ بہرے، گونگے اور اندھے کی مثال دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ کفار سے تو حیوان بھی بہتر ہیں کیونکہ حیوانات کو جب چوپان آواز دیتا ہے تو وہ اس آواز پر اِدھر اُدھر مڑ جاتے ہیں حالانکہ وہ اس کے معنی کو نہیں سمجھ رہے ہوتے لیکن کافر ایسے ہیں کہ بات سن کر اسے اَن سُنی کر دیتے ہیں، اپنے آپ کو بہرے پن میں ڈالتے ہیں۔ وہ دیکھ تو رہے ہوتے ہیں لیکن اندھے بن جاتے ہیں، نشانیاں ان کے سامنے ہیں لیکن ایسے لگ رہا ہے کہ اُن کو کچھ نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ اس طرح وہ حق پر پردہ ڈالتے ہیں اور اُس کو چھپاتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

''اے ایمان والو پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو''۔

نعمات الٰہی پر شکر بجالانے کا حکم

اس آیت کا خطاب مومنوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ پہلا خطاب عمومی تھا اور گویا کہ وہ لوگ جو نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو اُن سے منصرف ہوا ہے اور پھر سخن کا رُخ خاص گروہ کے لیے پھیر دیا ہے جو دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں تو اللہ ان کے قریب ہے اور اللہ اُنہیں نعمات عطا کرتا ہے۔ انہیں چاہیے کہ اللہ کی ان نعمات پر شکر بجالائیں۔ یہ وہی ہیں جو فقط اللہ کی عبادت کرتے ہیں انہیں اللہ کی نعمات کا شکر بجالانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ فرمان عبادت میں انحصار کو بیان کر رہا ہے کہ یہ ایسے ہیں جو فقط اللہ کے اوامر کی اطاعت کرتے ہیں اور اللہ کی نواھی کا ارتکاب نہیں کرتے، یہ مومنین کی شان ہے۔ ان مومنین سے کہا جارہا کہ تم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی پاکیزہ اور حلال روزی کھاؤ، حرام اور غیر حلال کا استعمال مت کرو اور اللہ کا شکر بجالاؤ۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٧٣﴾

"سوائے اس کے نہیں کہ تم پر مردار اور خون اور سوٗر کا گوشت، اور اس چیز کو کہ اللہ کے سوا اور کے نام سے پکاری گئی ہو، حرام کیا ہے، پس جو لاچار ہو جائے نہ سرکشی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بخشنے والا نہایت رحم والا ہے"۔

حرام چیزوں سے پرہیز

اس آیت میں حرام چیزوں کو کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ مردار کھانا، جانور کا خون پینا، خنزیر کا گوشت کھانا حرام ہے اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ اس کے حرام ہونے کی وجہ ان کا نجس ہونا ہے۔ غیر خدا کے نام سے اگر کسی حیوان کو ذبح کیا ہے تو وہ بھی حرام ہے۔ لیکن اس سے استثناء ہے کہ اگر مجبوری ہو اور حق سے تجاوز نہ کریں تو جتنی مجبوری ہے اتنا ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا پڑ جائے تو کر سکتے ہیں، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ رحمت خدا ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی لیکن اس کی اپنی زیادتی اس مجبوری کا سبب نہ بنی ہو، خود سبب نہ بنا ہو تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے جو مہربان ہے۔ یہ جملہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اضطراری حالت میں رخصت دی ہے اور جائز قرار دیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ مومنین کو تھوڑی سے تخفیف ملے، وگرنہ اضطرار کی حالت میں بھی حرمت اور نہی موجود ہے۔ حرمت کا سبب ختم نہیں ہو جاتا لیکن اُن کے لیے تخفیف ہے کہ اللہ مہربان ہے، غفور و رحیم ہے، بخشنے والا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ اُس اضطرار اور مجبوری کے اسباب خود مہیا نہ کئے ہوں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۴﴾

”بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا مول لیتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں نہیں بھرتے مگر آگ، اور اللہ ان سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

اہلِ کتاب کی گمراہی

یہاں پر ایک جملہ معترضہ بیان ہوا ہے جو اہل کتاب کے حوالے سے ہے کہ انہوں نے اللہ کے بہت سارے حلال کو چھوڑا اور بہت سارے حرام کو کھایا اور خداوند تبارک و تعالیٰ کے حلال کو اپنے مقام، منصب، ریاست، عہدے کی خاطر حرام قرار دے دیا ہے حالانکہ ان کی کتاب میں کوئی ایسی بات درج نہیں تھی اور جو کچھ اللہ کی کتاب میں تھا اُس کو انہوں نے چھپایا اور کم ترین قیمت میں اسے بیچ ڈالا اور وہ یہی دُنیا کے منصب و عہدہ تھا اسی کو لے کر اور دُنیا کی وقتی سہولیات کے بدلے میں اللہ وحدہ لاشریک کے احکام کی خلاف ورزی کی اور حقائق پر پردہ ڈالا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بتایا کہ انہوں نے جو کچھ کھایا وہ گویا کہ اپنے شکم میں آگ کو بھرا اور اللہ کے حکم میں جو تبدیلی لائے تو اس کے بدلے میں سوائے آگ کے انہیں کچھ نہیں نصیب ہوا، انہوں نے ہدایت کی جگہ گمراہی لی اور مغفرت کی جگہ عذاب حاصل کیا اور پھر قیامت کے دن اس حق کو چھپانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی توجہ ان کی طرف نہیں ہو گی اور نہ ہی اللہ کا مکالمہ ان کو نصیب ہو گا نہ اس کی شیرینی نصیب ہو گی اور وہاں پر ان کا تزکیہ بھی نہیں ہو گا اور ان کو پاک بھی نہیں کیا جائے گا، انہیں اسی نجاست کے ساتھ جہنم میں پھینکا جائے گا اور ان کے لیے جو دردناک عذاب ہے اس عذاب میں انہوں نے ہمیشہ رہنا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

"یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدا اور عذاب کو بخشش کے بدلے، پس دوزخ کی آگ پر ان کا کتنا بڑا صبر ہے"۔

ہدایت کے بدلے گمراہی کے خریدار کا انجام

جو آسمانی کتاب اہل کتاب کے پاس موجود تھی اس میں کیونکہ حقائق درج تھے اس لیے ہدایت تو ان کے پاس موجود تھی لیکن اُنھوں نے اس ہدایت کو چھوڑ دیا اور ہدایت کے بجائے گمراہی کا انتخاب کر لیا اور عذاب کی طرف چل دیے۔ اگر وہ چاہتے تو ان کو مغفرت تو ملتی لیکن انہوں نے اپنے اختیار سے مغفرت کے بدلے عذاب کا انتخاب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے افراد کے متعلق فرما رہا ہے کہ یہ عجیب ہیں انہوں نے حقائق کو بدلا، حقائق پر پردہ ڈالا، حقیقت کو چھپایا اور پھر اس کے بدلے میں اپنے لیے آگ خرید کی ہے، تو ان میں کتنی طاقت ہے کہ اس آگ کو برداشت کر سکیں؟ انہوں نے اللہ کے قانون اور اس کی شریعت سے عناد اور دشمنی کی، مخالفت کی تو وہ آگ پر کیسے صبر کریں گے اور اس آگ کو کیسے برداشت کریں گے؟ آگ میں تو ہمیشہ جلنا پڑے گا اور آگ انہی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کے متعلق تعجب سے کہا گیا ہے کہ ان میں تو یہ ہمت اور قوت نہیں ہے وہاں تو چیخیں گے، چلائیں گے، آگ ان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، یہ لوگ کس طرح اس آگ کے اندر صبر کر سکیں گے؟ جواب معلوم ہوا ہے کہ اس آگ کی سختی کو برداشت کرنا انکے بس میں نہیں ہوگا۔ وہ آگ گناہگاروں کو جلانے کے لیے ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ؒ﴿۱۷۶﴾

”یہ اس لیے کہ اللہ نے کتاب سچائی کے ساتھ اُتاری، اور بے شک جنھوں نے کتاب میں اختلاف کیا البتہ ضد میں بہت دور جا پڑے“۔

سچائی اور حق پر مبنی اللہ کی کتاب

یہ آیت بھی پچھلی آیت کا تتمہ ہے جس میں اہل کتاب کی حالت بیان کی گئی ہے کہ ہدایت تو ان کے پاس موجود تھی جس کے مطابق انہوں نے عمل کرنا تھا لیکن انہوں نے جو حق پر مبنی باتیں تھیں ان پر عمل نہ کیا، اس کو چھوڑ دیا اور کتاب کے مطالب میں اختلاف کرنے کے ساتھ ساتھ افتراق اور انتشار کا شکار ہوئے، اصلاح کی بجائے فساد کیا اور حق کی مخالفت کی اور جو فطری، طبیعی ناموس تھی اس کو پامال کیا اور فطرت کے مخالف چلے تو اس پر ان کی سزا آتش جہنم ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

”یہی نیکی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو بلکہ نیکی تو یہ ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر، اور اس کی محبت میں رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں مال دے، اور نماز پڑھے اور زکوۃ دے، اور جو اپنے

معاہدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب وہ عہد کرلیں، اور تنگدستی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں"۔

نیکی کی قبولیت کا ضابطہ

اس آیت میں نیکی کی قبولیت کا ایک کلی ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ کونسی نیکی اللہ کے ہاں قبول ہے؟ آپ کی مرضی ہے، جدھر چاہو رُخ کرلو تو وہ نیکی بن جاتی ہے۔ قبلہ کے بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تبدیل ہونے کی وجہ سے لوگوں کے درمیان جھگڑا اور بحثیں چل رہی تھیں اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر برتری جتا رہے تھے۔ مسیحی مشرق کی طرف رُخ کرکے عبادت کرتے تھے اور یہودی مغرب کی جانب رُخ کرکے عبادت بجالاتے تھے۔ ان کے درمیان یہ مسئلہ ایک مشکل کی شکل اختیار کرچکا تھا تو اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ بات یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرو یا مغرب کی طرف منہ کرو، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادت اور نیکی کے قبول ہونے کا معیار یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کلی ضابطے کو بیان کرنے کے بعد دین کے بنیادی عقائد اور اصول کو بیان کر دیا ہے۔ اس حوالے سے بتا دیا ہے کہ پہلی بات اللہ پر ایمان لانا ہے، دوسری بات آخرت پر ایمان ہے، تیسری بات سارے فرشتوں کو قبول کرنا، چوتھی بات اللہ کی کتاب کو ماننا، سارے نبیوں کو ماننا اور اللہ کی محبت میں رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، ابن سبیل جو سفر میں ہیں اور انکے پاس ضرورت پورا کرنے کا خرچہ نہیں ہے، سوالی اور غلام کو آزاد کرنے کے لیے مال خرچ کریں۔ یہاں پر جس مال کو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے عمومی مال مراد ہے، کیونکہ مال میں سے واجب مقدار خرچ کرنے کا تذکرہ بعد میں آرہا ہے۔ اس آیت

میں بیان کئے گئے دوسرے احکام میں سے یہ ہے کہ جب وعدہ کریں تو اسے پورا کریں، جنگ کی حالت میں، مشکلات میں، بیماریوں میں صبر کریں، صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں تو یہی سچے متقین ہیں، یہ سب متقین کی صفات ہیں۔ نیکی کا باقاعدہ طور پر مصداق یہی امور ہیں ۔ ابرار وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان خصوصیات سے نوازا ہے جن کا تذکرہ اس آیت میں ہوا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

پہلی بات: عقیدہ، یہ ایمان کا پہلا درجہ ہے جیسا کہ پہلے ہم بتا چکے ہیں۔

دوسری بات: عمل، اپنے مال سے اُن افراد پر خرچ کرنا جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا۔

تیسری بات: اخلاقیات، یعنی عہد و پیمان کی پابندی کرنا تاکہ معاشرے اور سوسائٹی کا نظام درہم برہم نہ ہو اور مشکلات میں صبر کرنا جو کہ نفس کا کمال ہے۔ پھر ان خصوصیات کے حامل افراد کی تعریف کی گئی ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے اسلام میں سچے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو دین اسلام کے اصل مفاہیم اور معانی اور مصادیق کو عملی شکل دیتے ہیں۔ انہوں نے دُنیا میں اپنی زندگی سچائی کے اصولوں کے مطابق گزاری ہے۔ یہی تقویٰ والے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان پر واجب کیا ہے اس کی پابندی کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں ایمان ہے، یہ عقیدہ کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں اور اعضاء و جوارح سے عمل کرتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ

تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ رَحۡمَۃٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۸﴾

”اے ایمان والو! مقتولوں میں برابری کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے، آزاد بدلے آزاد کے اور غلام بدلے غلام کے اور عورت بدلے عورت کے، پس جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کیا جائے تو دستور کے موافق مطالبہ کرنا چاہیے اور اسے نیکی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے، یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے، پس جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

قصاص کا حکم

اس آیت میں قصاص کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ جب معاشرے میں قتل ہو جائے تو اس حوالے سے کیا کیا جائے؟ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا وجہ دوسرے کو قتل کرے تو قاتل سے قصاص لیا جائے البتہ اس حوالے سے قاتل اور مقتول کا بعض خصوصیات میں ایک جیسا ہونا ضروری ہے جیسے اگر مقتول آزاد ہو تو قاتل بھی آزاد ہو، مقتول غلام ہو تو قاتل بھی غلام ہو، عورت کے بدلے عورت ہی ماری جائے گی۔ یعنی جو جرم ہوا ہے اسی کے مطابق قصاص ہو گا۔ اگر صاحب خون قاتل کو معاف کر دیتا ہے خواہ پورے حق کو یا کچھ کو مثلاً اگر خون کے وارث متعدد ہیں، کچھ نے معاف کر دیا کچھ نے معاف نہیں کیا تو اس صورت میں قصاص یعنی قتل کا بدلہ قتل ختم ہو جائے گا لیکن دیت برقرار رہے گی۔

آیت میں قاتل کو بھائی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر محبت اور مہربانی کو ابھارا جائے اور معاف کرنے کے عمل کی تشویق کی جائے۔ صاحب حق کو چاہیے کہ وہ قاتل کے ساتھ اچھا رویہ اپنائے۔ اگر وہ قاتل سے خون بہا کا مطالبہ کرے تو وہ خون بہا دینے کا پابند ہو گا

لیکن اس میں اچھائی، احسان اور نیکی کا پہلو مد نظر ہو۔ یہ بات اللہ کی طرف سے ایک تخفیف اور رحمت ہے۔ یہ دو طرفہ معاملہ ہے یعنی اگر صاحب حق صفائے قلب کے ساتھ قصاص کو دیت میں تبدیل یا قاتل کو عفو کرے تو اس میں جو لذت ہے وہ انتقام میں نہیں ہے۔ قصاص کے دیت میں تبدیل ہونے کے متعلق مومنین کو کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے لیے تخفیف ہے۔ اس لیے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، یعنی اگر صاحب خون قاتل کو عفو کرے اور اس کے بعد پشیمان ہو جائے تو پھر وہ قاتل سے قصاص نہیں لے سکتا۔ اگر صاحب خون عفو کرنے کے بعد پشیمان ہو جائے اور قصاص طلب کرے تو وہ متجاوز ہو گا اور اس کے لیے عذاب ہو گا۔ یعنی ایک دفعہ معافی کا اعلان کرنے کے بعد دوبارہ خون کا بدلہ لینے سے منع کیا گیا ہے۔

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"اور اے عقل مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم (خونریزی سے) بچو"۔

قصاص کی حکمت

اس آیت میں قصاص کے قانون کی حکمت کو بیان کیا گیا ہے۔ علم بیان کے اعتبار سے یہ آیت قرآن کریم کی بلیغ ترین آیات میں سے ہے۔ اس آیت میں معنی اور مضمون کے لحاظ سے دقیق ترین بات کا خلاصہ لطیف ترین پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ بہت مختصر جملہ اور بڑے سادہ الفاظ میں قصاص کی حکمت کو بیان کیا گیا ہے۔ قصاص کو معرفہ اور حیات کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس مطلب پر دلالت ہو کہ حیات، قصاص سے وسیع تر اور عظیم تر ہے۔ قصاص کا نتیجہ اور اس کی برکات کا دائرہ وسیع تر ہے اور اس کی بڑائی اور عظمت اس سے زیادہ ہے کہ اسے زبان سے بیان کیا جائے۔ اس جملے میں بہت سارے لطائف ہیں جن کو اس مختصر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس نے بلاغت اور فصاحت کے تمام جملوں کو عبور کر لیا ہے۔ عفو کے حکم کے

بعد " لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ " کا جملہ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ اس نکتے کو بیان کیا جائے کہ اگرچہ عفو میں قاتل کے لیے تخفیف اور رحمت ہے لیکن عمومی مصلحت صرف قصاص سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ قصاص کا اجرا ہی حیات کی ضمانت دیتا ہے نا کہ عفو اور دیت وصول کرنا اور نہ ہی اس کی جگہ کوئی اور چیز۔ تم اگر قصاص کے قانون پر عمل کروگے تو تقویٰ والے بن جاؤگے اور پھر قتل کرنے سے رکوگے۔ یہ جملہ قصاص کی حکمت کو بیان کر رہا ہے کہ قصاص معاشرے میں خوبصورت اور طیب زندگی کے لیے ہے، اگر قصاص کے قانون پر عمل کیا جائے تو معاشرے میں قتل و غارت گری نہیں ہوگی، بلاوجہ افراد قتل نہیں کئے جائیں گے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

"تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے اگر وہ مال چھوڑے تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے مناسب طور پر وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر حق ہے۔"

وصیت کا حکم

اس آیت میں وصیت کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کا انداز وجوب والا ہے استحباب والا نہیں ہے اور اس کی تایید آیت کا آخری حصہ ہے۔ اہل تقویٰ پر واجب ہے کہ موت سے پہلے خیر یعنی معروف اور احسان کے متعلق اپنے رشتہ داروں کو وصیت کریں۔ کیونکہ اہل تقویٰ ہی ہیں جو اپنے رب کے اوامر کی پابندی کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت وراثت کی آیات کے وسیلے سے نسخ ہو چکی ہے، جس میں میت کے چھوڑے ہوئے میراث کا قانون بیان ہوا ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر اس کا وجوب نسخ ہوا ہے، لیکن استحباب اپنی جگہ پر باقی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حق کو متقین کے ساتھ مقید کرنا اسی غرض کو پہنچانے

کے لیے ہو۔ البتہ وصیت کے استحباب میں تو کسی کو شک نہیں ہے لیکن بعض نے وجوب کا کہا ہے تو اس کا تعلق علم فقہ سے ہے اس حوالے سے ہر شخص اپنے فقیہ اور مرجع تقلید کے فتویٰ کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثۡمُهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ يُبَدِّلُوۡنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ؕ﴿۱۸۱﴾

"پس جو اسے اس کے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ ان ہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں، بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

وصیت کو تبدیل کرنے کی ممانعت

پچھلی آیت میں وصیت کے بارے حکم دیا گیا ہے کہ والدین اور رشتہ داروں کے لیے اچھائی، نیکی اور احسان کی وصیت کریں۔ اس میں اگلا حکم یہ دیا گیا کہ اگر مرنے والا وصیت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے مال میں سے ایک خاص حصہ کسی کو دینا ہے تو اس کے مرنے کے بعد اس کے کل مال کے تیسرے حصہ پر اس کی وصیت لاگو ہو گی اور اس کو اصل ترکہ سے پہلے الگ کیا جائے گا اور باقی بچنے والے مال کو ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ وصیت کا حکم واجب ہے۔ اس لیے جب میراث کے تفصیلی احکامات آئے تو اس میں جو حکم تھا وہ نسخ ہو گیا ہے لیکن وصیت کا استحباب اپنی جگہ پر باقی ہے اور ہر شخص وصیت کر سکتا ہے بلکہ وصیت کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ اب اگر کسی نے وصیت کی ہے اور دوسروں نے اس وصیت کو سنا بھی ہے تو پھر اس وصیت کو تبدیل کرنا بڑا جرم ہے اور اس کا گناہ اسی پر ہو گا جس نے اس وصیت کو تبدیل کیا ہے۔ وصیت کے مطابق عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

البتہ اس کی وصیت مال کے تیسرے حصہ پر ہو گی باقی مال ورثاء میں تقسیم ہو گا جیسے وراثت کے قوانین وضابطے ہیں۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

"پس جو وصیت کرنے والے سے طرف داری یا گناہ کا خوف کرے پھر ان کے درمیان اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے"۔

وصیت میں کمزوریوں کی اصلاح کرنا

" جَنَف" انحراف کے معنی میں ہے۔اس آیت میں وصیت کا ایک اور حکم بیان کیا جارہاہے کہ اگر وصیت کرنے والے نے وصیت کرنے میں کوئی غلطی، گناہ یا انحراف کیا ہے اور حق سے پھرا ہے تو جو وصی ہے اسے چاہیے کہ وہ اسکے ساتھ بھلائی کرے اور اس نے جو انحراف کیا ہے اس میں اصلاح کرے تاکہ اس کے ورثاء کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوں۔ اس طرح اس کے عمل سے وصیت کرنے والے کو بھی فائدہ پہنچے گا اور اس کے ورثاء کو بھی فائدہ پہنچے گا۔وصیت میں اس طرح اصلاح کرنا درست ہے اور اس عمل سے وصیت پر عمل کرے گا اصلاح کرنے کے بعد۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے اور اپنے بندوں پر مہربانی کرتا ہے اور اسی حوالے سے یہ حکم دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے ان پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ"۔

روزے کا قانون

اس آیت میں روزے کے قانون کو بیان کیا گیا ہے۔آیہ میں اللہ تعالیٰ کا خطاب مومنین کو ہے اور جو حکم بھی اللہ کی طرف سے ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ان ہی لوگوں کے لیے ہوں گے جن میں ایمان کی صفت ہو گی۔ جو ایمان نہیں لاتے اگرچہ ان پر بھی واجبات و فرائض ہیں، لیکن جب تک وہ ایمان نہیں لاتے تو ان سے وہ عمل قبول نہیں "کُتِبَ" واجب کے معنی میں ہے۔ "صِیَامُ" کا معنی سحری کے وقت سے لے کر رات تک اپنے آپ کو اس عمل سے روکے رکھنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ یہ لفظ روزے کے لیے استعمال ہوا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ روزہ فقط اُمت مسلمہ اور اُمت محمدی پر فرض نہیں ہوا، بلکہ اس سے پہلے بھی جو اُمتیں تھیں ان پر بھی روزہ فرض تھا۔ اس طرح نہیں کہا گیا کہ اُن سب میں روزہ تھا بلکہ ایک کلی حکم روزے کا ان کے لیے تھا۔ یہ حکم اُن اقوام کے لیے تھا جو دین اور شریعت رکھتی تھیں، جو کسی دین اور شریعت کے پیروکار ہی نہ ہوں تو انہوں نے کیا روزہ رکھنا تھا؟

پھر روزے کے واجب ہونے کی وجہ بتائی گئی کہ روزے کیوں فرض کئے گئے ہیں۔ اس کی وضاحت کر دی گئی کہ روزہ انسان کو پاک کرتا ہے اور اس کو ارتقاء اور کمال تک لے جاتا ہے۔ انسان کو کمال کے مرحلے تک لے جانے کے لیے روزے کو فرض کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو حلال جسمانی لذتوں سے بچائے، اور وہ چیزیں جو عام حالات میں جائز ہیں ان کو بھی ایک وقت کے لیے اپنے اوپر حرام قرار دے دے تو وہ اپنے آپ کو مادیات کی وابستگی اور تعلق داری سے محفوظ کر لے گا۔ اس لیے روزہ انسان کو متقی بنانے کا

سبب بنتا ہے اور یہ بہترین عمل ہے انسان کے معنوی ارتقاء کے لیے اور انسان کے کمال تک پہنچنے کے واسطے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

"گنتی کے چند روز، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے، اور ان پر جو اس کی طاقت رکھتے ہیں فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا، پھر جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے، اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو"۔

روزہ رکھنے سے مستثنیٰ افراد

اس آیت میں روزہ کے متعلق مزید تفصیل بتائی جارہی ہے۔ ایام کو نکرہ لایا گیا ہے تو اس سے مراد اُن کے عدد کی کمیت کی طرف اشارہ ہے یعنی اتنے دن جن کو گنا جاسکتا ہے، محدود دن جن کی تعداد معلوم ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ روزہ رکھنے کے ایام کی تعداد معلوم ہے۔ دوسری آیت میں آئے گا کہ سال میں ماہ رمضان کے مہینے میں تیس دن یا انتیس دن، ایک ماہ روزے رکھنے کا حکم ہے۔ آیت میں بیماری کی حالت کو استثناء کیا گیا ہے۔ روزہ صرف صحت و تندرستی کی حالت میں واجب ہے۔ اگر کوئی فرد بیمار ہے تو اس پر روزہ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر روزہ رکھنا اس کی بیماری کو مزید بڑھادے یا اسے اور بیماری لگ جائے

گی اوراس کی صحت کے لیے نقصان کا سبب ہو تو اس پر بھی روزہ واجب نہیں ہے۔ البتہ اس کی تشخیص ماہر ڈاکٹر کے ذریعہ ہی کروانا ہو گی۔ ایسے افراد دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لیں گے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص سفر پر ہے، وطن سے باہر گیا ہوا ہے اور سفر کی جو شرائط ہیں، اٹھائیس میل آنے جانے کا جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے، اس کے لیے بھی رخصت ہے کہ وہ سفر میں روزہ نہ رکھے بلکہ دوسرے دنوں میں رکھے۔ یہ بھی فقط رخصت نہیں بلکہ حتمی فیصلہ ہے کہ مسافر اور بیمار روزہ نہ رکھیں، وہ جب صحت مند ہو جائیں یا اپنے وطن میں ہوں تو اس وقت روزہ رکھیں گے۔ یہاں پر روزہ کے حوالے سے دوسرا حکم بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے فدیہ دینے کا حکم۔ "اطاق" اپنی پوری طاقت اور قوت کو کسی عمل کے استعمال میں لے آنا کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی یہ ہو گا کہ وہ لوگ جو کسی بھی حوالے سے اپنی طاقت استعمال میں لا کر روزہ نہ رکھ سکیں تو ان پر ہے کہ وہ اس دن کا فدیہ دیں۔ فدیہ بَدَل اور عوض کے معنی میں ہوتا ہے۔ اس دن کے روزہ کے بدلے مالی عوض دیں۔ فدیہ میں عام طور پر ایک مسکین کو درمیانے درجے کا کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور یہ وجوب بھی عینی اور حتمی ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس میں اختیار ہو۔ اختیار اسے نہیں ہے یعنی جب وہ پوری طاقت لگانے کے باوجود بھی روزہ نہیں رکھ سکتا تو پھر اس کے لیے ہے کہ وہ روزہ نہیں رکھے بلکہ اس روزے کے بدلے میں فدیہ دے۔ اس کی مزید تفصیل فقہی کتابوں میں روزے کے احکام میں موجود ہے۔

اگر کوئی رضاکارانہ طور پر اچھا عمل انجام دیتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ "طوع" اپنی پسند اور رغبت سے کوئی کام انجام دینے کے معنی میں ہے۔ اگر کوئی رغبت اور چاہت سے کام انجام دیتا ہے اور اس میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہوتی تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ روزے رکھنے کے عمل میں کوئی جبر نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے اختیار سے رکھنا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کو استحباب کے معنی میں لیا ہے لیکن المیزان کے مؤلف نے اس چیز کو قبول

نہیں کیا وہ اس کو پورے عمل کی طرف اشارہ جانتے ہیں کہ یہ جو روزے کا عمل ہے یہ اپنے اختیار اور رغبت سے کریں گے اور رغبت سے روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ خود روزہ خیر ہے اور پھر روزے میں اختیار اور رغبت یہ ایک اور خیر ہے۔

حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزاء دُوں گا" "امیں ہی اسکی جزاء ہوں"۔

روزے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ انسان مادی تعلقات، دُنیا دوستی سے بلند تر ہو جائے، مادی آلودگیوں سے پاک ہو جائے، خود پرستی سے پاک ہو جائے۔ روزہ انسان کے اندر محدودیت لے آتا ہے اور اسے انسان کو معرفت حاصل ہوتی ہے اور روزہ انسان کو خدا تک لے جاتا ہے۔ روزے میں ریا کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ نماز یا حج غیر خدا کے لیے بھی ہو سکتی ہے لیکن روزے میں غیر خدا کے لیے ہونے کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں خدا کی رضا ہوتی ہے کیونکہ روزہ ایک ایسا عمل ہے جس کی خبر یا اسے ہوتی ہے جس نے روزہ رکھا ہے یا پھر اللہ کو ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے روزہ کو اپنی طرف نسبت دی ہے، ویسے تو ہر عمل خدا کے لیے کرنا چاہئے لیکن روزہ کے بارے میں ایک خصوصی حکم ہے کیونکہ جس طرح باقی اعمال میں ریاکاری اور غیر خدا کا تصور آسکتا ہے وہ روزے میں نہیں ہو سکتا۔ روزہ ایسی عبادت ہے جس میں عبادت خالص اللہ کے لیے ہوتی ہے اس میں ریا، دکھاوا اور دیگر عناوین جو عبادت کو باطل کر دیتی ہیں اسکا امکان کمتر ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ

لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۫ وَ لِتُکْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

"رمضان کا وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے واسطے ہدایت ہے اور ہدایت کی روشن دلیلیں اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے کو پالے تو اس کے روزے رکھے، اور جو کوئی بیمار یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے، اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر تنگی نہیں چاہتا، اور تاکہ تم گنتی پوری کرلو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو"۔

قرآن کا تعارف اور ماہِ رمضان کے روزوں کا حکم

اس آیت میں دو امر واضح کئے گئے ہیں؛ ایک تو یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن جو اللہ کی آسمانی کتاب ہے یہ ماہ رمضان میں نازل ہوئی ہے۔ اور پھر قرآن کی تعریف کی گئی ہے، اس کی توصیف بیان کی گئی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ لوگوں کے لیے راہنما ہے، ہدایت ہے، اُن کو دُنیاوی زندگی میں کیسے رہنا ہے، اس کی تمام راہنمائی دی گئی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ، اس کے انبیاء اور اللہ کی سابقہ اُترنے والی کتابوں کی پہچان کروائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت اور راہنمائی کے لیے اس کتاب کے اندر روشن دلائل موجود ہیں اور جو شخص اس کتاب کو پڑھ لے تو وہ ہدایت پر آجاتا ہے اور جو بھی اپنے آپ کو ہلاکت سے بچانا چاہے تو یہ کتاب ان کے لیے روشن مینارہ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کتاب حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالنے والی ہے۔ اس کے دلائل بڑے واضح ہیں اور اس کے ذریعے حق اور ناحق میں بڑی آسانی سے تمیز کی جا سکتی

ہے۔ شرط یہ ہے کہ کوئی اس نظر سے قرآن کا مطالعہ کرے اور قرآن کو پڑھے۔ جیسا پہلے کہا گیا قرآن میں روزے کے گنے ہوئے دن ہیں جن میں روزہ رکھنا ہے۔ اب بتا دیا کہ جو شخص بھی ماہ رمضان کے چاند کو دیکھے تو اس کو چاہیے کہ وہ روزہ رکھے اور حدیثوں میں بھی ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ کھولو۔ چاند دیکھنا ضروری ہے۔ یہاں پر استثناء جو پہلے بھی بتایا گیا کہ مریض اور جو سفر پر ہیں یہ دو ایسے ہیں کہ ان کے لیے حکم ہوا کہ یہ ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں۔ بلکہ وہ ماہ رمضان کے علاوہ کسی اور دن میں روزہ رکھیں گے۔ پچھلی آیت اس آیت میں بیان شدہ حکم کے لیے ایک قسم کا مقدمہ اور تمہید تھی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق مریض اور مسافر کو روزے سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا ہے کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے وہ کسی مشکل میں پڑ جائیں، وہ اس دن کے روزے کے عوض کسی اور دن روزہ رکھیں گے۔ یہاں پر تیس دن بیان نہیں ہوئے بلکہ مہینہ بتایا گیا ہے اس کہ وجہ یہ ہے کہ چاند کے حساب سے مہینہ دو طرح کا ہی ہوتا ہے یا تو انتیس دن کا ہوتا ہے یا پھر تیس دن کا مہینہ ہوتا ہے۔ جتنے بھی دن کا مہینہ تھا اتنے دن پورے کرنے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جو تمہاری ہدایت کا انتظام کیا ہے تمہاری راہنمائی کی ہے تو تمہارے اوپر فرض ہے کہ تم اللہ کی بزرگی اور برتری کو بیان کرو، اس لیے کہ اس عمل کے ذریعے تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا رہے ہو۔

روزے کا نتیجہ تمہارے سامنے آگیا اور وہ اللہ کی کبریائی اور حق تعالیٰ کی بزرگی کا بیان ہے۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اُتارا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اللہ کی اس بڑی نعمت کا شکر روزہ رکھ کر کریں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور بندوں کی عبودیت کا طریقہ بیان کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نعمت دی ہے اور حق و باطل کے امتیاز کے لیے کتاب اُتار دی ہے تاکہ کوئی بھٹکے نہیں تو گویا کہ یہ ایسی نعمت ہے جس پر ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے یعنی اللہ کی بزرگی اور اللہ کی برتری اور اللہ کی شان کو بیان کرے۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں نزدیک ہوں، دُعا کرنے والے کی دُعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، پھر چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں''۔

اللہ دعاء کرنے والے کی دعا سنتا ہے

اس آیت میں دعاء کا حوالہ آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی الہام فرمایا کہ لوگ دعا کریں اور پھر ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ اللہ دعا کو سنتا ہے۔ یہ جو فرمایا میرے بندے! یہ پیار کی بات ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سمجھانے کے لیے واسطہ ختم کر دیا اور کہا میرے بندوں کو بتادو کہ میں نزدیک ہوں اس میں شک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی اور رحمت کرتے ہوئے فعل کے صیغہ کے بجائے صفت بیان کی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ صفت میں دوام اور قرب کا معنی پایا جاتا ہے۔اللہ فرمارہا ہے میں ہمیشہ اور ہر وقت ہر بندے کے قریب ہوں۔ اس جگہ مضارع کا صیغہ لایا گیا ہے کہ میں ہر وقت دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں اور ایسا نہیں ہوتا کہ وہ مجھے پکارے اور میں اس کا جواب نہ دوں۔ فقط یہ ہے کہ جواب اسی وقت دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارے، جب وہ مجھ سے مناجات کرے، مجھ سے مانگے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں ہے، ادھر دُعا اور اُدھر اجابت، یعنی بغیر شرط اور بغیر قید کے دعا سنی جاتی ہے اور جس کے حضور دعا کی گئی ہے وہ اس دعا کو سنتا ہے۔

سوال ہمیشہ کسی فائدے کے لیے ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں کسی ہدف تک پہنچنے کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ اللہ فرمارہا ہے جب بھی میرا بندہ مجھ سے کچھ مانگے، بغیر قید و شرط کے دعاء قبول کروں گا۔ تو جس وقت بھی دعا کرنے والا حقیقی دعا کرے گا، دل و زبان سے پکارے گا، اس کی چاہت فطرت کے مطابق ہو گی، تو بغیر کسی قید و شرط کے اسکی دعا قبول ہو گی۔ اگر دعا قبول نہیں ہوئی اور اسکا نتیجہ سامنے نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ ہو گی یا تو دعا حقیقی نہیں تھی، خالی لقلقہ زبان تھا، دل سے نہیں پکارا تھا۔ یا ایک ایسی چیز مانگ رہا ہے جس کی حقیقت کا اس کو علم ہی نہیں ہے، یا دعا میں اس نے اللہ کو نہیں پکارا، زبان سے خدا خدا کیا ہے، دل میں ظاہری اسباب اور مادی اور خیالی اسباب اور وسائل اس کی نظر میں تھے تو ایسے شخص کی دعا بھی بے نتیجہ رہ جاتی ہے۔

اس کے اوپر اللہ تعالیٰ نے ایک نتیجہ مرتب کیا ہے کہ اے میرے بندو! دیکھو جب میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں اور تمہاری حاجت کو پورا کرتا ہوں اور تمہاری دعا قبول کرتا ہوں اور تمہیں جواب دیتا ہوں، تو جب میں تمہیں پکارتا ہوں تو تمہیں چاہیے کہ تم بھی ہدایت پر آؤ، اسلام کو قبول کرلو۔ جس پر اسلام کو قبول کرنا دشوار ہو تو وہ گمراہ ہے۔ تمہارا رب بہت مہربان جس نے سات مرتبہ متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اور بات کی سات مرتبہ اپنی طرف نسبت دی ہے بغیر واسطہ کے، میرے بندے! میرے متعلق، مجھ سے دعا مانگو اور میرے لیے، میری بات کو مانو، میرے اوپر ایمان لے آؤ سات مرتبہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت دے کر بندوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اے میرے بندو! تم کیوں پس و پیش کر رہے ہو؟ خدا کی جو دعوت ہے اسلام کی دعوت، ایمان کی دعوت، اعمال کی دعوت، رشد و ترقی کی دعوت، کمال کی دعوت، اس کو قبول کرلو اور اسی راستے پر آجاؤ، یہ راستہ تمہاری ترقی اور کمال کا راستہ ہے۔ اللہ کا یہ انداز بتا رہا ہے کہ اللہ کو اپنے بندوں سے کتنا زیادہ پیار ہے اور چاہتا ہے کہ سب اسلام کو قبول کرلیں اور ہدایت پر آجائیں کوئی بھی گمراہ نہ ہو۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ
اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ
كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ
عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

"تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا حلال کیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے پردہ ہیں اور تم ان کے لیے پردہ ہو، اللہ کو معلوم ہے تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے پس تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں معاف کر دیا، سو اب ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تمہارے لیے سفید دھاری سیاہ دھاری سے فجر کے وقت صاف ظاہر ہو جائے، پھر روزوں کو رات تک پورا کرو، اور ان سے مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو، یہ اللہ کی حدیں ہیں سو ان کے قریب نہ جاؤ، اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیز گار ہو جائیں"۔

روزے کی حالت میں ممنوع چیزیں

اس آیت میں روزے کے حوالے سے ہی مزید کچھ احکام بیان ہوئے ہیں۔ روزے میں جو چیزیں انسان کے لیے جائز نہیں ہیں اس کی تفصیلات تو فقہی کتابوں میں ہے ، اس بارے ایک بات تو یہ بیان کی گئی ہے کہ روزے کی حالت میں اپنی بیویوں کے ساتھ ہمبستری نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دن کو روزہ رکھو لیکن تمہیں رات کو ان کی قریب جا نے کی اجازت دی گئی ہے۔ پھر شوہروں اور بیویوں کے حوالے سے ایک بہت ہی لطیف انداز سے بات کہی گئی کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لیے ساتر اور پردہ کا سبب ہیں، وہ فسق و فجور سے ایک دوسرے کو روکتے ہیں، ایک دوسرے کی بدی اور برائیوں کو چھپاتے ہیں، عیبوں پر پردہ ڈالتے ہیں، یہ بہت ہی عمدہ اور لطیف استعارہ ہے۔ انسان لباس کے ذریعہ اپنی شرمگاہ کو چھپاتا ہے ، جبکہ اوپر والا لباس کسی سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح بیوی شوہر کے عیبوں پر پردہ ڈالتی ہے اور وہ عیب جو دوسروں سے چھپے ہوتے ہیں، اس کی بیوی کو معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح شوہر بیوی کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے جبکہ وہ عورت لوگوں کے سامنے ہوتی ہے لیکن لوگوں کو اس کے عیبوں کا علم نہیں ہوتا، اس کے عیبوں کا اس کے شوہر کو ہی پتہ ہوتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن عباس اور ابو ہریرہ سے اس حوالے سے نقل ہوا ہے کہ مسلمان ماہ رمضان میں جب نماز عشاء پڑھ لیتے تھے اور اور کھانے سے فارغ ہو جاتے تھے تو وہ رات کو بیویوں کے قریب جانے کو حرام سمجھتے تھے اور کچھ مسلمان نماز عشاء کے بعد اس جنسی خواہش کے مرتکب ہوتے تھے اور اس عمل کو اپنے لیے خیانت سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں نے اس مسئلے کی پیغمبر اکرم ﷺ سے شکایت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ تم اس عمل سے اللہ کی نافرمانی کرتے ہو اور اپنے آپ سے خیانت کرتے ہو۔

اس میں استمرار کی جانب بھی اشارہ ہے یعنی جب روزہ کا قانون بنا تو لوگ چھپ کر اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔وہ روزہ کی رات کھانا بھی کھا لیتے اور جماع بھی کر لیتے تھے۔

اس آیت سے وہ حکم نسخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم جو جرم کرتے تھے اور خیانت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ معاف کر دیا اور یہ حکم تم سے اٹھا لیا ہے۔عفو اور توبہ وہاں ہی ہوتی ہے جہاں پہلے معصیت ہو چکی ہو۔ اس عمل کا حکم نسخ ہو گیا اور پھر کہا کہ اب آپ کو اجازت ہے کہ آپ اپنی بیویوں کے ساتھ آمیزش کر سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے اولاد مقدر کی ہے وہ اللہ سے درخواست کرو اور اس طرح روزہ کی رات میں مباشرت اور ہمبستری کے جواز کا حکم آیا۔''ابتغاء'' اولاد کی طلب کے معنی میں ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر شہوت بجھانے کے ارادے کے سوا کچھ اور نہیں، لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اولاد مقدر کی ہے تاکہ اس طرح اولاد کا سلسلہ جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے تعلق کو صرف شہوت بجھانے کے لیے نہیں رکھا بلکہ اسے انسانی نسل کی بقاء کا وسیلہ قرار دیا ہے اسی لیے اس آیت میں کہا ہے کہ ہمبستری کے وقت اللہ سے اولاد طلب کرو۔

طلوع فجر تک کھانے پینے کی اجازت

پھر حکم دیا کہ کھاؤ پیو۔رات کو کھا پی سکتے ہو اور فجر کا لفظ آیا ہے اس کے دو مصداق ہیں، ایک تو فجر اول ہے جس کو فجر کاذب کہتے ہیں دوسری فجر صادق ہے۔سفید خط اور سیاہ خط، یہ لکیر ہوتی ہے جو دو قسم کی ہے جب یہ بالکل آپس میں الگ الگ ہو جائیں یعنی جب اندھیری اُفق پر سفیدی چھا جائے اور ایک دھاگے کی طرح سفیدی اوپر سے نیچے جا رہی ہو اور اندھیرے کو سیاہ لکیر کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ اصل میں معین کیا گیا ہے کہ فجر صادق کے طلوع کا پہلا وقت کب ہے اور وہ یہ ہے

کہ جب سفیدی اوپر آجائے اور نور کی شعاع دونوں لکیروں سے جدا آرہی ہو ایک سیاہ لکیر کے ساتھ جب سفید لکیر آجائے تو گویا کہ صبح صادق ہو گئی ہے۔ یعنی جیسے ہی صبح صادق ہوجائے تو کھانا پینا بند کر دینا ہو گا۔

روزے کے اختتام کا وقت

پھر کہا گیا کب تک بند رکھنا ہے؟ روزے کو رات کے چھا جانے تک مکمل کرنا ہے۔روزہ چاہے واجب ہو یا مستحب ، آغاز فجر سے رات تک روزے کو باطل کرنے والی چیزوں سے دوری کرنا ہوگا۔ صبح سے رات تک ایک ہی عبادت ہے ۔ اس میں افتراق اور جدائی نہیں ہے ۔''الی اللیل'' رات چھا جانے تک۔ اس بنا پر غروب آفتاب رات نہیں ہے بلکہ غروب کے بعد جب تھوڑا اندھیرا چھا جائے تو اس کو رات کہتے ہیں، اسی لیے یہاں رات کا لفظ آیا ہے۔ اس بارے مسلمانوں میں اختلاف ہے فقہائے حنفی اور ان کے پیروکار بالکل غروب کے وقت کو افطار کا وقت قرار دے دیتے ہیں، جبکہ فقہ جعفری کے پیروکار غروب کے تیرہ سے اُنیس منٹ بعد انتظار کرتے ہیں اور رات چھانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

معتکفین کے لیے فرمان

اس آیت میں بیان کیا گیا دوسرا حکم یہ ہے کہ جب مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں، اعتکاف ایک علیحدہ عبادت ہے جس میں مسجد میں ہی بیٹھنا ہوتا ہے تین دن کے لیے اور روزہ بھی رکھنا ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی روزہ رکھنا اور مسجد سے بغیر کسی معقول عذر کے باہر نہیں نکل سکتے اور غیر خدا کی طرف توجہ نہیں کر سکتے تو اس وقت اعتکاف کے جو ایام ہیں، اس جگہ پر موجود رہنا ہوتا ہے۔ اعتکاف کی حالت میں بیویوں کے ساتھ قرابت نہیں کر سکتے۔ روزے کی حالت میں بیویوں سے ہمبستری کرنے سے

منع کیا گیا ہے لیکن روزے کی آنے والی شب میں بیوی سے ہمبستری کر سکتے ہیں۔ اس حکم سے اعتکاف والوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے اور ان کو یہ حکم ہے کہ وہ رات کو بھی اپنی بیویوں کے ساتھ ہمبستری نہیں کر سکتے۔ اسکے بعد اللہ نے بتا دیا ہے کہ یہ اللہ کی طے شدہ حدود ہیں، ان کی خلاف ورزی درست نہیں ہے۔ اللہ کی ان حدود کے قریب مت پھٹکو، ان کو توڑو مت۔ یہ رکاوٹیں ہیں جو بتا دی گئی ہیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی نشانیاں بتاتا ہے اور وضاحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ تم لوگ متقی بنو اور اپنے آپ کو ہلاکت سے بچاؤ، عذاب سے بچاؤ، اللہ کی ناراضگی سے بچاو، یہ سب تقویٰ کے حصول کے ذرائع ہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

”اور ایک دوسرے کے مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ، اور انہیں حاکموں تک نہ پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو“۔

باطل طریقے سے دوسروں کا مال کھانا

اس آیت میں اموال کے حوالے سے بات ہو رہی ہے۔ ”تصرف“ یعنی کسی کے مال کو بغیر اجازت کے اپنے استعمال میں لے آنا۔ یہ لفظ دوسروں کا مال کھانے پر استعمال ہوتا ہے۔ مال وہ چیز ہے جس کی طرف انسانوں کی رغبت ہوتی ہے، ایسی چیز جس پر انسان کا دل لگتا ہے اور ”تدلوا“ کا معنی عطا بھی ہے تو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے آپس میں جو مال ہے یہ باطل طریقے سے مت کھاؤ، باطل حق کے مقابلے میں ہے، ”حق“ وہ ہوتا ہے جو کوئی ثبوت رکھتا ہے، ”باطل“ وہ ہے جس کا ثبوت نہیں ہے۔ مال تو اصل میں اللہ کا ہے اور اللہ نے لوگوں

کے درمیان مال کی تقسیم کے لیے عادلانہ قوانین بنائے ہیں تاکہ ان کی مالکیت ان قوانین کی روشنی میں ثابت ہو۔ اگر وہ قوانین کی خلاف ورزی کریں گے تو مالکیت ثابت نہیں ہو گی اور مالکیت کے ثبوت کے باقاعدہ قواعد ہیں اور یہ اس لیے ہے تاکہ فساد کی جڑیں کاٹ دی جائیں۔ اس حوالے سے حکم ہوا ہے کہ باطل طریقے سے مال مت کھاؤ کیونکہ اگر مال اس طرح کھاؤ گے تو تمہیں اس کی سخت سزا ملے گی کیونکہ یہ گناہ ہے۔ پھر اس کے ساتھ ایک اور بات کہہ دی کہ رشوت کے طور پر بھی حکمرانوں کو مال نہ دو، تاکہ اس رشوت کے ذریعے تم دوسروں کے مال کو ہڑپ کر جاؤ۔ "دلو" ڈول کو کنوئیں میں ڈالنا اور اس سے پانی کھینچنا۔ یہ کنایہ ہے کہ انسان رشوت دے کر حکمرانوں کو اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے اپنی طرف کھینچ کر لے آئے۔ "فریق" ایک گروہ جو علیحدہ ہوا ہو، ہر چیز جو اس نے الگ کر رکھی ہے، "اموال الناس" جو لوگوں کے اموال ہیں۔

دوسروں کے مال کا اسلام میں بہت احترام ہے اور مالکیت کو اسلام میں محترم قرار دیا گیا ہے۔ دوسروں کے مال کے احترام کے بغیر انسانی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اس میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ "اثم" یہاں رشوت دینے والے کے لیے ہے کہ دوسرے کا مال کھانے والے نے گناہ کیا ہے اور رشوت لینے والے نے بھی گناہ کیا ہے اور لوگوں کو ناجائز طریقے سے نقصان پہنچانا اور ان کے اموال کو آپس میں ناجائز طور پر تقسیم کرنا، رشوت کو ذریعہ بنا کر حکمرانوں سے اپنے حق میں فیصلے لینا، یہ سب گناہ ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع کیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

"آپ سے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو یہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت کے اندازے ہیں، اور نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ لیکن نیکی اسکے لیے ہے کہ جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے (اللہ کے عذاب سے ڈرے) اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"۔

چاند کی مختلف شکلوں کی حکمت

"اھلہ" ھلال کی جمع ہے جو پہلی، دوسری یا تیسری رات کے چاند کو کہا جاتا ہے۔ چاند جب سورج کی شعاعوں سے باہر نکلتا ہے تو اس وقت جو حالت چاند کی ہوتی ہے اس کو ہلال کہا جاتا ہے۔ بعض نے ساتویں رات تک کی حالت کو ہلال کہا ہے۔ بچے کے پیدا ہونے کے فوراً بعد رونے کی آواز کو "استہلال" کہتے ہیں۔ چاند کی مختلف شکلوں کے متعلق لوگوں کا سوال ہے کہ اس کا کیا فائدہ ہے؟ ہلال سے لے کر بدر تک، بدر یعنی چودھویں رات کا مکمل چاند۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ یہ لوگوں کے لیے اوقات بتاتا ہے اور حج کے وقت کو معین کرتا ہے۔ "مواقیت" میقات کی جمع ہے جس کا معنی کسی عمل کے لیے تعین شدہ وقت۔ اسی طرح ایک عمل کے لیے معین جگہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو فرمایا ہے کہ یہ اوقات اعمال کی ترتیب کے لیے ہیں اور قمری مہینے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور وقت کو طے کرنے میں آسانی کا ذریعہ ہیں۔ اسی طرح حج بھی معین مہینے میں ہے اور انہی چاند راتوں کے ذریعے اس کی پہچان ہوتی ہے۔

گھروں میں آنے کے آداب

یہاں پر ایک اور حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جب گھروں میں آتے ہو تو ان کے پچھواڑے سے مت آؤ۔ زمانہ جاہلیت میں ایسا تھا جب وہ حج پر آتے تھے تو گھروں کے پیچھے سے ان میں داخل ہو جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ادب بتایا کہ جب کسی کے گھر میں جاؤ تو اس کے دروازے سے اندر جاؤ اور یہ تقویٰ کے مطابق ہے خدا ترسی، متقی ہونا یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کا جو طریقہ ہے اسے استعمال کرو کہ گھر کے دروازے سے اندر آؤ کیونکہ یہ اس گھر والے کے لیے خوشحالی کا سبب ہوگا اور اس طرح نفرت بھی ایجاد نہیں ہوگی۔

اس حکم کے ذریعے ادب بھی سکھایا گیا ہے کہ گھر میں کس طرح داخل ہونا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ جاتے تھے کہ دروازے کی طرف کیوں جائیں، شاید بڑی حویلیاں ہوں گی جن کے پیچھے سے ہی اندر کود جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرکے تقویٰ اختیار کرو اور تقویٰ ایمان کے سارے مراتب اور تمام کمالات کی جامع حالت ہے اور جب انسان کے پاس کمال کے تمام مراتب آجائیں اور ساری حالتیں اس میں ہوں تو وہ کامیاب ہو گا۔ کمال کا انتہائی مقام اور ایمان یہ انسان کی فلاح، رستگاری اور کامیابی کا ذریعہ ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ تقویٰ والے ہو جاؤ، شاید اس طرح تم کامیاب ہو جاؤ، یہ نہیں کہا کہ کامیاب ہوگے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ انسان کو کامیابی کی طرف ہدایت کرتا ہے، راہنمائی دیتا ہے اور کامیابی کا سبب بنتا ہے۔ تقویٰ کے نتیجے میں جو ثواب ملتا ہے وہ ثواب ہی کامیابی ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۱۹۰

''اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔

مشرکین سے جہاد کا حکم

اس آیت میں جہاد اور جنگ کا حکم بیان ہوا ہے لیکن اس میں ایک شرط لگادی ہے۔ یہ پہلا حکم تھا جو مشرکین مکہ سے جنگ کے متعلق آیا کہ جو بھی تمہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تم بھی اس کا مقابلہ کرو۔ البتہ تمہارا یہ کام اللہ کے لیے ہو۔ یہ کام اس کے دین کا نفاذ، توحید کے کلمے کی سربلندی اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہو، لوگوں کے اموال اور ان کی ناموس پر قبضہ کی نیت سے نہ ہو اور قومیت، قبیلے اور جاہلیت کے زمانے کی جو عصبیت اور تعصب موجود تھا اسکا بدلہ چکانے کی نیت سے نہ ہو کہ ان پر غلبہ ہو جائے یا غنیمت حاصل کرنے کے لیے ہو یا برتری کی خاطر ہو یا اپنے آپ کو بڑا بنانے کی خاطر ہو۔ بلکہ اسلام میں جو جہاد اور جنگ ہے اس میں دفاع کا پہلو ہے اور وہ بھی ایک محدود حد تک ہے۔

اسلام میں جہاد کو اس حد تک محدود کیا گیا ہے کہ اگر کفار اسلام کے دائرے پر حملہ کریں تو پھر ان حملہ آوروں کے ساتھ جنگ کرنا ضروری ہے اور جب وہ خود حدود کو پھلانگ دیں اور اسلامی سرحدوں پر چڑھائی کردیں تو پھر ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اس جنگ میں بھی یہ کہہ دیا کہ زیادتی نہیں ہونی چاہیے، حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے بلکہ جنگ شروع کرنے سے پہلے حق کی دعوت دینی چاہیے اور حق کی دعوت دیے بغیر ان کے ساتھ جنگ شروع نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح ان کے ساتھ بھی جنگ نہیں کرنی چاہیے جو اسلام کے خلاف جنگ میں نہیں ہیں۔ اسلام امن کا دین ہے اور یہ جنگ بھی ہدایت کے لیے ہے، نہ کہ قتل و غارت گری کے لیے اور مال غنیمت بٹورنے کی خاطر۔

وَ اقۡتُلُوۡهُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡهُمۡ وَ اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡكُمۡ وَ الۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡكُمۡ فِیۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹۱﴾

”اور انہیں قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے، اور غلبہ شرک قتل سے زیادہ سخت ہے، اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے یہاں نہ لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تم بھی انہیں قتل کرو، کافروں کی یہی سزا ہے“۔

مشرکین کو مکہ سے نکال دینے کا حکم

اس آیت میں مشرکین سے جنگ اور جہاد کے حوالے سے دوسرا حکم یہ ہے کہ مشرکین کو جہاں بھی پاؤ انہیں نابود کردو، انہیں مکہ سے نکال دو۔ فتنہ ہر وہ عمل جو آزمائش کے پیش نظر انجام دیا جائے۔ اس آیت میں فتنہ سے مراد کسی کو اللہ کا شریک قرار دینا، اللہ کے رسولؐ کا انکار کرنا، مسلمانوں کو اذیت دینا ہے۔ یہ وہ اعمال تھے جو مشرکین مکہ نے ہجرت کے بعد انجام دیے اور ہجرت سے پہلے بھی یہی زیادتیاں کیں، مسلمانوں کو شکنجے دیے اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے کوششیں کیں اور ان کا یہ فتنہ اس سے زیادہ سخت تر تھا۔ اب جو ان کو قتل کیا جا رہا ہے، قتل تو دُنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے جبکہ فتنہ مادی اور معنوی زندگی کے خاتمہ کے ساتھ آخرت کی ویرانی کا بھی سبب بنتا ہے۔ اسی لیے حق کے خلاف کی جانے والی سازشیں ایسا فتنہ ہے جو قتل سے زیادہ خطرناک ہے۔

مسجد الحرام میں قتال کا حکم

پھر فرمایا کہ مسجد الحرام کے قریب جنگ و جدل اور قتل و غارت گری نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مسجد الحرام کی حرمت ہے یہ حرم امن الٰہی کی جگہ ہے یہاں جنگ نہیں ہونی چاہیے لیکن اگر مشرکین آپ کے خلاف مسجد الحرام میں ہی جنگ شروع کر دیں اور آپ کو مارنا شروع کر دیں تو پھر تم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرو اور اُن کے عہد و پیمان اور حرمت باقی نہیں رہے گی کیونکہ انہوں نے اس حرمت کو خود توڑا ہے۔ جب وہ حرمت کو توڑ رہے ہیں تو اپنے دفاع کے لیے ان کو وہاں مارنا ہو گا اور ان کے خلاف جنگ کرنی ہو گی۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

”پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے“۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

”اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور اللہ کا دین قائم ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو سوائے ظالموں کے کسی پر سختی جائز نہیں“۔

فساد کے خاتمے کے لیے لڑائی کا حکم

یہ آیات پچھلی آیت میں بیان ہونے والے مطالب کا تتمہ ہیں جس میں کہا گیا تھا کہ اگر مشرکین مسجد الحرام میں تم سے جنگ کریں تو پھر تم بھی ان کے ساتھ جنگ کرو۔ اس آیت میں ایک اور بات کہی جا رہی ہے کہ اگر وہ مسجد الحرام کے قریب جنگ شروع کر بیٹھیں پھر انہوں نے ہاتھ روک لیا تو تمہیں بھی ہاتھ روک لینا چاہیے اور وہاں پر جنگ نہیں کرنی

چاہیے۔ دوسری بات جو اس آیت میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جنگ کرنے کا مقصد فتنہ، بت پرستی اور شرک کا خاتمہ ہے۔ مشرکین جو لوگوں کو بت پرستی کے لیے آمادہ کرتے تھے وہ سلسلہ بند ہو اور دین حق پر چلنے والوں کو اذیت دینے کا خاتمہ ہو۔

جنگ کا مقصد یہ ہے کہ سارا دین اللہ کے لیے ہو، بس اللہ کا نظام ہو اور اللہ کے احکام ہوں اور دین حق پر چلا جائے، باطل نابود ہو اور اللہ کی شریعت کے علاوہ کوئی اور شریعت رائج نہ رہے۔ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ جنگ سے پہلے لوگوں کو حق کی دعوت دی جائے، دین حق کی طرف بلایا جائے۔ اگر وہ قبول کرلیں تو ٹھیک ہے کیونکہ جنگ کرنے کا یہی مقصد ہے۔ اور اگر وہ دعوت کو ٹھکرا دیں تو پھر اُن کے لیے کوئی مہربانی نہیں ہے۔ ان سے مدد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ہی یاور، ولی اور سرپرست ہے۔ خدا فقط مومنین کی مدد کرتا ہے۔ اگر وہ پوری طرح سے جنگ سے ہاتھ اٹھالیں تو تم بھی ان سے دشمنی ترک کرو۔ فقط ظالموں کے ساتھ جنگ ہوگی جو ایمان لے آتے ہیں تو ان کے لیے جنگ نہیں ہوگی۔ دفاع کا حق تو ہر انسان کے لیے ہے اور انسان اپنی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے حق رکھتا ہے کہ اپنا دفاع کرے۔ شرک انسانیت کی ہلاکت ہے اور فطرت کی موت ہے۔ شرک سے جنگ اور جہاد سے حیات ملتی ہے، زندگی نصیب ہوتی ہے اور ظالم کا قصاص اسی طرح ہے کہ اسے تادیب کی جائے اور یہ اس پر احسان ہے اور یہ ظلم کے خاتمہ کا وسیلہ ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

"حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے اور سب قابلِ تعظیم باتوں کا بدلہ ہے، پھر جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے تم پر زیادتی کی، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے"۔

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

"اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

"اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو، پس اگر روکے جاؤ تو قربانی سے جو میسر ہو قربانی (دو)، اور اپنے سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے، پھر جو

کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اسے سر میں تکلیف ہو تو روزوں سے یا صدقہ سے یا قربانی سے فدیہ دے، پھر جب تم امن میں ہو تو عمرہ سے حج تک فائدہ اٹھائے تو قربانی سے جو میسر ہو (دے)، پھر جو نہ پائے تو تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات روزے جب تم گھر لوٹو تو رکھو، یہ دس پورے ہو گئے، یہ اس کے لیے ہے جس کا گھر بار مکہ میں نہ ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

حج اور عمرہ کا حکم

اس آیت میں حج اور عمرہ کا حکم بتایا جا رہا ہے۔ حج اور عمرہ کا ہر ہر عمل عبادت میں شامل ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب حج اور عمرہ شروع کرو تو اسے مکمل بھی کرو، لیکن اگر اس کی تکمیل میں رکاوٹ آجائے اور حج اور عمرہ کے انجام دینے میں دشمن مانع ہو جائے یا بیمار ہو جائیں، جیسے صلح حدیبیہ میں ہوا کہ مسلمانوں نے حج کے لیے احرام باندھا ہوا تھا لیکن اُن کے لیے موقع نہ دیا گیا تو پھر کہا گیا کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے قربانی کر دو اور قربانی اللہ کے لیے ہدیہ ہے۔ یہ ہدیہ انسان کو اپنے مقصود کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس جگہ ہدیہ سے مراد وہ حیوان ہے جسے حاجی اپنے ساتھ مکہ لے جاتے ہیں اور حج کے ایام میں اسے قربانی کرتے ہیں اور اس میں خاص شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

پھر سر مونڈھنے کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ جہاں پر حیوان ذبح کرتے ہو تو وہیں پر اپنے سر بھی مونڈھو، لیکن اس صورت میں ہے جب انسان مجبور نہ ہو۔ جب انسان محصور نہ ہو اور حج کے اعمال کو پورا کر رہا ہو تو پھر تو اسی طرح ہو گا کہ قربانی کے بعد اپنا سر منڈوائے گا لیکن اگر مریض ہو جائے اور سر منڈوانے میں تکلیف ہو ایسی تکلیف جو قابل برداشت نہ ہو تو پھر کفارہ دینا ہو گا۔ اگر انسان بیمار ہو یا سر پر کوئی تکلیف ہو تو پھر کفارہ دینا ہو گا اور اس کا کفارہ مسلسل تین

دن روزے رکھنے ہوں گے یا مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا ایک بھیڑ ذبح کرنا ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اگر مانع اور رکاوٹ ختم ہو جائے اور جس شخص کا حج اور عمرہ تمتع ہے مکہ والا نہیں ہے تو وہ عمرے کو تمام کرے، اپنی عبادات کو پورا کرے، یہاں تک کے وہ مُحِل ہو جائے اور دوبارہ حج کے لیے احرام باندھے اور جو بھی قربانی اس سے ہوسکے اپنے ساتھ لے جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حج جائز ہے جیسا کہ صحیح ترمذی اور ابن قیم نے عبد اللہ بن عمر سے نقل کیا ہے۔[1]

اب اگر جس میں قدرت نہیں ہے تو وہ تین دن حج میں اور سات دن واپسی پر روزہ رکھے گا اور یہ اس کے لیے ہے جس میں قدرت ہو، ممکن ہو تو قربانی کے دن سے پہلے رکھ لے، اگر ممکن نہ ہو تو قربانی کے دن کے بعد رکھے۔ جب وطن واپس آئے تو سات دن روزہ رکھے، اسے دس دن کی مدت پوری ہو جائے گی، یہ ان کے لیے ہے جو مکے والے نہیں ہیں۔ یہ حج تمتع اور عمرہ تمتع کا حکم غیر اہل مکہ کے لیے ہے جن کے گھر اور مسجد الحرام کے درمیان بارہ میل کا فاصلہ ہو۔ اہل یعنی خواص اس سے بیوی بچے مراد ہیں اور ان کو عیال بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے شخص کے لیے دو قسم کے راستے قرار دئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عمرہ کے مناسک کے بعد احرام سے نکل آئے، دوسرا یہ کہ حج کے لیے مکہ سے ہی احرام باندھ لے اور اسے واپس میقات کی طرف پلٹنا ضروری نہیں ہے۔ یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حج

---

[1] - یہ بات عربی زبان میں تفسیر المیزان کا خلاصہ کرنے والے جناب شاکر صاحب نے کہی ہے لیکن فقہ جعفری کے مطابق اور خود صاحب المیزان کا نظریہ بڑا واضح ہے کہ جو مکے والے نہیں ہیں انہیں عمرہ تمتع کرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد مکہ سے ہی حج کا احرام باندھنا ہوگا اور حج تمتع کو انجام دینا ضروری ہوتا ہے نہ کہ وہ مستحب ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ عمل ایک مستقل عبادت ہے اور جو حج تمتع کرنے والا اگر احرام حج میقات سے نہیں باندھ سکا تو پھر جہاں سے اسے ممکن ہو وہ احرام باندھے گا اور قربانی مستقل عبادت ہے۔

تمتع کا حکم با قاعدہ دیا گیا ہے اور فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا جملہ مطلق ہے مقید نہیں ہے۔

پھر فرمایا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور دیکھو اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق چلو، تو یہی اللہ کا تقویٰ ہے اور یہ تقویٰ تمہاری کامیابی کا ذریعہ ہے اور جو اللہ کے احکام کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اس کے لیے سخت سزا ہے اور سزا سے نہیں بچ سکے گا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ شدید عذاب دینے والا ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ مشرکین جو تھے وہ احتساب کا انکار کرتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ قیامت کا دن ہے ہی نہیں، عذاب کے انکاری تھے۔ یہ حکم دیا گیا ایسا حکم جو زمانہ جاہلیت میں ان کے خلاف تھا، لہٰذا کہا گیا کہ اگر وہ اس حکم کو نہیں مانتے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چلتے تو پھر اس کی سزا بڑی سخت ہے وہ اس سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

”حج کے چند مہینے معلوم ہیں، سو جو کوئی ان میں حج کا قصد کرے تو مباشرت جائز نہیں اور نہ گناہ کرنا اور نہ حج میں لڑائی جھگڑا کرنا، اور تم جو نیکی کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے، اور زادِ راہ لے لیا کرو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ و پرہیزگاری ہے، اور اے عقل مندو میرا تقویٰ اختیار کرو“۔

حج کے مہینے

معلوم مہینوں سے مراد شوال، ذیقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔ یہ وہ مہینے ہیں جن میں حج اور عمرے کے لیے احرام باندھے جا سکتے ہیں۔ جن پر حج فرض ہو جائے اور وہ حج کا احرام باندھ

لیں تو حالتِ احرام میں ان کے لیے حکم ہے کہ اپنی عورتوں کے قریب نہ جائیں، آپس میں جھگڑا نہ کریں، جدل و جدال نہ کریں۔ جو حج بجالانے کے مقام پر پہنچ چکے ہیں اور حج کا عمل شروع کر دیا ہے تو اس کے مکمل ہونے تک ان چیزوں کی رعایت ان پر لازم اور واجب رہے گی۔ تم جو بھی عملِ خیر بجالاتے ہو تو تمہارا عمل خداوند تبارک و تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تم حضور قلب کے ساتھ اللہ کی جناب میں حاضری دو اور نیک عمل سے غافل نہیں رہو، خدا تمہارے عمل سے غافل نہیں ہے، خدا کو تمہارے سارے عمل کا علم ہے۔ اپنے لیے آخرت کا زاد راہ بناؤ۔ اور یہ دُنیا ہی ہے جہاں آپ اپنے لیے زادراہ بنا سکتے ہو، بہترین زاد راہ تقویٰ ہے، تم صاحبان عقل میرا تقویٰ اختیار کرو، میری پرواہ رکھو، میرے اوامر کی پابندی کرو، میرے رسولؐ کی دعوت کو قبول کرو۔ اس نے تمہیں جو حرام اور حلال بتایا ہے اس کو تسلیم کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ تقویٰ انسان کا معنوی کمال ہے اور اس کمال کے حصول کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پابندی ہے، اس کے بغیر انسان کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

”تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے پھرو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو، اور اس کی یاد اس طرح کرو کہ جس طرح اس نے تمہیں بتائی ہے، اور اس سے پہلے تو تم گمراہوں میں سے تھے“۔

اعمال حج

کیا انسان حج کے دوران خرید و فروخت کر سکتا ہے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج کے دوران خرید و فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اس حوالے سے دوسرا حکم یہ بیان فرمایا ہے کہ جب عرفات میں پہنچ چکے ہو اور آگے چلتے ہو تو اگلی جگہ مشعر الحرام ہے، عرفات میں وقوف کے بعد مشعر الحرام پہنچو، یہ وہی مزدلفہ والی جگہ ہے جہاں پر رک کر اللہ کا ذکر کرنا واجب ہے۔ اللہ نے جو ہدایت دی ہے اس پر اللہ کا شکر بجالاؤ کیونکہ اس سے پہلے تمہیں ان باتوں کی خبر نہ تھی، اللہ نے ہی تمہیں اس گمراہی اور بھٹکنے سے بچایا ہے اور یہ تم پر اللہ کا بڑا انعام ہے اس پر اللہ کا شکر بجالاؤ۔

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر تم لوٹ کر آؤ جہاں سے لوگ لوٹ کر آتے ہیں اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے''۔

عرفات اور مزدلفہ کے احکام

یہاں پر ایک اور مطلب کی جانب اشارہ ہے؛ وہ یہ ہے کہ قریش والوں نے آپس میں حلف اٹھا رکھا تھا کہ وہ عرفات میں وقوف نہیں کریں گے، وہ عرفات کے بجائے مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے تو اس آیت میں انہیں بتایا گیا کہ جیسے باقی لوگ عرفات سے جب کوچ کریں تو تم بھی اسی وقت کوچ کرو۔ اسلام میں عرفات کے وقوف کا حکم دیا گیا جبکہ قریش مکہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ تم اس سے پہلے بھٹکے ہوئے اور گمراہ تھے اور اللہ تعالیٰ

نے تمہیں اس گمراہی سے نکالا اور تمہاری ہدایت کی، لہٰذا تم اب اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، اللہ مہربان اور گناہ معاف کرنے والا ہے جو اللہ کا حکم ہے اس کے مطابق عمل کرو۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

''پھر جب حج کے ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے یا اس سے بھی بڑھ کر یاد کرنا، پھر بعض تو یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے، اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے''۔

دنیا کے طالب کے لیے دنیا ہی ملے گی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جب مناسک حج ختم ہو جائیں تو اللہ کو بہت یاد کرو جس طرح زمانہ جاہلیت میں تم حج کے مناسک ادا کرنے کے بعد اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے تھے اسی طرح اللہ کو یاد کرو اور زبانی یاد کرنا کافی نہیں ہے بلکہ دل سے یاد کرو کیونکہ خدا کا تمہارے اوپر حق ہے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اس کا حق تمہارے آبا واجداد سے زیادہ ہے۔

زمانہ جاہلیت کے عرب حج کے بعد فخر و مباہات کے لیے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے آبا واجداد کو نثر اور اشعار کی صورت میں یاد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے آباء واجداد کی بجائے اب تم اللہ کو یاد کرو۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں اے اللہ! ہمیں فقط دُنیا کے فوائد دے دے، آخرت بے شک ہمارے لیے نا ہو۔ ایسے لوگ دنیا کے طالب ہیں، لہٰذا آخرت میں انہیں کچھ نہ ملے گا آخرت میں ان کے اعمال حبط ہو جائیں گے، باطل ہو جائیں گے، اس کی وجہ

وہ خود بنے کہ انہوں نے دُنیا چاہی، آخرت کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے لیے راہنمائی کر دی تھی کہ وہ آخرت کے لیے اپنا سامان مہیا کریں، تقویٰ اختیار کریں لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کو آخرت میں سوائے خسارہ کے اور کچھ نہ ملے گا۔ دنیا طلب کی لہٰذا انہیں دنیا ہی ملی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

"اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیکی اور آخرت میں بھی نیکی دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا"۔

اللہ سے دنیا و آخرت کی بھلائی کا سوال

ظاہر ہے مومن اور کافر میں یہی فرق ہے۔ جن کا باطن مریض ہے وہ صرف دُنیاوی مفادات چاہتے ہیں، آخرت میں ان کو کچھ ملے یا نہ ملے، آخرت کی طرف ان کی توجہ نہیں ہے۔ یہاں مومنین کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی چاہتے ہیں، یہ اس لیے ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے لہٰذا اللہ سے ہی ہر شئے چاہتے ہیں، دُنیا کی خیر بھی اللہ سے چاہتے ہیں اور آخرت کی خیر بھی اللہ سے چاہتے ہیں۔ مومن خدا سے حسنات اور نیکیاں مانگتا ہے، دُنیا دار فقط دُنیا مانگتے ہیں چاہے اچھی ہو یا بری ہو وہی اس کے لیے حسنہ ہے۔ اسی لیے پہلی آیات میں حسنہ نہیں آیا، پہلی آیات میں فقط "فی الدُنیا" تھا، حسنہ نہیں کہا۔ آخرت میں کچھ نہیں چاہئے دُنیا میں ہی چاہیے۔ مومنین کی بات آئی تو یہاں اُن کے لیے حسنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مومنین دنیا کے لیے بھی حسنہ چاہتے ہیں اور آخرت کے لیے بھی حسنہ چاہتے ہیں تو اللہ انہیں دنیا و آخرت کی بھلائی اور خیر عطا کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

"یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے"۔

جو مانگو گے وہی ملے گا

خدا تو اپنے بندے کو وہی دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے اور جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کا ذکر کر کے اللہ کو یاد کر کے اللہ سے مانگتے ہیں تو وہ بہرہ ور بھی ہوتے ہیں، لیکن کچھ وہ ہیں جو اللہ کا ذکر چھوڑ دیتے ہیں تو پھر ان کو وہ عطیات نہیں ملتے جو اللہ کا ذکر کرنے والوں کو ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی ان کا جائزہ لے گا اور ان کا حساب ہو گا اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے اسی کا نتیجہ اور ثمر انہیں ملے گا۔ دُنیا ہو یا آخرت ہو، دُنیا میں بھی جو انسان کرتا ہے وہی اسے ملتا ہے، دنیا کے لیے جو کیا ہے تو اسے وہ دنیا میں ہی ملے گا اور اگر دنیا میں جو کچھ کیا ہے آخرت کے لیے کیا ہے تو پھر اسے وہ آخرت میں ملے گا۔ قیامت کے دن جس نے جو کیا ہے اسی کا بدلہ اسے دیا جائے گا۔ لہٰذا سوچ سمجھ کر سوال کیا جائے فقط دنیاوی مفادات اللہ سے طلب نہ کریں۔ اللہ سے دنیا اور آخرت دونوں کے لیے سوال کریں تاکہ آخرت میں انعامات اور دنیا میں بھی خیر سے رہے۔

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

''اور اللہ کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو، پھر جس نے دو دن کے اندر کوچ کرنے میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں جو (اللہ سے) ڈرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے''۔

حج کے بعد کے اعمال

اس آیت میں پھر حج کا تذکرہ ہوا ہے۔ حج کے بہت سارے اعمال ہوتے ہیں ان میں گیارہ، بارہ، تیرہ، ذوالحجہ کے اعمال ہوتے ہیں۔ اس آیت میں اس کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ ان تین دنوں میں اللہ کی عبادت کرنی ہے، اللہ کو یاد کرنا ہے اور یہ تین دن اسی کام کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی جلدی میں ہو اور دو دن بعد گیارہ اور بارہ تاریخ کے بعد مکہ پلٹ آئے اور تیسرا دن وہاں پر نہ رہے تو اس نے کوئی گناہ نہیں کیا اور اگر اس کو کچھ مؤخر کر دے تو بھی گناہ نہیں کیا۔ یہ ان کے لیے ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں، جن میں تقویٰ نہیں ان کے لیے یہ بات نہیں ہے۔

اس مقام میں متقی سے مراد وہ ہیں جس نے حج کے اعمال کو پورا کیا ہے اور احرام کی حالت میں جو کام حرام تھے اس کا مرتکب نہیں ہوا؛ اس کے لیے ہے کہ وہ اگر دو دن آگے کر لیتا ہے یا پیچھے کر لیتا ہے تو اس نے گناہ نہیں کیا اس کو اس غلطی کی معافی مل جائے گی۔ البتہ اس حوالے سے فقہی کتابوں میں موجود حج کے احکام دیکھنا ہوں گے اس بارے تفصیلات کو وہاں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

پھر کہا خدا کا تقویٰ اختیار کرو کہ اسی کی طرف سب نے پلٹ کر جانا ہے۔ گویا کہ اس مقام پر تقویٰ کا جو حکم دیا گیا ہے یہ اس لیے ہے کہ قیامت کے دن تقویٰ ہی انسان کے فائدے میں ہو گا جس نے اللہ کو یاد رکھا ہو، معصیت سے دُور رہا ہو۔ تقویٰ اس کے بغیر پورا ہوتا ہی

نہیں۔ تقویٰ کا معنی ہی یہ ہے کہ واجبات کو ادا کیا جائے اور محرمات کو چھوڑا جائے۔ حشر ایک دفعہ حج کے مراسم میں ہوتا ہے کہ وہاں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں ایک لباس میں ہوتے ہیں دوسرا قیامت میں ہوگا۔ یہاں جو یہ کہا گیا کہ تم سب یہ بات جان لو کہ اللہ کی جناب میں تمہیں محشور کیا جائے گا، حشر کا حوالہ ہے تو اس میں ایک لطیف اور بہت ہی عمدہ اور خوبصورت اشارہ ہے جس طرح حج میں میدان عرفات میں سارے لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں، قیامت کے دن بھی ایسے ہی ہوگا اور سارے لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں گے اور ان کو وہاں پر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴

''اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کی بات دنیا کی زندگی میں آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے''۔

منافقین دو دل

''عجاب'' خوش کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اور ''**یعجبک**'' یعنی اس کا قول اور اس کی بات تجھے خوش کرتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دُنیا کے ظاہر کے مطابق فیصلہ دیتے ہیں، باطن میں جو چھپا ہوا ہوتا ہے اس کو بنیاد نہیں بناتے۔ یہاں پر منافقین کی بات ہو رہی ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں، لگتا ہے کہ وہ حق پرست ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ان کی باتیں آپ کو بڑی اچھی لگ رہی ہوتی ہیں۔ اللہ ان کے باطن سے واقف ہے، یہ اسلام کے بدترین دشمن ہیں، اللہ ان کے دلوں کے حالات سے واقف ہے۔ وہ جب

باتیں کرتے ہیں تو اللہ کو گواہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کے دل اُسی طرح ہیں جس طرح اُن کا ظاہر ہے وہ جو بات کہہ رہے ہیں دل سے کہہ رہے ہیں جبکہ خدا جانتا ہے کہ وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ وہ اس فکر میں ہیں کہ دین کہیں ترقی نہ کر جائے، جب ان کا باطن آشکار ہو جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے افکار انتہائی بُرے ہیں اور یہ دین کے سخت ترین دشمن ہیں۔ خدا کا نظام، خدا کے احکام، خدا کا دین انہیں بالکل پسند نہیں ہے۔ بس یہی ان کی ظاہری باتیں ہیں جو آپ کو اچھی لگتی ہیں اور آپ اس پر خوش ہو جاتے ہو، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

''اور جب پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو ملک میں فساد ڈالتا اور کھیتی اور مویشی کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا''۔

منافقین فسادی ہیں

''تولّٰی'' کا معنی حکمران بننے کی سوچ، اپنے آپ کو حکمران بنانا، غلبہ حاصل کرنا ہے۔'' ولایت'' حکمرانی کے معنی میں ہے۔ حضور پاک ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ جب یہ آپ سے مڑ کر جائیں گے، پیچھے ہٹیں گے تو ان کا چہرہ اور ان کی باتیں بدل جائیں گی اور یہ فساد کے لیے سرگرم ہو جائیں گے۔ یہاں دو لفظ بولے گئے ہیں ''حرث و نسل'' انسانی زندگی کی بقا انہی دو چیزوں پر منحصر ہے، تمام موجودات کی زندگی ایک تو غذا سے وابستہ ہے دوسری چیز جس سے نوع بشر کی بقا وابستہ ہے وہ نسل کی نگہداری ہے۔ یہ ایسے فسادی ہیں جو نسل کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں اور کھیت کو بھی ویران کرنا چاہتے ہیں جس سے غذا حاصل کی جاتی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانیت میں اعتدال اور ان کی عادت کی بہتری کے لیے قانون بنایا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی گواہی دی ہے کہ تاریخ میں کس طرح حکمرانوں نے شریعت کے احکام اور الٰہی قوانین کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور زمین میں فساد بپا کرنے کے لیے ہر وسیلہ کا استعمال کیا اور انہوں نے اپنی سلطنت اور حکمرانی کو دوام بخشنے کے لیے انسانوں کو قتل کرنے اور ان کے جان و مال کو نقصان پہنچانے اور کھیتوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا، اس نے فسادیوں کے لیے سخت سزا مقرر کر رکھی ہے جو انہیں نصیب ہو گی۔ یہ ان فسادیوں کا رویہ ہے اور اللہ انہیں سخت سزا دے گا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶

"اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو شیخی میں آ کر اور گناہ کرتا ہے، سو اس کے لیے دوزخ کافی ہے، اور البتہ وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

منافقوں کی روش

اس آیت میں منافقوں کی روش کو بیان کیا گیا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ نصیحت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ ان کے دلوں میں نفاق ہے اور گناہوں نے ان کے اندر تکبر اور نخوت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ خدا اور حق کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے، جہنم ہی ان کے لیے کافی ہے کیونکہ عزت اور عظمت فقط اللہ کے لیے ہے۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو وہ اس نصیحت کو ماننے کی بجائے غرور میں آ کر اور گناہ کرتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

"اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی جان بھی بیچ دیتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے"۔

رضای الٰہی کیلئے اپنی جان بیچنے والے

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی غم نہیں ہے، وہ ہمیشہ اطاعت خداوندی کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی جان و مال کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور اپنے نفس کے بارے میں کوئی خواہش نہیں رکھتے، ان کی فکر بس یہی ہوتی ہے کہ دین کا معاملہ ٹھیک رہے اور دُنیا سے وہ کچھ بھی نہیں چاہتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسوں کے ذریعہ حق کو زندہ رکھا ہوا ہے اور ان پر خدا کی جانب سے مہربانی اور خصوصی رحمت ہے۔ اگر ایسے انسان نہ ہوں تو منافقین اور فساد پھیلانے والے زمین پر غلبہ حاصل کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کے ارکان منہدم ہو جائیں گے اور ہدایت کے راستے مسدود ہو جائیں گے اور اصلاح کی اُمید ختم ہو جائے گی۔

بہت ساری سنی اور شیعہ روایات میں یہ بات آئی ہے جن میں سے تفسیر برہان ثعلبی اور دیگر نے کہا ہے کہ یہ آیت لیلۃ المبیت شب ہجرت جب حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سوئے تھے، تو حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس میں حضرت علی علیہ السلام کا وصف بیان ہوا ہے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کو عمومیت دی جائے اور اس کا مصداق کامل حضرت علی علیہ السلام ہی ہوں۔[1]

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان سے لیا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾

”اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، کیوں کہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے“۔

شیطان کی پیروی سے دُوری کا حکم

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اللہ کے حضور تسلیم کامل ہونا چاہیے۔ اللہ کا رسولؐ جو شریعت لے آیا ہے اس شریعت کی پابندی کرنی چاہیے اور سارے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسی طریقے کو اپنائیں جو طریقہ ان کو سکھایا گیا ہے۔ کسی مخلوق کی اطاعت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے اور نہ ہی اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔ حضور پاک ﷺ کی اطاعت، اللہ کی ہی اطاعت ہے جس طرح حضور پاک ﷺ کے اوصیاء کی اطاعت آپؐ کی اطاعت ہے کیونکہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کا کہتے ہیں۔ جبکہ شیطان کا مقصد یہ ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اس کے لیے وہ باطل کو حق کے طور پر پیش کرتا ہے۔ جب تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تسلیم میں داخل ہوں تو ظاہر ہے ہر وہ قدم جو اس تسلیم محض کے مدمقابل ہو گا وہ شیطانی قدم ہو گا۔ شیطان انسانوں کا دشمن ہے اور واجب ہے کہ انسان اپنے دشمن کو پہچانے اور شیطانی اقدامات سے خود کو چوکنا رکھے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾

''پھر اگر تم کھلی کھلی نشانیاں آجانے کے بعد بھی پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

بھٹکنے والے خود ہی خسارہ میں

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح نشانیاں دی ہیں، حق سمجھا دیا ہے اور جب حق تمہاری سمجھ میں آگیا ہے اور اس کی نشانیاں بھی روشن ہیں تو اس کے ہوتے ہوئے پھر بھٹک جاؤ اور تم میں لغزش آجائے اور شیطان کی پیروی شروع کردو تو تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ اللہ تو غالب ہے اور اللہ کا ہر فیصلہ مصلحت اور حکمت کے تحت ہے، اس کا سارا نقصان تمہیں ہوگا، اللہ کے حکم کے سامنے کوئی چیز مانع ورکاوٹ نہیں بن سکتی، اللہ کا حکم جاری و ساری رہے گا۔ شیطانی ہتھکنڈے اللہ کے حکم کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کرسکتے، چاہے وہ وقتی طور پر ہونے والے فیصلوں کے متعلق ہو یا دائمی اور ہمیشہ کی سکون والی زندگی کے متعلق۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

''کیا وہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ ان کے سامنے بادلوں کے سایہ میں آ موجود ہو اور فرشتے بھی آجائیں اور کام پورا ہو جائے، اور سب باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں''۔

بے جا خواہشات و مطالبات

''ظل'' شامیانہ یا سائے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں کہا جا رہا ہے کہ ساری نشانیوں کو بتا دینے او ہر شئے کو واضح سمجھا دینے کے بعد یہ لوگ کس بات کا انتظار کر رہے

ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا عذاب بادلوں کے ذریعے انکے اوپر آئے اور ان کا خاتمہ کردے؟اس آیت میں اللہ کے آنے سے مراد اللہ کے عذاب کا آنا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر اللہ کے فیصلے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی، اللہ کا فیصلہ طے شدہ ہے اور عذاب نے جس وقت آنا ہے تو عذاب کا وقت بھی معین ہے اور سب نے اللہ کی جانب پلٹ کر جانا ہے اور کبریائی اور بزرگی اللہ کے لیے ہے۔ اللہ کا کرم رکاوٹ ہے کہ ہر وقت عذاب نہیں اُتارتا؛ لیکن یہ طے شدہ بات ہے۔ دُنیا کے بڑے سلاطین متکبرانہ باتیں تو کرتے ہیں لیکن اُن کے لیے کوئی کبریائی اور بڑائی نہیں ہے، حقیقی بڑائی اور کبریائی فقط اللہ کی ذات کے لیے ہے، ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی تنہا اور یکتا ہے اور سب پر قادر ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

''بنی اسرائیل سے پوچھیے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں دیں، اور جو اللہ کی نعمت کو بدل دیتا ہے بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آچکی ہو تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتیں اور ان کی ناسپاسی

اس آیت میں بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کسی قوم کے پاس اپنا نمائندہ بھیجتا ہے، نبی بنا کر بھیجتا ہے، رسول بنا کر بھیجتا ہے تو اسے کتاب بھی دیتا ہے حکمت بھی دیتا ہے نبوت دیتا ہے اسے اختیار دیتا ہے اور طیب اور طاہر روزی عطا کرتا ہے۔ بنی اسرائیل والوں کے پاس بھی جب اللہ کا نبی آیا، رسول آئے تو ان کو بھی کتاب بھی دی گئی اور ان کا انتخاب ان ہی میں سے کیا گیا، ان کو طیب اور طاہر روزی مہیا کی گئی اور

پہلی اُمتوں پر ان کو برتری بھی دی گئی لیکن انہوں نے اللہ کی اس نعمت کی قدر نہیں کی۔ ان کے پاس جب اللہ کی نعمت آگئی تو انہوں نے اللہ کی نعمت کو بدل دیا اللہ کی نعمت کی قدر نہیں کی تو پھر ان پر اللہ کا عذاب آگیا۔

بنی اسرائیل نے اللہ کا کلام جو ان کی ہدایت کے لیے تھا اس کلام میں بہت ساری جگہوں پر تحریف کر دی اور انہوں نے اپنی خواہشات کے مطابق آسمانی کتاب میں ایسی باتیں ڈال دیں جن کا اللہ نے حکم نہیں دیا تھا اور اللہ کی طرف غلط نسبت دے دی۔ اس طرح انہوں نے حسد کیا اور آسمانی کتاب جو آئی ہے اس کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے جبکہ انہیں علم تھا کہ اللہ آخری پیغمبرؐ بھیجے گا ان کا نام تک ان کی کتاب میں موجود تھا۔ اس طرح انہوں نے افتراق اور انتشار پھیلایا اور آپس میں بھی لڑتے رہے ایک دوسرے کو نابود کرتے رہے اس طرح ان کی سعادت اور خوش بختی جاتی رہی اور ذلت اور بے چارگی اس دُنیا میں ان کا مقدر ہو گئی اور آخرت میں بھی سخت ترین عذاب ان کے لیے ہے جہاں پر ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا جاری اور ساری قانون ہے، اس کا تعلق فقط بنی اسرائیل سے نہیں ہے بلکہ جو بھی اللہ کے بتائے ہوئے راستے سے اختلاف کرے گا اور اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر نہیں چلے گا تو اس کے لیے اللہ کا سخت ترین عذاب ہو گا اور اسے سزا بھگتنی ہو گی۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ يَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

''کافروں کو دنیا کی زندگی بھلی لگتی ہے اور وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو ایمان لائے، حالانکہ جو لوگ پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن ان سے بالاتر ہوں گے، اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

کافروں کا مزاج اور ان کے نفسانی رجحانات

اس آیت میں کفار کے مزاج اور ان کی طبیعت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ یہ شہوت پرست ہیں، خواہشات نفسانی کی جانب ان کی توجہ ہے، یہ دُنیا پرست ہیں اور دُنیا ان کے لیے بڑی مزین اور خوبصورت بن کر ان کے سامنے پیش ہوئی ہے جس وجہ سے انہوں نے حق اور حقیقت کو انہوں نے بھلا دیا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو بجائے اس کے کہ اللہ کی پرستش کرتے اور نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈالتے؛ منصب، عہدہ، مال، ظاہری زیب وزینت کی پرواہ نہ کرتے، لیکن اُنہوں نے اسی کو ہی اپنے لیے سب کچھ جانا اور اس کے لیے دین میں بھی تبدیلی لے آئے تاکہ اس طریقے سے اپنے لیے امتیازات، مناصب اور عہدے حاصل کر سکیں اور عوام پر حکمرانی کر سکیں اور دین کے بڑے کہلائیں۔ انہوں نے دینی حقائق بدل دیے اور وہ اپنے لیے سیادت چاہتے تھے، اسی لیے انہوں نے اپنے دل کی بات کو پوشیدہ رکھا۔ یہ سارا کفر تھا جو انہوں نے اختیار کیا اور دُنیا کافروں کے لیے ہی ہے، جو دُنیا کے ہو جاتے ہیں وہ دین کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑے گا۔ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ کفر اور نفاق والوں کا آپس میں گٹھ جوڑ ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر خیال کرتے ہیں جبکہ قیامت میں برتری ان کی ہو گی جو باتقویٰ ہیں۔ یہاں پر ایمان کی جگہ تقویٰ کا لفظ اس بات کو سمجھانے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ ایمان بغیر تقویٰ کے اور بغیر عمل کے بے فائدہ ہوتا ہے۔ ایمان کے ساتھ تقویٰ اور عمل ضروری ہوتا ہے اور وہ جو ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان والے جب تقویٰ اختیار کر لیں گے

تو قیامت کے دن انہی کے لیے برتری ہو گی نہ ان کو جو دنیا میں اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے، بغیر حساب کے روزی دے جس کو چاہے جو مقام و مرتبہ عطا کرے کیونکہ وہی خالق اسباب ہے، وہی وسیلہ ساز ہے وہی تمام مسببات کو ایجاد کرنے والا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ص وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ط وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

"سب لوگ ایک دین پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بھیجے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں میں اس بات میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر انہیں لوگوں نے جنھیں وہ (کتاب) دی گئی تھی اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن دلیلیں آ چکی تھیں آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر اللہ نے اپنے حکم سے ہدایت کی ان کو جو ایمان والے ہیں اس حق بات کی جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہے سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے"۔

انبیاءؑ سے پہلے انسانوں کی کیفیت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ سے پہلے جو انسانوں کی کیفیت تھی اس کو بیان کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا کہ بشر کی زندگی میں اتحاد اور اتفاق تھا اور وہ فطرت کی بنیاد پر فسق و فجور سے منزہ تھے اور فطری طور پر جانتے تھے کہ فسق کیا ہے اور فجور کیا ہے اور پھر اس کو چھوڑتے تھے، تقویٰ کو انجام دیتے تھے۔ ''اُمت'' ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کا مقصد اور ہدف ایک جیسا ہو اور یہی ہدف ان کے درمیان وحدت اور یکجہتی اور جوڑنے کا سبب بنتا ہے۔ اسلامی مملکت کی سرحدیں عقیدتی سرحدیں ہوتی ہیں، اصطلاحی جغرافیائی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ اس اُمت کا ایک ہدف اور ایک مقصد ہے اور وہ ہدف اللہ ہے۔ جب انسانوں کے درمیان اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان اختلافات کو نپٹانے کے لیے ان میں انبیاءؑ بھیجے جو بشارت دینے والے بھی تھے اور ڈرانے والے بھی تھے اور ان کے ساتھ حق پر مبنی کتاب اُتاری تاکہ جب کوئی اختلاف کریں تو اس اختلاف کے وقت ان کے درمیان اس کتاب کی بنیاد پر فیصلہ دیں۔

یہاں پر دو اختلاف پیش نظر ہیں: ایک دُنیاوی امور میں فطری اختلاف ہے اور یہی فطری اختلاف دُنیاوی امور میں ادیان کی تشریح اور پیغمبروںؑ کے بھیجنے کا سبب بنا۔ دوسرا اختلاف خود دین میں ہے اور وہ یہ کہ ہر شخص اپنے لیے حد سے زیادہ چیز چاہتا ہے اور یہیں سے ظلم و زیادتی کی بنیاد بنی اور یہ غیر فطری امر تھا، فطرت کے خلاف امر تھا۔ دین میں اختلاف کی وجہ علماء دین کا ایک دوسرے کے ساتھ حسد اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی اور سرکشی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں دوسرے اختلاف کے بارے میں بیان فرمایا کہ وہ پیدا نہیں ہوا مگر ان لوگوں کی طرف سے جن کے پاس کتاب اور روشن دلیل آئی اور اس کی وجہ برتری طلبی، طغیان اور سرکشی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے شہروں پر غلبہ ان کا غلبہ ہو،

خدا کے بندوں پر ان کا اختیار ہو، اس کے لیے وہ دین کے راستے سے داخل ہوئے اور آسمانی کتاب کو انہوں نے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے وسیلہ بنایا اور اس طرح انہوں نے فسق و فجور کا راستہ اپنا لیا اور دین میں تبدیلی لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اختلافی مسائل میں ایمان لانے والوں کی حق کی طرف راہنمائی کر دی اور انہیں ہدایت دی جبکہ خدا پر یہ ضروری نہیں تھا اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس حق کی جانب جو آسمانی کتاب میں اُتارا گیا تھا ان کے لیے ہدایت ہوئی۔ اللہ چاہے تو ہدایت نہ کرے اور چاہے تو کرے۔

یہاں پر جو اختلاف ہے اس سے عام اختلاف مراد لیا گیا ہے چاہے وہ فطری اختلاف ہو۔ فطری اختلاف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لیے برتری چاہتا ہے، ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح نہیں دیتا۔ظاہر ہے کہ دین اللہ کا نظام ہے تو یہاں پر خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس بات کو بتایا کہ اللہ جسے چاہے صراط مستقیم کی راہنمائی دے دے اور جسے چاہے نہ دے۔

اوپر والی بات کی مزید وضاحت آخر میں کر دی، کہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں تھا کہ وہ ان کو ہدایت کرے، یہ اللہ کی طرف سے فضل و کرم ہے کیونکہ کوئی چیز خدا پر لاگو نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اللہ کو کسی امر پر مجبور کیا جا سکتا ہے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کرے، جس کو چاہے ہدایت نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اسباب بنا دیئے ہیں اور ہر سبب کی تاثیر اللہ نے رکھی ہے، اب وہ تاثیر ہٹا بھی سکتا ہے اور تاثیر کو برقرار بھی رکھ سکتا ہے۔اب وہ سبب جو ہدایت کا سبب ہے اس کی تاثیر باقی رکھنا اللہ کا کام ہے، اس کی تاثیر کو ہٹا دینا بھی اللہ کا کام ہے، لیکن اس ذریعہ کا استعمال انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے لہٰذا جو مومنین ہیں انہوں نے اپنے اختیار سے ہدایت کے راستے کا انتخاب کیا ہے لیکن اس کا سبب اللہ بنا ہے، اس طرح وہ اللہ کے اذن سے اور اللہ کی دی ہوئی توفیق سے ہدایت پا جاتے ہیں۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۴﴾

”کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہیں وہ (حالات) پیش نہیں آئے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، انہیں سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہو گی! سنو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے“۔

بہشت میں جانے کا ضابطہ

اس آیت میں بہشت جانے کے لیےایک ضابطہ بیان کیا گیا ہے ، اس کے لیے ضروری ہے کہ الٰہی احکام اور اوامر کے سامنے تسلیم ہو جاو، اللہ کی کتاب میں اختلاف مت ڈالو، اللہ کے دین کو تبدیل مت کرو تاکہ عذاب میں نہ جاؤ۔ پھر بتایا کہ کیا آپ چاہتے ہو کہ آزمائش کے بغیر جنت میں جاؤ جبکہ جو آپ سے پہلے گزرے ہیں ان کی آزمائشیں ہوئی ہیں، ان پر مصائب آئے ہیں، ان پر جنگیں مسلط ہوئی ہیں، ان کو تکلیفیں ہوئی ہیں جن میں جان، مال، عزت، آبرو سب کچھ کا جانا شامل ہے۔ ”الۡبَاۡسَآءُ “ وہ مصیبتیں ہوتی ہیں جو انسان کی جان پر نہیں آتیں، جیسے مال کا ضائع ہونا، عہدہ کا چلا جانا، بدامنی، خاندان میں کسی مصیبت کا آنا۔ ”الضَّرَّآءُ “ وہ مصیبتیں ہوتی ہیں جو انسان کی اپنی ذات پر آتی ہے جیسے زخمی ہونا، قتل ہو جانا، بیمار ہو جانا۔ اور ”زلزال“ کا معنی ہے لغزش کے بعد لغزش، اضطراب کے بعد اضطراب، وحشت و پریشانی جو انسان کو ہلا کر رکھ دے۔

ایسے موقع پر کہتے ہیں اللہ کی مدد کب آئے گی؟ یہ کیونکہ امتحان ہے تو بتایا گیا ہے کہ ساری اُمتوں کے امتحان ہوئے ہیں اور وہ آزمائش سے گزرے ہیں اور تم چاہتے ہو کہ تمہارے اوپر کوئی آزمائش نہ آئے۔ اللہ ہر ایک کی مدد کرتا ہے جو اس سے اُمید لگائے رکھتا ہے۔ آگاہ رہو کہ یہ جو پوچھا جارہا ہے کہااللہ کی مدد کب ہوگی؟ تو اللہ دنیا میں اپنے رسولوں کی مدد کرتا ہے، مومنوں کی مدد کرتا ہے، اللہ انہی کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد لینے کے لائق ہوتے ہیں اور اللہ سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

”آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں، کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے، اور جو نیکی تم کرتے ہو سو بے شک اللہ خوب جانتا ہے“۔

اللہ کی راہ میں انفاق

یہ سوال مومنوں کا حضور پاک ﷺ سے ہے۔ ان کے سوال کی ضرورت نہیں تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کو تبدیل کیا اور اس سوال کا جواب دیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ کس چیز کو خرچ کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ ایک اور طرح سے کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ تم جو بھی مال خرچ کرتے ہو، ماں، باپ، رشتہ داروں کے لیے، یتیموں کے لیے، مسکینوں کے لیے، سفر میں لوگوں کے لیے؛ تو یہ سب خیر اور اچھا ہے۔ خیر مال کے معنی میں ہے۔ جو بھی مال خرچ کروگے جہاں خرچ کروگے جو افراد بتا دیئے ہیں ان

کے درجات اور مراتب بیان کر دیئے ہیں تو وہ خیر اور اچھا ہے۔ یتیم وہ ہے جس کا بچپنے میں باپ مر جائے، مسکین بے چارہ ترین فقراء کو کہتے ہیں۔ یعنی مسکین فقر سے بدتر شکل ہوتی ہے۔ "ابن سبیل" اسے کہتے ہیں جو سفر میں ہیں اور ان کا خرچہ ختم ہوا ہو اور اس کے اہل و عیال بے سہارا ہو گئے ہوں۔ البتہ اپنے وطن میں وہ مالدار ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ جو بھی خرچ کرو گے وہ سب خیر ہے، اچھا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آگاہ ہے کہ چاہے کم خرچ کرو یا زیادہ خرچ کرو یہ اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرمانا چاہتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو وہ میری پسند ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں جسے ہم پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران آیت ۹۲ میں فرمایا ہے: "تم ہر گز نیکی اور اچھائی کو نہیں پا سکتے یہاں تک کہ اس کو خرچ کرو جس سے تم پیار رکھتے ہو"۔ دوسری بات یہ کہ جب انفاق کرو تو اس میں احسان نہیں جتانا چاہئے، جن پر خرچ کیا جا رہا ہے ان کو اذیت نہیں دینی چاہیے، ان سے کوئی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے، اللہ کی رضا کے لیے خرچ کیا جائے۔ تیسری بات: انفاق خالص اور بے ریا ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے باطن سے آگاہ اور باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری باطنی نیت کے مطابق تمہیں ثواب دے گا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾

"تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو، اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

جہاد کا حکم

اس آیت میں جہاد کے حکم کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جہاد اور قتال مومنین پر واجب ہے۔[1] لیکن یہ ایسا فریضہ ہے جس کو تم پسند نہیں کرتے۔ جہاد اور قتال سے ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کو مشقت ہوتی ہے، اس میں جانیں خطرے میں ہوتی ہیں اور مسلسل تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، تھکاوٹ ہوتی ہے، امنیت، رفاہ اور آرام جاتا رہتا ہے۔ یا اس وجہ سے ناپسندیدہ تھی کہ مومنین چاہتے تھے جنگ میں تاخیر ہو تاکہ وہ زیادہ آمادگی سے آگے بڑھیں اور اپنی طاقت کو اور بڑھا سکیں اس لیے کہ انہیں تو ظاہری چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کی آگاہی تھی ہی نہیں، وہ سوچ رہے تھے کہ ہم مزید کچھ تیاری کر لیں۔

اس حوالے سے تیسری بات یہ تھی کہ ان کی قرآنی تربیت اور ان کی محبت و شفقت اس ناپسندیدگی کی وجہ تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ خونریزی ہو بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ بڑے دوستانہ انداز سے لوگوں کو دعوت دیں اور پیار کے ساتھ اسلام کی طرف لے آئیں تاکہ دونوں طرف کی جانیں خطرے میں نہ ہوں لیکن یہاں تین معنوں میں سے پہلا معنی بہتر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتا ہے کہ ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو، لیکن وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ایک چیز تم پسند کرو وہ تمہارے لیے اچھی نہ ہو۔

یہاں پر اُمید کہنے والے کی طرف سے نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کی طرف تو جہالت کی نسبت نہیں دی جا سکتی بلکہ جو مخاطب ہیں جو سن رہے ہیں کہ اللہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم ظاہری معاملات کو دیکھ کر حکم لگا رہے ہوتے ہو، اس امر کے باطن سے تم آگاہ نہیں ہوتے اور حقیقت امر تم سے مخفی ہوتا ہے اور ''عسیٰ'' کا تکرار اس لیے ہے کہ مومنین صلح اور مصالحت آمیزی

---

[1] ۔ اس حکم سے بیمار، اندھا اور فالج والے افراد کو استثناء کیا گیا ہے۔ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ۔

کی طرف مائل تھے اور جنگ نہیں چاہتے تھے۔ انہیں نہیں پتہ تھا کہ جس چیز کے ظاہر کو دیکھ کر وہ اسے محبت کرتے تھے اس کے باطن پر ان کی توجہ نہیں تھی، کیونکہ ہو سکتا ہے اصل معاملہ اس کے برعکس ہو، جس کو وہ ناپسند کرتے تھے وہ ان کے فائدے میں ہو، اللہ تمہاری خیر و شر سے واقف ہے۔ یہ جملہ سابقہ بیان کو بتا رہا ہے اور اس میں ان کی غلطی کو بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کو چاہیے کہ وہ خود کو معیار نہ بنائیں، اللہ کے اوامر کے سامنے تسلیم ہوں کیونکہ اللہ کا علم مطلق ہے اور باقی جتنے لوگ ہیں اللہ کی مخلوق ہیں اور ان کا علم مقید اور محدود ہے۔ انہیں اوامر کے باطن کا علم نہیں ہے تو وہ پھر اپنے علم کو معیار قرار نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ کا حکم اس لیے دیا ہے کیونکہ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

”آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو اس میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے، اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس میں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ

ہے، اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے، اور وہ تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے، اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے پھر کافر ہی مر جائے پس یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور وہی دوزخی ہیں جو اسی میں ہمیشہ رہیں گے"۔

حرمت والے مہینے

اس آیت میں حرمت والے مہینوں کا حکم بیان ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں جنگ کرنا حرام ہے۔ رسول پاک ﷺ کو فرمایا گیا ان کو بتا دو کہ ان حرام مہینوں میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے۔ لیکن مشرکین کا راہ خدا سے روکنا، مسجد الحرام میں داخلہ سے روکنا اور مکے والوں کو وہاں سے نکالنا اس سے بھی بڑا جرم اور بڑا گناہ ہے۔ مذکورہ کام، حرام مہینوں میں جنگ کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یہاں پر سبیل اللہ سے عبادات اور حج کے مراسم مراد ہیں کیونکہ مشرکین نے ان مہینوں میں مسلمانوں کو حج نہیں کرنے دی تھی۔ سبیل اللہ کے کفر سے عملی کفر مراد ہے اس سے اعتقادی کفر مراد نہیں ہے یعنی حج کے جو عبادتی اعمال تھے انہوں نے ان کو بجا لانے سے انکار کر دیا، ان اعمال کو انجام دینے نہ دیا اور مسجد الحرام کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی اور لوگوں کو مسجد الحرام میں نہیں آنے دیا اور مومنوں کو مسجد سے نکال دیا اور یہ مشرکین سبب بنے کہ پیغمبر ﷺ بھی وہاں سے چلے جائیں۔

یہ گناہ اللہ کے ہاں ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے یعنی فتنے کا جرم قتل سے زیادہ ہے۔ یہاں پر فتنہ سے مراد لوگوں کو کفر کی دعوت دینا، لوگوں کو ایمان سے روکنا، لوگوں کو اللہ کے دین سے منحرف کرنا ہے اور یہ کام ماہ حرام میں جنگ کرنے سے زیادہ بڑا جرم ہے۔ مشرکین جب تک تمہیں دین سے منحرف نہ

کر دیں اور دین کے لیے تمہاری جدوجہد اور کوشش سے تمہیں روک نہ لیں ہمیشہ تمہارے ساتھ جنگ کرتے رہیں گے اور وہ اس کام سے باز نہیں آئیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ جو بھی دین سے پھر جائے گا تو اس کے سارے نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور دُنیا و آخرت میں وہ بے بہرہ ہو گا اور جہنمیوں سے ہوں گے اور جو شخص بغیر توبہ کے کفر کی حالت میں مرے گا تو اس کا کوئی عمل بھی صحیح نہیں رہے گا اور اس کے سب اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ جب ارتداد کی وجہ سے عمل باطل ہو جائے گا تو وہ جہنمیوں کا ساتھی بن جائے گا کیونکہ کفر کی حالت میں مرا ہے، جو بھی کفر کی حالت میں مرے گا تو وہ جہنم ہی جائے گا اور ہمیشہ عذاب میں رہے گا اور کبھی وہاں سے نہیں نکلے گا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝۲۱۸

”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے“۔

ایمان عمل اور جہاد فی سبیل اللہ

ایمان زبان سے اقرار اور اعضاء و جوارح سے عمل اور دل میں عقیدے کا مستقر ہونا اور ٹھہرنا ہے۔ جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے ہجرت کرتے ہیں، اللہ کی خوشنودی کے لیے جہاد کرتے ہیں اور دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں تو اللہ ایسے لوگوں کو نااُمید نہیں کرتا ان کی مدد کرتا ہے۔ ان کی مدد دو طرح سے ہو سکتی ہے یا تو ان کو شہادت ملے گی تو یہ بھی کامیابی ہے یا تو ان کو دنیا میں خیر و برکت ملے گی تو یہ بھی کامیابی ہے اور خدا مہربان ہے۔ ایمان کے ساتھ عمل

ضروری ہے اور عمل میں جہاد فی سبیل اللہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے اس لیے عمل کا عام ذکر کرکے اسکے بعد عمل جہاد کا خصوصی ذکر اسکی اہمیت بتانے کے لیے کیا ہے۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَ الۡمَیۡسِرِ ؕ قُلۡ فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِہِمَا ؕ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾

”آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت بڑا ہے، اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دو جو زائد ہو (اسے خرچ کرو)، ایسے ہی اللہ تمہارے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو“۔

شراب اور قمار کی حرمت

اس آیت میں دو بڑے گناہوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ ایک تو خمر ہے اور خمر، ہر نشے والی اور مست کرنے والی چیز کو کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ پردہ ڈالنے اور چھپانے کے معنی میں ہے۔ کیونکہ نشہ عقل کو چھپادیتا ہے، مستور کردیتا ہے اور نشے کی حالت میں خیر وشر کی تمیز باقی نہیں رہتی اس لیے نشے والی چیز کو خمر جاتا ہے۔ ”میسر“ جوئے اور قمار کو کہتے ہیں۔ لغت میں ”میسر“ سہولت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ جواء باز بغیر رنج اور تکلیف اور محنت کے دوسرے کا مال آسانی سے وصول کرلیتا ہے اس لیے اسے یاسر کہتے ہیں۔ ”اثم“ سستی کے معنی میں ہے، یعنی نشے اور قمار کی حالت خیرات اور اچھائی کی طرف جانے میں سستی کا سبب بنتے ہیں۔ اثم ایسا گناہ ہے جو اپنے پیچھے شقاوت اور محرومیت چھوڑتا ہے اور زندگی کی سعادت کو تباہ کردیتا ہے، خوش بختی اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ شراب کے طبّی نقصانات بھی ہیں جو

انسان کے تمام بدن پر طاری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا اخلاقی نقصان بھی بہت زیادہ ہے۔ان نقصانات میں سے کچھ یہ ہیں کہ شراب انسان کو جرائم پر آمادہ کرتا ہے اور انسان نشے کی حالت میں اپنے اسرار فاش کر بیٹھتا ہے اپنی ناموس کی بر حرمتی کرواتا ہے، دوسروں پر زیادتی کرتا ہے، ہتک حرمت کرتا ہے اور اس کا طبّی نقصان یہ ہے کہ شراب پینے والے کی عقل ضائع ہو جاتی ہے۔ شراب پینے والا دیوانگی اور مستی میں آجاتا ہے اور نشے کی حالت اس کا اثر عقل زائل کرنے پر ہوتا ہے۔ جواء زندگی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے اجتماعی مفاسد بہت زیادہ ہیں۔اس کو سب جانتے ہیں لہٰذا اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں مثلاً مالی فوائد ہیں، لذت ہے، شہوت ہے، مزہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کا نقصان ان کے فوائد سے زیادہ ہے۔ جوئے اور شراب کے ظاہری فوائد سے اس کے منفی اثرات بہت زیادہ ہیں۔اس آیت میں کہیں بھی ان کی اباحت اور جواز کا حکم نہیں ہے کیونکہ گناہ اور اثم، شراب اور جواء یہ آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے آسان کہا گیا ہو اور پھر اسے سخت اور مشکل تر کہا گیا ہو، پہلے ہی صراحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ یہ دونوں گناہ ہیں کیونکہ یہ بری عادت لوگوں میں عام تھی اور لوگ اس کی حرمت کو قبول کرنے میں شک اور تردید میں تھے اس لیے اس کی حرمت کو چند مراحل میں بیان کیا گیا ہے اور اس کی حرمت کی تاکید ہوئی ہے اس بنا پر مذکورہ آیت میں اس کی حلیت کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جس کے حلال ہونے کا کوئی معنی نہیں ہے۔

آیت کے دوسرے حصہ میں لوگوں کی زبانی یہ سوال پوچھا گیا ہے کہ جو مال کماتے ہیں اس سے کتنا خرچ کریں؟ تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اتنا بھی خرچ نہ کرو کہ اپنے پاس کچھ نہ رہے اور اس طرح بھی ہاتھ باندھ کر نہ رکھو یعنی خرچ کرنے میں بہت زیادہ

کنجوسی بھی نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے حد وسط اور درمیانی راستے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تم فکر کرو، اللہ کے سب احکام واضح ہیں جن کا دل بیدار ہو، جن کے کان سننے والے ہوں، جو دیکھ رہے ہوں جو سوچ سمجھ کر کام لیں تو ان کے لیے یہ ساری چیزیں واضح ہیں۔

سورہ ق کی آیت ۳۷ میں ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ﴿۳۷﴾

"بے شک اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو"۔

فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾

"دنیا اور آخرت کے بارے میں، اور یتیموں کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں، کہہ دو ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے، اور اگر تم انہیں ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ بگاڑنے والے کو اصلاح کرنے والے سے (الگ) جانتا ہے، اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں تکلیف میں ڈالتا، بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

یتیموں سے نیک سلوک

اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو انسان کا عارضی گھر قرار دیا ہے تاکہ وہ اس میں زندگی گزار کر اپنے حقیقی گھر کے لیے زاد مہیا کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آخرت کو انسان کا حقیقی اور ہمیشہ رہنے والا گھر بنایا ہے جس کی طرف سب نے پلٹ کر جانا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ دُنیا میں

جو کچھ کمائے وہ آخرت کے لیے ہو کیونکہ اللہ نے اسے اجازت دی ہے کہ دُنیا میں رہ کر آخرت کے گھر کے لیے کمائے، یہ دُنیا عمل کا گھر ہے۔ اس آیت میں لوگوں کے لیے تشویق کی ہے کہ وہ مبداء و معاد یعنی آغاز اور انجام، دُنیا و آخرت کے متعلق حقائق کی آشنائی کے لیے غور و فکر کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ علم مطلق اللہ کے لیے ہے، لیکن عالم کی عظمت اور ان کے علل و اسباب میں فکر کریں تاکہ ان کی حقیقت تم پر آشکار ہو، اندھی اطاعت نہ کریں۔ یتیموں کے بارے پوچھتے ہیں تو ان سے کہو ان کے امور کی اصلاح کرنی چاہیے، یہاں ایک قسم کی تخفیف اور آسانی بیان کی گئی ہے۔ پہلے کہا گیا کہ تمہیں یتیموں کے ساتھ میل جول رکھنے کی اجازت ہے، پھر فرمایا کہ اگر خدا چاہے تو تمہاری مدد کرے، پس معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلے میں سن رکھا تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا سخت آرڈر ہے۔ پھر اللہ نے حقیقی اصلاح اور بہتری کی بات کہہ دی نا کہ ظاہری اصلاح کی۔ اور یہ کہہ دیا کہ اُن کے ساتھ میل جول رکھو۔ اس میں یتیم اور کمزور کے ساتھ باہمی میل جول کی طرف اشارہ ہے۔

پھر بتایا کہ مومنین سارے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اُن کے درمیان موجود امتیازات اور ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ سے ممتاز ہونا اور دوسرے کو کمتر سمجھنا اور اپنے کو برتر سمجھنا یہ ساری چیزیں فساد کا سبب بنتی ہیں۔ اسلام میں کمزور اور طاقتور، غنی و فقیر، ناقص و کامل سب برابر ہیں۔ سورہ الحجرات کی آیت ۱۰ میں بتایا گیا ہے کہ: ''مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں'' وہاں اونچ نیچ نہیں ہے آپس میں برادرانہ میل جول رکھو۔ اسی طرح یتیم کے مال کے ساتھ بھی اپنے بھائی جیسا سلوک کرو۔ اللہ تعالیٰ فسادی اور اصلاح کرنے والے دونوں کو جانتا ہے، اصلاح خیر ہے اور فساد شر ہے۔ اللہ کے ہاں تو کسی شئے کی حقیقت پوشیدہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کو بھی جانتا ہے جو اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں اور وہ فساد کرنے والوں کو بھی جانتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمہیں مشقت میں ڈالے اور خدا با عظمت ہے، ہر چیز پر اُسی کا غلبہ ہے،

اس کا ہر حکم حکمت اور دانائی کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کوئی حکم جاری فرماتا ہے تو وہ بھی مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

''اور مشرک عورتیں جب تک ایمان نہ لائیں ان سے نکاح نہ کرو، اور مشرک عورتوں سے ایمان دار لونڈی بہتر ہے گو وہ تمہیں بھلی معلوم ہو، اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں، اور البتہ مومن غلام مشرک سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھا ہی لگے، یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے، اور لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں''۔

مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم

''نکاح'' عقد کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ کلمہ جماع اور مقاربت کے لیے استعارہ بنا ہے۔ ''شرک'' کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کے معنی میں ہے۔ جس کے کئی مراتب ہیں۔ جن میں کسی کو اللہ کا شریک بنانا، بت پرستی یا شرک خفی یا یہودی اور نصرانیوں کا کہنا کہ عزیر اللہ کے فرزند ہیں یا خود یہود یا نصرانی اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس کے علاوہ شرک عملی کے کئی اور

مصادیق بھی ہیں جن میں: ظاہری اسباب کی تاثیر گذاری کے استقلال کے عقیدہ رکھنا یا بشری قوانین کو الٰہی قوانین پر برتری دینا۔ یہاں تک کہ شرک خفی کے مصادیق جن سے اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کے سوا کوئی بھی مبراء نہیں ہے۔ شرک خفی کا آخری مرحلہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا اور ماسوای اللہ کی طرف توجہ کرنا ہے۔

قرآنی اصطلاح میں مشرک کا لفظ اہل کتاب کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے، ان کے لیے کافر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر بظاہر آیہ شریفہ مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کر رہی ہے۔ اہل کتاب مردوں اور عورتوں سے نکاح کرنے سے منع نہیں کر رہی ہے۔ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِکَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْکُمْ ۚ "اور مشرک عورتوں سے ایمان دار لونڈی بہتر ہے گو وہ تمہیں بھلی معلوم ہو" بہتری کا معیار ایمان ہے، اس لیے مشرک آزاد عورت سے ایمان دار لونڈی بہتر ہے، اگرچہ مشرک آزاد عورت مال دار، حسب نسب والی اور خوبصورت ہی کیوں نہ ہو وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ ؕ "اور مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں" برتری کا معیار ایمان ہے، نہ مال وثروت اور حسن و جمال۔ اُولٰٓئِکَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ۖ "یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر باطل عقاید کے راسخ ہونے کی وجہ سے وہ تمہیں پست اخلاقی صفات جیسے کفر، فسوق اور گمراہی کی جانب دعوت دیتے ہیں جس کا نتیجہ آتش دوزخ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِہٖ ۚ "اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے" آیت کے اس حصے میں بجائے اس کے کہ کہا جائے مومنین تمہیں بہشت کی جانب دعوت دیتے ہیں، کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جنت کی جانب دعوت دیتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مومنین اپنی زندگی کے تمام امور میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے خود کو مستقل اور جدا نہیں سمجھتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار کو اپنے تمام امور کا ولی اور سرپرست جانتے ہیں۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بہشت کی جانب دعوت دیتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مومنین کو مشرکین سے نکاح کرنے سے منع کرنے کے نتیجہ میں مشرکوں کو ایمان لانے کی جانب ترغیب دلائی گئی ہے اور یہی امر مومنوں کے بہشتی بننے کا سبب بنتا ہے۔ وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ۠ ﴿۲۲۱﴾ "اور لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں" اللہ تعالیٰ کی آیات اور نشانیاں سب لوگوں کے لیے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر دلالت کرتی ہیں کہ سب کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہیں۔

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى یَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ﴿۲۲۲﴾

"اور آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو وہ نجاست ہے پس حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو، اور ان کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے، بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

ایام حیض کے احکام

اس آیت میں حیض کے حوالے سے حکم بیان کیا گیا ہے۔ خواتین کو ہر ماہ مخصوص ایام میں آنے والے خون کے دنوں کو ایام حیض کہا جاتا ہے۔ رسول خدا ﷺ کو بتایا گیا ہے

کہ حیض کے بارے میں تجھ سے سوال کرتے ہیں تو ان کو بتاؤ کہ حیض ایک اذیت ہے، البتہ ایسی اذیت جو قابل برداشت ہے۔ اذیت ایسی چیز کو کہتے ہیں جو انسان کی طبیعت کے موافق نہ ہو۔ جنہوں نے "اذی" کو ضرر کے معنی میں لیا ہے تو انہوں نے محیض کو عورتوں سے جماع کے معنی میں لیا ہے یعنی حالت حیض میں عورتوں سے جماع کرنا ضرر کا سبب ہے۔

بہرحال حیض ایسی حالت ہے جو انسان کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس حالت میں عورت کو تکلیف بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تکلیف قابل برداشت ہوتی ہے۔ اس حالت میں عورت سے مقاربت کرنے سے روکا گیا ہے کہ ان ایام میں ان سے جدا رہو۔ البتہ عورتوں سے مقاربت نہ کرنے کا حکم مطلق نہیں ہے بلکہ یہ حکم اس وقت تک ہے جب تک عورت حالت حیض سے پاک نہیں ہوتیں۔ حیض سے پاک ہونے تک مقاربت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسلام میں یہودیوں کی طرح مطلق سخت گیری بھی نہیں ہے اور نصرانیوں کی طرح مطلق آزادی بھی نہیں ہے بلکہ اسلام کی نظر میں درمیانہ راستہ صحیح ہے۔ مردوں سے کہا گیا ہے کہ جب عورتوں کو خون آرہا ہو تو اس وقت ان کے ساتھ خون آنے کی جگہ پر مقاربت اور مباشرت نہیں کرنی لیکن دیگر تمتعات اور لطف اُٹھانے کے حوالے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے یہاں تک کے وہ مکمل پاک ہو جائیں اور حیض آنا بند ہو جائے۔ اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جب وہ مکمل طور پر پاک ہو جائیں تو اس طرح جیسے اللہ نے حکم دیا ہے ان سے مقاربت کر سکتے ہو۔

نہی کے بعد جواز کے حکم کے آنے کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ حالت نہ رہے جس کی وجہ سے مقاربت سے دوری کا حکم دیا گیا تھا جب وہ وقت ختم ہو جائے اور خون رک جائے تو مقاربت میں قباحت نہیں اور غسل کے بعد جماع کیا جا سکتا ہے۔ یہ حکم بے فائدہ نہیں ہے کیونکہ نسل انسانی کی بقاء کا تعلق اسی جماع ہی سے ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے یعنی ایسے اعمال جو انسان کی پاکیزگی کا سبب

ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کاموں میں سے ایک کام توبہ کرنا بھی ہے۔ توبہ کا معنی ہے اللہ کی جانب پلٹنا۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو قبول کرلیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر توبہ اور پاک ہونے کو تکرار کرکے اس کی اہمیت بتائی ہے جس طرح وضو اور غسل کرنے سے پاکیزگی اور طہارت ہوتی ہے، اسی طرح عمل صالح بھی انسان کی طہارت اور پاکیزگی کا سبب بنتا ہے۔

اس کے علاوہ علوم نافعہ کی تحصیل بھی انسان کے باطن کو پاک کرنے کا وسیلہ بنتی ہے۔ یہ ساری چیزیں طہارت کے زمرے میں آتی ہیں اور اللہ پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ انسان کی معنوی پاکیزگی کا سبب بننے والے اعمال سے محبت کرتا ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ، اور اپنے لیے آئندہ کی بھی تیاری کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم ضرور اسے ملو گے اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دو''۔

بیویوں سے لطف اندوز ہونا

''حرث'' زراعت کے معنی میں ہے۔ '' اَنّٰى '' اسم شرط ہے اور وقت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض دفعہ جگہ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جس وقت چاہو اپنی عورتوں کے ساتھ تم مقاربت کر سکتے ہو۔ '' شِئْتُمْ '' سے وجوب کی نفی کی گئی ہے۔ اس آیت میں عورتوں کو انسانی معاشرے میں کھیتی سے نسبت دی گئی ہے کیونکہ اگر عورتیں نہ

ہوں تو انسان کی نوع کو دوام نہیں مل سکتا۔ آیت میں عورتوں سے جماع کے لیے اس کے فطری طریقہ کو ہی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ اپنی نسل کو باقی رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اس جملے سے نوع انسان کی بقاء کی تشبیہ دی ہے تاکہ وہ اللہ کے دین کو زندہ رکھیں اور اس کی یگانگی اور وحدانیت کو ظاہر کریں اور اس کی عبادت کریں۔ عبادت، خلقت کا ہدف ہے ۔لوگوں نے اس زمین پر ہمیشہ نہیں رہنا اور نہ ہی وہ شکم پرستی، فرج پرستی یعنی جماع اور غفلت کی وادی میں بھٹکتے اور گمراہی میں سرگرداں رہنے کے لیے خلق ہوئے ہیں۔" اپنی ذات کے لیے کچھ آگے بھیجو" اس جملے سے انسان کو جہاں تولید نسل کی تشویق کی گئی ہے وہاں اعمال صالحہ کا شوق بھی دلایا گیا ہے۔

پھر بتایا ہے کہ جو کچھ تم آگے بھیجوگے، اس کو قیامت کے دن دیکھوگے۔ یہ خطاب یا تو فقط مردوں کے لیے ہے یا مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ پھر فرمایا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یعنی اعمال صالحہ بجالاؤ، اللہ کے طے شدہ حدود کو مت پھلانگو۔ اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچاؤ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سے تمہاری ملاقات ہونی ہے۔اس دن برے اعمال سے بچنے والے مومنین کے لیے بشارت ہے۔ لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے تم نے ضرور ملنا ہے اس لیے تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جب اللہ کے حضور تمہارا احتساب ہوگا تو تمہیں وہاں شرمندگی نہ ہو۔ اور ایمان کے تقاضے کو پورا کرو اور مومنین کو اچھائی اور اچھے ثواب کی بشارت دو کیونکہ مومنین صالح جب عمل صالح آگے بھیجیں گے، اولاد کی تربیت کریں گے تو صالح فرد سے صالح معاشرہ تشکیل پائے گا ۔ لہٰذا انسان کا اپنی بیوی کے ساتھ مقاربت کرنا اس سے پیار محبت کرنا اور اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرنا؛ تقویٰ الٰہی ہے اور یہی چیزیں انسان کو آخرت میں فائدہ دیں گی۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ نیکی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے سے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ

''عُرْضَةً''، کسی چیز کو پیش کرنے کے معنی میں ہے جو انسان کے فائدے میں ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اپنے فائدے کی خاطر قسموں میں اللہ کو مت کھینچ کرلے آؤ۔ دوسروں پر احسان نہ کرنے، دوسرے کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنے، تقویٰ اختیار نہ کرنے، لوگوں کی اصلاح نہ کرنے کے لیے اللہ کی قسم مت اٹھاو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اس بات سے راضی نہیں ہے کہ اس کے نام کو اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرو۔ خدا نے تو نیکی کرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور اصلاح کا حکم دیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اس طرح معنی کیا ہے لیکن یہ معنی بھی کر سکتے ہیں کہ '' لا '' کو مقدر بنانے کی ضرورت نہ ہو، اس صورت میں اس کا یہ معنی ہوگا کہ اللہ کے نام کی بہت قسمیں نہ کھاؤ، اگر ایسا کروگے تو یہ سبب ہوگا کہ تم نیکی، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے میں کامیاب نہیں ہوگے۔ کیونکہ جو بہت زیادہ قسمیں اٹھاتا ہے اور اللہ کے نام کو ہر وقت بات بات پر اللہ کے نام کی قسم کھاتا ہے تو اس طرح اللہ کا مقام اور شان گر جاتی ہے اور اس کی اہمیت نہیں رہتی۔ اور جب قسم کھانے کی عادت بن جاتی ہے تو پھر بعض دفعہ جھوٹی قسمیں بھی اٹھاتا ہے حالانکہ دین کا مقصد تو نیکی، اصلاح، اچھائی اور اپنے آپ کو بڑا بنانے سے پرہیز کرنا ہے۔ اور جب قسم اٹھالی تو پھر اس کی پابندی بھی کرنی پڑے گی۔

''وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' کے جملے سے ایک قسم کی تنبیہ کی گئی ہے کہ ہر حال میں اس آیت پر عمل کرو۔ لیکن پہلا معنی زیادہ واضح ہے، اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ سچ کے بارے میں بھی قسم نہ اٹھاؤ، چہ جائیکہ جھوٹی قسم، جھوٹی قسم تو ویسے ہی حرام ہے لیکن اگر قسم اٹھالیتے ہو تو پھر اس قسم کے مضمون کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ اگر قسم کو توڑو گے تو اس کے لیے کفارہ دیناپڑے گا۔ اس کے متعلق تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾

''اللہ تمہیں تمہاری قسموں میں بے ہودہ گوئی پر نہیں پکڑتا لیکن تم سے ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جن کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہو، اور اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے''۔

جھوٹی قسموں کا مواخذہ

''لغو'' ہر وہ عمل جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو یعنی بے فائدہ ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بے ہودہ قسموں سے منع فرمایا ہے، بے ہودہ قسم اس قسم کو کہا جاتا ہے جس میں قسم اٹھانے والا نہیں چاہتا کہ اس قسم کے ذریعے عہد و پیمان باندھے بلکہ زبان کی حد تک عہد و پیمان باندھتا ہے، بے ہودہ کہہ رہا ہوتا ہے جی ہاں! واللہ باللہ اللہ کی قسم ایسا ہے، اللہ کی قسم یہ ہے! تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں قسموں کے بارے میں اسی طرح نہیں روکا ہے لیکن جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کا اللہ مواخدہ کرتا ہے۔ ''کسب'' کوشش اور عمل سے منفعت حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔ اور قسم کے تین قسم کے آثار ہوا کرتے ہیں: (۱) ایک تو لفظ کے حوالے سے ہے اور اس قسم کی قسم کا اثر کلام اور بات کی تاکید کرنا ہے۔ (۲) اس کا دوسرا اثر

عہد و پیمان کو منعقد کرنا ہے۔ (۳)اور اس کا تیسرا اثر اس کو توڑنے اور اس کی مخالفت کے حوالے سے ہے کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے بے ہودہ اور بلاوجہ بغیر مقصد کے قسم کھانے سے منع کیا ہے، نہ کوئی قرارداد ہے اور نہ ہی کوئی مقصد جس پر وہ قسم اُٹھا رہا ہے، ویسے ہی بلامقصد ہر بات پر اللہ کی قسم اٹھا رہا ہے۔ ایک دفعہ کسی کام کے لیے اللہ کی قسم اٹھا رہا ہے، کوئی معاہدہ کر رہا ہے اس کے لیے قسم اٹھا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ فلاں کام کی مخالفت نہیں کروں گا۔ تو اس طرح کی بے ہودہ گفتگو سے اللہ نے منع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا۔ یہ عمل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی اللہ تبارک و تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے اور تمہاری خطاؤں اور تمہارے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

”جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا لیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بڑا بخشنے والا نہایت رحم والا ہے“۔

بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم

اس آیت میں عورتوں کے ساتھ مقاربت کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے۔ ”ایلاء“ ایک طرح کی قسم ہے جو شوہر کی جانب سے ہوتی ہے جس میں وہ اپنی بیوی کے قریب نہ جانے اور اس سے مقاربت نہ کرنے کی قسم اٹھاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ”ایلاء“ کو چار ماہ سے مقید کر دیا ہے کہ چار ماہ تک وہ ایسا کر سکتا ہے۔ یعنی ”ایلاء“ کی شرعی حد چار مہینے ہے، اس سے زیادہ اپنی عورتوں سے مقاربت نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

یعنی شوہر چار ماہ تک اپنی بیوی سے دوری کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ پلٹ آئے یعنی چار مہینے سے پہلے اس بیوی سے مباشرت کرے تو اللہ تعالیٰ اس قسم پر اسے کوئی سزا نہیں دے گا لیکن اگر کسی نے یہ قسم کھائی اور چار ماہ کے بعد بھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا تو پھر قسم توڑنے کا کفارہ ہے، کفارہ ادا کرنے کے بعد اس پر کوئی عذاب نہیں ہے۔ خدا اس سے درگذر کرے گا۔ اور اگر اس نے طلاق کا فیصلہ کر لیا تو پھر بھی اس پر عذاب نہیں ہے۔ شریعت نے اس قسم کے توڑنے کا کفارہ معین کیا ہے تو اس پر تو یہاں کوئی دلالت نہیں ہے، البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قسم توڑنے کا گناہ نہ ہو، اس طرح کفارہ کو ترک نہیں کر سکتا کیونکہ کفارہ کی بخشش نہیں ہے اور قسم توڑنے کا کفارہ سورہ مائدہ کی آیت ۹۲ میں بتایا گیا ہے کہ دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾

''اور اگر انہوں نے طلاق کا پختہ ارداہ کر لیا تو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

ایلاء کے بعد کفارہ یا طلاق دینا

اس آیت میں ایلا کی قسم کے بعد اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والے عذاب سے بچنے کے دو طریقے بیان ہوئے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ دے کر عذاب الٰہی سے بچا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا طریقہ طلاق دینا ہے۔ ایلا کی گئی بیوی کو طلاق دے کر بھی اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے۔ ایک شخص نے اپنی بیوی سے مقاربت نہ کرنے کی قسم اٹھائی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کے پاس چار ماہ کی مہلت ہے اس کے بعد اس کے لیے اس گناہ سے بچنے کے دو طریقے ہیں؛ یا تو اپنی بیوی کو طلاق دے تاکہ وہ دوسرے مرد سے شادی کر لے یا چار ماہ بعد قسم توڑنے کا کفارہ دے کر اپنی بیوی کے ساتھ مقاربت کرے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال میں انسان کے باطن اور ظاہری اقوال کو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی

ہے۔ جو نہ طلاق دے اور نہ ہی چار ماہ بعد قسم توڑنے کا کفارہ دے کر اپنی بیوی سے مقاربت کرے تو ایسا شخص گناہگار اور مجرم ہے۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۠(۲۲۸)

''اور طلاق دی ہوئی عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں، اور ان کے لیے جائز نہیں کہ چھپائیں جو اللہ نے ان کے پیٹوں میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے خاوند اس مدت میں ان کو لوٹا لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ اصلاح کا اردہ رکھتے ہیں، اور دستور کے مطابق ان کا ویسا ہی حق ہے جیسا ان پر ہے، اور مردوں کو ان پر فضیلت دی گئی ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے''۔

مطلقہ عورتوں کی عدت

"طلاق"، قید و بند سے آزاد ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ عورت کے ازدواج کی قید سے آزاد ہونے کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ''تَرَبَّص'' اپنے آپ کو نسب کے فساد سے بچانے کے لیے روکے رکھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی عورت شوہر کے علاوہ کسی اور کے ساتھ مقاربت نہ کرے تاکہ نسب کا سلسلہ درہم برہم نہ ہو جائے۔ ''قرو'' قرء کی جمع ہے اور یہ لفظ حیض کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور حیض سے پاک ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پر کہا گیا ہے کہ مطلقہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ تین طہارتیں یا تین حیض دیکھ چکی ہوں۔ اللہ نے تاکید سے فرمادیا کہ ان کے ارحام میں جو اللہ نے پیدا کیا ہے اسے نہ چھپائیں، یعنی عورتیں عدت سے جلدی نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ اسی طرح وہ اپنے شوہر کو رجوع سے بھی نہیں روک سکتیں اور نہ ہی حمل کو پنہاں کر سکتی ہیں۔ آیت میں عورتوں کو اس حکم کی پیروی کرنے کی تشویق کی گئی ہے۔ اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں اور عدت طلاق میں رجوع کر لیتے ہیں اور اسے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ ان کا رجوع کرنا اصلاح کی نیت سے ہو نہ کہ ضرر اور نقصان پہنچانے کے لیے یا فساد اور یا فتنہ کی نیت سے۔

''معروف'' ہر اس عمل کو کہتے ہیں جو عمومی افکار اور میل جول میں مانوس اور معاشرہ اور سوسائٹی کے مزاج سے سازگار ہے۔ اس بناء پر معروف ایسا حکم ہے جو عقلی ہدایت اور عقلی اور شرعی حکم اور اخلاقی فضیلت کو بھی لیا ہوا ہے۔ اگر کوئی عمل انسانی آداب اور اس کی روشوں اور طور طریقوں کے مطابق ہے تو معروف ہے اور جو عمل معروف ہوگا وہ معقول بھی ہوگا۔ معروف کے مصادیق میں سے ایک مصداق معاشرے کے تمام افراد کا قوانین اور سزاؤں کے لحاظ میں برابر ہونا ہے۔ البتہ اجتماع میں افراد کی موقعیت کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔

جیسے حکم اس طرح ہو کہ حاکم کی حکومت محفوظ رہے۔ عالم کا علم محفوظ ہو، محکوم کی محکومیت، جاہل کی جہالت، قدرت مند کی قدرت اور کمزور کی کمزوری کا خیال رکھا جائے اور ہر فرد کا جو حق بنتا ہے وہ اسے ملنا چاہیے، نہ اس کے حق سے کم نہ اس سے زیادہ۔

اسلام نے عورت کے حقوق بڑے عمدہ انداز میں طے کئے ہیں۔ بعض احکام اس کے فائدے میں ہیں اور بعض اس کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن اس میں توازن ہے اور یہ قوانین انصاف پر مبنی ہیں جن کو عورت کی اجتماعی زندگی کو مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے جس میں ہر طرح کی ہم آہنگی موجود ہے۔ یہاں پر مردوں کے حوالے سے ایک بات کہی گئی ہے جو پچھلے جملے کو مکمل کرنے کے لیے ہے، یہ دونوں جملے ایک معنی دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورتوں اور اُن کے شوہروں کے درمیان مساوات اور برابری کے حقوق اور قوانین کا لحاظ رکھا ہے لیکن ایک بات ہے کہ مردوں کے لیے ایک رتبہ زیادہ رکھا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شوہروں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ عدت کے ایام میں اس سلسلے کو توڑ کر اصلاح اور بہتری کی خاطر بیوی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ حق مرد کو دیا گیا ہے اور یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کا حکم برحق ہے کیونکہ خداوند تبارک و تعالیٰ انسانوں کی مصلحتوں اور ان کے مفادات سے آگاہ ہے اور وہ حکیم اور دانا ہے، اس کا ہر فیصلہ اور حکم انسانوں کی بہتری کے لیے ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

”طلاق دو مرتبہ ہے، پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، اور تمہارے لیے اس میں سے کچھ بھی لینا جائز نہیں جو تم نے انہیں دیا ہے مگر یہ کہ دونوں ڈریں کہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت معاوضہ دے کر پیچھا چھڑا لے، یہ اللہ کی حدیں ہیں سو ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا سو وہی ظالم ہیں“۔

طلاق کے دیگر احکام

اس آیت میں طلاق کے دیگر احکام بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ طلاق دو دفعہ ہے۔ یعنی شوہر ایک دفعہ طلاق دیتا ہے اور عدت میں رجوع کر لیتا ہے اور پھر دوبارہ طلاق دیتا ہے اور پھر رجوع کر لیتا ہے تو یہ دو دفعہ کی طلاق ہو گئی۔ شوہر دو دفعہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد رجوع کر سکتا ہے تاکہ اس کے ساتھ اچھے انداز سے گزارے، ایسی زندگی جس میں جبر نہ ہو تاکہ زندگی کا آغاز سعادت مندانہ اور خیر اور سلامتی سے ہو۔ لیکن جب تیسری بار طلاق دے تو شوہر کو رجوع کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ عورت کسی اور مرد سے شادی کرے اور اس شوہر سے جدا ہو تو پھر نئے سرے سے اس سے شادی کر سکتا ہے۔ شوہر تیسری مرتبہ عدت طلاق میں رجوع نہیں کر سکتا۔

شوہر نے جو کچھ عورتوں کو دیا ہے جیسے مہریہ یا دوسرے خرچ کئے ہیں تو طلاق دینے کے بعد وہ سب کچھ ان سے وصول نہیں کر سکتا۔ مگر یہ کہ اگر اس طرح نہ ہوا تو الٰہی قوانین کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا یعنی آپس میں اخلاقی طور توافق نہیں ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی بڑھ جائے گی تو اس صورت میں مرد عورت کے مہر سے کچھ لے کر اسے طلاق دے سکتا ہے۔ مذکورہ صورت میں طلاق لینے کے لیے کوئی گناہ نہیں کہ عورت کی طرف کچھ

مرد کو دیا جائے اور مرد اسے لے لے۔ یہ اسی صورت میں ہے جب وہ آپس میں ٹھیک طریقے سے نہ رہ سکتے ہوں اور حدود الٰہی کی نافرمانی ہو رہی ہو تو اس کے لیے ایک حل بیان کیا جا رہا ہے۔ بیوی اور شوہر دونوں کی یہ حالت ہو کہ مسلمانوں میں سے کوئی ان کی اس حالت سے آگاہ ہو تو اسے یہ خوف لاحق ہو جائے اور عقلاء ایسا حکم دیں کہ اب یہ آپس میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو اس صورت میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت حق مہر سے کچھ مرد کو دے دے تاکہ وہ اسے طلاق دے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہ احکام اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ کیونکہ فقہی احکام جو اللہ کے قوانین ہیں وہ اجتماعی اور اخلاقی مصلحتوں کے تحت وضع کئے گئے ہیں لہٰذا ان کی پابندی کرنی چاہیے اور ان کی حدود پامال نہیں کرنا چاہیے اور جو بھی الٰہی حدود کو پامال کرتا ہے تو وہ ظالموں میں سے ہے۔ اسلام عمل کا دین ہے، شریعت عمل سے عبارت ہے۔ لہٰذا دین فقط بات کا نام نہیں ہے۔ دین کے ظواہر پر عمل کرنا بھی کافی نہیں ہے بلکہ اسلام کے قوانین کی جو رُوح ہے اور جو شریعت کے قوانین میں مصلحت مدنظر رکھی گئی ہے اس کا لحاظ کرنا بہت ضروری ہے اس بنا پر اسلام کے فقہی احکام اس کے اخلاقی معارف سے جدا نہیں ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

”پھر اگر اسے طلاق دے دی تو اس کے بعد اس کے لیے وہ حلال نہ ہو گی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں اگر ان کا گمان غالب ہو کہ وہ اللہ کی حدیں

قائم رکھ سکیں گے، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں وہ انہیں کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔

تین دفعہ طلاق دی گئی عورت سے دوبارہ نکاح

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد شوہر بیوی کی طرف رجوع نہیں کر سکتا اور وہ اس پر حرام ہو جائے گی مگر یہ کہ وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور ان کے درمیان عمل مقاربت بھی ہو جائے اور پھر دوسرا شوہر اس کو طلاق دیدے اور عورت اور پہلا شوہر کا آپس میں توافق ہو گیا تو وہ اس عورت کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ اس حوالے سے بتا دیا کہ قوی گمان ہو کہ اب وہ الٰہی حدود کا لحاظ رکھیں گے اور یہ نئے نکاح میں ضروری شرط ہے۔

"تراجع" یعنی دونوں طرف رجوع کرنے کا ارادہ، پہلی دو طلاقوں میں صرف مرد کو رجوع کرنے کا حق حاصل تھا لیکن یہاں تراجع ہے یعنی دونوں طرف، عورت اور مرد اس بات پر مائل ہوں کہ اب نئے سرے سے پھر اکٹھے مل کر زندگی گزاریں اور انہیں یقین ہو کہ اب وہ نفسانی خواہشات میں نہیں بہہ جائیں گے اور اللہ کی حدود کو نہیں چھوڑیں گے، اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق چلیں گے تو ایسی صورت میں انہیں نکاح کر کے آپس میں اکٹھے رہنے کی اجازت ہے۔ یہ سارے حدود اور فقہی اور اخلاقی احکام معاشرے کی اصلاح کے لیے مناسب ہیں، اس جملے میں عجیب اور حیرت انگیز ایجاز ہے جس سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اس آیت میں چودہ ضمیریں ہیں اور ہر ضمیر کا مرجع مختلف ہے لیکن اس بیان میں کسی قسم کی کوئی سنگینی اور ثقل نہیں ہے اور کلام بڑا سلیس ہے۔ جس کے سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہیں ہے۔ یہ کلام فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ منزل پر ہیں۔ ویسے تو پورا قرآن فصیح اور بلیغ

ہے لیکن بعض آیات میں یہ پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اُن آیات میں سے ایک آیت یہی آیت ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں چودہ ضمیریں استعمال ہوئی ہیں اور ہر ضمیر کا مرجع مختلف ہے اور پھر اس کو سمجھنے میں کوئی دقت بھی نہ ہو تو یہ دلیل ہے کہ یہ کلام، اللہ کا ہے کسی عام انسان کا نہیں، یہ کلام انسان کا ہو ہی نہیں سکتا۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

”اور جب عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں حسن سلوک سے روک لو یا انہیں دستور کے مطابق چھوڑ دو، اور انہیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکو تاکہ تم سختی کرو، اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیتوں کا تمسخر نہ اڑاؤ، اور اللہ کے احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے اور جو اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے کہ تمہیں اس سے نصیحت کرے، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے“۔

طلاق کے بعد کے مسائل

اس آیت میں طلاق کے بعد کے مسائل کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جب طلاق کی عدت مکمل ہونے کے قریب ہو تو یا تو عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا جائے اور شوہر اچھے انداز سے بیوی کو اپنے پاس رکھے اور اگر رجوع نہیں کرتا تو پھر اسے آزاد کرے۔ یہاں پر بلوغ اجل سے مراد یہ ہے کہ عدت کے مکمل ہونے کے ایام قریب ہو جائیں اور عدت کے آخری ایام ہوں۔ تو پھر یا تو ان کے ساتھ نیکی کرو اور طلاق دی ہے تو پھر اب انہیں آزاد کر دو تاکہ وہ جہاں چاہیں آگے جا کر نکاح کر لیں۔ اگر آپس میں سعادت مندانہ زندگی گزارنے کے لیے آمادگی نہیں ہیں تو پھر انہیں اذیت اور تکلیف مت پہنچاؤ اور اُن کو آزادی دے دو اور مہر نہ دینے سے بھی منع کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی مہر دے دو (یہ غیر طلاق خلع کی صورت میں ہے)۔ مرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ میں نہ تجھے آزاد کر دیتا ہوں اور نہ ہی تجھے آرام سے رکھوں گا۔ جو بھی ایسا کام کرے گا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ عورت کو نقصان کی نیت سے روکے رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

ازدواج سعادت مند زندگی کے لیے ہے۔ سعادت، سکون اور آرام سے آتی ہے اور جب مرد اور عورت میں باہمی تعلق اور خوشی کا ماحول نہ ہو بلکہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے اور اذیت دینے کے درپے ہوں تو آرام اور سکون اور سعادت درمیان سے اٹھ جائے گی اور ازدواجی زندگی کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی ایسا کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ کی نشانیاں اور اللہ کے احکام انسان کی مصلحت میں ہیں، انسان کی سعادت کے لیے الٰہی قانون بنایا گیا ہے۔ لہٰذا ان شرعی دستورات پر عمل کرنا خود انسان کے فائدے میں ہے اور شرعی دستوات اخلاقی دستوارت کے ساتھ ہم آہنگ ہیں کیونکہ اس طرح نفوس کی تربیت کرکے ان کی تطہیر کی جاتی ہے۔

دین کا دار و مدار خالی احکام کے ظواہر پر نہیں ہے بلکہ اس کی روح اور اس کے باطن پر بھی نظر ہے۔ آیات خدا کا مذاق اُڑانا؛ یہ سب بہت بڑا جرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمات ہیں ان کو یاد کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر کتنی مہربانیاں کی ہیں، تمہیں وجود کی سعادت دی ہے، بہترین دین عطاء کیا ہے اور ایسی شریعت اور کتاب تمہارے لیے بھیجی ہے جس کا ظاہر اور باطن تمہارے مفاد میں ہے۔ اللہ اس طرح تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں خیر کی دعوت کرتا ہے اور صراط مستقیم دکھاتا ہے اور احکام الٰہی تمہاری زندگی کے کمال کا وسیلہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جو نعمات ہیں وہ تمہارے لیے ہیں تو جان لو کہ تمہارے دل اللہ کی جانب متوجہ رہنے چاہئیں، اللہ دانا ہے، وہ تمہارے ظاہر سے بھی آگاہ ہے اور باطن سے بھی آگاہ ہے۔ تمہارا ظاہر تمہارے باطن کے مخالف ہوگا تو گویا تم نے اللہ پر بڑی جرأت اور جسارت کی ہے، اس سے تمہاری ظاہری بناوٹ بھی منہدم ہو جائے گی لہٰذا تمہارا ظاہر تمہارے باطن کے مطابق ہونا چاہیے اور ان دونوں میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پس وہ اپنی عدت تمام کر چکیں تو اب انہیں اپنے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق راضی ہو جائیں، تم میں سے یہ نصیحت اسے کی جاتی ہے جو اللہ اور قیامت کے دن

پر ایمان رکھتا ہے، یہ تمہارے لیے بڑی پاکیزگی اور بڑی صفائی کی بات ہے، اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

عورتوں کے سرپرستوں کے لیے خصوصی فرمان

اس آیت میں خطاب عورتوں کے سرپرستوں کو ہے کہ اگر وہ اپنے شوہروں سے دوبارہ شادی کرنا چاہتی ہوں تو ان کو اس بات سے نہ روکو۔ عورتوں کے سرپرست اس کام کو اپنے سابقہ داماد سے ضد اور ہٹ دھرمی کہ وجہ سے انجام نہ دیں۔ اس آیت میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں ہے کہ باپ کی اجازت کے بغیر دوسرا عقد صحیح نہیں ہے۔ "ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" تم میں سے یہ نصیحت اسے کی جاتی ہے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اس آیہ کا خطاب سب مسلمانوں کو ہے۔

آیت میں اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان لانے کی طرف اشارہ اس لیے کیا گیا ہے کہ دین ہمیشہ اتفاق اور اتحاد کی دعوت دیتا ہے نہ افتراق اور جدایی کی جانب۔ اس نکتہ کی جانب اس لیے متوجہ کرایا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کو احکام الٰہی پر عمل کرنے کی جانب تشویق کی جائے۔ "ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ" یہ تمہارے لیے بڑی پاکیزگی اور بڑی صفائی کی بات ہے۔

"زکواۃ" پاک اور صحیح نمو کے معنی میں ہے۔ "طہارت" ظاہری اور باطنی پاکیزگی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا عورتوں کو ان کے سابقہ شوہروں کے ساتھ شادی کرنے سے نہ روکنا ان کے سرپرستوں کے پاک اور پاکیزہ ہونے کا سبب ہے۔ اس طرح کا رجوع، دشمنی اور جدایی سے وصال اور مندمل ہونے کی طرف رجوع ہے۔ اور اس سے انسانی نفوس میں توحید کا غریزہ قوی تر ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر دینی فضائل رشد کرتے ہیں اور عورتوں میں عفت اور حیا کا ملکہ پروان چڑھتا ہے۔ اس طرح کی تربیت عورتوں کے دلوں کے پاک

ہونے اور اجنبی مردوں کی جانب متمائل نہ ہونے میں مؤثر ہے۔ وَ اللّٰهُ يَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ ’’ ’’اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری ان مصلحتوں سے بھی آگاہ ہے جن کو تم خود نہیں جانتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کی تعلیم دے۔

وَ الۡوَالِدٰتُ يُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَ كِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوۡلُوۡدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَ عَلَى الۡوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا ؕ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

’’اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ اس کے لیے ہے جو دودھ کی مدت کو پورا کرنا چاہے، اور باپ پر دودھ پلانے والیوں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق ہے، کسی کو تکلیف نہ دی جائے مگر اسی قدر کہ اس کی طاقت ہو، نہ ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ ہی کو اس کی اولاد کی وجہ سے، اور وارث پر بھی ویسا ہی نان نفقہ ہے، پھر اگر دونوں اپنی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور اگر کسی اور سے اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ تم دے دو جو دستور کے مطابق

تم نے دینا ٹھہرایا ہے، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے"۔

بچوں کو دودھ پلانے کے احکام

ان آیات میں بچوں کو دودھ پلانے کا حکم، ماں باپ کی حیثیت اور وارث کا حوالہ دیا گیا ہے۔ والدہ کا دائرہ اُمہات سے زیادہ محدود ہے اسی لیے آیت میں والدات کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی جنھوں نے بچے کو جنا ہے۔ اُم کا دائرہ وسیع ہے، اُم اوپر والے پر بھی بولا جاتا ہے۔ "حول" ایک سال کے معنی میں ہے۔ حول کو اس لیے سال کہا گیا ہے کیونکہ اس میں تبدیلی آتی ہے۔ حول کے ساتھ کامل کی صفت اس لیے لائی گئی ہے کیونکہ سال کے مختلف اجزا ہوتے ہیں اور بعض اوقات سال کے کچھ حصے کو بھی سال کہا جاتا ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ پورے دو سال دودھ پلایا جائے اور اس کے ایام میں کوئی کمی نہ ہو۔ مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں اور یہ اُن کے لیے ہے جو پورا دودھ پلانا چاہیں۔ یعنی مطلقہ عورتیں بھی حضانت اور دودھ پلانے کا حق رکھتی ہیں۔ لیکن اس کا اختیار خود اسی کے پاس ہے۔ بچے کو طلاق شدہ بیوی کے سپرد کرنا اور اسے بچے کو دودھ پلانے کا حکم دینا، شوہر کا اختیار نہیں ہے، دودھ پلائی کا اختیار خود ماں کے پاس ہے۔ "مَوْلُوْدٌ لَّهٗ" جس کا بچہ ہے اُس سے باپ مراد ہے کہ وہ اُس کے کھانے پینے، لباس کا معروف طریقہ ہے وہ اس کے ذمہ ہے۔ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ ہر ایک کو اتنی ذمہ داری دی جاتی ہے جس کی وہ طاقت رکھتا ہے، کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دی جاتی۔ شوہر اپنی توانائی اور طاقت کے مطابق نفقہ اور خرچ دے گا۔

یہاں پر دو حکم بیان کئے جارہے ہیں۔ کسی ماں کو اس کی اولاد کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ پرورش اور نگہداری اور دودھ پلانا ماں کا حق ہے اور شوہر زبردستی بچے کو ماں سے جدا نہیں کرسکتا، شوہر بچے کو ماں

سے علیحدہ کرکے اس کو نقصان نہیں دے سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت بھی ایسا نہیں کر سکتی کہ بچے کو اپنے باپ سے نہ ملنے دے اور اسے نہ دکھائے۔ جو کچھ بچے کے باپ پر شریعت کی طرف سے لازم ہے جیسے بچے کو نفقہ دینا، اس کے پوشاک کا انتظام کرنا، اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے تو اس کے جو وارث ہیں ان کی بھی یہی ذمہ داری ہے۔

اب اگر ماں اور باپ باہم آپس میں مشورہ کرنے کے بعد بچے کی دودھ چھڑائی کر دیں اور فیصلہ کرلیں کہ دودھ انہیں نہ دیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ یعنی باہمی مشورے سے دودھ کی مدت پہلے بھی ختم کر سکتے ہیں اور اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس حکم سے واضح ہو گیا کہ حضانت اور دودھ پلانا عورت کا حق ہے، لیکن ایسا کرنا اس پر واجب نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی نہ ہو سکے، اگر وہ خود راضی ہو جائے اور شوہر کی باہمی رضایت سے مدت کم بھی کر سکتے ہیں اور مناسب اجرت دے کر بچے کے لیے دایہ بھی لے سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بچے کی صحت کے لیے ماں کا دودھ نقصان دہ ہے یا بالکل دودھ ہی نہیں یا ماں بچے کو دودھ نہیں دینا چاہتی ہے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کے بچے کی دیکھ بال کے لیے دایہ لے لی جائے شرط یہ ہے کہ اس دایہ کو مناسب اجرت دی جائے۔ اس کے ساتھ بچے کی ماں کا جو حق بنتا ہے نفقہ کا، وہ اس کو دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دایہ بچے کی نگہداری کی اجرت دے رہے ہیں تو ماں کا نفقہ بند کر دیں۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ کی ناراضگی سے خود کو بچاؤ اور جان لو جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔ تقویٰ ان اعمال کی اصلاح سے متعلق ہے جن کا حکم اوپر بیان کیا گیا ہے، اس کی بہتری پر توجہ ہونی چاہیے اور اس کی خلاف ورزی کرکے اللہ کی نافرمانی نہ کی جائے۔

وَ الَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَ يَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۳۴﴾

"اور جو تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیویوں کو چار مہینے دس دن تک اپنے نفس کو روکنا چاہیے، پھر جب وہ اپنی مدت پوری کر لیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ دستور کے مطابق اپنے حق میں کریں، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو خبر دار ہے"۔

عدت وفات

اس آیت میں وفات کی عدت کا حکم بیان ہوا ہے۔ آیت میں مذکور عدت ان عورتوں کے لیے ہے جو حاملہ نہیں، لیکن اگر جس عورت کا شوہر فوت ہوا ہے اس کی باقی ماندہ حمل کی مدت چار مہینے دس دن سے زیادہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہو گی۔ ''فَلَا جُنَاحَ'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عورت کے رشتہ دار یا اس کے مرے ہوئے شوہر کے رشتہ دار یہ حق نہیں رکھتے کہ عورت کو دوسری شادی کرنے سے منع کریں۔ اس سلسلے میں عورت کو حق ہے۔ تمام چیزیں اللہ کے علم میں ہیں، خدا جو بھی حکم دیتا ہے اس کی پابندی کی جائے اور اس میں ایک بات تو یہ ہے کہ عورتیں وفات کی عدت رکھیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اس مدت کے بعد وہ عورتیں ازدواج کرنے میں خود مختار ہیں۔ کسی اور کو انہیں روکنے کا حق نہیں ہے۔

وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِہٖ مِنۡ خِطۡبَۃِ النِّسَآءِ اَوۡ اَکۡنَنۡتُمۡ
فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ سَتَذۡکُرُوۡنَہُنَّ وَ لٰکِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡہُنَّ
سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۬ؕ وَ لَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی
یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُ ۚ
وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۲۳۵﴾

''اور تم پر اس میں گناہ نہیں ہے کہ ان عورتوں کو اشارہ سے پیغام نکاح دو اور یا تم اسے اپنے دل میں چھپاؤ، اللہ جانتا ہے کہ تمہیں ان عورتوں کا خیال پیدا ہوگا لیکن مخفی طور پر ان سے نکاح کا وعدہ نہ کرو مگر یہ کہ قاعدہ کے مطابق کوئی بات کہو، اور جب تک معیاد نوشتہ پوری نہ ہو اس وقت تک نکاح کا قصد بھی نہ کرو، اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے پس اس سے ڈرتے رہو، اور جان لو اللہ بڑا بخشنے والا بردبار ہے''۔

عدت وفات کے دوران نکاح کا پیغام دینا

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جو عورتیں عدت وفات میں ہیں اگر کوئی ان کا رشتہ مانگے اور اشاروں، کنایوں سے اپنی خواہش اس عورت تک پہنچائے یا اس کے دل میں یہ بات ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ دل میں کسی عورت کی محبت کا آجانا یا اس کی طرف تمایل پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے خدا اس سے منع نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے عدت ختم ہونے سے پہلے نکاح کرنے سے منع کیا ہے۔ اس حوالے سے آپس میں جو گفتگو ہو وہ شائستہ اور

متعارف ہو، انداز اچھا ہو اور کوئی منکر اور غلط عمل نہ ہو، دھوکہ نہ ہو اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہو اور جب نکاح کا دل سے فیصلہ کرلیں اور یہ طے ہو جائے کہ ہم نے آپس میں عقد نکاح کرنا ہے تو جب تک مدت تمام نہیں ہوتی اس سے پہلے نکاح نہیں کرنا اور یہ اللہ کا امر ہے کہ اس امر میں اللہ کے حکم کی مخالفت نہ کرو اور ایام عدت میں نکاح مت کرو۔ زبانی اور دل سے چاہت میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ تمام امور سے آگاہ ہے، وہ ذات ایسے کام کو پسند نہیں کرتی جو تمہارے مفاد میں نہیں ہے، جس چیز سے تمہیں روکا ہے تو اسی لیے روکا ہے کہ اس کا انجام دینا تمہارے نقصان میں ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ بعض مصلحتوں کے تحت کچھ کاموں کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے جتنی اجازت دی ہے اسی تک ہی محدود رہو، اس سے آگے نہیں بڑھو۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

”تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور ان کے لیے کچھ مہر بھی مقرر نہ کیا ہو، اور انہیں کچھ سامان دے دو وسعت والے پر اپنے قدر کے مطابق اور مفلس پر اپنے قدر کے مطابق سامان حسب دستور ہے، نیکوکاروں پر یہ حق ہے“۔

ہمبستری کرنے سے پہلے طلاق کا حکم

اس آیت میں اُن عورتوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے جنہیں ہمبستری کرنے سے پہلے طلاق دی جائے یا ان کا حق مہر مقرر نہ کیا گیا ہو۔ یہاں پر ”مس“ سے ہمبستری اور

"فریضہ" سے عورت کا مہر مراد ہے۔ ہمبستری کرنے سے پہلے یا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دینے میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اگر مہر معین نہیں کیا گیا ہو تو طلاق دینے کی صورت میں واجب ہے کہ عرف میں متعارف مقدار میں مہر، طلاق دی گئی عورت کو دیا جائے۔ "مالی توانائی اور مالی حالات جس قدر اجازت دیتے ہیں" یہ حکم مخصوص ہے اس مطلقہ عورت کے لیے جس سے ہمبستری نہیں کی گئی ہو اور اس کا مہر بھی متعین نہیں کیا گیا ہو۔ لیکن باقی عورتوں کا حق نیک لوگوں پر واجب ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ میں محسن کی وصف اس حکم میں دخالت رکھتی ہے اور کیونکہ احسان کرنا واجب نہیں ہے اس بناء پر اس آیت میں بیان شدہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ لیکن اہل البیت علیہم السلام سے منقول روایات اس کے وجوب کو بیان کرتی ہیں۔ اس کی مزید تفصیل طلاق کے احکام میں دیکھی جائے۔

وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

"اور اگر تم انہیں طلاق دو اس سے پہلے کہ انہیں ہاتھ لگاؤ حالانکہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو نصف اس کا (دے دو) جو تم نے مقرر کیا تھا مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، اور تمہارا معاف

کر دینا پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے، اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو، کیوں کہ جو کچھ بھی تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے"۔

مہر مقرر کی گئی عورت کی طلاق کا حکم

اس آیت میں ہمبستری کے بغیر دی گئی طلاق کی دوسری صورت کا حکم بیان ہوا ہے۔ پہلی صورت یہ تھی کہ اگر عورت کو ہمبستری کرنے سے پہلے یا مہر متعین کرنے سے پہلے طلاق دی جائے تو اس صورت میں بہتر ہے کہ جو متعارف طریقہ ہے، جتنی مالی حیثیت ہے کچھ نہ کچھ مہر کے عنوان سے اسے دیا جائے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہمبستری تو نہیں کی لیکن مہر طے شدہ تھا تو اس صورت میں کہا گیا کہ طے شدہ مہر کی نصف مقدار مطلقہ عورت کو دینا ہوگا۔ البتہ ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ اگر عورت کا ولی یعنی اس کا باپ یا دادا جو شرعی ولی ہے اگر سارا مہر معاف کر دے تو اچھا ہے۔ اگر عورت نے پہلے سے پورا مہر لیا ہوا تھا تو واپس کر دے یا شوہر آدھا مہر عورت سے طلب کر لے اور وہ اسے بخش دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

نکاح کے حوالے سے تین افراد کی دخالت ہے، ایک خود عورت ہے دوسرا شوہر ہے اور تیسرا عورت کا ولی ہے، ان میں سے ہر شخص آدھا مہر معاف کر سکتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ بخشش کرنا اور مالی حق چھوڑنا یہ تقویٰ کے نزدیک تر ہے، جب انسان اپنے جائز حق کو اللہ کی خاطر چھوڑتا ہے تو اللہ اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی خاطر ایسا اقدام کیا جائے تو یہ بعینہٖ تقویٰ ہے۔ "فضل" اخلاقی عادات اور خوبیوں میں اضافہ کے معنی میں ہے۔

اس آیت میں لوگوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ اگر آپ دوسروں کے ذمہ اپنے مالی حقوق کو چھوڑ دیں تو یہ ان پر آپ کا احسان ہوگا۔ اور یہ امر دونوں کے لیے آسانی اور تخفیف قرار پائے گا کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ تمام باطنی امور سے آگاہ اور واقف ہے۔ ہمیں چاہیے کہ

فقط ظاہری صورت کی اصلاح نہ چاہیں بلکہ اپنے اعمال کے باطن کی بہتری کے لیے بھی قدم اٹھائیں۔ خدا ہر بات سے آگاہ ہے، آپ کے باطن سے بھی اور آپ کے ظاہر سے بھی آگاہ ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾

''سب نمازوں کی حفاظت کیا کرو اور (خاص طور پر) درمیانی نماز کی، اور اللہ کے لیے ادب سے کھڑے رہا کرو''۔

نماز کے اوقات کی حفاظت

''حفظ'' ضبط کرنے اور اپنی ذات میں معانی کو محفوظ رکھنے کے معنی میں ہے۔ یہاں پر حفظ نماز کے اوقات کا خیال رکھنا اور نماز کو ان کے اوقات میں بجالانے کے معنی میں ہے۔ خاص کر میانہ اور وسطی نماز کا خیال رکھا جائے۔

کون سی نماز وسطی ہے؟ بعض نے کہا کہ نماز صبح وسطی ہے، بعض نے کہا ہے نماز ظہر ہے اور بعض نے کہا ہے نماز عصر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نماز عشا ہے بعض نے نماز جمعہ کو وسطی نماز کہا ہے۔ قیام کا مطلب ہوتا ہے کسی کام میں مصروف ہو جانا، قنوت کا معنی ہوتا ہے خضوع و خشوع اور عاجزی سے اللہ سے کچھ طلب کرنا۔ یہاں پر اسے اللہ کی اطاعت مراد ہے کہ خضوع اور خشوع اللہ کے لیے ہو۔ خلوص اللہ کے لیے ہو۔ یہاں پر نماز کے اوقات کی حفاظت کا خصوصی طور پر حکم ہے یعنی ساری نمازوں کا خیال رکھیں اور پانچ نمازوں کے درمیان والی نماز کا خصوصی خیال رکھیں۔ ظاہر ہے اس سے مراد ایسی نماز ہے جس میں غفلت کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے وہی نماز مراد لی جائے تو بہتر ہوگا، اس بناء پر صبح کی نماز زیادہ مناسب لگتی ہے کہ عام طور پر اس نماز کی ادائیگی میں غفلت ہوتی ہے اور اس کے وقت کا خیال جس طرح ہونا چاہیے، نہیں ہوتا۔ باقی تو اللہ کے علم میں ہے کہ اس سے کون سی نماز مراد ہے۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا ۚ فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۹﴾

''پھر اگر تمہیں خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہی (پڑھ لیا کرو)، پھر جب امن پاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جیسا اس نے تمہیں سکھایا ہے جو تم نہ جانتے تھے''۔

نماز خوف کا طریقہ

یہ جملہ شرطیہ ہے جو پہلے جملے پر عطف ہے۔ اگر تم دشمن سے ڈر رہے ہو یا جان کا خطرہ ہے یا کوئی اور معاملہ ہے جس سے خوف ہے تو جتنا امکان ہے اسی کے مطابق نماز ادا کرو اور اتنی نماز پڑھو جتنا پڑھ سکتے ہو۔ خواہ پیدل حالت میں ہو یا سواری پر ہو، جس حالت میں بھی ہو قبلہ کی طرف رخ کر لو اور نماز خوف بجالاؤ۔ نماز کسی حالت میں نہیں چھوٹتی، اگر انسان پانی میں غرق ہو رہا ہو اور اس وقت نماز کا وقت ہو گیا ہو تو اشارے سے بھی نماز پڑھنا واجب ہے۔ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے، رکوع اور سجود پوری طرح انجام نہیں دے سکتا تو جتنا انجام دے سکتا ہے، اتنا ہی انجام دے۔

اس فریضے کی ادائیگی میں سہولت ہے۔ جس مقدار میں انجام دے سکتے ہو اتنا انجام دو۔ اس آیت کے شروع میں جو فاء استعمال ہوئی ہے یہ تفریع کے معنی میں ہے، پچھلی بات کا نتیجہ ہے۔ اس بناء پر اس آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ نماز کی نگہداری واجب امر ہے لہٰذا جس وقت تم امن میں ہو تو نماز کی نگہداری تم پر اسی طرح واجب ہے جیسے اس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور جب تم خوف کی حالت میں ہو تو پھر نماز کو اتنی مقدار میں بجالاؤ جتنا تم انجام دے سکتے ہو۔ اور خدا کو بہت زیادہ یاد کرو کیونکہ احکام اور شریعت اللہ نے تمہیں تعلیم دی ہے اور

تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے نماز کا حکم بھی اللہ کی طرف سے ہے باقی احکام بھی اللہ نے دیئے ہیں۔ اور اللہ کے بیان کردہ احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

"اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو انہیں اپنی بیویوں کے لیے سال بھر کے لیے گزارہ کے واسطے وصیت کرنی چاہیے گھر سے باہر گئے بغیر، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ عورتیں اپنے حق میں دستور کے موافق کریں، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے"۔

عدت وفات میں عورتوں کا نفقہ

اس آیت میں زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کا ذکر ہے جس کے مطابق جس عورت کا شوہر مر جاتا تھا تو وہ عورت ایک سال تک گھر سے باہر نہیں آتی تھی اور شوہر اس کے لیے ایک سال کے اخراجات کی وصیت کرتا تھا تاکہ وہ گھر سے باہر نہ جائے۔ یہ آیت، عدت وفات کی آیت کے ذریعے نسخ ہوئی ہے جس میں عدت وفات چار ماہ دس دن بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ حکم ہے کہ جن عورتوں کے شوہر مر جائیں وہ چار ماہ دس دن گھر میں رہیں نہ کہ ایک سال۔ آیت میں زمانہ جاہلیت والی رسم کا ذکر ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر مرنے والا شخص اپنی بیوی کے لیے ایک سال کے نفقہ اور خرچہ کی وصیت کرے اور وہ عورت اس مدت میں شوہر کے گھر سے باہر چلی جائے تو اس میں شوہر کے ورثاء کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر عورت چاہے تو دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے اس میں شوہر کے رشتہ داروں کی کوئی کوتاہی یا ان پر

کوئی گناہ نہیں ہے۔ اللہ ہی غالب ہے اور مصلحتوں سے آگاہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا کہ یہ آیت، عدت وفات والی آیت اور آیات میراث جن میں بیوی کے حصے کو ایک چوتھائی شوہر کی اولاد ہونے کی صورت میں اور بے اولاد ہونے کی صورت میں آٹھواں حصہ معین کیا گیا ہے، کے ذریعے نسخ ہوئی ہے۔

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

''اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے دستور کے موافق خرچ دینا، پرہیزگاروں پر یہ لازم ہے''۔

مطلقہ عورتوں کا نفقہ

یہ حکم تمام طلاق یافتہ عورتوں کے لیے ہے اور اُن کو کہا گیا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ البتہ یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ طلاق شدہ عورت مطمئن ہو جائے اور اپنے آپ کو آسودہ اور پاکیزہ سمجھے اور مطلقہ کا لفظ ان پر بھی بولا جاتا ہے جن سے مقاربت ہوئی ہو اور ان کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن سے مقاربت نہیں ہوئی ہو۔ یہ اُن کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

''اسی طرح اللہ تمہارے واسطے اپنے احکام بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ لو''۔

عقلمندی بارے تاکید

''عقل'' لغت میں گرہ لگانے یا باندھنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے انسان کے ادراک کو جو دل سے پیمان باندھ لینے کا سبب بنتا ہے عقل کہا گیا ہے۔ اسی طرح انسان کے جتنے بھی مدرکات ہیں جن کے ذریعے سمجھتا ہے اور اچھائی اور برائی کے درمیان تشخیص دے

سکتا ہے اور ان کے درمیان جدائی ڈالنے اور آپس میں امتیاز کا سبب بنتا ہے اس کو بھی عقل کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام جو بیان کئے گئے ہیں ان کو سمجھو اور دل سے ان پر عمل کرنے کا پیمان باندھ لو اور اپنے دل سے قائل ہو جاؤ اور اس بارے میں خلاف ورزی مت کرو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے حالانکہ وہ ہزاروں تھے، پھر اللہ نے ان کو فرمایا کہ مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کر دیا، بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔

موت سے فرار ممکن نہیں

اس آیت میں ایک گروہ کی داستان بیان کی گئی ہے جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ "علم" کو رؤیت اور دیکھنے کے معنی میں لیا ہے اور اس میں جاننے کی تاکید ہے۔ موت سے فرار کوئی اچھی بات نہیں ہے اور ڈر اور خوف انسان کی عمر کو بڑھاتا نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کے فیصلے کو دُور کرتا ہے۔ یہ آیت اس گروہ کے بارے میں ہے جو موت کے ڈر سے نکلے تھے لیکن انہیں موت نے آلیا اور وہ موت سے بچ نہ سکے۔ "مُوْتُوْا" "پھر اللہ نے ان کو فرمایا کہ مر جاؤ" اس میں امر تکوینی ہے یعنی قضائے الٰہی ان کی موت کے حوالے سے طے شدہ تھی اور اس میں کوئی منافات نہیں ہے کہ اُن کی موت طبیعی اسباب جیسے طاعون کی بیماری کی وجہ سے ہو، جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا اور ایک عرصہ وہ زندہ رہے۔ اس جملے میں اخبار اور توصیف

کے بجائے صیغہ امر اس لیے لایا گیا ہے تاکہ بتایا جائے کہ امر الٰہی ہی نافذ ہے اور اللہ کی قدرت کا سب پر غلبہ ہے۔

پھر بتایا گیا ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ لوگوں پر کرم اور مہربانی کرتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ شکر بجا نہیں لاتے۔ لفظ ناس یعنی انسان کا دو دفعہ تکرار ان کی فکری سطح کی پستی کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر اسم ظاہر ''ناس'' کے بجائے ضمیر لاتے تو پھر یوں ہو جاتا کہ جو زندہ ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر شاکر نہیں ہیں حالانکہ یہاں تمام انسان مراد ہیں انسانوں کی اکثریت شکر بجا نہیں لاتے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اس گروہ کو زندہ کرکے ان پر تفضل فرمایا، اس تفصل سے کیا مراد ہے؟اس سوال کے جواب کو بعد میں آنے والی آیات کے بغیر استنباط نہیں کیا جاسکتا جو جنگ اور جہاد کے متعلق ہیں، کیونکہ جنگ اور جہاد ملت کو زندہ کرنے کا سبب ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت مثال ہے اس اُمت کے لیے جو پسماندہ رکھی گئی اور غیروں کے زیر سلطہ رہی لیکن اس نے اپنے حقوق کے لیے قیام کیا جس کے نتیجے میں انہیں نئی زندگی ملی۔ لیکن صاحب المیزان نے یہ رائے اختیار نہیں کی کیونکہ یہ آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے لہٰذا انہوں نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

''اور اللہ کی راہ میں لڑو اور سمجھ لو کہ بے شک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے''۔

جہاد فی سبیل اللہ

یہ آیت جہاد کو واجب قرار دے رہی ہے۔ اس آیت میں اور بعد والی آیات میں قتال کو فی سبیل اللہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ تاکہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ حکم فنا ہونے والی دنیاوی سلطنت اور حکمرانی کے لیے قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے وہ جہاد ہرگز مراد نہیں جو اس پرچم کے لیے ہو جو قومی تعصب کی بنیاد پر بنا ہے یا جس کی بنیاد جاہلانہ افکار اور وطن پرستی ہو

۔ اس سے مراد وہ جہاد ہے جو دین الٰہی کو پھیلانے اور لوگوں کی دُنیا و آخرت کی بہتری کے لیے ہو۔ پھر مومنین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اس راستے میں خود سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو اللہ اور اللہ کے رسول کے دستور کے خلاف ہو یا ان کے دلوں میں نفاق پیدا ہو کیونکہ خدا سب کے اعمال سے بھی واقف ہے اور ان کے اقوال سے بھی واقف ہے اور ان کی باتیں بھی سنتا ہے اور ان کے دل کی بات سے بھی آگاہ ہے اور دانا ہے۔ لہٰذا جہاد اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے نظام کی برتری کے لیے ہے نہ کہ ذاتی مفاد اور قومی تعصّبات اور قومی مسائل کے لیے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

”ایسا کون شخص ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے پھر اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر دے، اور اللہ ہی تنگی کرتا ہے اور کشائش کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے“۔

قرض الحسنہ کی تاکید

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرض دینے کے عمل کی تشویق کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس عمل کی جانب تشویق کرنے کے لیے قرض دینے کو اپنی طرف نسبت دی ہے جبکہ یہ قرض اللہ کی راہ میں دیا جاتا ہے۔ مومنوں کو کہا گیا ہے کہ اگر ایک دوسرے کو قرض حسنہ دوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اس کے چند برابر عطا کرے گا۔ ”قبض“ کسی چیز کو لینے کے معنی میں ہے اور اس کے مقابلے میں ”بسط“ کا لفظ ہے جو پھیلانے کے معنی میں ہے۔ اس میں تین صفات ذکر ہوئی ہیں، قابض، باسط اور مرجع عباد۔ پہلی بات یہ سمجھائی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں قرض دے گا تو اس کا قرض باطل نہیں ہو گا۔ بعید نہیں کہ اس کا چند برابر اس کو دیا جائے۔ قابض، قرض لینے والا خدا ہے جو اس قرض کو لیتا ہے۔ باسط؛ پھیلانے والا، خدا

جس کو چاہے اس کے رزق اور روزی کو پھیلا دیتا ہے۔ مرجع بھی وہی ذات ہے جس کا مطلب ہے کہ سب کی بازگشت بھی اسی کی طرف ہے۔ سب نے اللہ کی طرف جانا ہے۔ جب سب نے اللہ کی طرف جانا ہے تو دئے گئے قرض کو کئی گنا اضافے کے ساتھ وہاں وصول کر لوگے اور پورا پورا تمہیں مل جائے گا بلکہ اس سے زیادہ مل جائے گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر صدقہ دوگے تو اس کا دس برابر ملے گا اور اگر قرض دوگے تو اٹھارہ گنا ملے گا۔ قرض الحسنہ دینے کی بہت تاکید وارد ہوئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶

"کیا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو موسیٰ کے بعد نہیں دیکھا، جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں، پیغمبر نے کہا کیا یہ بھی ممکن ہے کہ اگر تمہیں لڑائی کا حکم ہو تو تم اس وقت نہ لڑو؟ انہوں نے کہا ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے حالانکہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے دور کر دیا گیا ہے، پھر جب انہیں لڑائی کا حکم ہوا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی داستان

''مَلَاِ '' لوگوں کی ایک جماعت جن کا ایک بات پر اتفاق ہو اور جو دیکھنے والوں کو بڑے لگیں اور ان کی عظمت ان کے سامنے آجائے۔ اس آیت میں اس سے مراد بنی اسرائیل کی وہ جماعت ہے جن کے بادشاہ جالوت تھے۔ اسی لیے ''مَلَاِ '' کو بڑے اور ہم خیال لوگوں کے معنی میں لیا گیا ہے۔ ''جالوت'' کی سختیوں کی وجہ سے اُن کی زندگی بہت سخت ہو چکی تھی تو اُنہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا ہمارے لیے کسی شخص کو متعین کر دیں تاکہ ہم اُس کے امر کے تحت اللہ کی راہ میں قیام کریں۔ پیغمبر ان کے حالات سے واقف تھے اس لیے اُن سے کہا اگر کسی شخص کو تمہارا حکمران منتخب کیا جائے تو تم اس کی نافرمانی نہیں کروگے؟ کیونکہ یہ احتمال پایا جاتا تھا کہ جب ان پر جہاد فرض ہو جائے تو وہ نافرمانی کریں گے اس لیے نبی نے حکمران کا نام لینے کی بجائے اس کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس درخواست کے متعلق اللہ ہی جانتا ہے۔

ان کے جواب میں ''کُتِبَ '' آیا ہے جس کا معنی عمل کا واجب ہونا ہے۔ خدا ہی ہے جو کسی امر کو واجب کرتا ہے۔ اور اللہ کے امر کی مخالفت اُن کے ظاہری حالات سے آشکار تھی لیکن اس کے باوجود اس مسئلے کو سوالیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس کا انکار کریں اور اس طرح اُن پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ انہوں نے جواب میں کہا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم پر جہاد فرض ہو اور ہم جہاد نہ کریں، جبکہ ہمیں گھروں سے باہر نکالا گیا ہے اور ہمیں اپنے رشتہ داروں اور اولاد سے دُور کیا گیا ہے۔ وطن سے دُور ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ بیوی بچوں سے بھی دور ہوں اسی لیے انہوں نے کہا ہمیں وطن اور اہل و عیال سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ جب اُن پر جنگ فرض ہو گئی تو جس طرح اُن سے توقع تھی اور اللہ تعالیٰ اُن کی حالت سے آگاہ تھا اور اس کے متعلق اپنے پیغمبر کو وحی کے ذریعہ بتا بھی

دیا تھا، ویسا ہی ہوا اور جنگ میں فقط تھوڑے ہی لوگ گئے، باقی سارے اس حکم کی پیروی سے پیچھے ہٹ گئے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ۖ وَ اللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَ اللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

"ان کے نبی نے ان سے کہا بے شک اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر فرمایا ہے، انہوں نے کہا اس کی حکومت ہم پر کیوں کر ہو سکتی ہے اس سے تو ہم ہی سلطنت کے زیادہ مستحق ہیں اور اسے مال میں بھی گنجائش نہیں دی گئی، پیغمبر نے کہا بے شک اللہ نے اسے تم پر پسند فرمایا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ فراخی دی ہے، اور اللہ اپنا ملک جسے چاہے دیتا ہے، اور اللہ گنجائش والا جاننے والا ہے"۔

طالوت کا بادشاہ مقرر کیا جانا

طالوت بنیامین کے پوتوں یا نواسوں سے تھے۔ بنیامین جو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا مادری پدری بھائی تھا اور نبوت "لاوی" کی نسل میں تھی اور بادشاہت یوسفؑ کی نسل میں۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو چُن لیا تو اُنہوں نے اس بات پر اعتراض کر دیا کیونکہ بنی اسرائیل کی عادت تھی کہ وہ اللہ کے اوامر کو ٹھکراتے تھے جبکہ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طالوت ہمارے اوپر حاکم ہو جائیں؟ نبوت کا گھرانہ اور بادشاہی کا گھرانہ بنی اسرائیل میں دو بڑوں کے پاس ہے۔ طالوت نہ

یوسف سے ہے نہ لاوی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور بادشاہی ہمارے خاندان میں قرار دی ہے کس طرح بادشاہی دوسرے خاندان میں منتقل ہو جائے۔

بنی اسرائیل کا عقیدہ تھا کہ اللہ کے حکم میں بداء اور تبدیلی نہیں آسکتی اس لیے وہ کہتے تھے کہ بادشاہی دوسرے خاندان میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ طالوت کے پاس تو مال نہیں، وہ کیسے ہمارا حاکم بن سکتا ہے؟ بنی اسرائیل کہتے تھے اللہ کا ہاتھ تو بندھا ہوا ہے تو قرآن نے ان کا جواب دیا کہ ان کے ہاتھ ٹوٹیں۔ یہاں پر بھی انہوں نے کہا کہ بادشاہی ایک سلسلے سے دوسرے سلسلے میں منتقل نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ مادی معیارات طالوت میں نہیں پائے جاتے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے مادی معیارات کے تحت نہیں ہوتے اور اللہ کے ہاں مال اور مادیات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہاں برتری کا معیار کچھ اور ہے، مال مفسدہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پیغمبر نے ان کو جواب میں بتایا کہ دیکھو یہ اختیار تمہارا یا میرا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ پوری اُمت ایک ارادے کے تحت ہو اور کسی کو بھی ناحق اس کا مزاحم نہیں ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسا حاکم ہو جس کے پاس علم ہو اور وہ جانتا ہو کہ عوام کا مفاد کس میں ہے۔ لوگوں کی زندگی کے بارے میں اسے پتہ ہو کہ کس طرح وہ خوشحال رہ سکتے ہیں اور اُن میں امنیت آسکتی ہے۔ اس کے ساتھ جسمانی قدرت بھی ضروری ہے کہ معاشرے پر اس کی ہیبت طاری ہو۔ مالداری جس کو وہ سلطنت کا بنیادی رکن سمجھتے تو وہ جہالت کی بنیاد پر ہے۔ پھر اللہ کا اختیار ہے، جس کو چاہے ملک اور بادشاہی عطا کرے، پوری سلطنت اور مملکت اللہ کی ہے، جس کو جو نصیب ہوا ہے وہ اللہ نے ہی دیا ہے۔ اللہ کے تصرفات کے بارے میں کسی کو سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ وہی علی الاطلاق سبب بنانے والا ہے۔ اس کا کوئی معنی نہیں کہ اللہ کی عطا اور اللہ کی بخشش کیوں ہے؟ اللہ کی بخشش اور عطا کے پیچھے ایک مصلحت اور حکمت ہوتی ہے۔ اب وہ مصلحت و حکمت واقع ہو یا نہ ہو،

اللہ ہی اس کو جانتا ہے۔ ہر صورت خدا علیٰ الاطلاق مالک ہے اس کا ہر فیصلہ صحیح ہے اور جو بھی فیصلہ صادر ہوتا ہے وہ انسان کے فائدے میں ہوتا ہے۔ جو بھی وہ خلق کرتا ہے وہ بہترین اور خوبصورت ہے اور اللہ وسعت دینے والا ہے، روزی دینے والا وہی ہے، مال دینے والا وہی ہے، دانا وہی ہے اور ہر قسم کے تصرف اور عطاء کے لیے اس کا ہاتھ کھلا ہے اور اس کا عمل ثابتعلم کے تحت ہے جس میں کسی قسم کی خطاء کا اندیشہ نہیں ہے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

”اور بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہا کہ طالوت کی بادشاہی کی یہ نشانی ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق واپس آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے اطمینان (تسلی) ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو موسیٰ اور ہارون کی اولاد چھوڑ گئی تھی، اس صندوق کو فرشتے اٹھا لائیں گے، بے شک اس میں تمہارے لیے پوری نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو“۔

طالوت کے لیے موسیٰؑ وہارونؑ والا صندوق

تابوت، صندوق کے معنی میں ہے اور ”توب“ رجوع کرنے کے ریشہ سے ہے کیونکہ صندوق کا مالک ہمیشہ اس کے پیچھے جاتا ہے اواس کی طرف رجوع کرتا ہے اس لیے اس کو تابوت کہا گیا ہے۔ سکینہ، آرام، عدم اضطراب، استقرار کے معنی میں ہے اور باطن میں جب بھی کوئی فیصلہ کرنے جائیں، ارادہ کرنے جائیں تو ان میں انہیں اطمینان حاصل ہو اور یہ

حالت اس انسان کی ہوتی ہے جو دانا ہوتا ہے۔ سکینہ ایمان کے کمال کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔

بتایا گیا ہے کہ ایک صندوق آئے گا جس کو فرشتے اٹھائیں گے اور اس صندوق میں وہ کچھ ہے جو آل موسیٰ اور آل ہارون چھوڑ کر گئے تھے اور اس میں ایمان والوں کے لیے نشانی ہے۔ آل ہر شخص کے گھرانے اور اس کے اہل کو کہا جاتا ہے اور خود اس کو بھی شامل ہے۔ اس صندوق میں توریت کی لکھی ہوئی تختیاں اور اس کے نسخے تھے، خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو مومنین کے لیے عبرت قرار دیا۔ جس کا دل ایمان سے خالی ہو اسے سکون اور آرام نہیں ملتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جب لوگوں کو پتہ چلے کہ اس صندوق کو فرشتوں نے اٹھار کھا ہے تو ان کو سکون نصیب ہوگا اور یہ اللہ کی طرف سے ایک نشانی تھی کہ یہ بادشاہ اللہ کی طرف سے تائید شدہ ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

''پھر جب طالوت فوجیں لے کر نکلا، کہا بے شک اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے، جس نے اس نہر کا پانی پیا تو وہ میرا نہیں ہے اور جس نے اسے نہ چکھا

تو وہ بے شک میرا ہے، مگر جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اسے معاف ہے)، پھر ان میں سے سوائے چند آدمیوں کے سب نے اس کا پانی پی لیا، پھر جب طالوت اور ایمان والے اس کے ساتھ پار ہوئے تو کہنے لگے آج ہمیں جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی طاقت نہیں، جن لوگوں کو خیال تھا کہ انہیں اللہ سے ملنا ہے وہ کہنے لگے بارہا بڑی جماعت پر چھوٹی جماعت اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

لشکر طالوت کا امتحان

جب طالوت حاکم بنا اور اپنی فوج لے کر شہر سے باہر نکلا تو اپنے فوجیوں سے کہا دیکھیں ابھی ایک ندی آئے گی تو وہاں سے آپ نے پانی نہیں پینا۔ ''جُند''بڑے لشکر کو کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں بہت بڑا اکٹھ ہوتا ہے، جنود، جند کی جمع ہے، تعداد کی کثرت کے حوالے سے۔ یہ طالوت کے لشکر کے لیے ایک امتحان تھا کہ وہ اپنی خواہشات کو کنٹرول کر سکتے ہیں یا نہیں اور اس سے معلوم کرنا تھا کہ ان میں سے کس میں پائیداری کی طاقت ہے اور کون کمزور، ناتواں اور پیچھے ہٹنے والے ہیں اور امتحان میں رد ہو جائیں گے۔ طالوت نے اپنے لشکر والوں سے کہا جو یہاں سے پانی پیئے گا وہ ہم میں سے نہیں ہے اور جو نہیں پیئے گا وہ ہمارا ہے، مگر یہ کہ جس نے چلو میں پانی لے لیا اور تھوڑا سا پانی پیا تو وہ بچ گیا۔ جب وہ نکلے اور اس ندی پر پہنچے تو تین گروہ ہو گئے، ایک گروہ تو وہ تھا جس نے خوب پانی پیا اور وہ طالوت سے الگ ہو گئے۔ دوسرے گروہ نے پانی نہیں پیا، وہ طالوت کے ساتھ رہے۔ تیسرے گروہ نے تھوڑا سا پیا وہ نہ طالوت کے ہوئے نہ طالوت سے باہر گئے بلکہ ان کو ایک اور آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔

تین حصوں میں بٹ جانے کے بعد جنہوں نے پانی نہیں پیا تھا یا تھوڑا پیا تھا ان کے بارے میں بھی سستی اور نفاق کا احتمال تھا اور اس سب کے بعد کامیابی ان کی ہوئی جو ایمان

لائے اور جنہوں نے صبر کیا۔ جب وہ وہاں سے گزر گئے تو کہا کہ جالوت تو بہت طاقتور ہے اس کی فوج بھی بہت ہے، گھبرا گئے البتہ گھبرانے والے وہ تھے جنہوں نے تھوڑا سا پانی پیا تھا، زیادہ نہیں پیا تھا لیکن جنہوں نے بالکل پانی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا انہیں یقین تھا کہ انہوں نے اللہ سے ملاقات کرنی ہے اور اللہ تھوڑوں کو زیادہ پر غلبہ دے گا اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جنہوں نے خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا وہ واقعی مومن تھے اور ان کا ایمان ظاہر ہوا اور یہ وہی تھے جنہوں نے بالکل پانی نہیں پیا تھا۔ عملی طور میں قناعت کرنے والے اور واقعی مومن کا مصداق یہی تھے۔ انہوں نے دوسرے گروہ کو قانع کرنے کے لیے بعد میں رونما ہونے والے حادثات کی ان کو خبر دی اور کہا کہ ہو سکتا ہے کم تعداد والوں کو اللہ تعالیٰ زیاد تعداد والوں پر غلبہ دے۔ یہ غلبہ اللہ کے اذن سے ہونا ہے اور اللہ کے سوا کوئی یاور اور مددگار نہیں ہے۔ اللہ ہی حامی، مددگار اور ناصر ہے وہی دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے اور صبر اللہ کی مدد کی چابی ہے۔

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾

"اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے ہوئے تو کہا اے رب ہمارے دلوں میں صبر ڈال دے اور ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور اس کافر قوم پر ہماری مدد کر"۔

مومنین کی فتح کی دعا

"بَرَزُوْا" یعنی ظاہر ہوئے، "اَفْرِغْ" یعنی اوپر انڈیلنا، یعنی ہمیں صبر دے دے۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو مومنین نے اللہ سے صبر اور برداشت کی درخواست کی کہ ہمارے دل مضبوط ہوں اور جہاد میں ثابت قدم رہیں اور جہاد کے میدان سے فرار نہ

کریں اور ہمیں دشمن کے مقابلے میں کامیابی دے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے حکم اور اس کی شریعت کو ٹھکرانے والوں اور اس کی راہ سے پیٹھ پھیرنے والوں پر کامیابی کی مدد مانگی اور اللہ پر ہی بھروسہ کیا۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙۗ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

”پھر اللہ کے حکم سے مومنوں نے جالوت کے لشکروں کو شکست دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا، اور اللہ نے سلطنت اور حکمت داؤد کو دی اور جو چاہا اسے سکھایا، اور اگر اللہ کا بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع کرا دینا نہ ہوتا تو زمین فساد سے پُر ہو جاتی، لیکن اللہ جہان والوں پر بہت مہربان ہے“۔

جالوت کے لشکر کی شکست

جب جالوت اور طالوت کے لشکر کی جنگ شروع ہو گئی تو مومنین نے خوب مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ جو بنی اسرائیل کے ایک جوان تھے، ان کے ذریعے جالوت کو قتل کر ڈالا جبکہ جالوت بڑا طاقتور بادشاہ تھا اور لوگ اس سے ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا اور انسانوں کو سمجھایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ایک کمزور نوجوان مومن جس کا کوئی عنوان اور نام بھی نہیں اس کے ذریعہ طاقتور، ظالم پر غلبہ پیدا کر سکتا ہے اور اسے غلبہ دے سکتا ہے۔ جالوت کے قتل کئے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بادشاہی اور سلطنت داؤد کو دے دی اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو حکمت عطا کی، دانائی دی اور پھر داؤد کی بادشاہی اور اس کے بعد سلیمان کا سنہری دور بنی اسرائیل میں آگیا۔

داؤد اور سلیمان کا دور بہت ہی سنہری دور تھا جس میں داؤد کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل اور کرم سے حکمرانی عطیہ کے طور پر عطا کی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ بعض انسانوں کو بعض انسانوں سے دُور کرتا ہے تاکہ زمین میں فساد نہ ہو، اگر اس طرح کا سلسلہ نہ ہوتا تو پھر زمین پر فساد ہو جاتا اور زمین تباہ ہو جاتی، اہل زمین زمین پر نہ رہتے اور انسان کے معاشرے میں فساد اور تباہی، زمین کی تباہی ہوتی ہے اور انسانوں کے منافع آپس میں ٹکرا جائیں تو جنگیں ہوتی ہیں، زمین کی ویرانی کا ذریعہ بنتی ہیں، ایک کہتا ہے کہ وہ اپنے حق کا دفاع کر رہا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ وہ اپنے حق کا دفاع کر رہا ہے، ایک اپنی بات دوسرے پر ٹھونسنا چاہتا ہے، دوسرا اپنی بات کرنا چاہتا ہے، ہر ایک اپنا منصوبہ بناتا ہے تو اس طرح ایک دوسرے کو اس کے منافع سے دُور کرتا ہے، یہی سبب بن جاتا ہے کہ وہ حق جس سے لوگ ناآگاہ تھے اور وہ حق جو مر چکا تھا اسی کشمکش کے نتیجے میں اس کا احیاء ہو جاتا ہے اور وہ حق زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی منصوبہ بندی اور فیصلہ سے ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ چاہے اللہ اسکا انتظام کرتا ہے۔ جالوت کو ایک مومن جوان سے مروا کر لوگوں کے لیے امنیت کا دور لایا گیا۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

”یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم تمہیں ٹھیک طور پر پڑھ کر سناتے ہیں، اور بے شک تو ہمارے رسولوں میں سے ہے“۔

داستانوں کو بیان کرنے کی حکمت

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا ہے کہ جو داستانیں ہم نے بیان کی ہیں یہ برحق ہیں۔ یہ سباس وجہ سے تمہارے لیے بیان کیا جا رہا ہے تاکہ تیرے علم میں یہ ساری باتیں ہوں کہ سابقہ اقوام کا انجام کیا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کی کس طرح مدد کی۔ ساتھ ہی رسول اللہؐ کو خطاب ہے اور ان سے کہا جا رہا ہے کہ آپ رسولوں سے ہیں، آپ بھی اللہ

تعالیٰ کے نمائندوں کے اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بنایا ہے، تو ہی ہادی برحق ہے، تو ہی رسول ہے اور تو ہی انہیں صراط مستقیم پر لانے والا ہے۔ اس جگہ حضور پاکؐ کو بتایا گیا ہے کہ آپ رسولوں سے ہیں، اور دوسرے مقام پر بتایا گیا ہے کہ آپ خاتم المرسلین ہیں، ایک اور جگہ بتایا گیا ہے کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ لہٰذا جہاں پورا قرآن آپ کی شان کو بیان کر رہا ہے وہی اس آیت میں بھی حضور پاکؐ کے خواص میں سے ایک خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ بلاشک تم رسولوں میں سے ہو۔ اور تمہیں سابقہ اقوام کی داستانیں بیان کی جارہی ہیں تاکہ آج لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

”یہ سب رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام فرمائی، اور بعضوں کے درجے بلند کیے، اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو صریح معجزے دیے تھے، اور اسے روح القدس کے ساتھ قوت دی تھی، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان پیغمبروں کے بعد آئے وہ آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس صاف احکام پہنچ چکے تھے لیکن ان میں اختلاف پیدا ہو گیا

پھر کوئی ان میں سے ایمان لایا اور کوئی کافر ہوا، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔

پیغمبروں کی عظمت

پچھلی آیت میں مرسلین کا تذکرہ ہوا تھا۔ اس آیت میں بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیغمبروں کی عظمت اور بزرگی کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے '' تِلْكَ '' کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ تلک اسم اشارہ ہے جو دور کے اشارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں پر پیغمبروں کی عظمت اور بزرگی کو بیان کرنے کے لیے لفظ '' تِلْكَ '' بولا گیا ہے۔ سارے پیغمبروں میں جو بات مشترک ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب اللہ تبارک و تعالیٰ کے پیغام رساں ہیں لیکن ان رسولوں میں بعض کو بعض پر برتری ہے۔ ان سب کا مشترکہ کمال توحید ہے جس میں سب مشترک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے بعض کو بعض پر برتری ہے تو اس کی نسبت اپنی جانب دی ہے۔ خدا نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے البتہ یہ برتری ایک معیار کے مطابق دی گئی ہے، بلاوجہ نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے تفرقہ اور افتراق کا نام دیا ہے۔ اور اس افتراق کی نسبت خود لوگوں کی طرف دی گئی ہے۔

رسولوں کے بھیجنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک تو لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں اُن کو ختم کریں اور اُن کو حق کے راستے کی راہنمائی دیں۔ لیکن یہ سبب نہیں بنتا کہ جنگ اور خونریزی بالکل ختم ہو جائے۔ کیونکہ جنگیں لوگوں کے آپس میں اختلاف، ہٹ دھرمی، ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لہٰذا زمین کو ظالموں، دین کے دشمنوں اور ایمان کے مخالفین سے پاک کرنے کے لیے جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگر خدا چاہتا تو تکوینی طور پر جنگ اور خونریزی کے آگے رکاوٹ قائم کر دیتا لیکن یہ مسائل خود لوگوں کی

طرف ہیں اور اللہ کا نظام اسباب اور مسببات کے تحت چل رہا ہے، ہر شئے کی ایک وجہ اور علت ہوتی ہے جس کی روشنی میں اس کا اثر ہوتا ہے تو یہ سنت الٰہی اور اللہ کا قانون جاری و ساری ہے۔ اسی کے تحت ہی ہر شئے وجود میں آ رہی ہے اور تمام معاملات چل رہے ہیں۔ خدا نہیں چاہتا کہ ملتوں کے آگے رکاوٹ کھڑی کرے اور اسباب کے تحت چلنے والے نظام کی تاثیر ختم کر دے۔ جو کام اللہ نے انجام دینا ہے وہ یہ ہے کہ قانون بنا دیا اور کہہ دیا کہ جنگ مت کرو ،ایک دوسرے پر ظلم مت کرو! لیکن ہر شخص برتری چاہتا ہے اور دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتا ہے اور دوسرے پر غلبہ کی خواہش رکھتا ہے تو یہی چیز لڑائی کی اور اسلحہ اٹھانے کا سبب بن جاتی ہے۔

جو اللہ کے نظام کو قبول کرتے ہیں وہ پہلے تو منطق اور دلیل سے بات کرتے ہیں لیکن جب مخالفین نہ مانیں اور دین کے دشمن لڑائی پر آمادہ ہو جائیں تو پھر ان سے مقابلے کے لیے تلوار اٹھانا پڑتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے نمائندے اس لیے بھیجے ہیں کہ ان کو منطق اور دلیل سے سمجھائیں، جنگ و جدل سے روکیں، لیکن اگر نہ رکیں تو پھر انکا مقابلہ بھی کیا جائے اور اس کے لیے دفاع بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد انبیاء کی برتری کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تھوڑی تفصیل بتائی ہے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بعض نبیوں کو دوسرے بعض پر فضیلت دی ہے۔ اس حوالے سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کچھ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تکلم کیا اور وہاں پہلے "فضلنا" کہا اور اب یہاں غیب کی شکل میں صیغہ لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض فضائل بہ ذاتِ خود فضیلت ہیں جیسے معجزات، روح القدس کے ذریعے تائید۔ لہٰذا اس قسم کے فضائل کے بارے میں مخاطب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو بذات خود فضیلت نہیں ہیں بلکہ اُس وقت فضیلت بن جاتے ہیں جب کسی بڑی شان والے کی طرف ان کی نسبت ہو۔

تکلم اور گفتگو اس وقت قدر و قیمت بنالیتا ہے جب اللہ سے گفتگو ہو رہی ہو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف دی ہے تو اسے غایب کے صیغہ سے بیان کیا ہے اور عام مفسرین نے اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مراد لیا ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے تکلم فرمایا اور اس کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تکلم کرنا ان کے لیے اعزاز اور ان کے لیے ایک فضیلت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی نشانیاں دیں، بہت سارے معجزات انہیں دیئے جن میں مردے کو زندہ کرنا، کوڑھ کو شفا دینا، اندھے کو بینا کرنا، وغیرہ وغیرہ۔ روح القدس کے ذریعہ ان کی تائید کی گئی، روح القدس سے مراد جبرئیلؑ امین ہیں جو انبیاء کے پاس وحی لے کر آتے ہیں۔ انبیاؑ کی فضیلت کے متعلق ان دو اشاروں کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کلی قانون بتادیا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انبیاء نے لوگوں کے لیے جو سارے دلائل دیئے تھے اس کے نتیجے میں وہ جنگ نہ کرتے، آپس میں اختلاف نہ کرتے، افتراق میں نہ پڑتے، سارے ایمان لے آتے، جبکہ ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور کچھ کافر ہو گئے، اس کی وجہ تھی کہ وہ لوگ دین اور رسالت الٰہی سے دُور ہو گئے اور نفسانی خواہشات ان پر غالب آئیں، دُنیاوی مقاصد میں گھر گئے اور راہ خدا سے دُور ہو گئے۔ ظاہر ہے ایمان اور کفر اکٹھے نہیں ہو سکتے، اللہ کا قانون اور انسانی قانون اکٹھے نہیں چل سکتے۔

اللہ کا قانون نفسانی خواہشات سے سازگار نہیں ہے، آسمانی قوانین، کفار کے بنائے ہوئے قوانین کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں لہٰذا اسی وجہ سے مومنین اور کفار کے درمیان جنگ اور اختلاف اور جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ قتل و غارت نہ ہوتا لیکن اللہ نے سب چیزوں کو اسباب کے تابع کیا ہے اور انسان کے اختیار میں دیا ہے، اُن کے سامنے ساری چیزیں ہیں، صحیح کیا ہے غلط کیا ہے، حق کیا ہے باطل کیا ہے۔

جب اہل باطل حق کا خاتمہ چاہیں تو ظاہر ہے اہل حق اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سے جنگ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کوئی جنگ نہ ہوتی اور سب لوگ ایک ہی راہ پر چلتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ مخلوقات کو اس طرح بنایا کہ وہ اپنے اختیار سے ترقی کی منازل اور کمال کی راہیں طے کریں اور کمال کو پہنچیں۔ اور یہ جنگ کفر کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے اور اللہ کا ارادہ شکست ناپذیر ہے اور اس کی قدرت کبھی باطل نہیں ہوتی اور نہ ہی ناکام ہو جاتی ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِمَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَٰعَةٌ ۗ وَٱلْكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٥٤﴾

''اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ کوئی سفارش، اور کافر وہی ظالم ہیں''۔

اللہ کی راہ میں انفاق

بندوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم نے تمہیں روزی دی ہے اس سے خرچ کرو، تمہارا تو ہے ہی نہیں، روزی کے اسباب ہم نے بنائے ہیں، روزی کمانے کی صلاحیت ہم نے دی ہے، یہ ساری ہماری عطاء ہے تو پھر تم اس سے خرچ کرو۔ پھر بتا دیا ہے کہ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے قیامت کے دن اس کا حساب دینا پڑے گا اس لیے اس دن کے حساب سے پہلے خود اپنا حساب کر لو کیونکہ وہاں پر تو سارے دُنیاوی اسباب ختم ہو چکے ہوں گے، نہ تجارت ہوگی نہ دوستی ہوگی نہ سفارش ہوگی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اسے خرچ کرو، اس سے سرپیچی مت کرو، کفر اور ظلم کا راستہ نہ اپناؤ، کفر کا مطلب ہے اللہ کی

دی ہوئی نعمات کو چھپانا، ان پر پردہ ڈالنا اور جو کچھ اللہ نے انسان کو عطاء کیا ہے اس کو اللہ کا دیا نہ سمجھنا۔ گویا وہ اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں تو ایک دن اس ظلم کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

''اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا، نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے نہ نیند، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا ہے، ایسا کون ہے جو اس کی اجازت کے سوا اس کے ہاں سفارش کر سکے، تمام حاضر اور غائب حالات کو جانتا ہے، اور سب اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا کہ وہ چاہے، اس کی کرسی سب آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے، اور اللہ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی، اور وہی سب سے برتر عظمت والا ہے''۔

اللہ کی ذات جامع صفات کمالیہ

اللہ اس ذات کو کہتے ہیں جس میں ساری صفات کمالیہ اور جمالیہ یکجا موجود ہوں، کسی سے کچھ نہ لیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی جتنے بھی معبود ہیں اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ اُن میں کوئی لیاقت ہے کہ ان کے آگے جھکا جائے۔ ''حی'' ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کی

حیات ثابت ہو اور حیات ایسی وجودی حالت کو کہتے ہیں جو علم اور قدرت کے ساتھ ملی ہوئی ہے، انسان اور دیگر موجودات کی حیات کو موت طاری ہوتی ہے لیکن واقعی حیات اور اخروی حیات میں موت نہیں ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ حقیقی حیات کا مالک ہے اور یہ حقیقی حیات اللہ کی ذات میں منحصر ہے، یہ کسی اور کے لیے نہیں ہے اور کسی اور کو جو حیات ملتی ہے تو وہ اللہ کی طرف سے عطاء شدہ ہے۔" قیوم" ایسی ذات جو اپنی ذات کے ذریعے ہی قائم اور موجود ہو، خدا قائم بالذات ہے، اس کے سوا دوسری تمام مخلوقات اللہ کی وجہ سے قائم ہیں، اللہ ہی اُن کے قیام کی تدبیر بھی کرتا ہے اور ان کی موجودگی اور ان کی حفاظت بھی فرماتا ہے اور سارے مقدرات اور فیصلے بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ پورا عالم اللہ کی قیومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور" قیوم" اللہ کا وہ اسم جلالہ ہے جو تمام اضافی ناموں کو جمع اور اکٹھا کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اضافی ناموں سے مراد وہ اسماء ہیں جو کسی بھی حوالے سے ذات سے باہر کے معنی پر دلالت کرتے ہیں جیسے خالق ہے، رازق ہے، معید (پلٹانے والا) ہے، ممیت مارنے والا، محیی زندہ کرنے والا ہے وغیرہ۔

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے تمام معاملات کی تدبیر سے غافل نہیں۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ استعمال ہوا ہے کہ وہ اونگھتا بھی نہیں ہے چہ جائے کہ اس کو نیند آجائے اور وہ سو جائے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس سب پر اللہ کی سلطنت اور بادشاہی ہے۔ عالَم وجود کی مملکت میں سب کچھ اسی کا ہے۔ اُس کے سوا عالَم میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور کسی کی تاثیر بھی نہیں ہے، طبیعی علل و اسباب کی تاثیر بھی اس کے تصرف کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ کون ہے جو اللہ کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سفارش کرسکے؟ وہ قیوم، تمام اسباب اور غیب و حاضر کا مالک ہے، طبیعی اسباب کا مالک بھی وہی ہے، مسببات کا مالک بھی وہی ہے۔ اگر کوئی شفاعت کرے گا تو اللہ کے اذن اور اجازت سے کرے

گا۔ شفاعت کرنے والے مستقل نہیں ہیں، اللہ نے شفاعت کرنے والوں کے مستقل ہونے کی نفی کی ہے۔ شفاعت کے جو اسباب ہیں وہ سب اللہ کی اجازت سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ آیت کا سیاق بتاتا ہے کہ اس شفاعت سے مراد شفاعت تکوینی اور وجودی ہے نہ کہ شفاعت تشریعی جو قیامت کے دن ہے۔ البتہ یہ مطالب شفاعت تشریعی پر بھی صادق آتے ہیں، یعنی آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔[1]

اللہ تعالیٰ کا سب اسباب پر احاطہ ہے، سب اس کے علم میں ہے، حاضر و موجود اللہ کے علم میں ہے، کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں ہے، کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے، تمام سلطنت اسی کی ربوبیت کے احاطہ میں ہے۔ کوئی اور نہیں ہے جس کے لیے یہ احاطہ ہو۔ اللہ کی طرف سے پوری تدبیر ہے اور کمال کی تدبیر ہے۔ وہی ہے جو موجودات کے درمیان روابط، جوڑ اور تعلق سے آگاہ ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے علم کی بحث کو احاطہ سے تعبیر کیا ہے، اس تعبیر میں لطافت ہے۔

پھر فرمایا ہے کہ اللہ کی حکمرانی اور اللہ کی کرسی سب پر بھاری ہے اور اس کی سلطنت ربوبی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، یہ آسمان اور زمین اسی کی وجہ سے قائم ہیں، سارا عالَم اور پورا جہان اللہ کا مملوک ہے اور اللہ کی تدبیر کے تحت ہے اور سب اللہ کی معلومات کے تحت ہیں۔

کرسی، علم کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے، اس مطلب سے اس ذات کا عالَم کی نگہداری اور اس کے تمام آثار کی حفاظت اور اس کی ساری وسعت کی طرف اشارہ ہے۔ ہر چیز ضبط ہو رہی ہے، لکھی جا رہی ہے، درج ہو رہی ہے اور سب کی حفاظت کرنا اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ اللہ عظمت والا ہے، جہان کی وسعت اس کے لیے بوجھ اور تھکاوٹ کا

---

[1] ۔ روایات میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پیغمبر اکرم ﷺ اور اہل البیت علیہم السلام کو اللہ کی جانب سے سفارش کی اجازت ہو گی۔ (مترجم)

سبب نہیں ہے کیونکہ اللہ بلند شان والا ہے اور اس کے لیے برتری ہے، یہ چیزیں مخلوقات کے لیے ہیں، مخلوقات میں سستی آتی ہے، ضعف آتا ہے، کمزوری آتی ہے۔ مخلوقات کی کثرت سے اللہ کی عظمت میں تنگی یا کمزوری کا شائبہ نہیں آسکتا ہے، آسمان اور زمین اس کی عظمت اور طاقت کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے، وہ کیونکہ بلند شان ہے، عظمت فقط اسی کے لیے ہے، بڑائی فقط اسی کے لیے ہے، اس کے علاوہ جس کو کمال کہا جاسکتا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶

”دین کے معاملے میں زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے، پھر جو شخص شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے“۔

دین میں جبر نہیں

اس آیت میں چند قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قانون یہ بتا دیا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی مرضی سے دین کا انتخاب کر سکتا ہے۔ دین علمی اور عملی معارف کا نام ہے۔ جس میں اعتقادات ہیں، اعتقاد کا تعلق دل سے ہے اور اس میں جبر تو چل ہی نہیں سکتا، جبر ظاہری اعمال میں ہوتا ہے، اس لیے اگر انسان کو کسی کام پر مجبور کیا جائے تو چاہے وہ دل سے اس کام پر عقیدہ نہ بھی رکھتا ہو تو اسے انجام دیتا ہے۔ یہ محال ہے کہ کسی کے دل پر زبردستی کوئی چیز ڈال دی جائے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ جہالت علم کا نتیجہ دے، یہ تو نہیں ہو سکتا۔ تو جس چیز کا تعلق ہی دل سے ہے تو وہاں جبر کیسے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس آیت میں دین

میں جبر کی نفی کر دی گئی ہے۔ انسان اپنے اختیار سے کسی چیز کا عقیدہ رکھتا ہے۔ ''رُّشْدُ''کمال، ہدایت اور واقعی امر تک پہنچنا اور حقیقت کو سمجھنے کے معنی میں ہے۔ ''غَيِّ'' ہدف کو بھول جانا اس طرح کہ اسے پتہ ہی نہ ہو کہ کیا کر رہا ہوتا ہے۔ یہ دو لفظ آپس میں متضاد ہیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ رشد اور غیٔ یعنی ہدایت اور گمراہی کا معنی بڑا واضح ہے اور ان کا فلسفہ بھی معلوم ہے۔ اس لیے جبر کا راستہ وہ اپناتا ہے جو کوئی مہم ہدف کے پیچھے ہو اور اس ہدف تک منطق اور عقلی بحث کے ذریعے نہ پہنچ سکتا ہو یا جس تک کوئی چیز پہنچانا چاہتا ہے اُس کا فہم ناقص ہو تو اس صورت میں وہ جبر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جس کی پیروی میں ہدایت ہے، رشد ہے، ترقی ہے، کمال ہے اور اس کو چھوڑنا گمراہی اور غیٔ ہے۔ تو اس کو قبول کرنے کے لیے کسی قسم کے جبر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی بہتری سب پر واضح روشن ہے، کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جس چیز کی بہتری اور خیر ہونا اور فائدہ مند ہونا روشن اور واضح ہو تو وہاں جبر واکراہ معنی نہیں رکھتا۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ دین اسلام کی بنیاد اور اس کی عمارت شمشیر اور تلوار پر نہیں کھڑی اور نہ ہی خونریزی سے اسلام کی آبیاری ہوئی ہے۔ اگر اسلام میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے تو جہاد زبردستی کسی کو دین پر لانے کے لیے نہیں ہے، جہاد اپنے دفاع کے لیے ہے۔ جب کفار دین کو تباہ کرنے کے لیے حملہ آور ہوں تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاد حق کو زندہ رکھنے کے لیے ہے۔ جہاد انسان کے نفیس ترین اور قیمتی ترین سرمایہ فطرت کی حفاظت کے لیے ہے جو کہ توحید ہے۔ توحید کے نظریہ کے پھیل جانے کے بعد اسلام جنگ وجدل کی اجازت نہیں دیتا۔

''طاغوت'' طغیان اور حد سے آگے بڑھ جانے کے معنی میں ہے۔ طغیان مبالغہ کے لیے بھی آیا ہے یعنی بہت زیادہ سرکشی۔ یہ لفظ ان موارد میں بھی استعمال ہوتا ہے جو سرکشی کا وسیلہ بنیں۔ مثلاً غیر خدا کو معبود بنانا جیسے شیطان، جنات، گمراہی والے پیشوا یا

نظریاتی اور قراردادی رہبر اور لیڈر۔ یہاں پر خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے پر ایمان لانے سے پہلے طاغوت کے کفر اور اس کا انکار کرنے کا حکم دیا ہے۔ طاغوت ہر وہ طاقت، ہر وہ سلسلہ ہے جو اللہ کے مقابلے میں آئے پہلے اس کا انکار کیا جائے پھر اللہ پر ایمان لایا جائے۔ اور جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو اس نے عروۃالوثقیٰ کو تھام لیا۔

یہاں پر شرط اور جزا کو اس ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے کہ جزا، عمل کے ساتھ مناسب ہے۔ چونکہ عروۃالوثقیٰ سے تمسک اسی وقت ہی ہو سکتا ہے جب پہلے تمام قسم کے طاغوتوں کا انکار کیا جائے۔ "تمسک" کسی چیز کے ساتھ چپک جانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا ہر وہ کام چھوڑ دینا جو خدا سے دُور کرے اس کا نتیجہ عروۃالوثقیٰ کو تھام لینا ہے۔ عروۃالوثقیٰ کو تھامنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسان طاغوت کو چھوڑے، غیر اللہ سے کٹ جائے پھر اللہ پر ایمان لے آئے تب ہی عروۃالوثقیٰ سے تمسک کر سکتا ہے۔

عروۃالوثقیٰ یعنی مضبوط رسی، اللہ کا راستہ ہے۔ ایمان عروۃالوثقیٰ سے تمسک ہے اور پھر اس کا نتیجہ بتایا کہ جس نے مضبوطی سے اس کو تھام لیا تو پھر وہ نقصان میں نہیں جائے گا۔ ''عروۃ'' کسی چیز کے دستہ یا مضبوط جڑوں والے درخت کو کہتے ہیں جس کے پتے نہیں گرتے۔ اس کا معنی تعلق کا بھی ہے۔ یہ استعارہ ہے کہ ایمان اور سعادت کا تعلق ''عروۃ'' سے ہے، یہ ظرف ہے مظروف کے ساتھ جس طرح کسی ظرف کو اٹھانا یا پکڑنا یا اس سے استفادہ کرنا گویا کہ اس کے اندر جو کچھ موجود ہے جب تک اس کے کنڈے سے نہیں پکڑو گے تو اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔ ایک برتن کا جو کنڈا ہوتا ہے ہتھی جو ہوتی ہے اس سے پکڑ کر اس کو اٹھاؤ گے نا۔ تو اسی طرح یہ ایک ایسا سلسلہ ہے کہ سعادت اس کے بغیر حاصل نہیں ہو گی کہ اللہ پر ایمان لے آؤ اور طاغوت کا انکار کرو۔ اگر ایسا کر لو گے تو یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس نے ختم نہیں ہونا اور اللہ تبارک و تعالیٰ ہر بات کو سننے والا، دانا ہے۔ ایمان اور کفر کا تعلق دل سے

بھی ہے اور زبان سے بھی ہے۔ زبان سے اظہار ہوتا ہے اور دل سے عقیدہ رکھا جاتا ہے۔ یقین بالقلب، قلب کے ذریعے یقین۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

''اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے اور انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں، یہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

ایمان کی نورانیت

اس آیت میں ایمان والوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ جو ایمان لے آتے ہیں گویا وہ تاریکی سے نکل کر نور کی طرف آتے ہیں۔ ایمان انسان کو نورانیت عطا کرتا ہے۔ یہ ایک طرح کی تشبیہ ہے۔ جس طرح روشنی انسان کو راہ دکھاتی ہے اور صحیح چیز کا پتہ چل جاتا ہے، اندھیرے میں نہیں پتہ چلتا کہ وہ کیا شئے ہے اسی طرح جب انسان کے اندر ایمان آجاتا ہے تو اسے حقائق کا ادراک ہو جاتا ہے۔ بعض نے خیال کیا ہے کہ عقیدے کا نور حق ہے جس کی وجہ سے جہالت کی تاریکی، شک کی حیرت، دل کا اضطراب دُور ہو جاتا ہے۔ اور عمل صالح بھی نور ہے کیونکہ اُس کا رشد روشن ہے اور آدمی کی سعادت میں اس کا کردار بھی واضح ہے۔ اس کے مقابلے میں عقائد میں جہالت اور عمل غیر صالح ظلمت ہیں۔

ہم اس کو مزید بہتر اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ انسان اپنی خلقت کے تحت ایک فطری نور کا مالک ہے، اگر اس کا لحاظ رکھے اور اس پر اس کی توجہ رہے تو وہ ترقی کرتا ہے اور کمال کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اگر بچپن ہی میں معارف حقہ اور اعمال صالح سے جاہل ہو تو وہ تاریکی میں ہے۔ اس طرح نور اور ظلمت اس معنی میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مومن اپنے ایمان کے ذریعے اس تاریکی سے باہر آجاتا ہے اور معارف اور اطاعت کے نور تک پہنچ جاتا ہے، نور تو ایک ہے لیکن تاریکیاں متعدد ہیں اس لیے نور مفرد لایا گیا ہے اور ظلمت کو جمع کی شکل میں لایا گیا ہے۔ حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔ نور اور تاریکی حقیقی امور میں سے ہیں اور یہ اطاعت اور معصیت سے جدا نہیں ہے۔ معصیت تاریکی ہے اور اطاعت نور ہے۔ پھر بتا دیا کہ یہ تو ایمان والوں کی بات ہے اور جو کفر اختیار کرتے ہیں، اُن کے سرپرست کون ہیں؟ ان کے سرپرست ظالم و سرکش ہیں جو ان کو خدا سے دُور کرتے ہیں۔ کافروں سے نور حق چھن جاتا ہے اور وہ فطرت کے نور سے نکل کر جہالت اور شک اور تردید کی تاریکی میں جاپڑتے ہیں۔ وہ اللہ سے رخ موڑ کر ہزاروں جھوٹے معبودوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ایسوں کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے اور اس سے نکل ہی نہیں پائیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

''کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراھیم سے اس کے رب کی بابت جھگڑا کیا اس لیے کہ اللہ نے اسے سلطنت دی تھی، جب ابراھیم نے کہا کہ میرا رب وہ

ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، کہا ابراہیم نے بے شک اللہ سورج مشرق سے لاتا ہے تو اسے مغرب سے لے آ تب وہ کافر حیران رہ گیا، اور اللہ بے انصافوں کی سیدھی راہ نہیں دکھاتا"۔

حق کی دعوت کیلئے ابراہیمؑ کا استدلال

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ واقعہ بیان ہوا ہے جس میں آپؑ نے اپنے زمانے کے بادشاہ نمرود کو رب کی طرف دعوت دی اور اُن کے لیے دلائل پیش کئے اور اپنے مدعا کو واضح کیا اور دشمن کی دلیل کا توڑ پیش کیا۔ "حجت" قصد کرنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر کہا ہے کہ بابل کے بادشاہ نمرود کی حکمرانی کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے تھے، جن اسباب کو استعمال کرکے وہ بادشاہت پر پہنچ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے بادشاہ نمرود کے پاس آئے اور اس سے بحث کی اور کہا کہ اللہ نے تیرے اوپر احسان کیا ہے، تجھے ملک اور دولت دی ہے اور تو کفران نعمت کر رہا ہے اور اللہ کے اس احسان کو بھول گیا ہے۔ نمرود کے خدائی کے دعویٰ کے توڑ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ سارے موجودات کی حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ جب چاہے اس حیات کو ان سے لے لے گا، اللہ قادر مطلق ہے۔

نمرود نے فوراً دعویٰ کر ڈالا کہ جو تم کہہ رہے ہو اور اپنے رب کا وصف بیان کر رہے ہو کہ وہ جسے چاہے حیات دیتا ہے اور جسے چاہے مار دیتا ہے، اس کام کو تو میں بھی انجام دے سکتا ہوں، میں بھی زندہ کرتا ہوں، اور مارتا ہوں۔ اس مقام پر نمرود نے مارنے اور حیات دینے کے عمل کو ان بتوں کی جانب نسبت نہیں دی جن کی وہ پوجا کرتا تھا۔ کیونکہ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ ٹھیک نہیں بنتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

تو کہا تھا کہ میرا اللہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ اپنا مقابلہ حضرت ابراہیمؑ کے خدا سے کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ بتوں کی بجائے اللہ کے سامنے خضوع و خشوع کرو اور اس کی عبادت کرو۔ جس کے جواب میں نمرود نے وہی وصف جو ابراہیمؑ نے اپنے رب کے لیے بتایا اس نے اپنے لیے بتایا، اس طرح وہ اپنے دربار میں موجود لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتا تھا۔ اور پھر کہا کہ وہ دو آدمی جو جیل میں ہیں ان کو نکال کر لے آؤ اور ایک کو آزاد کر دیا اور دوسرے کو قتل کر دیا، یہ ایک قسم کا مغالطہ تھا؛ ابراہیم علیہ السلام کی مراد تو حقیقی موت اور حقیقی زندگی تھی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ دربار میں بیٹھے لوگوں کی فکری سطح بہت کمزور ہے اور وہ نمرود کے اس مغالطے کو نہیں سمجھ سکتے تو فوراً آپ نے دوسری دلیل پیش کی جس کا جواب نمرود کے پاس نہ تھا۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر میرا اللہ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو سورج مغرب سے نکال کر لے آؤ۔ حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دلیل نمرود کے پہلے دعویٰ پر متفرع تھی یعنی اگر تو پروردگار ہے اور تو ہی کائنات کے امور کی تدبیر کرنے والا رب ہے اور عالم پر تیرا تصرف ہے تو پھر یہ سورج بھی تو اسی کائنات کا ایک حصہ ہے حالانکہ وہ سورج کی پوجا بھی کرتے تھے اور اسے رب الارباب بھی کہا کرتے تھے۔ تو تم ایسا کرو، اگر مارنا اور زندہ کرنا تیرے اختیار میں ہے تو سورج کائنات کا ایک حصہ ہے، سورج کو تم مغرب سے لے آؤ۔ تو کافر مبہوت ہو گیا اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کا مبہوت ہونا اس لیے نہیں تھا کہ وہ کافر تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کی ہدایت نہیں کی کیونکہ وہ ظالم تھا۔ اس کا ظلم اس کے ہدایت سے محروم ہونے کا سبب بنا، اس کا ظلم اسے کفر میں لے گیا، اس کا ظلم اسے گمراہی میں

لے گیا یعنی ہدایت نہ پانے کا سبب ظالموں کا ظلم ہوتا ہے اور ظلم انسان کو عدالت کے راستے سے بھٹکاتا ہے اور اس کے لیے نااُمیدی اور خسارت کو لے آتا ہے۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

"یا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک شہر پر گزرا اور وہ (شہر) اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا، کہا اسے اللہ مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ پھر اللہ نے اسے سو برس تک مار ڈالا پھر اسے اٹھایا، کہا تو یہاں کتنی دیر رہا، کہا ایک دن یا اس سے کچھ کم رہا، فرمایا بلکہ تو سو برس رہا ہے اب تو اپنا کھانا اور پینا دیکھ وہ تو سڑا نہیں، اور اپنے گدھے کو دیکھ اور ہم نے تجھے لوگوں کے واسطے نمونہ چاہا ہے، اور ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر گوشت پہناتے ہیں، پھر اس پر یہ حال ظاہر ہوا تو کہا میں یقین کرتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا

یہ آیت سابقہ آیت پر عطف ہے اور اسی آیت کی وضاحت کر رہی ہے۔ مومنین کا ظلمت کی تاریکی سے ہدایت کے نور کی طرف آنے کے تین مراحل ہیں؛

ا۔ اس کا پہلا مرحلہ برہان اور استدلال کے ذریعے حق کی طرف ہدایت پانا ہے۔ اس کا نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان ہونے والے مکالمہ میں موجود ہے۔ نمرود چونکہ ظالم تھا اس لیے ہدایت نہ پا سکا اور اپنے کفر میں مبہوت ہو گیا اور گمراہ رہا۔

۲۔ اس کا دوسرا مرحلہ راستہ دکھانے کے ذریعے حق کی جانب ہدایت حاصل کرنا ہے۔ اس کی مثال وہ داستان ہے جس میں ایک شخص ویران بستی سے گزرا تو پوچھنے لگا کس طرح اللہ ان مردوں کو زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو وہیں پر مار دیا اور سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کر کے معاد پر ایمان لانے کی طرف اس کی ہدایت فرما دی۔

۳۔ تیسرا مرحلہ وہ ہے جس میں کسی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے اور حقیقت دکھا کر اُسے نشانی دی جاتی ہے اور اس واقعہ کے وقوع کی وجہ سے وہ ہدایت پا جاتا ہے۔ اس میں اس شخص کو سبب اور مسبّب دونوں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ ہدایت کا قوی ترین اور عالی ترین مرتبہ ہے۔ اس کا نمونہ بعد والی آیت میں بیان کیا جائے گا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے معاد کی توضیح پیش کی گئی ہے جس میں انہوں نے چار پرندے لیے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور مختلف جگہوں پر رکھا اور ان کو جب بلایا تو وہ زندہ ہو کے ان کے پاس حاضر ہو گئے۔

وہ شخص روایات کے مطابق اللہ کے نبی تھے۔ جب وہ ایک بستی سے گزرے تو اس بستی کو دیکھ کر کہا کہ اب اللہ ان مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اگرچہ وہ مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا انکاری نہیں تھا بلکہ اس کو ایک بڑا کام سمجھ کر اس نے تعجب کیا تھا۔ اللہ تبارک و

تعالیٰ نے اسے ایک سو سال کے لیے مار ڈالا، پھر اس کے جسم میں روح پھونک دی اور اسے زندہ کیا۔ پھر پوچھا کہ کتنے سال سوئے تو اس نے کہا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم پورے ایک سو سال سوئے رہے ہو اور کہا کہ دیکھو یہ جو تمہاری کھانے پینے کی چیزیں ہیں وہ خراب بھی نہیں ہوئیں وہ ویسی کی ویسی تر و تازہ پڑی ہیں۔ جبکہ تمہارا گدھا مر گیا ہے اور اس کی ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو گئی ہیں لیکن اللہ کے حکم سے تمہارا کھانا پینا تبدیل نہیں ہوا، وہ بالکل اسی حالت میں موجود ہے۔

یہ ماجرا فقط اس کی ہدایت کے لیے نہیں تھا بلکہ سب لوگوں کے لیے تھا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دیکھو ہم کیسے ان ہڈیوں کو جوڑتے ہیں اور اس پر گوشت چڑھاتے ہیں اور پھر جب اس پر گوشت چڑھ گیا اور وہ زندہ ہو گیا تو یہ سارا منظر دیکھ کر اس نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح مردے زندہ ہو رہے ہیں اور پھر فرمایا کہ اللہ ہی ہے جو نصیحت فرماتا ہے، ہدایت دیتا ہے، اب مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ کی قدرت بے انتہاء ہے اور وہ ہر کام پر توانا و قادر ہے۔ بظاہر جو شخص جو بستی سے گزرے تھے قوی احتمال ہے کہ وہ عزیر نبیؑ تھے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

"اور یاد کر جب ابراہیم نے کہا اے میرے پروردگار! مجھ کو دکھا کہ توں مردے کو کس طرح زندہ کرے گا، فرمایا کہ کیا تم یقین نہیں لائے ہو؟ کہا کیوں نہیں لیکن اس

واسطے چاہتا ہوں کہ میرے دل کو تسکین ہو جائے، فرمایا تو چار جانور اڑنے والے پکڑ پھر انہیں اپنے ساتھ مانوس کرلے پھر (انہیں ذبح کرنے کے بعد) ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دے پھر ان کو بلا تیرے پاس جلدی سے آئیں گے، اور جان لے کہ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے''۔

ابراہیمؑ کیلئے مُردوں کا زندہ کیا جانا

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کے جواب میں ایک برہان اور دلیل پیش کی جو ہدایت کے مراتب میں سے اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔ مادی حیات رکھنے والی چیز کے اجزاء کس طرح دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے؟ سوال یہ تھا کہ اللہ کیسے مردوں کو حیات عطاء کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ تم ایمان نہیں لائے ہو؟ انہوں نے کہا ایمان تو ہے مگر اطمینان قلب کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیمؑ کو اس مسئلے کا یقین اور علم تھا لیکن اطمینان چاہ رہے تھے، ان کو اضطراب اور تشویش تھی اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام مردے کو زندہ کرنے کی کیفیت کو جاننا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے اس غیر محسوس عمل کے بارے یقین تک پہنچنا چاہتے تھے اور چاہ رہے تھے کہ محسوس کریں کہ کیسے مردوں کو حیات دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہے تم چار پرندے پکڑو، ان کو ذبح کرو ان کا قیمہ بناؤ اور پھر اپنے پاس لے آؤ اور ان کو اچھی طرح جان لو اور پھر انہیں مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دو، اس طرح کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوں اور ان کے سارے ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے ہوں اور پھر ہر ایک کو اس پرندے کے نام سے آواز دو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف زندہ ہو کر پرواز کرتے ہوئے آئیں گے۔ اس سارے عمل کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرما دیا

کہ وہ ہر چیز پر قادر، غالب اور تمام امور کے حقائق سے آگاہ بھی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے دل میں موجود شک و تردید اور فتور کو زائل کر دیا کہ خدا غالب اور عزیز ہے۔ یعنی کوئی چیز اللہ کی قدرت کے دائرے سے باہر نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس سے دُور ہے نہ غائب ہے۔ جس طرح ان پرندوں کی ارواح اللہ کی قدرت کے قبضے میں تھیں اور وہ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی عمل بغیر حکمت کے نہیں ہوتا اسی لیے تمام جسموں کو ان کی ارواح سے بلاتا ہے تاکہ وہ اس کی طرف تیزی سے آجائیں۔ اس طرح اللہ نے ہدایت کا یہ منظر بھی دکھا دیا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ جو سات بالیاں اگائے ہر بالی میں سو سو دانے، اور اللہ جس کے واسطے چاہے بڑھاتا ہے اور اللہ بڑی وسعت اور جاننے والا ہے''۔

راہ خدا میں خرچ کرنے کا اجر

اس آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو ملنے والے اجر و ثواب اور فائدے کا تذکرہ ہوا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ظاہر ہے اللہ کی رضا شرط ہے۔ یعنی وہی انفاق فی سبیل اللہ کہلائے گا جس میں دکھاوا اور ظاہری فوائد مد نظر نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے انفاق کو اس دانہ سے تشبیہ دی ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے، پھر وہ ایک خوشہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ''سنبل'' اصل میں چھپانے کے معنی میں ہے، کیونکہ خوشہ کے اندر دانے چھپے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے اس کو سنبل کہا گیا ہے۔ ہر خوشے میں سو دانہ ہوتا ہے تو ایک دانہ

سے سو دانہ ملا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے تو کوئی دشواری نہیں ہے کہ ایک کام کے بدلے میں کئی گنا اجر و ثواب عطا کر دے جس طرح ایک دانہ سے سو دانے مل رہے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کو کئی گنا دے سکتا ہے۔

اُمت ایک ہی بدن اور جسم کی مانند ہے جس میں فقیر بھی ہیں دولت مند بھی ہیں سارے ایک ہی بدن کے اعضاء اور ایک ہی بدن کے دو ہاتھ کی مانند ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے جن کے پاس مال ہے انہوں نے دوسروں پر خرچ کرنا ہے جن کے پاس مال نہیں ہے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ ایک کے بدلے میں کئی گنا ان کو دے گا کیونکہ وہ رزق میں وسعت دینے والا اور بہت دانا ہے۔ لہٰذا کبھی بھی عطاء اور بخشش کرنے والے میں تنگی نہیں آتی اور اللہ سب کی نیتوں سے بھی آگاہ ہے، تمام کے اعمال پر اس کا احاطہ ہے، اسے ہر چیز کا مکمل علم ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق عطاء کرتا ہے۔ انفاق اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بڑی تاثیر ہے۔ سوسائٹی میں بھی خرچ کرنے والے کا بڑا مقام ہوتا ہے اور اللہ کے ہاں بھی اس کا مقام ہے، اگر کسی معاشرے کے امیر لوگ نیک ہوں اور وہ اپنی اصلاح کریں اور اپنے مال کا کچھ حصہ فقراء پر خرچ کریں تو ان کے دلوں میں ان کی محبت کا چراغ جلے گا اور اُن کے اندر ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو گا، اس طرح خرچ کرنا معاشرے میں اصلاح کا سبب بھی بنتا ہے۔ اگر انسان اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے تو اس کے معنوی فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت میں اللہ نے یہی کہا ہے کہ اگر اس کی راہ میں خرچ کرو گے تو وہ اس کا کئی گنا تمہیں پلٹا دے گا۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں، انہیں کے لیے اپنے رب کے ہاں ثواب ہے اور ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

راہ خدا میں کئے گئے انفاق پر احسان جتانے سے منع

اس آیت میں مزید بتایا گیا کہ جو مال اللہ کی راہ میں اور رضائے الٰہی کے لیے خرچ کیا گیا ہے تو جن کی انہوں نے مدد کی ہے اور جن پر انہوں نے خرچ کیا ہے، ان پر وہ احسان نہیں جتاتے، اُن کو تکلیف نہیں دیتے، ان کو طعنے نہیں دیتے کہ ہم نے تمہیں کپڑے دے دیے، ہم نے تمہاری مدد کر دی۔ ''مَنًّا'' احسان جتانے اور منت چڑھانے کے معنی میں ہے۔ البتہ ایک ضعیف قول کے مطابق ''مَنًّا'' کاٹنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ''اَذًی'' تھوڑا نقصان یا فوری نقصان دینے والے کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پیسے دے کر کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے۔ بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں دیے ہوئے کی کسی کو خبر تک بھی نہ ہو۔ اگر وہ سامنے آئیں تو ان کو یہ احساس نہیں دلاتے کہ ہم نے تمہاری فلاں موقع پر مدد کی تھی تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس بڑا اچھا اجر ہے۔ وہ کسی بھی تکلیف میں نہیں ہوں گے، دُنیا و آخرت میں کسی غم میں نہیں ہوں گے، ان کو نقصان نہیں پہنچے گا وہ ہمیشہ خوشحالی میں ہوں گے اور ان کی مشکلات حل ہوں گی یعنی دُنیا و آخرت میں وہ محزون یا پریشان نہیں ہونگے۔ یہ ان کے اس عمل کا فائدہ ہے جو انہیں دُنیا اور آخرت دونوں میں ملا ہے۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّ مَغۡفِرَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَۃٍ یَّتۡبَعُہَاۤ اَذًی ؕ وَ اللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ﴿۲۶۳﴾

''مناسب بات کہہ دینا اور در گزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو، اور اللہ بے پروا نہایت تحمل والا ہے''۔

مناسب بات، تکلیف دہ احسان سے بہتر

یہاں ایک بات سمجھائی گئی ہے کہ تم جب کسی سے بات کرو تو ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ'' یعنی اچھے انداز میں بات کرو۔ ایسی بات جس میں ناپسندیدگی نہ ہو اور عام لوگ اسے غیر معمولی نہ سمجھیں یعنی معمول کے مطابق گفتگو کی جائے۔ ''مَغْفِرَۃٌ'' چھپانے کے معنی میں ہے۔ یعنی اگر کوئی سوالی آئے تو اس کے ساتھ اچھے انداز میں گفتگو کرلو اور اُس کے لیے طلب بخشش کرو اور اس کی پریشانی پر پردہ ڈالو کہ دوسروں کو اس کے فقر کے متعلق نہ بتاؤ۔ یہاں پر اچھے انداز سے مراد اچھی بات کہہ دینا ہے، سوالی کے ساتھ مسکراہٹ سے پیش آجانا۔ اگر آپ اس کو کچھ دے نہیں سکتے تو اس کے ساتھ اچھے انداز میں پیش آنا اس صدقہ اور خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد اس کو اذیت دو اس کو طعنے دو اس پر منت چڑھاؤ۔

انفاق کرنے والے کا سوالی کو تکلیف دینا اس طرح ہو سکتا ہے کہ مثلاً اپنے کام کو بہت بڑا قرار دے یا سوالی کی درخواست پر ناراض ہو جائے۔ مومن انسان اپنے آپ کو ان چیزوں سے پاک رکھتا ہے اور وہ دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچاتا، جب خرچ کرتا ہے تو پھر جیسا کہ پہلے کہا گیا جس پر خرچ کیا ہے اس پر احسان نہیں جتاتا، منت نہیں چڑھاتا۔ اگر وہ سوالی کو کچھ دیتا نہیں تو کم از کم اس سے اچھی بات کرتا ہے اور اس کو اذیت نہیں دیتا۔ اللہ بے نیاز ہے، غنی ہے اور غناء فقر کے خلاف ہے، خدا اتنا غنی ہے کہ ہر ایک کو نعمت وہی دیتا ہے لیکن وہ اس کو بڑا بنا کر پیش نہیں کرتا، خدا حلیم ہے یعنی جاہلوں کی جہالت کی بنیاد پر فوراً غضب نہیں کرتا، فوراً جفاکاروں کا مواخذہ نہیں کرتا، ان کی گرفت نہیں کرتا۔ خداوند متعال نے ان دو صفات کے ذریعے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر ایک کوئی سوالی اصرار کر رہا ہے اور

ایک دفعہ آپ نے اسے کچھ دیا ہے اور وہ پھر مانگتا ہے تو اس کو تکلیف نہ دو اس کو ڈانٹو نہیں اس کو اذیت نہ دو، اس سے پیار سے پیش آؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

"اے ایمان والو! احسان جتا کر اور ایذا دے کے اپنی خیرات کو ضائع نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتا، سو اس کی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اس پر کچھ مٹی پڑی ہو پھر اس پر زور کا مینہ برسا اور اس کو بالکل صاف کر دیا، ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا ہاتھ بھی نہ لگے گی، اور اللہ کافروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا"۔

احسان جتانے سے خیرات کا ضائع ہو جانا

اس آیت میں مومنوں سے کہا گیا ہے کہ دیکھیں آپ جب خیرات کرتے ہیں تو خیرات کرنے کے بعد، صدقات دینے کے بعد، انفاق اور خرچ کرنے کے بعد غریبوں اور مسکینوں پر احسان مت جتاؤ، انہیں اذیت نہ دو، ان کو طعنے مت دو کہ ہم نے تمہاری مدد کی ہے ہم نے تمہیں یہ دیا اور وہ دیا۔ اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ جو لوگوں میں بڑا بننے اور دکھاوے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے تو ایسے شخص کا اللہ پر ایمان ہی نہیں ہے، ریاکار مومن

نہیں ہو سکتا۔ جب خرچ کیا گیا مال اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے نہیں تو ایسے شخص کا قیامت پر ایمان نہیں ہے جب قیامت پر ایمان نہیں ہے تو شروع سے ہی اس کا کام خراب ہے۔ جو شخص منت چڑھاتا ہے، اذیت دیتا ہے تو وہ اہل ایمان ہونے کے باوجود اپنے عمل کو باطل کرتا ہے۔ ریاکار اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کا خدا پر ایمان نہیں ہے، قیامت پر ایمان نہیں ہے کیونکہ اگر قیامت اور خدا پر ایمان ہوتا تو وہ احسان نہ جتاتا کیونکہ سب کچھ تو اللہ کا دیا ہوا ہے تو اللہ کی راہ میں دے رہا ہے تو اللہ نے ہی اجر دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کیا گیا مال دُنیا میں بھی مال کے بڑھنے کا ذریعہ بنتا ہے اور آخرت میں بھی۔ لہٰذا اگر کوئی ریاکاری کے لیے اپنے مال کو خرچ کرتا ہے تو اس کا عمل باطل ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے کہ ایک سخت سیاہ پتھر جس کے اوپر خاک اور مٹی چڑھی ہوئی ہے جب موسلا دھار تیز بارش آتی ہے تو مٹی ہٹ جاتی ہے تو اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا حالانکہ بارش تو زندگی لاتی ہے اور مٹی سے سبزہ اُگاتی ہے، زمین کو شاداب کرتی ہے، نباتات اگاتی ہے لیکن یہاں پر تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ ریاکار شخص کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا، اس نے مال تو خرچ کیا ہے۔ لیکن جب حساب ہوگا تو پتا چلے گا اس کا مال تو ضائع ہو گیا ہے۔ وہ احسان جتا کر اپنا سارا عمل اور ایمان گنوا بیٹھا ہے۔ ریاکار کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا کہ جن کی خوشنودی کے لیے تم نے یہ سارا کچھ کیا تھا جاؤ اس کا بدلہ بھی ان سے لے لو، میرے لیے تو کیا نہیں تھا مجھ سے کیا بدلہ لیتے ہو؟ اس طرح ریاکاروں نے جو کچھ بھی کیا تھا اس کا کچھ بھی بدلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کافروں کی ہدایت اس لیے نہیں کرتا کیونکہ اُن کا عمل خالص نیت سے نہیں ہے۔ کفار کی طرح ریاکار کا عمل بھی رحمت اور کرامت الٰہی قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس کی مثال اس سخت پتھر کی ہے جس میں پانی جذب کرنے کی استعداد ہی نہیں ہے

کہ وہاں سے کوئی شئے نکلے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ ایسے اشخاص کے دلوں سے آگاہ ہے، اس لیے وہ ایسوں کو ہدایت نہیں دیتا اور یہ کافر ہیں جو ہدایت نہیں پا سکتے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵

"اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کو مضبوط کرکے خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جس طرح بلند زمین پر ایک باغ ہو اس پر زور کا مینہ برسا تو وہ باغ اپنا پھل دوگنا لایا، اور اگر اس پر مینہ نہ برسا تو شبنم ہی اس کے لیے کافی ہے، اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھنے والا ہے"۔

رضائے الٰہی کیلئے خرچ کرنیوالوں کی مثال

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن کا تذکرہ کیا ہے جو اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے ہیں، دکھاوے کے لیے نہیں خرچ کرتے، نام و نمود کے لیے نہیں، منت نہیں چڑھاتے۔ اپنے آپ کو اللہ کے حضور موجود پاتے ہوئے، اللہ کے اوامر کو اس کی خوشنودی اور اس کی رضایت کے لیے بجا لاتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی نیت خالص رہے، اس میں کوئی ملاوٹ نہ آئے۔ ان کی مثال اچھی زرخیز زمین کی ہے جس میں بہت زیادہ نباتات اُگتے ہیں۔

اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ جو انفاق اللہ کے لیے ہوتا ہے اور خالص نیت کے ساتھ ہوتا ہے اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہیں ملایا جاتا ہے تو وہ ہرگز بے ثمر اور بے اثر نہیں ہوتا، جس طرح زرخیز زمین پر بہت زیادہ بارش آئے یا تھوڑی بارش آئے ہر صورت اس نے پھل دینا ہوتا ہے۔ عمل صالح جو اللہ کی خاطر انجام دیا گیا ہو اس کا اثر ہرگز ختم نہیں

ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی کے مراتب میں نیتوں کے مراتب کے تحت فرق ہوتا ہے اس لیے وہ ان کے مطابق اُن کے اعمال کا بدلہ دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے حالات سے بینا ہے اور اس پر کچھ بھی مشتبہ نہیں ہوتا۔ زرخیز زمین کی مثال دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ جو صدقہ اللہ کے لیے دیتا ہے تو اس کا اثر کبھی بھی زائل نہیں ہوتا، تھوڑا دے یا زیادہ دے اس کا اثر باقی رہتا ہے۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ تَکُوۡنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ لَہٗ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَہُ الۡکِبَرُ وَ لَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۪ۖ فَاَصَابَہَاۤ اِعۡصَارٌ فِیۡہِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۶۶﴾

"کیا تم میں کسی کو یہ بات پسند آتی ہے کہ اس کا ایک باغ کھجور اور ایک باغ انگور کا ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اسے اس باغ میں اور بھی ہر طرح کا میوہ حاصل ہو، اور اس پر بڑھاپا آ گیا ہو اور اس کی اولاد ضعیف ہو، تب اس باغ پر ایک بگولہ آ پڑا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل گیا، اللہ تمہیں اس طرح نشانیاں سمجھاتا ہے تاکہ تم سوچا کرو"۔

انسان کی طبیعت کا تقاضا

انسان کی طبیعت اور اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ چاہتا اور پسند کرتا ہے۔ ''وُدّ'' دوست رکھنے کے معنی میں ہے۔ ''جَنَّۃٌ'' بہت زیادہ گھنے درختوں والے باغ کو کہتے ہیں۔ جنت چھپانے کے معنی میں بھی ہے، باغ کو اس لیے جنت کہتے ہیں کیونکہ اس کے درختوں کا سایہ

زمین کو سورج کی گرمی سے بچاتا ہے۔ ''نَّخِيۡلٍ وَّ اَعۡنَابٍ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس باغ کے اکثر درخت کھجور اور انگور کے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس باغ میں ان دو درختوں کے علاوہ دوسرے درخت نہیں ہیں۔ ان درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں یعنی سارا باغ اس پانی کی وجہ سے سرسبز اور آباد ہے۔

یہاں پر ایک سوال ہے کہ ایسا باغ جو درختوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں پانی کی بھی فراوانی ہے، ہر قسم کا پھل اس میں ہے اور پھل دے بھی رہا ہے، اس باغ کا لگانے والا اس کو دیکھ کر بڑا خوشحال رہتا ہے، اب وہ بوڑھا ہو گیا اور اس کی اولاد ابھی چھوٹی ہے۔ باغ کے مالک کے بڑھاپے اور کمزور بچوں کو اکٹھا کرکے اس بات کو سمجھایا گیا ہے کہ اُن کو اس باغ کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں تاکہ چھوٹے بچوں کی معیشت کو پورا کر سکیں ۔ اس کے علاوہ اُن کے لیے معیشت اور روزگار کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب اگر اس باغ کو آگ لگ جائے اور اس کے سارے اسباب ختم ہو جائیں۔ نہ تو باغ کے مالک کی جوانی رہی تاکہ اس کی تلافی کرسکے اور دوبارہ درخت لگائے اور نہ ہی اس کی اولاد جوان ہے اور ان میں طاقت ہے۔ جو اس کا ہاتھ بٹا سکیں اور نہ ہی یہ اُمید ہے کہ دوبارہ یہ باغ سرسبز ہو گا۔

یہ اُن لوگوں کی مثال ہے جو خرچ کرنے کے بعد منت چڑھاتے ہیں، اذیت دیتے ہیں۔ اُن کا عمل اس کے نتیجے میں مکمل طور پر ضائع ہو جاتا ہے اور پھر اس کے دوبارہ واپس آنے کی کوئی اُمید بھی نہیں ہے۔ تو اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تم خرچ کرکے ایسی نیت نہ کرو، دکھاوا نہ کرو، منت نہ چڑھاؤ، احسان نہ جتاؤ، غریبوں کو کچھ دے کر ان پر طعنے نہ دو۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے فائدے اور نقصان کو سمجھ سکو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو اگر تھوڑا سا سوچو اور بصیرت رکھو تو پھر احسان کرکے اسے جتلاؤ گے نہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

"اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے ستھری چیزیں خرچ کرو اور اس چیز میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہے، اور اس میں سے ردی چیز کا ارادہ نہ کرو کہ اس کو خرچ کرو حالانکہ تم اسے کبھی نہ لو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ، اور سمجھ لو کہ بے شک اللہ بے پروا تعریف کیا ہوا ہے"۔

اللہ کی راہ میں بہترین مال خرچ کرو

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے صاحبان ایمان کو متوجہ کیا ہے کہ جو کچھ تمہیں ملا ہے، یا جس چیز کو تم نے حاصل کیا ہے جس کو تم پسند کرتے ہو جو تمہیں اچھا لگتا ہے اسی سے تم خرچ کرو نہ کہ وہ جس کو تم اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتے اس کو آگے دے دو۔ جو چیز پست ہے اور جو تمہیں اچھی نہیں لگ رہی اس کو راہ خدا میں دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اپنے بہترین مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ جس چیز کو تم خود اپنے لیے لینا پسند نہیں کرتے اسے آنکھ بند کر کے آگے خرچ نہ کرو۔ بے اہمیت اور پست چیز دوسروں کو دینا حقیقت میں اس کے شر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا ایسے انفاق کا انسان کے کمال میں کوئی اثر نہیں ہے۔ خداوند تو بے نیاز ہے وہ بے نیاز ہونے کے باوجود خرچ کیے گئے اچھے مال کی تعریف کرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔ ایسے خدا کے ساتھ ایسی رفتار صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ اس کی عظمت اور جلالت کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گھٹیا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚ﴿۲۶۸﴾

''شیطان تمہیں تنگدستی کا وعدہ دیتا ہے اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے، اور اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے، اور اللہ بہت کشائش کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے''۔

شیطان کا تنگدستی کا وعدہ

اس آیت میں گھٹیا اور پست اور بے کار چیز کو اللہ کی راہ میں انفاق کرنے کی وجہ بتائی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان خرچ کرنے والے سے کہتا ہے کہ اچھا مال دوگے تو تم فقیر ہو جاؤگے اور وہ اس کی بات مان لیتا ہے لہٰذا وہ جو گھٹیا مال ہے اسے آگے دیتا ہے جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ انسان پر بخشش کرتا ہے اور اپنی مغفرت، فضل، کرم سے اسے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ خدا سبحانہ و تعالیٰ کے پاس ساری قدرت ہے، اس انسان کا گھٹیا مال اور اس کی ثروت اس کو کچھ نہیں دے سکتی۔ جو لوگ اپنے مال میں سے گھٹیا اور پست چیز اللہ کی راہ میں دیتے ہیں تو اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ شیطان اپنے پیروکاروں اور اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے کہ خرچ کرنے سے ان کا مال ختم ہو جائے گا لیکن شیطان باطل کے سوا کوئی بھی امر نہیں کرتا، وہ خود بھی باطل پرست ہے اور اللہ کی نافرمانی پر کاربند ہے اور دوسروں کو بھی اسی پر آمادہ کرتا ہے۔ اللہ وسعت دینے والا ہے۔ وہ اپنی قدرت سے اپنے بندے سے کئے گئے مغفرت اور زیادہ عطا کرنے کے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ اللہ ہر چیز سے آگاہ بھی ہے ہر حالت اس کے سامنے ہے، کچھ بھی اس کے لیے پنہاں اور پوشیدہ نہیں ہے۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

"(اللہ) جس کو چاہتا ہے سمجھ دے دیتا ہے، اور جسے سمجھ دی گئی تو اسے بڑی خوبی ملی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں"۔

حکمت، خیر کثیر ہے

حکمت ایک طرح کی مضبوطی اور کسی امر کے اس طرح محکم اور مستحکم ہونے کو کہتے ہیں جس میں کوئی کمزوری نہ ہو، بطلان اور جھوٹ نہ ہو۔ عام طور پر عقلی معلومات جو حق اور سچ ہوتی ہیں ان پر حکمت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ حکمت سے دانائی بھی مراد لی جاتی ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو حکمت دی ہے تو گویا اسے بہت زیادہ خیر دے دی ہے۔ انسان حکمت کے ذریعے اپنے تمام امور اور معاملات کو صحیح جگہ پر قرار دے سکتا ہے اور صحیح فیصلے کر سکتا ہے، بصیرت کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے، اپنے لیے کمال کے راستہ کا چناؤ کر سکتا ہے اور برائی سے دوری اختیار کر سکتا ہے۔ وہ حکمت ہی کے ذریعے طے شدہ حدود کو پھلانگنے سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ گمراہی اور حکمت و دانائی ایک ساتھ اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا حکمت خیر کثیر ہے اور اس کا خیر ہونا اللہ کی عنایت ہے اور اللہ کی دی ہوئی توفیق ہے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ یعنی صاحبان عقل ہی متذکر ہوتے ہیں۔ "لُب" مغز کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ جب انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد عقل ہوتی ہے کیونکہ انسان کی عقل، اخروٹ کے مغز کی مانند ہے جو چھلکے کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ "تذکر" مقدمات سے نتیجے کی طرف منتقل ہونا یا نتیجے سے مقدمات کی طرف منتقل ہو جانے کے معنی میں ہے۔ لہٰذا حکمت کا حصول، تذکر پر موقوف ہے اور تذکر عقل پر موقوف ہے،

جس میں عقل نہیں ہے تو وہ حکمت سے بے بہرہ ہے، صاحب عقل ہی حکمت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

''اور جو تم خیرات کے طور پر خرچ کروگے یا تم کوئی منت مانگوگے تو بے شک اللہ کو سب معلوم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''۔

انفاق کے متعلق اللہ کا علم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ تم اپنے مال سے جو کچھ خرچ کرتے ہو یا اس کے خرچ کرنے کی دعوت دیتے ہو یا نذر کرکے اسے اپنے اوپر واجب کرلیتے ہو کہ اللہ کی راہ میں دوگے تو اللہ اس سے آگاہ ہے۔ اور جو بھی اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اللہ اس کو اجر دیتا ہے اور جو ظلم اور زیادتی کرتا ہے تو اس کی گرفت کی جاتی ہے۔ ظالموں کا کوئی یاور نہیں ہے۔آیت کا یہ حصہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ فقراء پر مال خرچ نہ کرنا ظلم اور گناہ کبیرہ ہے جس کا کوئی کفارہ بھی نہیں ہے کیونکہ یہ حقوق الناس سے ہے اور حقوق الناس میں جب تک جن کا حق دبایا گیا ہے ان کا حق ان کو واپس نہ کیا جائے، توبہ بھی قبول نہیں ہے۔ شفاعت بھی ان کے حق میں قبول نہیں ہوگی۔ اس حوالے سے سورہ مدثر کی آیت ۴۳ سے ۴۸ تک میں بیان ہوا ہے کہ جب مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ کون سی چیز تمہیں جہنم میں کھینچ کر لے آئی تو وہ کہیں گے ہم نمازی نہیں تھے اور ہم مسکینوں کو کھانا نہیں دیتے تھے، ایسے لوگوں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہیں دے گی۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ یُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

''اگر تم خیرات ظاہر کرکے دو تو بھی اچھی بات ہے، اور اگر اسے چھپا کر دو اور فقیروں کو پہنچا دو تو تمہارے حق میں وہ بہتر ہے، اور اللہ تمہارے کچھ گناہ دور کر دے گا، اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبر رکھنے والا ہے''۔

ظاہری اور مخفی صدقات

صدقات، اللہ کی راہ میں مطلق انفاق کو کہتے ہیں، اس کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔ اس کا اظہار یعنی ظاہر کر کے اور دکھا کر صدقہ دینا، گویا کہ نیک عمل کی طرف دوسروں کو دعوت دینا ہے۔ اس طرح کا صدقہ دینا دوسروں کی تشویق کا سبب اور فقراء کی حوصلہ افزائی کا سبب اور سوسائٹی کی حفاظت کا باعث بنے گا۔ اور چھپا کر صدقہ دینے کا یہ حُسن ہے کہ اس سے انسان ریا سے بچ جاتا ہے، منت اور اذیت سے بھی دُور رہتا ہے، فقیر کی آبرو محفوظ رہتی ہے اور اس میں ذلت اور خفت کا عنصر نہیں ہوتا، صدقہ لینے والے کی حیثیت داغدار نہیں ہوتی، پس چھپا کر صدقہ دینا خالص تر اور پاک تر ہے اور اس طرح دئے گئے صدقے کے نتائج زیادہ ہیں کیونکہ دین کی بنیاد اخلاص پر ہے، البتہ ظاہری صدقے کے نتائج زیادہ ہیں۔ اس سب کے باوجود اللہ تعالیٰ نے پوشیدہ صدقے کو ظاہری صدقے پر ترجیح دی ہے۔ مومن اعلان کرکے صدقہ دیتا ہے تو اس میں بھی خلوص ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کیونکہ وہ راہ خدا میں دئے گیے صدقہ پر منت اور احسان نہیں چڑھاتا، اس لیے اس کے علنی صدقے کا ثواب اور اس کی جزا یہ ہے کہ اس کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے اعمال سے باخبر

ہے اور وہ انسان کے عمل خیر کو عمل شر سے جدا اور علیحدہ کرتا ہے اس میں کوئی اشتباہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ باطن سے بھی آگاہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

”انہیں راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں اور لیکن اللہ جسے چاہے راہ پر لاتا ہے، اور جو مال تم خرچ کروگے اس کا نفع تمہاری جان کے لیے ہے، اور اللہ ہی کی رضامندی کے لیے خرچ کرو، اور جو اچھی چیز تم خرچ کروگے اس کا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا“۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا انعام

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ یہ جو آپ دیکھتے ہو لوگ انفاق کرنے کے مسئلے میں مختلف ہیں، کچھ منت اور اذیت کے بغیر خرچ کرتے ہیں تو اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی وہ ہدایت ہے جو ان کے دلوں میں ایمان مستقر ہونے کی وجہ سے ان کو ملی ہے۔ اور جو لوگ انفاق کرنے میں سستی کرتے ہیں اور احسان چڑھاتے ہیں، اذیت دیتے ہیں تو آپ کو ان کے متعلق مغموم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ لوگ اپنے کئے کا نتیجہ پائیں گے۔ اور جو خالص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ہر عیب سے پاک و منزہ جانتے ہیں تو ان کو اس کا فائدہ ملے گا، یہ وہی ہیں جنہوں نے تیری دعوت کو قبول بھی کیا ہے تو انہوں نے جو کچھ خرچ کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ انہیں ملے گا۔ وہ یہ خیال نہ کریں کہ انفاق کا کوئی فائدہ انفاق کرنے کی دعوت

دینے والے کو مل رہا ہے، نہیں! ایسا بالکل نہیں ہے، وہ ذات کسی بھی نیاز مندی اور ضرورت مندی سے پاک اور منزہ ہے۔ انفاق کرنے کا فائدہ خود انفاق کرنے والے کو ہی ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہو گی، دُنیا و آخرت میں فائدہ ان ہی کو نصیب ہونا ہے، البتہ ان کا اُخروی ثواب زیادہ ہے اور یہ ایک حقیقی امر ہے، خداوند تبارک و تعالیٰ بغیر کم و کاست ان کا اجر و ثواب ان کو دے گا اور وہ اپنے انفاق کا نتیجہ پائیں گے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

"خیرات ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں رکے ہوئے ہیں ملک میں چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے سوال نہ کرنے سے انہیں مال دار سمجھتا ہے، تو ان کے چہرے سے پہچان سکتا ہے، لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے، اور جو کام کی چیز تم خرچ کرو گے بے شک وہ اللہ کو معلوم ہے"۔

خیرات کے مستحق افراد

اس آیت کا شان نزول وہ مہاجرین ہیں جو مکہ سے اپنے عیال اور مال چھوڑ کر مدینہ آ گئے اور وہیں پر ٹھہر گئے اور خود کو راہ خدا میں جہاد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ مکہ میں کام کاج بھی نہیں کر سکتے تھے اور تجارت کے لیے سفر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ یہ آیت ان تمام افراد کو بھی شامل ہے جن کے لیے اس طرح کے حالات پیش آ جائیں۔ ان کی خودداری اور ان

کی طبع اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے فقر کو ظاہر کریں لیکن ان کی حالت اور ان کے ظاہر سے ان کا فقر معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان کے چہروں کی رنگت سے ان کو پہچان سکتے ہو، وہ تو نہیں کہیں گے کہ ہم فقیر ہیں اور لوگوں سے گڑگڑا کر سوال بھی نہیں کرتے۔ مومن فقراء دوسروں کے سامنے گدائی کے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور نہ ہی وہ دوسروں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ دے دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کروگے تو خدا اسے خوب جانتا ہے۔ اس سے پوشیدہ انفاق کی تاکید کی گئی ہے کہ انفاق چھپا کر کیا جائے تاکہ جس کو دیا ہے اس کی پیشانی پر شرمندگی کے آثار نہ آئیں، کیونکہ خدا تو پوشیدہ انفاق سے بھی آگاہ ہے اور اس کے ہاں کوئی عمل ضائع و باطل نہیں ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں رات اور دن چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے اپنے رب کے ہاں ثواب ہے، ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

اللہ کی راہ میں ظاہری اور پوشیدہ انفاق

یعنی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کے رب کے ہاں انعام اور ثواب ہے، ان کے لیے کوئی خوف، ڈر اور غم نہیں ہے اور ان کا عمل اللہ کے ہاں بغیر کسی کمی کے محفوظ ہے اور اللہ ان کو پورا پورا اجر دے گا اور اللہ نے بڑا اجر دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور ان کو کوئی غم نہیں پہنچے گا اور اللہ کی رضا اور خوشنودی ان کو ملے گی۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

''جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے دن وہ نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح کہ وہ شخص اٹھتا ہے جس کے حواس جن نے لپٹ کر کھو دیے ہیں، یہ حالت ان کی اس لیے ہو گی کہ انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے، پھر جسے اپنے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے لے چکا ہے وہ اسی کا رہا، اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو کوئی پھر سود لے وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

سود کی حرمت اور اس کے خطرناک نتائج

اس آیت میں سود کی حرمت اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف اشارہ ہے۔'' خبط'' ٹیڑھا پن اور توازن کھو بیٹھنے کے معنی میں ہے۔ عام انسان میں فطری طور پر یہ قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ خیر اور شر میں تمیز دے سکتا ہے اور زندگی کا صحیح راستہ طے کر سکتا ہے۔ لیکن جس انسان پر شیطان غالب آجاتا ہے اور سود کھانے لگتا ہے تو اس کی شر اور خیر میں جدائی ڈالنے، اچھائی اور برائی کو علیحدہ کرنے اور نفع اور نقصان کو علیحدہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو

جاتی ہے۔ رباخور بالکل اسی طرح ہے کیونکہ اس نے مقروض شخص کے مال سے مال چوری کیا ہے۔ اس طرح کہ جو چیز اس نے قرضے میں دوسرے شخص کو دی تھی اس کے بدلے میں اس سے زیادہ لیتا ہے اور اپنے مال کو مقروض کے مال سے بڑھاوا دیتا ہے۔ اس طرح قرض لینے والے کو کنگال کرتا ہے لہٰذا سود اجتماعی توازن کو ختم کرتا ہے اور انسانی فطرت کے بھی برعکس ہے۔

انسانی فطرت کہتی ہے کہ اگر کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ ہے تو اسے بلامعاوضہ حاجت مندوں کو دے نہ یہ کہ حاجت مند کو دے کر اس سے زیادہ لے۔ ربا خوروں کی دلیل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں بھئی سود بھی خرید وفروخت کی طرح ہے یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ خرید و فروخت اور ربوی معاملے میں بڑا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت حلال کی ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

''وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' اس جملے کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے متعلق خبر دی ہے جو پہلے بیان ہوا ہے اور اس کے لیے مقدمہ ہے جو بعد میں آرہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت آئے اور وہ اسے قبول کرلے تو یہ اس کے گناہان کا کفارہ ہوگا۔ جو بھی گناہ سے ہاتھ اُٹھالیتا ہے اور توبہ کرلیتا ہے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔

اس بنا پر سود خوری کی حرمت کے قانون سے پہلے جو اس گناہ کے مرتکب ہو چکے تھے تو اب یہ گناہ ان پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ کہا ہے کہ آئندہ ایسا عمل انجام نہ دیں تو سابقہ گناہوں کی تلافی ہوگی، لیکن اگر واپس پلٹ جائیں اور سود خور بن جائیں اور جس برے عمل کو چھوڑا ہے اس کو دوبارہ شروع کردیں اور اللہ کے فیصلے کو نہ مانیں تو یہ کفر باطنی ہے۔ اگرچہ زبان سے کفر کا اعلان نہ کرے، مرتد ہونے کا اعلان نہ کرے لیکن ایسا شخص کامیاب نہیں ہو سکتا یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آتش جہنم میں جلے گا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

"اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا"۔

سود اور صدقات کا تقابل

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ سود خور کا مال بڑھتا نہیں ہے وہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس سے قساوت قلبی آتی ہے اور دل سخت ہو جاتے ہیں، اسے خسارت ہوتی ہے، بغض، دشمنی، بدگمانی آجاتی ہے اور امنیت ختم ہو جاتی ہے اور دوسروں میں ربا خور کے خلاف انتقام کا جذبہ بڑھتا ہے۔ معاشرے میں اس کا مقام گر جاتا ہے اور فساد اور تباہی کے راستے کھلتے ہیں اور اس طرح اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے اور سود خور کی زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا ہم و غم مال اکٹھا کرنے پر ہوتا ہے جبکہ کچھ لوگ اس سے انتقام لینا چاہتے ہیں یہ ان کے مقابلے میں آتا ہے۔ روایت میں آیا ہے ایک درہم سود خوری کا گناہ ستر دفعہ ماں کے ساتھ زنا کے برابر ہے اور دوسری حدیث میں پیغمبر خدا ﷺ نے سود کھانے والا، سود کی وکالت کرنے والا، سود لکھنے والا، سود پر گواہ بننے والا سب پر لعنت فرمائی ہے اور سب کو اس گناہ میں برابر جانا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے سود کو دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سود خور کے لیے نقصان دہ قرار ہے۔ جبکہ صدقات مال کے بڑھنے اس میں نشو ونما پانے اور مال میں اضافے کا سبب بنتے ہے۔ صدقہ دینے سے دُنیا میں بھی مال بڑھتا ہے اور آخرت کے اجر و پاداش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ صدقہ دینے سے لوگوں کے دلوں میں صدقہ دینے والی کی محبت پیدا ہو جاتی

ہے، اس سے حسن معاشرت پیدا ہوتا ہے۔ اور دل ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، امنیت عام ہوتی ہے، غضب، چوری، ڈاکہ، فساد ختم ہوتا ہے، وحدت اور ایک دوسرے کی مدد میں اضافہ ہوتا ہے، فساد کے راستے ختم ہوتے ہیں۔ فناء ہونے کے راستے بند ہوتے ہیں، دُنیوی مال میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

صدقہ اور ربا دونوں کا تعلق معاشرے کے محروم اور محتاج طبقے کے ساتھ ہے کیونکہ زندگی کی ضروری احتیاجات سبب ہوتی ہیں کہ انسان اپنے حقوق کے دفاع کے درپے ہو، اگر ان پر احسان کروگے صدقہ دوگے تو اس کا ثمر ملے گا، اگر ان کے حق میں بدی کروگے سختی کروگے، سودی رویہ اپناؤگے تو یہ برائی انسانی معاشرے میں ظاہر ہو گی اور اس کے خطرناک ثمرات ہوں گے۔ اللہ تعالی کسی کافر کو بخشتا نہیں ہے، جس کا کفر بہت سخت ہے جو اللہ کی نعمات کا کفران کرتا ہے اور فطری راستے جو انسان کی زندگی کے لیے ہیں اور جو سارے معاملات اور کاروبار معمول کے مطابق ہیں جو ان راستوں کو بند کرتا ہے اور اللہ کے احکام جو عبادات کے بارے میں اور کاروبار کے بارے میں ہیں ان کا انکار کرتا ہے اور اللہ کے اس حکم جس میں اس نے سود کو حرام قرار دیا ہے، اسے اپنی زندگی میں لاگو کرتا ہے تو ایسا شخص گناہگار ہے، یہ گناہ اس کے نفس میں جگہ بنا چکا ہے، خدا ایسے بندے کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور نماز کو قائم رکھا اور زکوۃ دیتے رہے تو ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے اور ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

خدا پر ایمان اور نیک اعمال کا صلہ

یہ جملہ صدقہ دینے والوں کے عمل کا اور اس کے ثواب کا تجزیہ ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سودی کاروبار سے روکنے پر سود سے ہاتھ کھینچ لیا تو ان کا عقیدہ اچھا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اپنے ذمہ فرائض کو قبول کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، ان کا ایمان پختہ ہے اسی لیے وہ فرایض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کرتے ۔ ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان کو کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کو پورا پورا اجر دینے کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر ایمان و عقیدے کی روشنی میں نیک اعمال بجالائے تو انکے لیے بڑا اجر ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ ذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ باقی سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو"۔

تقویٰ کا حکم

اس آیت میں مومنین کو تقویٰ اختیار کرنے کا ایک طریقہ بتایا گیا ہے کہ جو تمہارے مقروض تھے جن کو تم نے مال دیا تھا اور ان سے سود واپس لینا تھا اگر تم مومن ہو تو ان سے باقی سود نہ لو بلکہ اسے چھوڑ دو اور خداوند تبارک وتعالیٰ نے تمہیں جس چیز کا حکم دیا ہے اس پر کاربند رہو کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے حکم کو مانو اور سود مت لو۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾

''اگر تم نے نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے، اور اگر توبہ کرلو تو اصل مال جو تمہارا ہے تو وہ تمہارے واسطے ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا''۔

سودی معاملہ اللہ اور پیغمبرؐ سے اعلان جنگ

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بڑا واضح حکم دے دیا ہے اور سود لینے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر ایسا کروگے تو گویا تم نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا اعلان کیا ہے۔ خدا نے شریعت بھیجی ہے، مومنوں کو خبر دار کیا ہے اور رسول نے مومنوں تک پیغام پہنچا دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس پر عمل نہیں کروگے تو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ساتھ جنگ ہو گی اور جو بھی ان احکام کو قبول نہیں کرتا گویا وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے جنگ کرتا ہے۔ سود کا معنی بھی یہی ہے، اللہ نے سود سے روکا ہے اور جو بھی اللہ کے احکام کے سامنے سر خم نہ کرے تو گویا اس نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف عمل کیا ہے اور دوسروں کو اس برے عمل پر اُبھارا ہے اور اپنا سکون برباد کیا ہے۔ سورہ اسراء کی آیت 16 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتا ہے اور وہ نافرمانی کرتے ہیں تب ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم اسے برباد کر دیتے ہیں''۔

اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ

بات یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی، اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ ہے۔ البتہ یہاں بتادیا گیا ہے کہ جو غلطی کے بعد توبہ کرلیتا ہے تو نہ اس پر ظلم ہوگا اور نہ ہی وہ کسی پر ظلم کرے گا۔ یہ جملہ پچھلی بات کی تائید ہے کہ حرمت کے حکم کے آنے کے بعد اگر مومنین توبہ کرلیں تو ان کا اصل سرمایہ انہیں واپس ملے گا لیکن جن سے سود لینا تھا ان سے سود نہیں لیں گے اور سود لے کر جو ظلم کر رہے تھے اب نہیں کریں گے لیکن اصل پیسے تمہیں واپس ملیں گے، اس طرح نہ تم ظلم کروگے کہ اصل سرمایہ سے زیادہ واپس لو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا کہ اصل سرمایہ کو بھی گنوا بیٹھو۔ یہاں پر اصل مال کی مالکیت کی تائید کی گئی ہے، اسی طرح اس بات کی بھی تائید کی گئی ہے کہ کمانے اور کاروبار کی تمام اقسام جائز ہیں اور راس المال بنیادی سرمایہ کہلاتا ہے البتہ قرض دے کر اس پر سود لینا اور بغیر کسی محنت کے مال کمانا جائز نہیں ہے۔

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

''اور اگر وہ تنگ دست ہے تو آسودہ حالی تک مہلت دینی چاہیے، اور بخش دو تو تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو''۔

تنگ دست کو مہلت دینا

''مَيْسَرَةٍ'' مالدار ہونے کو کہتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ''عسر'' کا لفظ ہے جو فقر اور تنگدستی کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں قرض لینے والے کی بات ہو رہی ہے، جس کو قرض دیا گیا ہے اگر وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ قرض واپس دے سکے اور مقررہ

مدت ختم ہو گئی ہے اور قرض دینے والا قرض کا مطالبہ کر رہا ہے لیکن مقروض قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور وہ مدت بڑھانے کی درخواست کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ اس کو مہلت دے دی جائے۔ اور ساتھ قرض دینے والے کو یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اس کے فقر اور تنگدستی کی وجہ سے اس کا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے کیونکہ اس سے وہ نابود ہونے سے بچ جائے گا اور تمہارے لیے صدقہ ہے جو باقی رہے گا اور ہمیشہ کی جنت کا ذریعہ بنے گا۔

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾

''اور اس دن سے ڈرو جس دن اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا''۔

قیامت کے دن سے ڈرو

یہ آیت قیامت کو یاد دلا رہی ہے۔ اس کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ اپنے آپ کو قیامت کے عذاب سے بچاو اور تقویٰ اختیار کرو اور اس دن کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرو اور حرام سے خود کو بچاو اور جو دوسروں کے حقوق اللہ نے بیان کئے ہیں ان حقوق کو ادا کرو کیونکہ زمین پر انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ بھی رکھیں اور ادا بھی کریں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ جو کچھ تم دنیا میں انجام دیتے ہو قیامت کے دن بغیر کسی کمی کے اس کی جزا دی جائے گی۔

پچھلی ساری آیات بتا رہی ہیں کہ سود خور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ میں ہوتا ہے اور سود خور کی توبہ بھی قبول نہیں ہے مگر یہ کہ جو سود لیا ہے اس کو واپس کر دے۔ خداوند متعال نے اس آیت میں کاروبار اور قرض دینے میں تقویٰ کی ہدایت فرمائی

ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے پاس سب نے پلٹ کر جانا ہے، وہاں سب کا حساب ہونا ہے اور جیسا عمل کیا ہے ویسا ہی بدلہ ملنا ہے۔آیت میں طلب گار کو اللہ کے حکم کی تعمیل کرنے اور اللہ کی رضا کے لیے مقروض کو مہلت دینے اور اس سے سود نہ لینے کی تشویق کی گئی ہے۔آیت ہمدردی کی حس کو ابھار رہی ہیں، مہربانی کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ سارے انسان ایک جسم کا حصہ ہیں اس لیے اُن کو چاہیے کہ آپس کی دشمنیوں کو جڑ سے اکھاڑ دیں، بغض اور نفرت کو دور کردیں اور ہر وہ چیز جو اسلامی سوسائٹی کی بنیاد کو درہم برہم کرے اس سے منع کیا گیا ہے، اسلام کی روح اور جان اس میں ہے کہ سب ایک دوسرے کا لحاظ کریں ایک دوسرے کی مدد کریں اور ظلم و زیادتی نہ کریں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْیَكْتُبْ بَّیْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا یَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ یَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْیَكْتُبْ ۚ وَ لْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ وَ لْیَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْهُ شَیْــٴًـا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْــٴَـمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَایَعْتُمْ ۪ وَ لَا یُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِیْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ یُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾

"اے ایمان والو! جب تم کسی وقتِ مقرر تک آپس میں ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف سے لکھے، اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اس کو اللہ نے سکھایا ہے، سو اسے چاہیے کہ لکھ

دے، اور وہ شخص بتلاتا جائے کہ جس پر قرض ہے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اس میں کچھ کم کرکے نہ لکھائے، پھر اگر وہ شخص کہ جس پر قرض ہے بے وقوف ہے یا کمزور ہے یا وہ بتلا نہیں سکتا تو اس کا کارکن ٹھیک طور پر لکھوا دے، اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ کر لیا کرو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو تاکہ اگر ایک ان میں سے بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو انکار نہ کریں، اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی معیاد تک لکھنے میں سستی نہ کرو، یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک انصاف کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم کسی شبہ میں نہ پڑو، مگر یہ کہ (جب) تجارت ہاتھوں ہاتھ ہو جسے آپس میں لیتے دیتے ہو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو، اور جب آپس میں سودا کرو تو گواہ بنالو، اور لکھنے والے اور گواہ بنانے والے کو تکلیف نہ دی جائے، اور اگر تم نے تکلیف دی تو تمہیں گناہ ہوگا، اور اللہ سے ڈرو، اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

قرض لینے اور دینے کی سند لکھنے کا حکم

اس آیت میں مومنین کو اس چیز کا حکم دیا گیا ہے کہ جب کسی کو قرض دو یا کسی سے قرض لو تو اسے باقاعدہ لکھو تاکہ بعد میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ اس لیے قرض لینے اور دینے کی سند صحیح ہونی چاہیے۔ قرض کے متعلق یہ بڑا واضح حکم ہے جس میں لمبا چوڑا فلسفہ نہیں ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے۔ "املاء اور املال" دونوں کا معنی یہ ہے کہ کوئی کچھ کہے اور دوسرا اسے لکھے۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ قرض لینے والے کو چاہیے کہ وہ املاء کرے اور کاتب لکھے تاکہ حق کا اقرار ہو سکے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ املال؛ یہ اس لیے کہ جو قرض لے رہا ہے اس کے لیے یاد آوری ہو کہ قیامت کے دن اللہ کی طرف پلٹ جانا ہے اور حساب دینا ہے اور قرض دینے والے کے حقوق میں زیادتی نہ کرے، دیئے گئے مال سے کچھ کم نہ کرے اور اس مال کو ضائع نہ کرے۔ اب ایک صورت ہے کہ قرض لینے والا اگر چھوٹا یا کمزور ہو یا اپنے امور کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا تو اس صورت میں اس کا سرپرست صحیح املاء کروائے۔ اس میں کوئی غلطی نہ کرے اور دو مرد گواہ ہونے چاہئیں یا دو مرد نہ ملیں تو دو عورتیں اور ایک مرد ہوں۔

پھر گواہوں کے لیے تقویٰ اور نیکی کی سفارش کی گئی ہے۔ دو گواہوں کا فلسفہ بتایا گیا ہے کہ ایک بھول جائے تو دوسرا اس کو یاد دلائے۔ اور جب بھی گواہی طلب کرے تو گواہی دینے سے انکار نہ کرے۔ قرض کم مدت کے لیے ہو یا زیادہ مدت کے لیے ہو کوئی فرق نہیں ہے دونوں صورتوں میں لکھنا چاہیے۔ قرض کے متعلق لکھی ہوئی سند ہو تو اس کا فائدہ ہے۔ اس طرح گواہی مضبوط رہے گی شک بھی نہیں ہو گا اور لکھنے کی وجہ سے تم بھی مطمئن رہو گے اور کوئی تردید نہیں ہو گی اس نے قرض دیا ہے فلاں نے قرض لیا ہے۔ البتہ اگر نقد معاملہ ہو رہا ہو اور کوئی خرید و فروخت ہو رہی ہو تو اس صورت میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نقد معاملات میں آسانی کے لیے ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ آپس کے کاروبار میں کسی کو نقصان نہ پہنچے اور آپ کو بھی نقصان نہ ہو تو پھر یہ ہے کہ اس میں بھی آپ گواہ بنا لیں، البتہ یہ ہے کہ لکھنے والے کو اور گواہ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے کیونکہ ان کو نقصان پہنچاؤ گے تو ایک مفسدہ ہو گا اور حقوق ضائع ہوں گے، معاملات میں تقویٰ ضروری ہے، اللہ تمہیں یہ چیزیں تعلیم دیتا ہے۔

اللہ اپنی نعمتیں تمہیں بتا رہا ہے یہ اللہ کا تمہارے اوپر احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال و حرام کے مسائل بیان کر دیئے ہیں، تمہیں کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہیے ان سب کو بیان کیا ہے۔ لہٰذا اللہ کا شکر بجالاو اور اللہ کے حضور خاضع اور خاشع رہو۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو اس مطلب پر دلیل بنایا ہے کہ تقویٰ، تعلیم الٰہی کا وسیلہ ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ آیت اس مطلب کو بیان نہیں کر رہی ہے، اس آیت میں یہ جو نقطہ ذکر ہو رہا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو احکام اور شریعت کے قوانین تعلیم دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہی کو ہر بات کا علم ہے کسی اور کو تو علم نہیں ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ کون سی چیز بہتر ہے اور کون سی چیز بہتر نہیں ہے۔ یہ احکام اخلاقی کمالات سے ملے ہوئے ہیں اور احکام کے وضع کرنے اور قوانین بنانے کا ہدف یہ ہے کہ معاشرے کے جتنے افراد ہیں ان کے حقوق کی حفاظت ہو بغیر اس کے کہ کسی کو نقصان پہنچے اور یہ انسان کی فطرت کا تقاضا بھی ہے کہ ایک دوسرے پر چڑھائی نہ کریں، ایک دوسرے سے زیادتی نہ کریں۔

(ایک چیز جس پر اس آیت میں بہت توجہ دی گئی ہے یہ ہے کہ دین اسلام جزیرہ عربستان میں جس وقت آیا اس وقت بہت تھوڑے اور انگشت شمار لوگ لکھنا جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرض دیتے وقت املاء کرانے اور لکھنے کا حکم دیا ہے۔ قرض لینا، قرض دینا حتیٰ کہ آپس کے کاروبار کو لکھا کرو۔ یہ خود معاشرے کے حقوق کی حفاظت کے متعلق قرآن کریم کا اعجاز ہے)۔ [1]

---

[1] - (مترجم)

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰی سَفَرٍ وَّ لَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِی اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۳﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو گروی کو قبضہ میں دے دیا جائے، اور اگر ایک تم میں سے دوسرے پر اعتبار کرے تو چاہیے کہ وہ شخص امانت ادا کر دے جس پر اعتبار کیا گیا اور اپنے اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص اسے چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گناہگار ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے''۔

تحریری دستاویز نہ ہونے پر گروی کا حکم

سابقہ آیت میں اس صورت کا حکم بیان ہوا کہ جب قرض دینے اور لینے کے متعلق کوئی تحریر لکھنے والا موجود ہو۔ اب اس آیت میں اس صورت کا حکم بیان کیا جا رہا ہے کہ جب کوئی لکھنے والا موجود نہ ہو، سفر پر ہیں یا لکھنے کے لیے کوئی مل نہیں رہا تو اس صورت میں جو مال دے رہے ہو اس کے بدلے میں رہن لے لو۔ اور یہ ہے کہ اس صورت میں ایک دوسرے کو امین سمجھو اور امانت کے طور پر اسے دے دو اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور امانت کو واپس دو۔ اجتماعی معاملات اور تعلقات میں امانت بہت ہی اہمیت رکھتی ہے اس لیے کسی کی امانت ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ پھر گواہی دینے کے بارے میں مزید کہا کہ گواہی کو چھپانے والا دل سے گناہگار ہے اور لوگوں کو نہیں چاہیے کہ وہ جس چیز کو جانتے ہیں

اس کے متعلق گواہی نہ دیں۔ اس آیت اور اس سے پہلی آیات میں قرض، رہن اور کاروباری معاملات کے متعلق بیس قانون بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی تفصیل فقہی کتابوں میں قرض کی بحث میں درج ہے۔ قرض دینے اور لینے اور کاروبار و گواہی کے احکام ان ہی آیات سے متفرع ہوتے ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، اور اگر تم اپنے دل کی بات ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جس کو چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب کرے گا، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

اللہ پورے جہان کا مالک

اس آیت میں پہلی بات تو یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے جہان کا مالک علی الاطلاق ہے۔ یہ تمہید باندھی گئی ہے بعد والے جملے کے مضمون کے لیے۔ بعد والی آیت کا مضمون یہ ہے کہ انسان کے دل میں جو کچھ ہے چاہے اسے ظاہر کرے یا ظاہر نہ کرے، اللہ اس سے واقف ہے اور اللہ اس کا حساب بھی لے گا کیونکہ اللہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ جب آسمان و زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تو تم اسی زمین کا حصہ ہو، لہٰذا تم سب لوگ بھی اللہ کا ملک ہو اور تمہارے اعمال اور تمہاری نفسانی صلاحیتیں سمیت جو سبب بنتے ہیں افعال کے صدور کا چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں سب اللہ کی سلطنت اور ملکیت کے تحت ہیں۔ اس آیت میں چار چیزیں بیان ہوئی ہیں جو ایک دوسرے کے مقابلے میں ہیں۔ آسمان، نفس کے اعمال

مقابلے میں ہے، یعنی ایک طرف آسمان، دوسری طرف نفس کے اعمال اور اس کی اندرونی صفات ہیں اور یہ ایک جیسے ہیں۔ زمین، بدنی اعمال کے مقابلے میں ہے۔ ہر صورت میں اللہ تبارک و تعالیٰ سب حالات و خیالات اور ارادوں پر محیط ہے، اللہ کا ہی سب پر غلبہ ہے، جو نفس کے اندر آتا ہے جیسے ایمان ہے، کفر ہے، محبت ہے، بغض ہے، نفرت ہے۔ ان میں سے بعض عمل کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض ارادہ تک ہی محدود رہتے ہیں اور عمل میں تبدیل نہیں ہوتے، خدا کو سب کا علم ہے۔

نفسانی ملکات اور نفسانی حالات ہی فعل کے صادر ہونے کا سبب بنتے ہیں، اطاعت ہو یا معصیت؛ خداوند تبارک و تعالیٰ انسان کا اس حوالے سے احتساب کرے گا۔ اطاعت کا اجر ملے گا، معصیت کی سزا ملے گی۔ اللہ ہی ہے جس کو چاہے معافی دے دے جس کو چاہے عذاب دے، یہ اللہ کا ہی اختیار ہے یعنی مغفرت اور عذاب دونوں اللہ کے اختیار میں ہیں۔ لوگوں کے اعمال پر اللہ کا احاطہ ہے لہٰذا اسی کا اختیار ہے اور یہ جو کہا '' مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ '' اسے باطنی برے حالات اور بری صفات مراد ہیں اور '' وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾ '' یہ وجہ ہے اس آخری جملے کی، یعنی جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا ہر چیز پر احاطہ ہے تو وہی تمہارے اعمال کا احتساب کر سکتا ہے، تمہارے اعمال کا جائزہ لے سکتا ہے کسی اور کو اس کا حق نہیں ہے کیونکہ کسی اور میں یہ طاقت ہے ہی نہیں کہ بندوں کے تمام اعمال پر اس کا احاط ہو۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ٭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾

''رسول نے مان لیا جو کچھ اس پر اس کے رب کی طرف سے اترا ہے اور مسلمانوں نے بھی مان لیا، سب نے اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس

کے رسولوں کو مان لیا ہے، (کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور مان لیا، اے ہمارے رب تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے"۔

رسولؐ اللہ اور مومنین کا ایمان

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے اوپر جو کچھ نازل ہوا ہے تو وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد مومنین کا نام لیا گیا ہے اس سے آپؐ کے احترام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعثت سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ صاحب ایمان تھے، اس وقت تفکر اور تعبد کے مرحلے میں نور بصیرت کے وسیلے سے آپ کے لیے حقائق کشف ہوتے تھے اور جو بھی پیغمبر ﷺ کو اپنے رب کی جانب سے مل رہا تھا اس پر ایمان لاتے تھے اور جو احکام، شرائع اللہ کے رسولوں کے پاس آئے ان پر بھی ایمان لائے اور مومنین بھی سب پر ایمان لائے، اللہ پر اللہ کے فرشتوں پر کتابوں پر سارے انبیاء پر۔ اللہ فرما رہا ہے کہ ہم ان رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ مومنین نے کہا ہم نے اللہ کی یہ بات سن لی ہے، ہم نے اطاعت کی ہے۔ پس اے ہمارے رب ہم تیری بخشش کے طالب ہیں اور جانتے ہیں کہ سب کی بازگشت تیری جانب ہے۔ یعنی یہ مومنوں کا زبان حال ہے! انسان پر واجب ہے کہ وہ بغیر استثناء کے اس پر ایمان رکھے جس کو اللہ تعالی نے نازل فرمایا ہے۔ اطاعت یہاں پر اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونا ہے۔ مومنین اپنی زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! تیرے سارے رسولوں پر ہمارا ایمان ہے، ہماری جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں ان پر پردہ ڈال دے، ہم سب نے تیری جانب پلٹ کر آنا ہے۔ جو بھی معاد کو اپنا نصب العین بناتا ہے تو وہ مسلسل اللہ کی رضا کے راستے میں قدم اٹھاتا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا
كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا
بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ٝ وَ اغْفِرْ لَنَا ٝ وَ ارْحَمْنَا ٝ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۟ ؑ ٢٨٦

''اللہ کسی کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتا، نیکی کا فائدہ بھی اسی کو ہوگا اور برائی کی زد بھی اسی پر پڑے گی، اے رب ہمارے! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کریں تو ہمیں نہ پکڑ، اے رب ہمارے! اور ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر رکھا تھا، اے رب ہمارے! اور ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت نہیں، اور ہمیں معاف کر دے، اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا کارساز ہے، کافروں کے مقابلہ میں تو ہماری مدد فرما''۔

طاقت کے مطابق ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کلی قانون بتایا ہے کہ ہر شخص کو جو ذمہ داری دی جاتی ہے وہ اس کی قدرت اور طاقت کے مطابق دی جاتی ہے۔ کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور تیرا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ سورہ فصلت کی آیت 46 میں ہے اور سورہ نمل کی آیت 90 میں ہے کہ ہر نفس کے لیے وہی ہے جو اس نے کیا ہے اور اس کے خلاف بھی وہی بات ہے جو اس نے خود انجام دیا ہوتا ہے۔ ہر کسی کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے بھیجا

ہے۔ جتنی اس کی وسعت تھی اسی کے مطابق اس کو ملے گا۔ سورہ نمل، آیت 90: کیا تم کو جزاء دی جائے سوائے اس کے کہ جو تم عمل کرتے ہو، یعنی جو عمل کرتے ہو وہی سزا دی جائے گی۔

اس آیت میں بندہ اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ جو ہم بھول گئے ہیں جو ہم سے کوتاہی ہوئی ہے، جو چوک ہو گئی توں ہمارا مواخذہ نہ کر، ہم سے بازپرس نہ کر۔

پہلے جو کہا تھا سمعنا، ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی، اب پھر متوجہ ہوئے ہیں اپنی کمزوری کی طرف اور گذشتہ اقوام جو ہیں ان کے ساتھ جو معاملہ ہوتا رہا اس کو بھی یاد کیا ہے لہٰذا التجاء کی ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں پناہ دے اور یہ کہا ہے کہ اے اللہ! ہم سے در گزر کردے کوئی کام ہم بھول گئے ہوں، ہم سے چوک ہو گئی ہو تو ہماری گرفت نہ فرما! پھر فرمایا کہ ہمارے اوپر ایسی ذمہ داری نہ ڈال دے جو ہماری طاقت میں نہیں ہے جیسے ہم سے پہلوں پر ہوتا رہا۔ ایسی سنگین اور سخت تکلیف ہمیں نہ دی جائے۔

بنی اسرائیل کے لیے یومیہ نمازیں پچاس رکعات تھیں۔ یہاں پر کہا گیا ہے کہ ہمارے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈال دے جیسے پہلوں پر ڈالا تھا۔ پھر کہا کہ ہمیں اتنی تکلیف دے جس کی ہم میں طاقت ہو، ایسی تکلیف نہ دے جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ یہاں طاقت سے زیادہ تکلیف سے مراد تکلیف مالا یطاق نہیں ہے جس کو عقلاء مکلّف کے لیے جائز نہیں سمجھتے ہیں بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہمیں ایسی تکلیف نہ دے جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اگر تکالیف اور فرائض کے دشوار ہونے کی وجہ سے ہم سے نافرمانی ہو گئی ہو تو اس کی وجہ ہم پر عذاب نہ دینا، خواہ وہ مسخ کرنے کی صورت میں ہو یا دوسرے عذاب کی شکل میں۔ اے ہمارے رب! ہمارے لیے ایسے فرائض اور ذمہ داریاں قرار نہ دے جو پہلوں کے لیے تھیں اور ہماری کوتاہیوں اور بھول چوک سے در گزر فرما! اور ہمیں اپنی ہدایت میں قرار دیدے تا کہ گناہ کا اثر مٹ جائے۔

"مغفرت" یعنی نفس سے گناہ کے اثر کو مٹا دینا۔ "رحمت" عطیہ الٰہی کے معنی میں ہے جس کے سبب نفس سے گناہ کا اثر جاتا رہے، گناہ پر پردہ پڑ جائے۔ یہ تین جملے ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ پھر کہا کہ تو ہی ہمارا مولا ہے تو ہی ہمارا سلطان ہے تو ہی ہمارا آقا ہے تو ہی کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، تو ہی ہمارے امور کا مدبر ہے، تو ہی ہمارے امور کا متولی اور کارساز ہے، ہماری مدد فرما۔ ان جملوں میں اللہ سے مدد مانگی گئی ہے کہ وہ ہمیں دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے اور یہ کہ ہم اس دین کو پورے انسانوں میں عام کر سکیں اور یہ تب ہی ہو گا جب تیری مدد ہمارے شامل حال ہو گی۔

سورہ آل عمران

مدنی۔ کل آیات 200

سورہ کے مطالب

سورہ آل عمران میں بڑی تفصیلات ہیں، انسانوں کے لیے ہدایت کا تذکرہ ہے، قرآن کا تعارف ہے، اللہ کی عظمت و توحید کا بیان ہے، احکام و قوانین کا تذکرہ ہے، جو کفر اختیار کرتے ہیں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں ان کی سزا کا تذکرہ ہے، معاد کا تذکرہ ہے، رسولوںؑ کا تذکرہ ہے، حضرت موسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ سابقہ اُمتوں کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں تاکہ اُمت مسلمہ اس سے عبرت حاصل کرے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ۙ﴿۱﴾

"الف، لام، میم"

اللہ تعالیٰ مہربان ہے، بخشش کرنے والا ہے، اسی کے نام سے بات شروع ہوئی ہے.
الف لام میم حروف مقطعات ہیں اس سورہ میں جتنے مطالب ہوئے ہیں ان کے معانی اور مضامین کے ساتھ یہ اشاراتی کوڈ ورڈ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے اسمائے الحسنٰی کی طرف اشارہ ہے۔

اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، نظامِ کائنات کا سنبھالنے والا ہے۔"

اللہ کا تعارف

اللہ حیّ وقیوم یعنی زندہ و پائیدار ہے، اس جملہ کی تشریح سورۃ بقرۃ میں آیت الکرسی کے ذیل میں گزر چکی ہے لیکن یہاں پر بطور اجمال اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اللہ زندہ ہے یعنی صاحب علم اور صاحب قدرت ہے حیّ اور قیومیت اللہ کی ذات کا حصہ ہے وہی ہے جو اپنے غیر کو حیات دینے والا ہے، وہ بہ ذات ہی زندہ ہے اور دوسروں کو زندہ کرنے والا ہے اس کی زندگی کسی سے حاصل شدہ نہیں ہے، قیوم ہے کہ اپنی ذات کی وجہ سے موجود اور قائم ہے۔ ساری مخلوقات اللہ کے وجود سے ہے پس عالم ہستی میں کوئی بھی وجود قائم نہیں ہے مگر اللہ کے وسیلہ سے، اور اس کی قیومیت علم اور قدرت کالازمہ ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾

''اُس نے تجھ پر یہ سچی کتاب نازل فرمائی جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اُسی نے اس کتاب سے پہلے تورات اور انجیل نازل فرمائی۔''

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾

''وہ کتابیں لوگوں کے لیے راہ نما ہیں اور اسی نے فیصلہ کن چیزیں نازل فرمائیں، بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہوئے اُن کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست بدلہ دینے والا ہے۔''

قرآن اور سابقہ آسمانی کتابیں

"نزول" تدریجاً اتارنے کو کہتے ہیں جبکہ "انزال" ایک دفعہ کسی شئے کو اُتارنے کے معنی میں ہے۔ جیسے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ، ہم نے لیلۃ القدر میں قرآن کو یکدم اتارا۔ دونوں نزول قرآن کے لیے ہیں۔ البتہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ قرآن آپ کے لیے تدریجا تھوڑا تھوڑا اتارا گیااور یکدم بھی اتارا گیا۔ ان آیات میں یہ بتایا جارہا ہے کہ قرآن اپنے نزول اور انزال دونوں کیفیات میں پہلے جو آسمانی کتابیں آئی ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس قرآن میں جو بات ہے حق ہے باطل اس میں ہے ہی نہیں اسی لیے قرآن نصرانی اور یہودیوں پر جو کتابیں آئی ہیں انکی تائید کرتا ہے لیکن جو اس وقت یہود و نصاریٰ کے پاس ہے ان آسمانی کتب کے کچھ حصے ہیں مکمل وہ نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اتارا تھا کیونکہ ان میں تحریف کردی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے ہی توریت اور انجیل کو اتارا۔ توریت کے معنی شریعت اور قانون ہے اور انجیل بشارت، قرآن نے انجیل کے لفظ کو مفرد کے طور پر بیان کیا ہے اور اسی پر زور دیا ہے حالانکہ نصرانیوں کے ہاں چار انجیل ہیں جسے وہ اناجیل کہتے ہیں، جبکہ انجیل، ایک ہی کتاب تھی جس کے بارے میں قرآن نے بیان کیا ہے انہوں نے تحریف کرکے ایک انجیل کو چار بنا دیں، انجیل اور توریت دونوں لوگوں کی ہدایت کے لیے تھیں پھر قرآن نازل ہوا وہ بھی ہدایت کے لیے آیا لیکن انہوں نے اللہ کی کتاب میں تحریف کردی، اللہ کی وحدانیت کو توڑ ڈالا اور اس سے منحرف ہوگئے۔

قرآن میں مسیحیوں کا نظریہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تین میں سے ایک ہے " اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ "، " اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ " مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ

ہے۔ ''انّ المسیح و امه الٰھان''۔ مسیح اور ان کی اماں دو معبود ہیں۔ اُن احبار نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے لیے اور ارباب بنا لیے۔

فرقان حق اور باطل کو جدا کرنے والا، قرآن جدا کرتا ہے کہ صحیح کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ نصرانی اور یہودیوں کی کتابوں میں جو صحیح بات ہے اس کو بھی قرآن بیان کرتا ہے اور جو غلط بات ہے اس کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

وہ تحریفات جو انہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق کیں ان سب کو قرآن بیان کرتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے لوگوں کی سزاوں کا بھی تذکرہ کیا کہ یہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور ان میں تحریف کرتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے جس سے وہ نہیں بچ سکیں گے وہ عذاب فقط مادی تکلیف اور رنج نہیں ہے کہ مثلاً مال چلا گیا، اولاد چلی گئی اور اجناس کم ہو گئیں، بیماری آ گئی بلکہ قرآن میں جب عذاب کی بات ہوتی ہے تو اس کا معنی وسیع تر ہے، نفسانی عذاب ہے، بدبختی ہے، بے چارگی ہے اور پھر آخرت کا عذاب آگ ہے اور اللہ بہت مقتدر ہے، عذاب اس کا انتقام ہے نافرمانوں سے۔ بدکار کو سزا اس کے عمل کی بنیاد پر ملے گی، خدا مقتدر ہے، بلند مرتبہ ہے، اس سے مقدس تر ہے کہ وہ بندوں کے اعمال سے متاثر ہو یا بندے اپنی نافرمانی سے اس کی ذات میں کچھ نقص لا سکیں اسی طرح اطاعت کر کے اس میں کچھ بڑھا سکیں، وہ اس سے مضبوط تر بالاتر محترم تر ہے۔ بندے نہ اس کی اہانت کر سکتے ہیں نہ ہتک کر سکتے ہیں، بندے اپنا ہی بگاڑتے ہیں اور اس کا انتقام تشفی کے لیے یا دل سے بغض کے ہٹانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اقتدار اور غلبہ سبب ہے کہ وہ اپنے وعدہ پر عمل کرے اور جو بدکار ہیں ان کو سزا دیں، جو نیکوکار ہیں انہیں جزا اور ثواب دیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؕ﴿۵﴾

''اللہ پر زمین اور آسمان میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔''

اللہ پر ہر چیز آشکار ہے

جب ایسا ہے کہ اللہ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے تو اس سے نیتیں بھی مخفی نہیں رہتیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ محسوسات سے آگاہ ہو، غیر محسوسات کا اسے پتہ نہ چلتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات محسوس و غیر محسوس سب سے یکساں طور پر واقف ہے کوئی کافر ایسا نہیں ہے کہ اپنی مکاریوں اور سازشوں کو خدا سے پوشیدہ رکھ سکے، اس کا انتقام فقط ظاہری امور کے حوالے سے نہیں ہے کیونکہ اس کا علم باطن کا بھی احاطہ کرتا ہے لہٰذا اس کا انتقام ان مخفی امور کو بھی شامل ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶

''وہی جس طرح چاہے ماں کے پیٹ میں تمہارا نقشہ بناتا ہے، اُس کے سوا اور کوئی معبود نہیں زبردست حکمت والا ہے''۔

اللہ ہی تخلیق کرنے والا ہے

اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ کسی کی تصویر بنانا یعنی اس چیز کا عکس لینا یا اس کی صورت دوسری شئے پر ڈالنا، شکل بنانا تو یہ کام خدا ہی کرتا ہے اللہ کی ذات اپنی مخلوق پر مکمل قدرت اور غلبہ رکھتی ہے، وہ مخلوقات کی آفرینش اور خلقت میں کسی کا محتاج نہیں ہے وہی غالب ہے اور حکمت کے تحت ہی سب کو خلق کرتا ہے، پورے عالَم اور جہان کی اشیاء کو ابتدائی طور پر اس نے خلق کیا ہے، جیسے چاہے جس نظام کے تحت چاہے اور جس طرح سے چاہے ہر طرح سے تخلیق کی بازگشت اسی کی طرف ہے اور اسی طرح ہی وہ ان مخلوقات کے اعمال کا بھی جائزہ لیتا ہے۔ ہماری جتنی خواہشات ہیں وہ اس کے اذن کے مطابق ہی پوری ہو رہی ہوتی

ہیں، ایسا نہیں ہے کہ جو سبب ہے اس سبب سے پورا ہدف حاصل ہو جائے بلکہ جتنا اللہ چاہتا ہے اتنا ہی ہوتا ہے، اللہ کی جانب سے خلقت کا سلسلہ حکمت کے تابع ہے۔ اللہ کے قرار دیئے گئے تخلیق انسان کے نظام کو توڑنا جائز نہیں ہے۔ الٰہی خلقت کے نظام میں توڑ پھوڑ کی جائے، رحم مادر میں انسان کی تصویر کشی اللہ ہی کرتا ہے جس کو جیسی چاہے شکل عطا کرتا ہے، اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا اور اس بنائی ہوئی شکل کو بدلنا بھی کسی کا حق نہیں ہے مگر یہ کہ علاج کی وجہ سے کوئی تبدیلی لائی جائے تو اس کی اجازت ہے۔ معبود وہی ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے کیونکہ وہی صاحب اقتدار ہے، صاحب حکمت ہے، اسی کی مشیت ہر جگہ چھائی ہوئی ہے اور وہی غالب ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦

''وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اُس میں بعض آیات محکم ہیں (جن کے معنی واضح ہیں) وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری مشابہ ہیں (جن کے معنی معلوم یا معین نہیں)، سو جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہیں وہ گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی غرض سے متشابہات کے پیچھے لگتے ہیں، اور حالانکہ ان کا مطلب سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا اور مضبوط علم والے کہتے ہیں ہمارا ان

چیزوں پر ایمان ہے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہی ہیں، اور نصیحت وہی لوگ مانتے ہیں جو عقلمند ہیں"۔

قرآن میں محکمات اور متشابہات

اس جگہ قرآن کے بارے بتایا گیا ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ یہاں پر "انزال" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جیسے پہلے بھی بتایا ہے کہ انزال دفعتاً اترنے کے معنی میں ہوتا ہے، اس جگہ انزال اس لیے کہا ہے کہ جو کتاب نازل ہو چکی ہے اس کی مجموعی خصوصیات اور اوصاف کو بیان کرنا ہے نہ کہ اس کے جزو، یا اس کی آیات کی خصوصیات بیان کی جارہی ہیں، کل قرآن کی خصوصیت بیان کی جارہی ہیں، قرآن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کچھ آیات میں بڑی وضاحت ہے کہ ہر شخص اپنا مقصود اس سے سمجھ لیتا ہے اور اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہو سکتا، نفوذ ناپذیر ہیں، تردید اس میں نہیں ہو سکتی، معنی بڑا واضح ہے اور یہی اصل کتاب کا مطلب ہے ایسی آیات کو محکم یا محکمات کہا جاتا ہے کیونکہ معنی اور مراد میں وضاحت کے حوالے سے پختگی کی حامل ہیں۔ سورہ ہود آیت 1: "کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئی ہیں ان میں ایک مضبوطی رکھی گئی ہے، پھر اسے جدا جدا کر کے بیان کیا گیا ہے"۔

"اُم" بازگشت کے معنی میں ہے، جہاں پلٹ کر آنا ہوتا ہے۔ قرآن کی جو آیات متشابہات ہیں وہ بھی ان محکمات کی طرف ہی پلٹتی ہیں ان محکم آیات کی روشنی میں متشابہات کی تفسیر کی جاسکتی ہے۔ آیات محکمات سب ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں ان کی مراد واضح ہوتی ہے جبکہ آیات متشابہات سے مختلف معانی اور مصادیق سمجھے جاسکتے ہیں، اوصاف اور کیفیات کے حوالے سے ان کی مراد واضح و معین نہیں ہے سننے والا فقط سننے سے اس کی مراد کو نہیں سمجھ سکتا بلکہ ایک معنی اور دوسرے معنی میں تردّد ہو جاتا ہے یہ معنی مراد ہے یا دوسرا

معنی مراد ہے۔ مگر یہ کہ جو کتاب کے محکمات ہیں ان کی طرف رجوع کر لے تو پھر اس کا جو واقعی معنی ہے اس کو درک کیا جاسکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی ساری آیات کا مضمون گویا معلوم ہے ہاں وہ مضمون اس شخص کے لیے جو جائزہ لے رہا ہے واضح ہو یا اس کے سمجھ کی کوتاہی، عدم آگاہی، درایت اور ا ناسخ و منسوخ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ جان سکے۔ متشابہ آیات پوشیدہ خزانے اور قرآن کے اعجاز کا مظہر ہیں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے راز کھلیں گے۔ لہٰذا وہ آیات جو عقائد، عبادات اور معاملات کے بارے میں ہیں سب محکم ہیں ان کا ظاہر کامل اور قطعی ہے ،ان کا مضمون واضح اور دلالت روشن ہے۔

متشابہ آیات کی کیفیت جاننے کے لیے بھی محکم آیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔
یہاں پر اللہ تعالیٰ نے منحرفین کا حوالہ دیا ہے کہ وہ لوگ جن کے دل میں انحراف ہے وہ محکمات کو لینے کی بجائے متشابہات میں جاگھستے ہیں وہ اپنے قلوب کے اضطراب اور پریشانی کے ہاتھوں مجبور ہو کر فتنہ پھیلانے کے لیے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان متشابہہ آیات کا سہارا لیتے ہیں ایسے لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں، ان کا عقیدہ اور ایمان بغیر عمل کے ہوتا ہے، ان کا ایمان اللہ کے نظام کے واضح اصولوں پر استوار نہیں ہوتا، ان کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہے اسی لیے قرآن کی تاویلیں کرتے ہیں، احکام کا فلسفہ نکال رہے ہوتے ہیں اور خود کو محکمات کی پیروی سے بے نیاز سمجھ رہے ہوتے ہیں جبکہ دین خدا کی اصل کو چھوڑے رہے ہوتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کوئی بھی نہیں ہے جو قرآن کے فلسفے اور حکمت کو جان سکے سوائے اللہ کے، اللہ ہی ہے جو آگاہ ہے اپنی کتاب کے بارے میں۔[1]

---

[1] ۔ اکثر شیعہ تفاسیر میں اس جملہ کو "ما یعلم تاویلہ اللہ" پر عطف کیا گیا ہے۔ ائمہ معصومین سے منقول روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ "راسخون فی العلم" سے مراد حضور پاک ﷺ کی ذات گرامی اور آپؐ کے آپؐ کے بارہ اوصیاء آئمہ اہل البیت علیہم السلام ہیں یہی حضرات اسکا پہلا مصداق ہیں۔

"راسخون فی العلم" جن کے پاس اللہ تعالیٰ نے علم اپنی جناب سے دیا ہے وہی لوگ ہیں جو پورے قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کی جانب سے ہے، محکم بھی اور متشابہ بھی اور متشابہ کو محکم کی طرف پلٹا کر اس سے وضاحت لی جا سکتی ہے جن کا علم ثابت اور راسخ ہے اس میں کوئی تردد نہیں ہے اور ان افراد میں سب سے افضل رسول اللہ ﷺ ہیں۔

قرآن میں غور اور اس کے معانی کو سمجھنے کے حوالے سے لوگوں کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ جن کا دل بیمار ہے وہ متشابہ کے پیچھے دوڑتے ہیں دوسرا گروہ جن کا علم ثابت ہے وہ محکم ہوں یا متشابہہ، سب پر ان کا ایمان ہے اور ان کے دلوں میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دلوں میں علم ثابت اور راسخ ہے لہٰذا وہ اس طرح استدلال کرتے ہیں۔

جو غیرت مند ہیں، صاحب عقل سلیم ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہیں اور دلیل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں اور دلیل ہی سے نتیجہ لیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "کل من عند ربنا" یہ غیرت مند افراد جو راسخ فی العلم ہیں اُن کی طرف سے استدلال ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے چاہے وہ محکم ہیں یا متشابہہ ہیں، ایسے لوگ وہ ہیں جن کا عقل خالص ہے جو پاک ہیں جن کے قلوب پاکیزہ ہیں اور وہ دلیل سے ہی معارف حقہ تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸

”اے ہمارے رب! جب تو ہم کو ہدایت کر چکا تو ہمارے دلوں کا نہ پھیر اور اپنے ہاں سے ہمیں رحمت عطا فرما، بے شک تو بہت زیادہ دینے والا ہے“۔

اللہ سے ہدایت پر قائم رہنے کی دعا

اس آیت میں اس دعا کا ذکر ہے جو ''راسخون فی العلم'' اپنے رب سے مانگتے ہیں وہ اللہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اُن کے دلوں میں انحراف کو نہ لے آ اور جس علم سے وہ آراستہ ہیں وہ علم ان سے زائل اور بر طرف نہ ہو اور وہ اپنے رب کے مقام اور شان سے آگاہ ہیں اور اپنے عقل سے جانتے ہیں کہ مطلق قدرت کا مالک اللہ ہے۔ اسی لیے اللہ سے درخواست کرتے ہیں مالک تو نے اپنی رحمت سے ہمیں یہ نعمت عطا کی ہے یہ رحمت ہمارے حال پر شامل رہے اور یہ علم جو ہمیں دیا ہے یہ باقی رہے تاکہ ہم صراط مستقیم پر چلنے کے لیے اس سے ہدایت اور مدد لے سکیں، دل میں انحراف نہ ہونا علم کے قائم رہنے کا وسیلہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ سعادت مند ہیں، اگر یہ علم نہ ہوتا تو جہالت اور کمزوری کی وجہ سے وہ بد بختوں سے ہوتے۔

یہاں پر اللہ کی صفت ”وھّاب“ کو بیان کیا گیا ہے: وہاب کا معنی بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے اللہ کی اس صفت کا حوالہ دے کر درخواست کی ہے کہ اُن کے دل پر علم کی بارش ہو، رحمت کی بارش ہو، رحمت کا کلمہ نکرہ لایا گیا ہے اور ”من لدنک“ کہا گیا ہے کہ اللہ اپنی طرف سے ایسا کرے یہاں پر اپنی جہالت کا اظہار ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ تیری رحمت کیسے ہونی چاہیے، فقط وہ رحمت جو تیری طرف سے ہو نہ کہ دوسروں کی طرف سے۔ تمام ملک ہستی اللہ کی طرف سے جانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں ظاہری اسباب کی کوئی استقلالی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی ان کو کوئی استقلال حاصل ہے۔ اے خدا تو ہی تنہا بخشنے والا ہے۔

قرآن میں متشابہات موجود ہیں اور راسخون فی العلم اس کے بارے میں آگہی رکھتے ہیں۔ جیسا بتایا گیا ہے متشابہات کے حوالے سے کہ ان کی موجودگی قرآن کے اعجاز کی دلیل ہے کیونکہ یہ:

(1) دلوں کی تقویت کے لیے ہے جن کے پاس علم ہے ان کا علم کامل تر اور بیش تر ہو جائے۔

(2) انسان کی جو قوت عاقلہ ہے اسکو بحث اور جستجو کے لیے ابھارا جائے، آمادہ کیا جائے۔

(3) پیغمبر ﷺ کی رسالت عوام و خواص سب کے لیے ہے لیکن لوگ اس پیغام کو وصول کرنے کے حوالے سے یکساں نہیں ہیں ان کے مراتب مختلف ہیں، بعض دوسروں پر برتری رکھتے ہیں لہذا کچھ آیات ایسی ہیں جن کو خواص سمجھ سکتے ہیں لیکن عوام بلا واسطہ نہیں سمجھ سکتے، کچھ آیات دقیق قسم کی ہیں جن میں زیادہ غور اور خوض اور عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور اسی طرح ان سے مطلب سمجھنے کے لیے ان آیات کو محکمات کی طرف پلٹانے پلٹانا پڑتا ہے اور یہ عمل ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

(4) رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹

"اے رب ہمارے! تو ایک دن سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا"۔

قیامت کا حوالہ

اس آیت میں قیامت کا تذکرہ ہے، اللہ سے درخواست کی گئی ہے کہ اپنی جناب سے رحمت دے ان کو علم ہے کہ یہ جو خلقت کا نظام قائم ہے اور جو دینی دعوتیں ہیں یہ قیامت کے

دن کے لیے مقدمہ ہیں جہاں پر سب کو اکھٹے ہونا ہے اور اُس دن اللہ کی رحمت کے سوائے کوئی اور چیز فائدہ نہ دے سکے گی، خود اللہ اور اللہ کی رحمت ہی مدد بن سکتی ہے، کسی جگہ سے کوئی اور مدد نہیں آسکتی اور اللہ نے ہی سب کو اکٹھا کرنا ہے یہ اللہ کا اعلان اور وعدہ ہے اور اللہ اپنا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا وہ انسان جو کہ راسخ فی العلم ہے جس کا علم پختہ ہے، پکا ہے کچا علم نہیں ہے، لیکن یہ علم اس وجہ سے کہ راسخ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا جو وعدہ دے رکھا ہے کہ اُس نے محقق ہونا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے لہٰذا اس بات کو یہاں پر یاد کر رہے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اللہ نے جو فرمایا ہے وہ اس کے خلاف نہیں کرے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ۝۱۰

''بے شک جو لوگ کافر ہیں اُن کے مال اور اُن کی اولاد اللہ کے مقابلے میں ہر گز کام نہیں آئیں گے، اور وہ لوگ دوزخ کا ایندھن ہیں''۔

کافروں کا انجام

اس آیت میں ان کی بات ہو رہی ہے جو اللہ کی قدرت کے انکاری ہیں، اللہ کی دعوت کے انکاری ہیں اُن کو سمجھایا جا رہا ہے کہ دیکھیں قیامت نے آنا ہے اور اُس دن تم اللہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، تمہاری اولاد اور تمہارے اموال تمہیں بچا نہیں سکتے۔ کہ فلاں کا مال اسے فلاں شخص سے نجات دے دے وہاں پر ایسا ہو نہیں سکتا، انسان ابتدائے خلقت میں اللہ کا محتاج ہے، غذا میں اللہ کا محتاج ہے، مال کو اگر تمام مشکلات کا حل قرار دے تو وہ خالق جو مدبر ہے وہ اسے بھول جاتا ہے اور مال اس کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے، کافر اور

خاص کر یہودی اپنے بارے میں جو کچھ خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ اموال اور ان کی اولاد انہیں خدا سے بے نیاز کر دیں گے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سوچ ان کو جہنم میں کھینچ کر لے جائے گی اور جھٹلانے والوں کے لیے جہنم ہی ہے وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے اور یہ کفار ہیں کافر وہاں جا کر جلیں گے اور ان کے لیے کوئی بچنے کا راستہ نہیں ہوگا۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱

''جس طرح فرعون والوں اور اُن سے پہلے لوگوں کا معاملہ تھا، انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا پھر اللہ نے اُن کے گناہوں کے سبب سے انہیں پکڑا، اور اللہ سخت عذاب والا ہے''۔

فرعون اور اس سے پہلے والی اقوام کا انجام

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے ان کو بتایا کہ جو فرعون کا گروہ اور اُن سے پہلے جو لوگ گزرے تھے انہوں نے ہمارا انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا۔ اللہ کی آیات کی تکذیب اور جھٹلانے کی جو روش انہوں نے اپنائی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اموال اور اولاد کو اللہ سے بے نیاز کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن خداوند نے ان کے گناہوں پر ان کی گرفت کی، انہیں عذاب دیا اور ان کے علاوہ جو کافر تھے ان کو بھی عذاب دیا، سب کو جہنم کا ایندھن بنایا تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوگا، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کسی کے لیے فرار کا راستہ نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی پناہ ہے کیونکہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانا، اللہ کا کفر اختیار کرنا، اللہ کے ساتھ جنگ میں آنا؛ یہ اللہ کی جلالت اور عظمت کے منافی ہے اور اللہ کے

اختیار میں ہے کہ ان کی گرفت اور ان کی بازپرس کرے اور اللہ جو صاحب جلال ہے وہی ہر شئے پر غالب ہے، سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اس سے کسی کو فرار ممکن نہیں ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

"کافروں کو کہہ دے کہ اب تم مغلوب ہو گئے اور دوزخ کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے، اور وہ برا ٹھکانہ ہے"۔

مشرکین کے لیے تنبیہ

یہ بات مشرکین سے کہی جارہی ہے، مشرکین کو سابقہ اقوام اور اُمتوں کے حالات بتائے ہیں، بنی اسرائیل کے حالات بتائے ہیں آل فرعون سمیت دیگر اقوام کے حالات بتائے ہیں کہ کس طرح اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انکے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ تو ان مشرکین سے بھی کہا جارہا ہے کہ عنقریب تم لوگ بھی ان ٹھکانوں سے نکالے جاوگے، تمہیں بری طرح شکست ہو گی اور پھر کفار کی حالت بہت بری ہو گی جب وہ میدان محشر میں آئیں گے ،وہاں ان کو پکڑا جائے گا اور انہیں جہنم میں پھینکا جائے گا، "مھاد" کے معنی بستر و فرش کے ہیں، وہاں ان کے لیے بدترین رہنے کی جگہ ہو گی، اور جہنم کتنا ہی برا ٹھکانہ ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

”تمہارے سامنے ابھی ایک نمونہ دو فوجوں کا گزر چکا ہے جو آپس میں ملیں، ایک فوج اللہ کی راہ میں لڑتی ہے اور دوسری فوج کافروں کی ہے وہ کافر مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، آنکھوں کے دیکھنے سے اور اللہ جسے چاہے اپنی مدد سے قوت دیتا ہے، اس واقعہ میں دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہے“۔

اللہ کی راہ میں لڑنے والوں کی مدد

اس آیت میں کافروں کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ خطاب مومنین کے لیے ہو۔ جنگ بدر میں جو فتح و نصرت ہوئی اس کا تذکرہ ہے، دو گروہ مقابلے میں آئے، ایک مومن اور دوسرا کافر گروہ۔ خاص کر اگر یہ آیت جنگ بدر کے بعد اُتری ہو تو ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ لڑ رہا ہے دوسرا گروہ کافر ہے اور وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے دو برابر سمجھ رہے ہیں۔ اللہ نے اس آیت میں سبیل اللہ کا مقابلہ سبیل الشیطان سے نہیں کیا بلکہ سبیل اللہ کے مقابل میں ”کافرۃ“ کہا ہے۔ اس بات سے سمجھایا ہے کہ کوئی بھی اللہ کی مدد سے بے نیاز نہیں ہے۔

کامیابی اللہ کے لیے ہے لہٰذا ایک گروہ کے لیے کہا کہ جو سبیل اللہ میں جنگ کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کو کافرہ کہا کہ کافر ہیں ایک گروہ وہ ہے اللہ پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور دوسرا گروہ جو کافر ہیں اور اللہ کے مقابلے میں، اللہ کا انکار کرتے ہیں اللہ کی دعوت کا انکار کرتے ہیں جب دونوں مقابلہ میں آئے تو کافر گروہ والے سمجھ رہے تھے کہ ہم غالب آئیں گے تو اللہ فرمارہا ہے کہ اللہ اپنی نصرت سے جس کی تائید کرے وہی غالب آئے گا، اور یہ صاحبان بصیرت کے لیے عبرت ہے۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد 313 تھی کافر مسلمانوں کو دو برابر دیکھ رہے تھے 626 دیکھ رہے تھے اور یہی امر کافروں کی شکست کا سبب بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے

مسلمانوں کی تائید کی۔ بعض نے اس سے دل کی بصیرت کو لیا ہے۔ عبرت لینا بصیرت ہے، آنکھ کا کام نہیں ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ان مسائل سے جو عبرت نہیں لیتے خدا ان کو اندھا شمار کر رہا ہے وہ بے بصیرت ہیں۔ اس طرح خداوند تبارک و تعالیٰ چاہتا ہے انسان سے یہ کہے کہ یہ میرا حق ہے کہ میں تمہیں اس طرف دعوت دُوں اس میں خطاب پیغمبر اکرم ﷺ کے لیے ہے اس لیے کہ باقی لوگوں کا فہم کم ہے اور ان کے دل اس مطلب کو درک کرنے سے بے بصیرت ہیں۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنوں کی کس طرح اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ کافروں کو اس کی سمجھ ہی نہیں آئی، کافروں کو مومنوں کی کم تعداد بھی زیادہ نظر آئی حالانکہ کافر تو بہت زیادہ تعداد میں تھے، ایک ہزار کے قریب قریب تھے ان کے پاس اسلحہ بھی کافی تھا، گھوڑے بھی زیادہ تھے، اونٹ بھی زیادہ تھے، مسلمانوں کے پاس تلواریں بھی نہیں تھیں سواریاں بھی پوری نہیں تھیں چند ایک کے پاس ہی سواریاں تھیں۔ اس کی تفصیل جنگ بدر کے حالات میں آئے گی۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

”لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے فریفتہ کیا ہوا ہے جیسے عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، یہ دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے اور اللہ ہی کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے“۔

دنیاوی لذات

''ناس'' بہت ساری جگہوں پر استعمال ہوا ہے جس سے کمزوری اور کم ظرفی کی طرف اشارہ ہے اور فکر کی پستی مراد ہے۔ جو لوگ ''حب الشھوات'' نفسانی خواہشات کی طرف متوجہ ہوں اور آخرت سے غفلت برتی جارہی ہوان کی نظر میں خواہشات نفسانی کی اہمیت ہو، جبکہ سمجھدار لوگ جن کی فکر بلند ہے وہ دُنیاوی مسائل کو آخرت کا مقدمہ قرار دیتے ہیں ان کی نظر اچھی عاقبت اور حق تعالیٰ کی ہمسائیگی پر ہوتی ہے۔ یہ شہوات اور خواہشات کے ایجاد کرنے والے خود انسان نہیں ہیں بلکہ یہ شہوات الٰہی قوت سے مسخر ہیں اور یہ دُنیاوی حیات کو جاری رکھنے کا لازمہ ہیں لیکن ان شہوات کی اسیری سے نکل کر آخرت کے راستہ کو طے کرنا انسان کے لیے اچھی روش اور حقیقی زینت ہے۔

دُنیاوی زینت کو پا لینا اور دُنیا سے وابستگی اور تعلق داری؛ یہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ دو راستے سامنے ہیں جن پر لوگوں کا امتحان ہوگا، اگر دو راستے موجود نہ ہوں تو امتحان کا تصور نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر اللہ کی اطاعت اچھی ہے تو اس لیے ہے کہ اس کی معصیت اور نافرمانی بری ہے۔ پس اطاعت حسنہ ہے اور بعد کے مرحلے میں ثواب ہے اور آخر میں سعادت ہے تو اس کے مدمقابل معصیت ہے برائی ہے اس کے بعد عقوبت ہے، درد ہے، تکلیف ہے اور اس کا اختتام شقاوت اور بدبختی ہے۔ دونوں طرف جب ظہور اور جلوہ گر ہوتی ہیں تو اس کا مدمقابل خفا سے دوچار ہوتا ہے، نیکی اچھی ہے اور سیئہ گناہ اور برا ہے، اسی ترتیب سے حسنہ ثواب کا موجب ہے سیئیہ عتاب کا موجب ہے۔ ثواب، عمل کرنے والے کے لیے لذت بخش ہے، عقاب گناہ کرنے والے کے لیے دردآور ہے۔ سعادت کی لذت ایسی ہے کہ وہ پسندیدہ ہے اور شقاوت اور بدبختی کا درد وحشت آور ہے۔ پس حکمت کا تقاضا ہے کہ یہ عالَم اور جہان اطاعت الٰہی پر مشتمل ہو تو اس میں فساد بھی ہوگا۔ سعادت یہ ہے کہ انسان فطرت

کے تحت توجہ رکھے۔ شقاوت یہ ہے کہ انسان فطرت کے تحت اس سے گریزاں ہوں۔ اگر یہ رویہ اور روش پورے جہان میں جاری نہ ہوتی تو عالَم وجود باطل ہو جاتا پس جو سعادت مند ہوتا ہے تو اپنے اختیار سے ہوتا ہے جس کو اس نے استعمال میں لایا ہے۔ اور جو شقاوت مند ہوتا ہے تو وہ بھی اپنے اختیار سے ہوتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو اختیار کا قانون جاری ہی نہ ہو سکتا اور لوگوں پر حجت تمام نہ ہوتی۔

اب جو شہوات کی بات ہوئی ہے تو کون کون سی شہوات ہیں جن کا شمار نفسانی خواہشات سے کیا گیا ہے۔ عورتیں ہیں، اولاد ہے، خزانے ہیں، سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے صندوق، نشان والے گھوڑے ہیں، چار پائے ہیں، کھیت ہیں یہ سب دُنیاوی زندگی کی مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے مرد عورتوں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ان سے عشق کرتے ہیں، انسان اولاد کی کثرت پر فخر کرتا ہے، مال سونا چاندی کے انبار کا انسان حریص ہوتا ہے کہ اور بڑھتا جائے اور ایسے گھوڑے جو سدھائے ہوئے ہیں۔[1] گدھا گھوڑا، بھیڑ بکری اور کھیت کھلیان، زراعت یہ سب مال دنیا ہے۔ یہ سب عارضی زندگی کا سامان ہے۔

شیطان ملعون انسان کے لیے انہیں زینت اور خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ وہ اسی میں مشغول رہے اور اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے اور وہ اپنا ہم و غم اسی میں صرف کرے۔ ہر وقت اسی کی فکر میں رہے لیکن مومن جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کے مطابق ان سے حصہ لیتا ہے اور زندگی کی گزرانے کے لیے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس جہان کو آخرت کے لیے کھیتی سمجھتا ہے اور آخرت کا مقدمہ جانتا ہے۔ وہ آخرت جس میں زندگی جاوید ہے، ابدی ہے اور اللہ کے پاس جانا ہے، جوار الٰہی اور اللہ کی ہمسائیگی ہی اچھی عاقبت اور اچھا انجام ہے۔ یہ کلام انسان کو ترغیب دلانے اور ابھارنے کے لیے ہے کہ یہ دنیاوی شہوات فانی ہیں ان

---

[1] ۔ آج کل گھوڑوں کی جگہ گاڑیاں ہیں، جہاز ہیں، جدید سے جدید ترین نئے نئے ماڈل کی کاریں ہیں۔ (مترجم)

کو چھوڑو اور جو حقیقی اور ابدی لذت ہے وہ رحمت الٰہی کی ہمسائیگی میں ملے گی اسی کی فکر کرو اور آخرت کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾

''کہہ دے کیا میں تم کو اس سے بہتر بتاؤں، پرہیزگاروں کے لیے اپنے رب کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک عورتیں ہیں اور اللہ کی رضامندی ہے، اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

اُخروی نعمات کی بہتری

سابقہ آیت میں دنیاوی شہوات اور ان کے پاداش میں ملنے والے ابدی عقاب کا ذکر تھا۔ یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ جو شہوات فنا ہونے والی ہیں، ختم ہونے والی ہیں اور دُنیاوی ہیں کہہ دو کہ اخروی نعمات ان سے بہتر ہیں، اُن کا حسن حقیقی ہے البتہ یہ بات ان کو بیان کردو کہ حقیقی لذت اور دائمی سکون ان کے لیے ہے۔ جن کے پاس تقویٰ ہے اپنے رب سے خود کو قریب رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کی ناراضگی سے بچا کر رکھتے ہیں ایسے لوگ درختوں کے سایہ میں ہوں گے گھنے باغات ہوں گے، نہریں جاری ہوں گی، وہاں ہمیشہ کے لیے ہوں گے اور ان کے لیے پاک و پاکیزہ طہارت والی بیویاں ہوں گی۔

فانی دُنیا کی لذات ظاہری ہوتی ہیں ان میں دوام نہیں ہے ان کے مقابلے میں جو لوگ دُنیا میں تکالیف برداشت کرتے ہیں ان ظاہری لذات اور فنا ہونے والی خوشیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کو آخرت کا ذریعہ بناتے ہیں، ان کی عبادت میں تقویٰ ہوتا ہے تو

پھر اُن کو ہمیشہ کے لیے بہشت جاودانی ملتی ہے جہاں پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی دُنیاوی لذتیں اور تکالیف سب دنیا میں رہ جائیں گی وہاں کوئی تکلیف نہیں کوئی نجاست نہیں، جسمانی لذتیں، جنسی لذتیں ایسی ہیں جن کا تصور بھی اس دُنیا میں نہیں ہو سکتا اور اللہ کی خوشنودی ان سب سے بڑی چیز ہے جو وہاں انہیں ملے گی اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے کیونکہ اللہ کی رضا اس شخصیت کے لیے ہے اس نفس کے لیے جس نے اپنے آپ کو دُنیا کے جھمیلوں سے روکے رکھا، دُنیا کی لذات میں غرق نہیں ہوا، اللہ کی اطاعت کی، تقویٰ کی پاسداری کی، جس کے نتیجے میں اللہ اس سے راضی ہوا اور اپنے رب کی اطاعت میں جس نے دُنیا گزاری تو اس کو بہت کچھ انعامات ملیں گے اور جنت کی نعمتیں جاودانی ہیں اور یہ اُس عبادت کا ثمر ہے کہ اللہ اس سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو گا جیسا کہ سورہ بینہ کی آیت 8 میں فرمایا:

جَزَآؤُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾

"ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے کی بہشت ہیں ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے"۔

اللہ کی رضا حاصل کرنے والے

دُنیاوی لذات جیسے کھانا پینا، نکاح کرنا، جنسی خواہشات پوری کرنا، یہ مومن اور کافر دونوں کے لیے ہے یہ نعمات تھوڑی مدت کے لیے ہیں، دُنیا کی زندگی فانی ہے تو مومن ان کو استعمال کرتا ہے تاکہ وہ زندہ رہے تاکہ وہ آخرت کے لیے اپنا کام کر سکے اور اس میں قوت ہو گی تو اللہ کی عبادت کرے گا، اسکے پاس جو مال ہوتا ہے وہ اس کو اللہ کے بندگان پر خرچ کرتا ہے اس مال کو اپنے لیے اصلی سرمایہ نہیں سمجھتا، اس کی نظر میں اصلی سرمایہ اللہ کے قوانین کی

روشنی میں زندگی گزارنا ہے اور جو کچھ اس کی آخرت کی ضرورت ہے اس کو وہ اسی دنیا سے پورا کرتا ہے اور یہیں پر رہ کر دنیا میں کمال تک پہنچتا ہے اور آخرت پھر اسی کی ہے دنیا و آخرت کا فرق یہ ہے کہ آخرت ہمیشہ کے لیے ہے دنیا فنا ہونی ہے، دنیا کو آخرت کا وسیلہ بناو، دنیا کو دنیا کے لیے مت کماو، جو کافر ہوتا ہے وہ دنیا میں رہتا ہے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے، دُنیا کی لذات میں غرق ہو جاتا ہے شیطان سب چیزوں کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے اور اس طرح وہ غافل ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کو آخرت کی بے آرامی اور تکلیف نصیب ہو گی کیونکہ دنیا کی جو لذتیں تھیں وہ تو عارضی تھیں دنیا کی لذات کو اس نے آخرت کی لذات پر ترجیح دی، اس لیے وہ گھاٹے اور نقصان میں ہے اور کافر ہمیشہ عذاب میں رہے گا اور وہاں سے نکل بھی نہیں سکے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ﴿۱۶﴾

"وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے ہیں سو ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"۔

مومنوں کی اللہ سے التجاء

یہاں پر ذکر ہو رہا ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایمان کے ذریعے اللہ پر احسان چڑھا رہے ہوں بلکہ اُن کا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اے اللہ تو نے خود مومن بندوں کو وعدہ دیا ہے اس وعدے کو پورا کر دے کیونکہ اللہ نے فرمایا: ایمان لے آؤ اللہ پر۔ تو اللہ فرماتا ہے "یغفر لکم"، اللہ تمہارے لیے مغفرت عطا کرے گا۔ یہاں پر مومن کہہ رہا ہے ہمارے رب ہم تو ایمان لے آئے ہیں پس جب ایمان لے آئے

ہیں خود تو نے فرمایا ایمان لے آؤ تو اب توں ہمارے گناہوں کو معاف کر دے ہمیں مغفرت کی نعمت عطا کر دے اور ہمیں آتش دوزخ سے محفوظ رکھ لے۔

البتہ یہ بات ذھن میں رہے کہ گناہوں کی مغفرت کا مطلب آتش جہنم سے رہائی اور بہشت میں داخل ہو جانا نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیحدہ فضل ہے اللہ کی جانب سے کہ اسے آگ کے عذاب سے محفوظ رکھے کیونکہ بندہ خود اپنے اعمال کے ذریعہ آتش اور آگ سے رہائی کا مستحق نہیں ہے اور اعمال کے وسیلے سے بہشت میں نہیں جا سکتا، بندہ اللہ سے کچھ بھی مطالبہ نہیں رکھتا، ایمان اور اللہ کی اطاعت یہ خود ایک بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ نے متقین کو دی ہے لہٰذا یہ نعمت جب مل جاتی ہے تو اس نعمت کا بندے کو شکر ادا کرنا چاہیے نہ کہ بندہ طلبگار بنے۔ یہ وصف ان کا ہے جن کے لیے اللہ نے بعد والی آیت میں توصیف بیان کی ہے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝١٧

''وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں اور فرمانبرداری کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی راتوں میں گناہ بخشوانے والے ہیں''۔

مومنوں کے اوصاف

یہاں پر ان مومنوں کے اوصاف بیان کئے جا رہے ہیں جن کے لیے مغفرت ہے اور عذاب سے بچ جانا ہے۔ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اللہ کی اطاعت میں صبر کرتے ہیں، معصیت چھوڑنے پر صبر کرتے ہیں، مصیبت آ جائے تو اس پر صبر کرتے ہیں، دین کے دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرنے میں جو

سختیاں آتی ہیں تو ان پر صبر کرتے ہیں۔[1] لا الہ الا اللہ کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیتے، پتھر کے بنائے ہوئے بت، انسان کی شکل میں جو بت ہیں ان کو نابود اور سرنگوں کرنے میں لگے رہتے ہیں، دین کی مرکزیت کی حفاظت کرتے ہیں اور انسان کا جو نظام ہے اس کو ساقط نہیں ہونے دیتے اور نظام الٰہی کو قائم کرتے ہیں، ظلم کا خاتمہ چاہ رہے ہوتے ہیں اور اس سب میں صابرین صبر کرتے ہیں کیونکہ صبر کے بغیر یہ سارا عمل نہیں ہو سکتا، سختیوں پر، دردوں پر، تکالیف پر، صبر کامیابی کے لیےاور برتری حاصل کرنے کے لیے وسیلہ ہے اور وہ اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں ثبات اور ٹھہراؤ کو حاصل کرتے ہیں۔ اللہ کے اوامر کے سامنے تسلیم محض ہو جاتے ہیں، اللہ کے حکم کو اور قدر و فیصلوں کو قبول کرتے ہیں۔

پہلا اطاعت کرنے کے لیے وقت چاہے پریشان نہیں ہوتا صبر کرتا ہے۔ مصیبت آجائے تو واویلا نہیں کرتا اس کا بھی اجر ہے۔ معصیت پر صبر کا بھی ایک اجر ہے۔ یہ فرق ہے تین سو، چھ سو، نو سو کا۔اس فرق کے ساتھ صابر کو ثواب مل رہا ہوتا ہے۔

سچے لوگ ہیں حق کو بیان کرتے ہیں، ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد نہیں ہوتا اور سچائی پر چلنا ان کی کمزوریوں پر قابو پانے کا سبب بنتا ہے وہ سچ بولتے ہیں۔ حق الوھیت و معبودیت کو ادا کرتے ہیں۔ جو عبودیت اور غلام ہونے کے لیے واجب ہے اسے ادا کرتے ہیں۔ بندگی حقیقت میں قنوت و خضوع ہے، جھکاؤ ہے اللہ کے حضور اپنے آپ کو ذلت کے ساتھ پیش کرنا ہےاور اپنی ذات کی نفی کرکے خود کو مقام عبودیت میں فنا کرنا ہے یہ خصوصیات ان بندوں کی تمام عبادات میں موجود ہوتی ہیں۔

وہ انفاق کرنے والے ہیں، ان کی مال سے دوستی نہیں پستی کو چھوڑتے ہیں، ذلت کو پس پشت ڈالتے ہیں، اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مال کو بچا بچا کر

---

[1] ۔ صبر کی تین قسمیں ہیں، اطاعت پر صبر، اس کا تین سو درجہ ثواب ہے۔ مصیبت پر صبر، اس کا چھ سو درجہ ثواب ہے اور معصیت پر صبر، اس کا نو سو درجہ کا ثواب ہے۔

رکھتے ہیں، سحر کے وقت اور رات کے آخری حصے میں کھڑے ہو کر اللہ کے حضور گڑ گڑا رہے ہوتے ہیں عبادت کر رہے ہوتے ہیں استغفار کر رہے ہوتے ہیں تا کہ اس طرح ان کی روح اپنے خالق ہستی کے ساتھ پیوند ہو جائے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۟ؕ ﴿۱۸﴾

''اللہ نے اور فرشتوں نے اور علم والوں نے گواہی دی کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں وہی انصاف کا حاکم ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں زبردست حکمت والا ہے''۔

مومنین کے اوصاف پر اللہ کی گواہی

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ خود اس بات کا گواہ ہے کہ وہ کہتے ہیں سوائے اللہ کے کوئی لائق عبادت نہیں۔ پھر اللہ کی وہ مخلوق جو فرشتے ہیں جو کوئی گناہ نہیں کرتے وہ بھی اس کے گواہ ہیں اور جو صاحبان علم ہیں وہ بھی اس بارے گواہی دیتے ہیں۔ کلمہ شہادت یعنی دیکھنا آنکھ سے، خود دیکھنا، سن کے شہادت نہیں ہو سکتی البتہ تمام حواس کے ساتھ محسوس کر لینا مراد ہو سکتی ہے تو شہادت گواہی دینے کے معنی میں ہے اور اسی طرح حق قائم کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ خلاصہ اس گواہی کا اللہ کی طرف سے اور فرشتوں کی طرف سے ہے کہ اللہ سے کوئی بھی بے نیاز نہیں ہے، کوئی چیز نہیں ہے جو اللہ کی جگہ لے سکے یا انسان کو اللہ سے بے نیاز کر سکے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہر عمل قسط اور عدل پر مبنی ہے اس کی خلقت پر عدل کی حکمرانی ہے۔ عالمِ امر اسباب و مسببات کی خلقت کے ذریعے سے وجود میں آیا ہے، سبب اور مسبّب

یعنی دو چیزوں کے درمیان روابط اور تعلقات قائم کرنا اور یہ ایک خاص تدبیر کے تحت ہے۔ سب نے اللہ کی طرف پلٹنا ہے تو اس بات کی فرشتے گواہی دیتے ہیں، تسبیح کہتے ہیں اور ان کی گواہی وہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے۔ صاحبان علم اور صاحبان عقل اللہ کی آفاقی آیات کو سامنے رکھ کر اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں اور یہ عقیدہ اُن کے شعور اور احساسات میں موجود ہوتا ہے، ان کی عقلوں میں اس نے نفوذ کر رکھا ہوتا ہے اور کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں ہے وہی غالب ہے، وہی مقتدر ہے، وہی حکیم ہے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی ثنا کے لیے ہے تاکہ اس کی بزرگی کا حق بیان کیا جائے، اس کی تنزیہہ ہو کہ وہ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے کیونکہ وہی خدا ہے جو عزت کا مالک ہے، غلبہ کا مالک ہے، حکمت اسی ذات میں منحصر ہے، کسی اور کے لیے یہ چیز نہیں ہے۔ اللہ ہی ہے جو حکیم ہے، عزیز ہے، قادر ہے۔

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ وَ مَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾

”بے شک دین اللہ کے ہاں فرمانبرداری ہی ہے، اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انہوں نے صحیح علم ہونے کے بعد آپس کی ضد کے باعث اختلاف کیا، اور جو شخص اللہ کے احکام کا انکار کرے تو اللہ جلد ہی حساب لینے والا ہے“۔

دین اسلام کی حقانیت

اس آیت میں اللہ کا واحد ہونا، اللہ کی یکتائی کا ذکر ہوا ہے۔ جب کائنات کا مالک و خالق ایک ہے تو اس بات کا تقاضا ہے کہ دین بھی ایک ہو اور وہ ایک دین اسلام ہے حقیقت کے سامنے تسلیم ہونا۔ اعتقاد اور عمل کی حقیقت، پس دین نظام الٰہی ہے جو تمام انسانوں کی

ضروریات اور سعادت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، جتنی شریعتیں ہیں جو انبیاءؑ لے آئے اگرچہ مقدار اور کیفیت میں فرق ہے لیکن سب کی روح ایک ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کے احکام اور اللہ کے قوانین کے سامنے تسلیم ہونا اور اس کی اطاعت کرنا یہی بات بندوں سے مطلوب ہے اور یہی دین کا اصل ہے کہ حق معلوم ہونے کے بعد انسان حق کے سامنے تسلیم ہو جائے۔ اہل کتاب کی طرح نہ بنیں کہ حق جاننے کے بعد اس میں اختلاف کریں اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب نے اختلاف اس وقت کیا جب حق ان کے سامنے واضح ہو چکا تھا، آپس میں جھگڑا کیا اور اختلاف پر اٹھ کھڑے ہوئے یعنی ایسا نہیں ہے کہ جہالت تھی یا وہ حقیقت سے واقف نہیں تھے بلکہ حقیقت کو جاننے کے باوجود ظلم اور دشمنی پر اتر آئے اختلاف کیا اور پھر انکار کیا۔

جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا ان کو پتہ ہونا چاہیے کہ اللہ سریع الحساب ہے۔ توحید کی حقیقت میں اختلاف کفر ہے اور جاننا چاہیے کہ خداوند دنیا و آخرت میں ان کا حساب چکائے گا ان سے بازپرس کرے گا۔ دنیا میں انہیں ذلت سے دوچار کرے گا اور حقیقی سعادت سے وہ محروم ہوں گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا، خداوند تبارک و تعالیٰ کی قدرت جو مطلقہ قدرت ہے بہت تیزی سے اعمال کا حساب لیا جائے گا اس میں دیر نہیں لگے گی۔

فَإِنْ حَآجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

''پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو ان سے کہہ دے کہ میں نے اپنا منہ اللہ کے حکم کے تابع کیا ہے اور ان لوگوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں، اور ان لوگوں سے کہہ دے جنہیں کتاب دی گئی ہے اور ان پڑھوں سے کیا تم بھی تابع ہوتے ہو، پھر اگر وہ تابع ہو گئے تو انہوں نے بھی سیدھی راہ پالی، اور اگر وہ منہ پھیریں تو تیرے ذمہ فقط پہنچا دینا ہے، اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

اہل کتاب کو رسول خداؐ کا جواب

اس آیت میں رسول اکرم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اہل کتاب اگر توحید اور دین کے بارے میں آپ سے بحث و مباحثہ کریں تو ان سے کہہ دو میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوامر اور احکام کے سامنے ہماری کوئی دوسری رائے نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں کوئی شک ہے۔ اہل کتاب، مشرکین اور اُمی یعنی جن کے پاس کچھ علم نہیں ہے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، جن کے پاس کتاب نہیں ہے ان سے کہو تم اسلام لے آؤ یا نہ لاؤ اگر اسلام لے آؤ تو تم ہدایت پا جاؤ گے اور اگر جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اسے قبول کر لیں تو گویا کہ جو سعادت کی منزل ہے اس کی طرف ان کی راہنمائی ہو جائے گی اور اگر اس سے منہ موڑ لیں تو پھر اپنا نقصان ہی کریں گے لیکن اے رسول تیرے اوپر تو بات اتنی تھی کہ تو نے پہنچا دی۔

تو پہلی بات یہ ہے کہ اگر انہوں نے اعراض کیا پھر گئے تو پھر ان کے ساتھ مجادلہ، مخاصمہ اور بحث و مباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسے شخص سے بحث کرنا جو ضروریات اور واضحات کا منکر ہو، جائز نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو اللہ تعالیٰ اس بات سے منع کر رہا ہے کہ دلیل پیش کرنے میں لوگوں پر زیادہ زور دے اور اُن پر بیٹھ کر فیصلہ دے تو اللہ فرما رہا ہے نہیں آپ کا کام پیغام رسانی ہے۔ ان پر زبردستی بات ٹھونسنا نہیں ہے اور نہ ہی اتنی بات لمبی کرتے جاؤ کہ

ہر صورت چاہو کہ وہ آپ کی بات کو مان لیں اور وہ ضد بازی پر اڑے ہوئے ہوں۔ آپ کا کام ہے بات پہنچا دی بس یہی کافی ہے۔

سورہ غاشیہ کی آیت 30 میں ہے: توں ان لوگوں پر حاکم مطلق نہیں ہے، تیرا تسلط ان پر نہیں ہے کہ جو تو چاہے ویسا ہی ہو جائے۔ تیرا کام ہے پیغام پہنچا دینا، تیری ذمہ داری ختم! جس نے مان لیا تو اسکا اپنا فائدہ ہے اور نہ مانا تو اس کا اپنا نقصان ہے۔

یہاں مشرکین اور اہل کتاب کو دھمکی دی گئی ہے اور خدا فرماتا ہے کہ اللہ حاکم ہے، بینا ہے، بصیر ہے، آگاہ ہے اور بندگان کے بارے میں اللہ کا حکم نافذ ہے چاہے اسلام لے آئیں یا اسلام نہ لائیں۔ خدا ان کے انجام سے بھی واقف ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾

”بے شک جو لوگ اللہ کے احکام کا انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرتے ہیں سو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنادیں“۔

آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے والے

اس آیت میں ان کافروں کی بات کی گئی ہے کہ جو آیات الٰہی اور انبیاءؑ کو عطا شدہ معجزات کو نہیں مانتے ان کا انکار کرتے ہیں۔ ظلم اور ستم کرتے ہیں ان انبیاءؑ کو جو اللہ کے نمائندے ہیں بشریت کی ہدایت اور ان کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے آئے ہیں، ان کا کام انسانوں کو توحید پرست بنانا ہے یہ لوگ اُن انبیاءؑ کو قتل کرتے ہیں صرف انبیاءؑ ہی نہیں بلکہ

سماج میں جو بھی ظالمانہ روش کی مخالفت کرتا ہے، عدل اور انصاف کے قیام کی بات کرتا ہے اُن کو بھی قتل کرتے ہیں یہ کافر ہیں ان کا شیوہ یہودیوں جیسا ہے اور ان کی تاریخ پہلے سے جرائم سے بھری پڑی ہے یہی کام نصرانیوں نے بھی کم و بیش کیاوہ بھی اسی راستے پر چلے ان کے ان اعمال پر اللہ تبارک و تعالیٰ غضبناک ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب کے آنے کی دھمکی دی ہے بلکہ خبر دی ہے اور عذاب دُنیا کا بھی ہے اور آخرت کا بھی ہے۔ دنیاوی عذاب اُن کا قتل ہو جانا اور دربدر ہونا، اُن کے اموال کا ضائع ہو جانا، اُن کی جانوں کا ختم ہو جانا، ان کی آپس میں دشمنیاں ہونا اور یہ قیامت تک ایسے رہے گا اور آخرت کا عذاب دوزخ کا عذاب ہے جو ان کو نصیب ہو گا یہ سب ان کے جرائم، غلط روش اور ایسے رویوں کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اپنائے رکھا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٢٢﴾

''یہی وہ لوگ ہیں جن کی دنیا اور آخرت میں محنت ضائع ہو گئی اور اُن کا کوئی مددگار نہیں۔''

محنت کا ضائع ہونا

اس آیت میں دو نکات ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس جرم میں قتل کرتا ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر رہا ہے تو ایسے شخص کے سارے اعمال باطل اور حبط ہو جائیں گے ان اعمال کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ایسے لوگوں کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہو گی، ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں ہو گا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہو گا، یہ عذاب سے نہیں بچ سکیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں ایک حصہ کتاب کا ملا، وہ اللہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ کتاب ان میں فیصلہ کرے، پھر ایک فرقہ ان میں سے پھر جاتا ہے ایسے حال میں کہ وہ منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں''۔

اہل کتاب کا حق سے منہ موڑنا

یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ یہ جو کتاب ان کے ہاتھ میں ہے یہودیوں اور نصرانیوں کے ہاتھ میں جو کتاب موجود ہے، یہ پوری وہ کتاب نہیں ہے جو اللہ نے اتاری تھی، انہوں نے اس کتاب میں تحریف کردی البتہ اسکا کچھ حصہ اصلی کتاب والا ہے اور زیادہ تر بدل دیا گیا ہے اور ان کو جب اللہ کی کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی کتاب کی بنیاد پر تمہارے درمیان فیصلہ دیا جائے گا تو اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے اور منہ موڑ لیتے ہیں۔

یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کے اندر ایک ایسی علت اور سبب پیدا ہو چکا ہے کہ یہ لوگ خود کو سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ہیں، ہم ہی عزت والے ہیں اور اعلان کرتے ہیں ''نحن ابناء اللہ'' ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں۔ اور اس غرور کی وجہ سے تحریف شدہ کتاب میں کہتے ہیں ''لن تمسنا النار'' ہمیں تو آگ نہیں چھوئے گی اور اگر چھوئے بھی تو تھوڑی مدت کے لیے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ سے بے نیاز سمجھتے ہیں ''ید اللہ مغلولہ'' کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ تو بندھا ہوا ہے اللہ کو عاجز سمجھتے ہیں یہ ان کے تین بڑے جرائم ہیں، پہلا جرم یہ ہے کہ یہ لوگ کہیں گے اللہ کے بیٹے ہیں اور اس وجہ سے دوسروں پر اپنی برتری جتاتے ہیں، دوسرا جرم

یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو آگ چھوئے گی بھی نہیں اور اگر چھوئے گی تو تھوڑی مدت کے لیے۔ تیسرا جرم یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں اللہ عاجز ہے کہ ہمیں عذاب دے سکے۔ جب خدا کے بیٹے بن بیٹھے، آتش دوزخ میں کہا ہم نہیں جائیں گے کیونکہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور یہ کہہ دیا اللہ کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ یہ سب حق اور حقیقت سے روگردانی کا سبب ہوا اور آسمانی کتاب سے انحراف سبب بنا جو ان کے لیے عذاب الٰہی ہوگا اور اسی وجہ سے جہنم میں جائیں گے وہاں پر یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہرگز آگ نہیں لگے گی مگر چند دن گنتی کے، اور ان کی اپنی بنائی ہوئی باتوں نے انہیں دین میں دھوکہ دیا ہوا ہے"۔

بنی اسرائیل کا اپنی نجات کا غلط دعویٰ

اہل کتاب کی بد اعمالیوں کے اسباب بیان کیے جا رہے ہیں کہ ان کے اس دعویٰ کے مطابق تو اللہ عادل نہیں ہے اسی لیے یہ لوگ کتاب کے مندرجات پر عمل کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ کہتے تھے ہمیں جہنم بھیجا بھی گیا تو چند دن کے لیے جائیں گے اور واپس نکل آئیں گے۔ تو یہاں پر کس چیز نے ان کو غرور میں ڈالا، کہ اللہ پر انہوں نے افتراء باندھا، جو بعد والی نسلیں آئیں وہ بھی اسی دھوکہ میں جو انکے پہلوں نے افتراء باندھا تھا وہ اس سے مغرور ہو گئے اس طرح وہ ساری اُمت ایک بات پر اکٹھی ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کی اس بد عملی سے خوش ہوئے۔ خود کو بھی دھوکہ دیا اور تکبر کیا، اپنے اوپر ستم کیا، وہ شہوت پرستی میں لگ گئے اور اس کو اور مستحکم کیا وہ ان تہمتوں کا تکرار کرتے رہے اور اس طرح وہ اسی عقیدے پر آ گئے۔ یہ

سب جو کچھ ان کے بارے بتایا جارہا ہے کہ یہ سب باتیں ان کی اپنی اختراعات اور ایجادات کی وجہ سے ہوئیں۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

''پھر ان کا کیا ہوگا جب ہم انہیں ایک دن جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور ہر کسی کو اپنی کمائی کا اجر پورا دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

قیامت کے دن سب کا جمع کیا جانا

یہ آیت اہل کتاب کے لیے ایک دھمکی ہے ان سے کہا گیا کہ وہ دن تو آنا ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے، جب وہ دن آئے گا تو سب کو اکٹھا کریں گے یہ اللہ نے فرمایا ہے۔ قیامت کے دن حساب ہوگا اور مومن اور کافر ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور اس دن ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے دنیا میں انجام دیا ہے کسی سے کچھ بھی کم نہیں ہوگا۔ کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا، عدل الٰہی پوری طرح جاری اور نافذ ہوگا، کوئی اللہ کے احتساب سے نہیں بچ سکتا، اللہ کا جو برحق فیصلہ ہے اس سے فرار کوئی نہیں کر سکتا اور وہ ہی ہے کہ جو ان کے اعمال کی بنیاد پر ان کی بازپرس کرے گا اور عدل کی بنیاد پر فیصلہ صادر فرمائے گا اس دن ذلت کے ساتھ وہ اس فیصلے کے سامنے تسلیم ہونگے۔ دنیا میں تو بہت اہل کرامت تھے لیکن وہاں ذلت و خوارگی ان کا مقدر ہوگی وہاں اپنے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

''توں کہہ اے اللہ، بادشاہی کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، جسے تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے تو چاہے ذلیل کرتا ہے، سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

اقتدار اور عزت اللہ کی طرف سے ہے

اس آیت میں رسول پاک ﷺ کو بتایا گیا کہ آپؐ ان سے کہیں کہ ان کو چاہیے کہ اللہ کی پناہ میں آئیں، خیر مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے اہل کتاب ان خیالی باتوں اور باطل گفتگو کو چھوڑیں جو ملک اور عزت انہوں نے اپنے لیے فرض کر رکھی ہے یہ سب اللہ کے متعلق ہے، وہی سارے ملک کا مالک ہے، حقیقی مالکیت اور اعتباری مالکیت سب اسی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے تمام انسانوں کا اور جو کچھ انسانوں کے پاس ہے اس کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو اللہ جسے چاہے مملکت دے، جس سے چاہے لے لے، جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔

مالکیت چاہے حق ہو یا ناحق ہو، ہر صورت یہ اللہ کی طرف سے ایک نعمت اور عطاء ہوتی ہے۔ لیکن جو نااہل ہوتے ہیں اُن کے لیے بدبختی ہوتی ہے۔ لیکن ہر حال میں خدا کی طرف سے ہے وہ اسباب جو اللہ نے بنائے ہیں اور اسباب کا جو اثر ہے وہ بھی اللہ کا بنایا ہوا ہے اور یہ سب بندگان کے لیے آزمائش اور امتحان کا وسیلہ ہے۔ اس جگہ اور دوسری جگہوں پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس مطلب کو اپنی مشیت اور اپنے ارادے سے مقید کیا ہے۔ اس کا معنی یہ

نہیں ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنے کاموں کو بے ہودہ اور بغیر کسی اولویت اور ترجیح کے انجام دیتا ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے، وہ جو کرتا ہے تو پورے اختیار کے ساتھ کرتا ہے اس کے جتنے بھی اعمال ہیں ہر صورت میں مصالح اور مفادات کے تابع ہیں۔

عزت، اقتدار، ذلت اور خوارگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے اسی نے اسباب بنائے ہیں اور جو بھی جس قسم کا سبب تیار کرے گا تو اس کو اسی سبب کا اثر ملے گا، عزت معنی ہے نایابی، ایسی چیز جہاں پہنچنا سخت ہو۔ ذلت ایسی چیز جس کا حصول آسان ہو چاہے حقیقت میں ہو یا فرضی ہو۔ عزت یہ ملک کے لوازمات سے ہے، عزت مطلق ہر لحاظ سے غلبہ، ہر لحاظ سے شرف، ہر لحاظ سے قدرت، اقتدار؛ یہ ملک کے لوازمات سے ہے اور خدا کے علاوہ یہ اقتدار کسی کے لیے نہیں ہے۔ خدا کہ وہ کسی ایک کو اقتدار دیدے کہ اقتدار کے اسباب اس کے پاس پہنچ جائیں اور وہ اقتدار پر آجائے۔ جس کسی کے پاس کچھ اقتدار ہے یا مملکت ہے تو اللہ کی جانب سے ہے اور اللہ چاہے تو وہ عزت چھین لے اور پستی و ذلت اس کے مقدر میں ہوں۔

اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ﴿۱۳۹﴾ (سورہ النساء، آیت ۱۳۹)

ترجمہ: کیا ان کے ہاں سے عزت چاہتے ہیں، سو ساری عزت اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

اقتدار اور عزت اللہ کے لیے ہے

رسول پاک ﷺ سے کہا گیا ہے کہ اے اللہ تیرے پاس ہی خیر ہے اچھائی ہے یعنی سارے خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ خیر وہی انتخاب ہے جب کسی چیز کو خیر کا نام دیا جاتا ہے تو اس لیے ہے کہ اس کا تقابل دوسری اشیاء سے ہوتا ہے ان کے مقابلے میں اُس کی بہتری جو ہو اسے خیر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہدف اور مقصد کو پورا کر رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا خیر محصور ہے اللہ

تعالیٰ کی ذات میں کیونکہ اللہ خیر محض ہے، وہ ہے جو خیر کو عطاء کرتا ہے، پس خیر و شر تکوینی امور میں بھی ہیں جیسے مملکت، اقتدار دینا، اقتدار نہ دینا؛ یہ تکوینی امور کا حصہ ہیں اور خیر و شر تشریعی امور میں بھی ہے جیسے اطاعت کی جتنی اقسام ہیں، معصیتوں کی جتنی اقسام ہیں، انسان اپنے اختیار سے اُن کا ارتکاب کرتا ہے۔ لیکن یہی خیر و شر اللہ کی طرف منسوب ہے کیونکہ اللہ عمل خیر کی توفیق انسان کو دیتا ہے ایسے حالات بناتا ہے اور وہ ایسے اسباب اختیار کرتا ہے جن اسباب کا نتیجہ خیر ہوتا ہے، بہتری ہے، اچھائی ہے۔ سبب کا خالق بھی اللہ ہے اور سبب کی تاثیر بھی اللہ نے رکھی ہے اسی لیے اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں لیکن اس کا انتخاب انسان نے اپنے اختیار سے کیا ہے تو یہ توفیق سلب بھی ہو سکتی ہے اور انسان خیر کے بجائے شر کا ارتکاب کرتا ہے وہ ایسے سبب کو اختیار کرتا ہے جس سبب کا نتیجہ اور اس کی تاثیر شر ہے، تکلیف ہے اور انسان الٰہی اوامر جو خیر کے امور ہیں اُن کی مخالفت کرتا ہے۔

درحقیقت انسان نے اپنے اختیار سے خیر اور شر میں اللہ کے امور کی خلاف ورزی کی ہے تو اے اللہ تو ہی قادر ہے ہر چیز پر یعنی جو پہلے باتیں آئی ہیں اس کو یہاں پر یہ بتایا گیا کہ خیر بھی تیرے ہاتھ میں ہے، قدرت مطلق بھی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہی قادر ہے، غیر خدا کسی چیز پر قادر نہیں ہے تو ہی اسباب کا خالق، تو ہی اسباب کی تاثیر کا خالق، تو ہی مسببات کا خالق، ہر شئے تیری قدرت کی طرف منسوب ہے، تمام قدرتیں تیری قدرت سے وجود میں آتی ہیں۔ اور جس طرح خیر پر قادر ہے اسی طرح شر پر بھی ہے، قدرت اور خیر تیری ذات ہی میں محدود ہے، کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ تیری خدائی تیرا نام برتر ہے بلند مرتبہ ہے بلند شان ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

''توں رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، اور جسے تو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

دن اور رات کا نظام اللہ کے ہاتھ میں ہے

''ایلاج'' داخل کرنے کو کہتے ہیں۔اس آیت میں دن رات کا فرق بیان کیا جارہا ہے کچھ لمبی راتیں ہوتی ہیں دن چھوٹا ہوتا ہے ، دن لمبے ہوتے ہیں رات چھوٹی ہوتی ہے یہ جغرافیائی طور پر شہروں کے عرض و طول میں جو فرق ہوتا ہے اس بنیاد پر ہے اور جو فصلیں آتی ہیں جو موسم بدلتے ہیں، سردیوں میں دن چھوٹے، راتیں لمبی۔ گرمیوں میں دن لمبے راتیں چھوٹی، تو یہاں رات کو دن میں داخل کرنا ، دن کو رات میں داخل کرنا ؛ یہ سب اللہ کی ہدایت پر ہے اور اللہ کی طرف سے یہ نظام کا حصہ ہے اور مردے کو مردے سے زندہ نکالنا اور زندہ سے مردہ نکالنا، یہ ایسے ہی ہے کہ مومن کو کافر باپ کی صلب سے لانا اور کافر کو مومن کی صلب سے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایمان کو حیات و نور کہا ہے اور کفر کو موت اور تاریکی کہا ہے۔

سورہ انعام کی آیت 122 میں ہے:

اَوَ مَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِىۡ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا

''بھلا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے اسے روشنی دی کہ اسے لوگوں میں لیے پھرتا ہے وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو وہاں سے نکل بھی نہیں سکتا''۔

خلق کرنا زندوں کو مردہ خاک سے اور پھر ان کو مارنا اور واپس نکالنا اسی مٹی سے اور اسی طرح گھاس، دانے اور اجناس کو بے جان مٹی سے نکالنا اور پھر زمین کی اس سے آبادی ہونا؛ اس آیت میں یہ قوت بیان ہوئی ہے جو تعبیر موجود ہے وہ صاحبان عقل پر مخفی نہیں ہے یہ آیت اور اس سے پہلے جو آیت آئی ہے، جس میں عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہونے سے متعلق بیان ہوا ہے ان میں لطافت اور خوبصورتی بڑی واضح ہے اللہ ہی وہ ہے جو بے حساب روزی جس کو چاہے دیتا ہے یہ اسی حوالے سے مطالب کا بیان ہے کہ مُلک، عزت، رات کو دن میں داخل کرنا، دن کو رات میں داخل کرنا، زندہ کرنا، مارنا یہ سب اے اللہ تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہی مخلوق کے امور میں تصرف رکھتا ہے، تو ہی اپنے امر میں غالب ہے اور جس کو چاہے بے حساب روزی دے یہ تیرا ہی اختیار ہے کسی اور کا اختیار نہیں ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

''مسلمان مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، اور جو کوئی یہ کام کرے اسے اللہ سے کوئی تعلق نہیں مگر اس صورت میں کہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو، اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

مسلمان، کفار سے دوستی نہ کریں

اس آیت میں مومنین سے کہا گیا کہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست نہیں بناؤ۔ جبکہ مومنوں کے درمیان ایسے بندے ہوں جو آپ کے سرپرست بن سکتے ہیں۔ ولایت

حقیقت میں مالکیت اور امر کی تدبیر اور معاملہ نپٹانے کے بارے میں ہے۔ ولی عام طور پر محبت اور دوستی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کافروں کو ولی بنانے کا مطلب روحانی طور پر ان کے ساتھ یکجا ہونا ہے اور ان کی پیروی اور ان سے متاثر ہو جانا ہے زندگی کے معاملات میں اور ان کو مومنوں پر ترجیح دینا ہے۔

بتایا گیا کہ ایمان اور کفر دو صفات ہیں دونوں جدا جدا ہیں لہٰذا کافروں کو مومنین سے ولایت، دوستی اور تعلق داری میں بھی جدا جدا ہونا چاہیے اور یہی زندگی کے لیے بہترین ہے اور کفار کئی درجہ مومنوں سے کمتر ہیں اور ان کی نسبت میں وہ حقیر ہیں۔ لہٰذا اچھا نہیں ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ دوستانہ اور ولایتی تعلق رکھیں۔ اور جو شخص بھی ایسا کرتا ہے تو اللہ کے نزدیک اس کی کوئی حرمت نہیں ہے۔ ایسا شخص کہ اس کا نام بھی نہیں آنا چاہیے یہ اس قدر برا عمل ہے۔ یہ کنایہ ہے اس سے کہ ہم اس کا نام ہی نہیں لیتے۔ اللہ کے ہاں اس کی کچھ حیثیت نہیں ہے، کسی کام میں کسی حالت میں کسی طور پر وہ اللہ کی جماعت سے نہیں ہے۔ اُن کی کوئی حیثیت نہیں ہے نہ دینی نہ عقیدتی نہ ولائی۔ ان کا مومنوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا اللہ کی جماعت سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے، جو لوگ کافروں سے دوستی لگا بیٹھے ہیں ان کے لیے ایک صورت کا استثناء کیا گیا ہے کہ اگر ایسا تقیہ کی وجہ سے ہو یعنی ایک ایسا عمل انجام دیتے ہیں کہ اس میں جان کی حفاظت مد نظر تھی یا عزت اور آبرو مد نظر تھی یا کوئی خوف تھا تو اس کے لیے یہ عمل صحیح ہے، اور یہ عمل دل سے جوڑ نہیں اور نہ ہی دل سے محبت اور ولایت ہے۔ ایسی ولایت اور سرپرستی حقیقت میں واقعی اور حقیقی ولایت اور سرپرستی نہیں یہ استثناء منقطع ہے اور آئمہ اہل البیت علیہم السلام کی روایت کے بھی مطابق ہے کہ تقیہ جائز ہے۔

تقیہ ایسے موارد پر ہوتا ہے کہ جہاں انسان نے اپنے کسی بڑے ہدف کی خاطر ظاہری طور پر کچھ اور عمل کر دیا ہے یا ظاہری طور پر کچھ بات کہہ دی ہو۔ اس کی مفصل بحث ہے

جو عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات کے بارے میں چوکنا کرتا ہے کہ ڈرو اللہ کے غضب سے کہ تم سب نے اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

"حذر" کا معنی بچاؤ ہے، احتراز ہے، ڈر ایسے عمل سے جو وحشتناک ہے۔ تو عذاب الٰہی کا خوف ہونا چاہیے اور اس سے ڈرنا چاہیے اور ایسا امر سامنے نہ ہو جو اس کے مانع ہو، کوئی بھی اُمید نہیں جو اس شر سے بچا سکے، اور مجرم سے وہ شر دور کر سکے۔ خود خدا ہی ہے جس سے اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ اس بدی کو اس سے دُور کر دے لہٰذا کافروں کو دوست بنانا اور مومنوں کو چھوڑنا اور ان کی دوستی اور ولایت رکھنا یہ عبودیت سے خروج ہے، اللہ تعالیٰ کی ولایت سے دوری ہے اور دین سے فساد میں خود کو داخل کرنا ہے، یہ عمل فساد کرنا ہے طغیان ہے فطری نظام میں اور یہ بدترین اور خطرناک ترین ہے دین کے لیے نقصان دینے والا امر ہے۔ اس کا ضرر کافروں کے کفر اور مشرکین کے شرک سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کی دشمنی دین کے ساتھ آشکار ہے اور آسانی کے ساتھ ان کا مقابلہ ہو سکتا ہے اور ان کے شر کو دین کے مرکز سے دُور کیا جا سکتا ہے لیکن جو مسلمان دین سے دوستی کا دعویٰ رکھتا ہے اور دل میں دین کے دشمنوں کا دوست ہے تو اس کا ضرر کافروں کے کفر سے بھی بہت زیادہ ہے، کیونکہ دوستوں سے اُنس اور محبت ہوتی ہے اور دین کے دشمنوں سے اُنس اور دوستی ہلاکت کا سبب ہے اور پھر اُن کے لیے بقاء اور حیات کی اُمید نہیں ہے، یہ اللہ کے حکم پر طغیان اور سرکشی ہے اور دین کو باطل کرنا اور فاسد کرنا ہے اسی لیے خداوند اس سے خبردار کرتا ہے اور حتمی عذاب ایسے لوگوں کے لیے ہے اور یہ خدا کی طرف سے چوکنا اور خبردار کیا گیا ہے اور کوئی درمیان میں حائل اور رکاوٹ نہیں ہے۔ پس سب کی واپسی اللہ کی طرف ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں ہے اور اللہ کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

"تو کہہ دے کہ اگر تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اسے اللہ جانتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اسے وہ جانتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اللہ کی ہر چیز سے آگہی

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ رسولؐ کو یہ حقیقت بتانے کے لیے مامور کیا کہ ان کو بتاو جو تمہارے دلوں میں ہے چاہے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ سب کچھ جانتا ہے یہ نہ سمجھو کہ اللہ کو معلوم نہیں ہے جو تم نے سوچا ہے اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے، خدا بزرگ تر ہے کہ افراد کے آئندہ کے بارے میں جانتا ہے اور تم اس کی مخالفت کرو اور اللہ سے اس بات کو چھپانا چاہیں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ سب سے آگاہ ہے۔ اور یہ انسان بھی تو اسی زمین میں رہتا ہے اس کے بارے ہر چیز اللہ کے سامنے ہے کچھ بھی اللہ سے مخفی نہیں ہے، ہر چیز پر اللہ کی قدرت کے تحت احاطہ علمی ہے، ہر چیز اس کے اقتدار کے تحت ہے وہی لامحدود قدرت کا مالک ہے۔

یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۛۚ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۛۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَ بَیْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

"جس دن ہر شخص موجود پائے گا اپنے سامنے اس نیکی کو جو اس نے کی تھی، اور جو کچھ کہ اس نے برائی کی تھی، اس دن چاہے گا کہ کاش درمیان اس کے اور درمیان

اس کی برائی کے مسافت دور کی ہو، اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اور اللہ بندوں پر شفقت کرنے والا ہے"۔

قیامت کے دن ہر عمل کا حاضر ہونا

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جو عمل ہم کر رہے ہیں یہ عمل یہی رہ جائے گا، اللہ فرمارہا ہے کہ یہ یہیں نہیں رہے گا، نیک عمل ہے یا برا عمل ہے پورا عمل قیامت کے دن موجود و حاضر ہوگا خود عمل موجود ہوگا یہاں اعمال کے تجسم کی بات ہو رہی ہے، جو اس نے برائی کی ہے جب وہ اس کے سامنے ہو گی تو وہ برائی کو دیکھ کر پریشان ہوگا وہ اس وقت کہے گا کاش کہ میرے درمیان اور اس برائی کے درمیان فاصلہ ہوتا۔ یہاں خیر و شر کو نکرہ لایا گیا ہے تاکہ عمومیت کا فائدہ دے اور "امد" سے مراد زمانی فاصلہ ہے لیکن اس کے سامنے عمل کا حاضر ہونا اس کے لیے بے آرامی کا سبب ہو گا لہٰذا وہ اپنی ذات سے آرزو کرے گا کہ کاش میرے درمیان اور میرے اس عمل کے درمیان بہت لمبی دوری ہوتی لیکن اس کی یہ خواہش وہاں پوری نہیں ہو گی۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ (سورہ زخرف، آیت: 38)

ترجمہ: "یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی پس کیسا برا ساتھی ہے"۔

قیامت کے دن گناہگاروں کی آرزو

اللہ تعالیٰ دوبارہ خبردار کرنے کے لیے اس مطلب کا ذکر کرتا ہے "یحذرکم اللہ نفسا" اللہ تمہیں اپنے بارے میں چوکنا کرتا ہے، ڈراتا ہے، خبردار کرتا ہے۔ یہ اس مطلب

کی اہمیت کے پیش نظر ہے کہ معصیت کا انجام آخرت میں خطرناک ہے۔ اللہ اپنے بندگان پر مہربان ہے، اللہ کو اپنے بندے بہت پیارے ہیں لیکن بندے جب خود غلطی کرتے ہیں اور اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو پھر انہیں دھمکایا گیا ہے، رلایا گیا ہے، خبردار کیا ہے۔ یہ اس بات کا اقرار ہے کہ جو یہ کہنے والا ہے وہ تمہارا خیر خواہ ہے اور فرد کی اصلاح و بہتری کے سوا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور پھر وہ اس کو اس وقت آگاہ کر رہا ہے جب وہ ابھی اس مصیبت میں یا اس گناہ میں گرفتار نہیں ہوا تاکہ وہ بچ جائے اور خود کو بچائے اور اگر وہ خود کو نہ بچائے تو پھر وہ خود ہی مجرم ہے۔ اللہ تو اپنے بندگان پر مہربان ہے۔ اللہ نے تو سب کچھ بتا دیا تھا اب آخر میں گناہگاروں کی آرزو کہ کاش ایسا نہ ہوتا تو اسکا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۱﴾

"کہہ دو اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو تاکہ تم سے اللہ محبت کرے اور تمہارے گناہ بخشے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

اللہ کی محبت کا معیار

یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ پر خالص ایمان لانے، اللہ کی خالص بندگی اور شرک سے اجتناب کی دعوت ہے، جب انسان کے دل میں اللہ کی محبت ہو گی اور غیر خدا کی محبت دل سے نکلے گی، بتوں کی محبت، شرکاء کی محبت، دُنیاوی مقاصد کی محبت جب دل سے نکلے گی اور فقط اخروی بہشت میں جانا اور دوزخ سے چھٹکارا پانا یہ سب کچھ ذہن میں ہوگا تو انسان کو طالب اور مطلوب کے درمیان جو رابطہ ہے اسے اختیار کرنا ہوگا طالب اور مطلوب کا رابطہ محبت ہے، محبت ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو محبوب کے ساتھ جوڑتی ہے۔

اسی لیے یہاں پر بتایا گیا کہ اگر اللہ کے ساتھ محبت اور تعلق بیان کرنا ہے تو اس تعلق کی ایک نشانی ہے، وہ نشانی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی جائے، رسول اللہ ﷺ کی پیروی کا مطلب ہے کہ وہ جو قوانین و شریعت لے کر آئے ہیں ان پر عمل کیا جائے تو پھر اس محبت کرنے والے کو بشارت دی جا رہی ہے کہ جب تم اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت پر عمل کروگے، اللہ کے رسولؐ کی اتباع کروگے تو جس سے محبت کر رہے ہو جو تمہارا محبوب ہے وہ بھی تم سے محبت کرے گا ایک محب کے لیے اس سے برتر اور بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے عاشق سے اس سے بڑھ کر اور کیا ہے کہ محبوب اور معشوق اس سے محبت کرے اور خالی محبت ہی نہیں بلکہ محبت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جو تمہاری غلطیاں ہیں وہ بھی تمہیں بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا ہے بہت مہربان ہے اور پھر یہ بات ایک حد پر نہیں رکتی۔ فیض الٰہی مسلسل جاری رہے گا، گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کرامت اور رحمت تک پہنچنے میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ بندہ جو گناہ کرتا ہے تو اللہ اور بندے کے درمیان حجاب آجاتا ہے اور اگر گناہ چھوڑ دے اور محبت آجائے عشق آجائے اس محبت اور عشق سے وہ سارے حجاب اتر جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور وہ حجاب ختم ہو جاتا ہے اور اللہ معاف کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔

(اسی حوالے سے مشہور حدیث رسول ﷺ ہے ''من اراد ان یحبه الله فلیحب حسینا'' جو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ اس سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ حسین علیہ السلام سے محبت کرے۔ کیونکہ حسین علیہ السلام سے محبت اور عشق انسان کو اللہ کا عاشق بناتا ہے

اللہ کا محبوب بننے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حسین علیہ السلام سے محبت کرو تو تمہیں اپنے محبوب کی محبت نصیب ہو گی۔[1]

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

"کہہ دو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا"۔

اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت

یہاں پر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کا حکم ہے، صراط مستقیم پر چلو۔ صراط مستقیم ہی اللہ کا راستہ ہے اور اس سے مقصود اسلامی شریعت ہے، اسلام کے قوانین ہیں۔ یہاں پر اللہ اور اللہ کے رسول کا الگ الگ ذکر کیا ہے جبکہ اللہ کے رسول کا راستہ تو وہی اللہ کا ہی راستہ ہے، فقط ایک ہی کہہ دیتے تو بات وہی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ اطاعت خلوص کے ساتھ ہو اور رسول اللہ ﷺ کا راستہ اخلاص کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ عوام تک اللہ کے اوامر اور نواہی کی صورت میں جو احکام پہنچاتے ہیں وہی اللہ کی اطاعت کا ذریعہ ہے، اسی لیے واضح اعلان کر دیا جو اللہ اور اللہ کے رسول سے منہ موڑ لے اور ان کی بات نہ مانے تو پھر اللہ ان سے محبت نہیں کرتا، یہاں اللہ نے اپنی محبت کی نفی کر دی کافروں سے اور مومن جو کہ اللہ کے محب ہیں پیروکار ہیں رسول اللہ ﷺ کے تو اسے اللہ کی دوستی اور محبت نصیب ہوتی ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے اور یہاں پر کفر سے مراد فروع دین کا کفر ہے نماز کا انکار کر دے، روزے کا انکار کر دے، حج کا انکار کر دے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا انکار کر دے۔ یہاں

---

[1] ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مولا حسین علیہ السلام کے محبوں سے قرار دے تاکہ ہم اللہ کے پیارے بن جائیں اور اللہ ہم سے محبت کرنے لگ جائے۔ (مترجم)

پر اصول دین کا کفر مراد نہیں ہے۔ مثلاً جو شخص زکوۃ کا انکار کرتا ہے، نماز کا انکار کرتا ہے اور اللہ کے دشمنوں سے دوستی رکھتا ہے تو ایسے افراد کے کفر کا انجام بتایا گیا ہے کہ ان کا انجام اسی طرح کا ہے جس طرح اصول دین میں کفر کرنا اور اصول دین میں جس طرح اللہ کو نہ ماننا، شرک کرنا تو فروع دین میں کفر کرنا بھی اسی طرح ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۳﴾

”بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور ابراھیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو سارے جہان سے پسند کیا ہے“۔

سارے جہان سے پسندیدہ بندے

یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ گروہ کی بات کی ہے۔ اصطفاء کا معنی کسی چیز کو ہر چیز سے خالص بنا کر لے لینا جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ تمام عالمین میں سے اللہ جن کو چن رہا ہے وہ خالص ہیں۔ اور اس انتخاب کے عمل میں اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔ پہلا انتخاب جس کو اللہ نے خالص اپنے لیے بنایا ہر شک و شبہ سے پاک، ہر گناہ سے پاک؛ وہ آدم علیہ السلام ہیں، وہ اللہ کے پہلے خلیفہ ہیں وہ انسانوں کے باپ ہیں، فرشتوں نے ان کا سجدہ کیا اللہ کے حکم سے اور وہ پہلا انسان ہے جس کے لیے اللہ نے توبہ کا دروازہ کھولا اور وہ پہلے انسان ہیں جن کے لیے دین کی تشریع ہوئی، وہ ہی سب سے پہلے شریعت لے کر آئے۔ دوسرے نوح علیہ السلام ہیں، نوح علیہ السلام ان پانچ اولوالعزم پیغمبروں سے ہیں جن کے اوپر کتاب بھی اتری اور قانون اور شریعت بھی اور یہ نوع انسانی کے دوسرے باپ ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے ان کو اور ان کے پیروکاروں کو سلامتی دی، ہلاکت سے بچایا اور اُن کے توسط سے انسانوں کی نسل اور اولاد کو دوام بخشا۔ تیسرا ابراہیم علیہ السلام کا خاندان، "آل "ہر چیز میں سے جو اس کے ساتھ خاص ہوتی ہے اس کو آل کہتے ہیں۔ یہاں پر حضرت ابراہیم

علیہ السلام کے جو قریبی ہیں وہ مراد ہیں اور اس جگہ وراثت کا معنی عقیدے میں وراثت ہے کہ آل ابراہیم علیہ السلام سے مراد ان کی پاکیزہ اولاد ہے جن کے پاس اللہ کی نمائندگی تھی، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور بنی اسرائیل سے جو انبیاءؑ تھے وہ مراد ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل، کیونکہ ان سے آگے نسل چلی ہے اسحاقؑ کا ایک ہی بیٹا یعقوبؑ تھا اور اسی طرح اسماعیلؑ ہیں کہ ان کی اولاد طیب و طاہر ہے کہ ان میں افضل اور سید اور سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور پھر اُن کے اوصیاء، اہل البیت علیہم السلام ہیں۔ آل عمران، عمران کا خاندان۔

عمران حضرت مریم علیہ السلام کے باپ تھے یہاں آل عمران سے مراد مریم اور عیسیٰ علیہ السلام اور عمران کی بیوی عالمین پر سارے انسانوں پر ان کو برتری تھی، اُن کو عالمین پر برتری دینا اس کے منافات نہیں رکھتا کہ اُن کے علاوہ کچھ اور کو بھی برتری دی گئی ہو یا اُن کا آپس میں ایک دوسرے پر برتری ہو کیونکہ سب انبیاءؑ کا ذکر تو نہیں کیا اس میں اجمالاً سب کا تذکرہ آجاتا ہے اور اس میں فرق نہیں ہے اگر اُن کا آپس میں ایک دوسرے پر جو تفاضل اور برتری ہے وہ بھی اس میں شامل ہو۔ یہ کلی حکم ہے کہ تمام انسانوں پر اس گروہ انبیاءؑ کو اور ان کی آل کو برتری دی گئی۔ تمام انبیاءؑ میں حضور پاک ﷺ کو سب پر برتری حاصل ہے اور اس کا تذکرہ آل ابراہیم علیہ السلام کے ضمن میں کر دیا گیا ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کا ذکر کیا جس سے بنی اسرائیل کے انبیاءؑ مراد ہیں اور حضرت اسماعیلؑ سے حضور پاک ﷺ کی ذات والا صفات اور آپؐ کی آل پاک علیہم السلام مراد ہیں۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

"جو ایک دوسرے کی اولاد تھے، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

"(وہ وقت یاد کرنے کے لائق ہے) جب عمران کی عورت نے کہا اے میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اسکو میں تیری نذر کرتی ہوں کہ اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی سو تو مجھ سے اسے قبول فرما، بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے"۔

حضرت عمرانؑ کی بیوی کا نذر ماننا

انسان بعض دفعہ نذر اور منت کے ذریعے اپنے اوپر کسی عمل کو واجب کرلیتا ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ اللہ کے لیے ہو، محرّراً یعنی قید سے آزاد کرنا، یہاں مراد یہ ہے کہ جب بیٹا ہو گا تو ماں باپ کی اخلاقی قید میں ہوتا ہے اور ماں باپ کی باتیں اسے ماننا ہوتی ہیں، واجبات کے علاوہ اگر والدین روزہ مستحبی رکھنے سے روک دیں تو نہیں رکھ سکتا، نماز تہجد سے روک دیں تو نہیں پڑھ سکتا۔ ماں باپ کی اولاد پر ولایت ہوتی ہے، حضرت عمرانؑ فوت ہو چکے تھے کیونکہ حضرت عمرانؑ موجود ہوتے تو اس کی بیوی کو یہ سارا حق نہیں تھا کہ اپنے بیٹے کو ذمہ داریوں سے آزاد کر دے جو اولاد کی ذمہ داریاں ماں باپ کے لیے ہوتی ہیں۔ اس میں شوہر کا دخل بھی ہوتا تھا۔

مقصد یہاں یہ تھا کہ میں اسے اللہ کی ولایت میں دے دُوں گی اور وہ فقط اللہ کی عبادت کرے گا اور اللہ کی مسجد اور کلیسا جو بھی مقدس مقامات ہیں وہ اسی میں رہے گا اور یہاں تک کہ بالغ ہو جائے اور خود صاحب اختیار ہو تو پھر اس کی مرضی ہے کہ وہیں پر ٹھہرے یا وہاں سے نکل جائے تو پھر درخواست کی کہ میری منت اور آرزو اللہ قبول کرلے اور اللہ سے یہ

بھی عرض کیا اس سے اپنا عقیدہ ظاہر کیا کہ اللہ ہی بات کو سنتا ہے اور اللہ ہی ہر نیت سے آگاہ ہے۔ یہ میری نیت خالص ہے جو اللہ کے حضور پیش کی ہے، اللہ اس میں میری مدد کرے گا اور میری اس منت کو قبول فرمائے گا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

''پھر جب اسے جنا تو کہا اے میرے رب میں نے تو وہ لڑکی جنی ہے، اور جو کچھ اس نے جنا ہے اللہ اسے خوب جانتا ہے، اور بیٹا بیٹی کی طرح نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے بچا کر تیری پناہ میں دیتی ہوں''۔

مادر مریمؑ کی اپنے رب سے مناجات

حضرت عمرانؑ کی زوجہ نے تو یہ سوچ کر منت مانی تھی کہ لڑکا ہوگا اور اسے اللہ کے گھر میں چھوڑ دیا جائے گا، بالغ ہونے تک وہ خدا کی عبادت میں رہے گا اور اللہ کے گھر کا خدمت گذار ہوگا لیکن جب بچی پیدا ہوئی تو وہ غمزدہ ہو گئی اور پھر خود ہی کہہ دیا اللہ تو آگاہ ہے۔ اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خیال یہ تھا کہ اس کا لڑکا ہوگا اس نے منت مانی تھی کہ وہ بچہ اللہ کے گھر کی خدمت میں ہوگا اور پھر یہ کہہ دیا کہ اللہ کو تو پتہ ہی ہے۔ اس کی آرزو تو یہ تھی لیکن اللہ کا فیصلہ اور تھا اور پھر اللہ اس سے آگاہ ہے کہ کس طرح اس بیٹی سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا کہ جس کا باپ نہیں ہوگا اور وہ اتنے کھلے معجزات لے کر آئے گا اور اس لڑکی کا بچہ پیغمبر ہوگا اللہ کا رسول ہوگا۔ اسے اس لیے اس کی ماں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے بیٹا اور

بیٹی دونوں برابر تو نہیں ہیں۔ اگر فرض کریں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ہوتے مریم علیہ السلام کی جگہ تو اس کے لیے وہ شان نہ ہوتی جو اس بیٹی کے لیے شان ہے۔ بیٹی کو اللہ تعالیٰ نے بڑا مقام دیا اور اس بیٹی کو باعظمت بنایا اور اس بیٹی سے ایسا فرزند دیا جس کا بعد میں تذکرہ آئے گا جو ایک معجزہ ہے اور جو بے مانند ہے۔ تو اس سے لگتا ہے کہ جو یہ دو جملے ہیں ''وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ط'' اللہ داناتر ہے جو اس نے جنا۔ یہ جملہ اور یہ جملہ کہ بیٹا بیٹی کی مانند نہیں ہے۔ یہ دونوں جملے اللہ کی طرف سے ہیں اور اللہ اس مریم کی ماں کو متوجہ کر رہا ہے کہ جو اللہ کے علم میں ہے وہ کسی اور کے علم میں نہیں ہے۔ ٹھیک ہے مریم کی ماں سوچ رہی تھی کہ بیٹا پیدا ہو گا لیکن اللہ کو پتہ ہے کہ اس بیٹی کو بیٹوں سے زیادہ مقام ملے گا۔ اگر یہ بات مریم کی ماں کی ہوتی تو یوں فرماتیں: بیٹی بیٹے کی طرح نہیں ہے۔ جبکہ یہاں کہا گیا کہ بیٹا بیٹی کی طرح نہیں ہے یہ اللہ کا کلام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بیٹی دی ہے کہ جس کی عظمت اور شرافت بیٹوں سے زیادہ ہے اور اللہ اس میں اپنی جناب سے روح ڈال دے گا اور اس سے ایک بچہ ایسا پیدا ہو گا جو بغیر باپ کے ہو گا اور یہ خود معجزہ ہو گا اور کس طرح وہ اپنی ماں کی عصمت اور طہارت کی گواہی دے گا اور روح اللہ کہلائے گا۔ مریم علیہا السلام کی والدہ نے کہا کہ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔

اس شہر کے لوگ ''مریم'' عبادت کرنے والی عورت اور خدمت گذار کو کہتے تھے۔ یہ نام بھی اس لیے رکھا کہ حضرت مریم کی ماں نے منت مانی تھی کہ جو بچہ پیدا ہو گا تو میں اسے اللہ کے گھر کا خدمت گذار بناؤں گی اس لیے اس کا نام مریم رکھا اور اسے اللہ کی پناہ میں دے دیا کہ اس کی عبادت اللہ کے لیے ہو اور اسکا نام اس کے اعمال کے مطابق ہو اور یہ دعا صرف حضرت مریم کے لیے نہیں تھی بلکہ ان کی اولاد کے لیے بھی تھی اسے یقین تھا کہ عمران کی نسل سے کوئی ایک صالح اور نیک بچہ ضرور پیدا ہو گا کیونکہ عمران تو فوت ہو چکے تھے اور لڑکے کی جگہ لڑکی پیدا ہو گئی تو پھر ماں کو یقین تھا کہ اسی لڑکی سے اللہ اولاد دے گا اور

اسے بچہ دے گا۔ جس کا بڑا مقام ہوگا اس لیے اس کے لیے بھی دعا کی ہے کہ وہ بھی شیطان مردود سے محفوظ رہے، اللہ کی پناہ میں رہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"پھر اسے اس کے رب نے اچھی طرح سے قبول کیا اور اسے اچھی طرح بڑھایا اور اسے زکریا کے سپرد کر دیا، جب زکریا اس کے پاس حجرہ میں آتے تو اس کے پاس کچھ کھانے کی چیز پاتے، کہتے اے مریم! تیرے پاس یہ چیز کہاں سے آئی ہے، تو وہ کہتی یہ اللہ کے ہاں سے آئی ہے، اللہ جسے چاہے بے قیاس رزق دیتا ہے"۔

مادرِ مریمؑ کی دعا کا قبول ہونا

اللہ تعالیٰ نے زوجہ عمران کی اس نذر کو بہترین قبولیت عطا فرمائی جب اس نے اسکا مریم نام رکھا اور اسے اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا کہ وہ اللہ کے گھر کی خدمت گذار بنے گی تو اللہ نے اعلان کر دیا کہ تیری اس نذر کو ہم نے قبول کر لیا ہے اور پھر اس کی بہترین تربیت ہوئی اور یہ گویا کہ عمران کی بیوی کی دعا قبول ہو گئی کہ مریم اور اس کی ذریت شیطان کے شر سے محفوظ رہے گی اور اللہ نے کہا وہ میری پناہ میں ہو گی اور اس کا رشد اس کا کمال اور اس کی پاکیزگی ہمارے ذمہ ہے اور اس کی ذریت بھی اسی طرح طاہر ہو گی۔ قبول حسن، اس کی

بازگشت اللہ کے چناؤ کی طرف ہے اور نبات حسن طہارت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم نے اس کو طاہر بھی بنایا ہے اور اس کا انتخاب بھی کر لیا ہے اور اس کی ذریت میں بھی انتخاب ہے۔

سورہ آل عمران، آیت 42 میں ہے:

”اے مریم بلاشک اللہ ہے جس نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاکیزہ بنایا ہے“۔

تو اس کی کفالت زکریاؑ نبی کے ذمہ لگا دی اور وہ بھی قرعہ کشی کے ذریعہ ہوا کہ وہ ان کے سرپرست بن گئے۔ بی بی کے تکفل میں جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا مختلف افراد کہتے تھے کہ ہم انہیں اپنی کفالت میں لیتے ہیں لیکن اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے قرعہ ڈالا گیا تو قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام آیا اور حضرت مریمؑ کی کفالت کی ذمہ داری زکریاؑ کو ملی۔ پھر مریم کے لیے اللہ کے گھر بیت المقدس میں ایک خاص حجرہ بنا دیا گیا، حضرت مریمؑ اس حجرہ کے محراب میں عبادت میں مصروف رہتی تھیں؛ محراب کو اس لیے محراب کہتے ہیں کہ وہاں شیطان سے جنگ کی جاتی ہے، اس مقام سے خواہشات نفسانی کو دھتکارا جاتا ہے اور بندے اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ حضرت ذکریاؑ جیسے ہی حجرہ میں آتے تھے تو وہاں پر رزق (غذا) پاتے تھے اس جگہ طعام نہیں کہا گیا، رزق کہا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ گرمیوں میں سردیوں کے میوہ جات موجود ہوتے تھے اور سردیوں میں گرمیوں کے میوہ جات موجود ہوتے تھے۔ اس جگہ رزق کہا گیا ہے کہ اس میں میوے اور پھل سب مراد ہیں تو حضرت زکریا علیہ السلام تعجب سے حضرت مریمؑ سے پوچھتے ہیں یہ رزق کہاں سے تمہارے پاس آ جاتا ہے جب میں آتا ہوں تو یہ رزق موجود ہوتا ہے۔ تو بی بی مریمؑ نے جواب دیا یہ اللہ کی طرف سے ہے، مریمؑ کے لیے یہ کرامت تھی اس لیے تو مریمؑ نے فورا جواب دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ جس کو چاہتا ہے بغیر حساب کے یعنی بغیر ظاہری اسباب کے رزق عطا کرتا ہے مریمؑ کے اس جواب سے حضرت زکریاؑ قانع ہو گئے کیونکہ وہ ان

کے خالو بھی تھے۔ حضرت مریمؑ کی اس عبادت اور کرامت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے زکریاؑ نے ایک طاہر اور طیب بیٹے کی درخواست کر ڈالی۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾

"زکریا نے وہیں پر اپنے رب سے دعا کی، کہا اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے"۔

زکریاؑ کی اللہ سے پاک بچے کی درخواست

حضرت زکریاؑ کی اولاد نہیں تھی۔ جب زکریاؑ کو یقین ہو گیا کہ مریمؑ صاحب کرامت ہے تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کئے کہ اللہ اسے بھی ایک طیب اور طاہر بچہ دے دے۔ طیب ہر وہ چیز ہوتی ہے یا ہر وہ فرد ہوتا ہے جو دوسری چیز کے لیے سازگار ہو اور حاجت پوری ہونے میں اس کا دخل اور اثر ہو اور زکریاؑ کی دعا کا مقصد یہ تھا کہ اس کی ذریت طیب ہو، اللہ سے چاہا ہے کہ ایسا بیٹا دے جو اسی طرح کی کرامت والا ہو جس طرح مریمؑ کے لیے کرامت ہے۔ مریمؑ جیسی ہی اس کی شخصیت ہو وہ طاہر ہو، اللہ کی اطاعت میں ہو اور صاحب کرامت ہو تو پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ تو دعا کو سنتا ہے، اللہ کہتا ہے دعا مانگو میں دعا کو قبول کرتا ہوں تو یقین کا اظہار بھی کیا کہ جو میں نے درخواست کی ہے تو میری دعا کو اے اللہ قبول کر لے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

"پھر فرشتوں نے اس کو آواز دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے کہ بے شک اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ کی گواہی دے گا اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائے گا اور صالحین میں سے ایک نبی ہوگا"۔

زکریاؑ کی دعا کی قبولیت

حضرت زکریاؑ نے جو دعا مانگی وہ قبول ہو گئی اور اس کی بشارت فرشتوں نے دی۔ اس حالت میں دی کہ جب وہ نماز پڑھ رہے تھے اور محراب عبادت میں تھے، اس بچے کا نام بھی بتا دیا کہ اس کا نام یحییٰ ہوگا، اللہ نے اس کا یہ نام رکھا ہے اور یحییٰ کی صفات بھی بتا دیں کہ وہ عیسیٰؑ کی مانند ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ اولوالعزم تھے ان کو یحییٰ پر برتری تھی وہ صاحب کتاب نہیں ہوں گے وہ تصدیق کریں گے اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور وہ سید ہوگا وہ حصور ہوگا وہ اپنے لیے بیوی نہیں لے گا، غیر شادی شدہ ہوگا وہ صالحین سے نبی ہوگا اور دینِ عیسیٰؑ کا مبلغ ہوگا۔

یہاں "کلمہ" سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں۔ سید اس کو کہتے ہیں جو عام لوگوں کے معاملات کو سنبھالنے والا ہوتا ہے یا ان کی جماعت کی قیادت کر رہا ہوتا ہے، جو جنسی شہوات کو ترک کرتا ہے اور لغت میں ایسے کو حصور کہتے ہیں کہ جو عورتوں کے ساتھ آمیزش نہیں کرتا۔اسی طرف اشارہ ہے وہ ایک جماعت کی قیادت بھی کر رہا ہوگا لیکن عورتوں کے

قریب نہیں جائے گا شادی نہیں کرے گا اور وہ صالحین سے ہوگا اور وہ نبی ہوگا۔ یہ بھی زکریاؑ کے لیے بشارت تھی۔ کہ یہ پیغمبر صالح پیغمبر ہوگا اس کے پاس اللہ کی نمائندگی ہوگی۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝۴۰

''کہا اے میرے رب! میرا لڑکا کہاں سے ہوگا حالانکہ میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، فرمایا اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔

یحییٰ کی بشارت پر زکریاؑ کا تعجب

یہ سوال اور حیرانگی دراصل حقیقت کی طرف رجوع کے لیے ہے نہ کہ یہ انکار ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ یہ امر نہیں ہو سکتا ایسا محال ہے بلکہ اس کی حقیقت سے پردہ اٹھانا مقصود ہے حضرت زکریا علیہ السلام نے دو سوال کیئے۔ یہ دو امر سورہ مریم میں بھی آئے ہیں جس میں دعا کا ذکر کیا ہے اور اپنے لیے بیٹا مانگا ہے۔ اللہ کی بشارت جب آئی تو اس پر تعجب کیا ہے اور خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ یہ سوال و جواب اس لیے نہیں ہیں کہ اللہ سے ایسا ہو نہیں سکتا بلکہ جب کوئی غلام اپنے مولا کی طرف توجہ کرتا ہے اور اس کی طرف اسکا رخ ہوتا ہے اور وہ اپنے مولا کی حضوری میں غرق ہوتا ہے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے مولا سے بات کرے تو یہاں بھی اسی طرح ہوا کہ انہوں نے بات کی ہے کہ واہ سبحان اللہ یا اللہ تو بھی کیسا قادر ہے کہ میں تو اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں اور مجھے ماشاء اللہ خوبصورت بیٹا ملنے والا ہے۔

پھر زکریاؑ کو جو بشارت دی گئی تھی اس نے یہ آواز سنی تھی اور یہ آواز بھی اس نے سن لی کہ یہ اللہ کا حتمی فیصلہ ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اور یہ آواز بھی اسی طرف سے سنی جہاں سے یحییٰ کے لیے بشارت کی صدا آئی تھی۔ یہ جواب زکریاؑ کے سوال کے

لیے ثبوت تھا اور دوسری جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعہ کے لیے یہ مقدمہ بھی تھا اور اس ہی کے ساتھ اس کی شباہت بھی ہے کہ ایک کنواری لڑکی سے کیسے بیٹا پیدا ہوتا ہے؟ اور اس طرح ایک بوڑھا اور ایک بانجھ عورت سے کیسے بیٹا پیدا ہوتا ہے؟ جس طرح ایک کنواری عورت سے بیٹا پیدا کرنا اللہ کی قدرت میں ہے اسی طرح مرد و عورت جو بانجھ ہوں ان سے بھی اللہ اولاد دے سکتا ہے۔ اللہ کی قدرت سے تو یہ سارا بعید نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

"کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر، فرمایا تیرے لیے یہ نشانی ہے کہ تو لوگوں سے تین دن سوائے اشارہ کے بات نہ کر سکے گا، اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر"۔

زکریاؑ کا دعا کی قبولیت کیلئے نشانی مانگنا

حضرت زکریاؑ کو جب خبر مل گئی اور یقین بھی تھا کہ اللہ مجھے اس طرح بیٹا دے رہا ہے اس کا نام بھی یحییٰ رکھنا ہے اور اس کی یہ خصوصیات ہیں تو اللہ سے درخواست کی کہ میرے لیے اس حوالے سے کوئی نشانی بتادے تاکہ اس سے پتہ چل جائے کہ یہ جو خبر اسے دی گئی ہے رحمانی خطاب تھا، شیطانی نہیں تھا۔ یا یہ چاہا کہ میری بیوی کے حمل کی کوئی نشانی ہو جائے اور یا حمل کا وقت مانگ لیا، لیکن پہلی بات صحیح تر ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اللہ کی طرف سے جواب آیا، یہ ویسی آواز تھی جیسی آواز پہلے سن رہے تھے۔ آواز سنی کہ تین دن تک لوگوں سے بات نہیں کرنی، اشارے سے بات کرنی ہے۔ اشارہ یعنی ہاتھ کا اشارہ دولب کا اشارہ؛ زکریا کی اولاد ہونے کی نشانی یہ تھی تین روز زبان بند رکھیں اور بات نہیں کر

سکتے تھے فقط اشارے سے بات کرتے تھے اور ساتھ یہ بھی حکم تھا کہ اللہ نے جو تمہیں خبر دی ہے تو تم اللہ کا ذکر بہت کرو، معلوم ہے کہ یہاں پر شیطان تو نہیں کہتا اللہ کا ذکر بہت کرو، اللہ کی تسبیح کرو، وہ تو خود بھی نہیں کرتا کسی اور کو بھی نہیں کہتا۔ اس امر کا حضرت مریمؑ کے واقعہ کے ساتھ بڑی شباہت ہے کیونکہ ولادت جب عیسیٰ علیہ السلام کی ہو گی تو اس سے بھی یہی کہہ دیا جائے گا۔ مریم سوال کرنے والوں سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں اور میں کسی کے ساتھ بات نہیں کروں گی۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے پسند کیا ہے اور تجھے پاک کیا ہے اور تجھے سب جہان کی عورتوں پر پسند کیا ہے"۔

مریمؑ کے لیے اللہ کا پیغام

حضرت مریم سلام اللہ علیہا جب اپنے محراب عبادت میں تھیں تو مریمؑ سے فرشتے بات کرتے تھے، یہاں بھی فرشتوں نے مریم سے بات کی کہ ایک تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو قبولیت ہوئی تھی اس کی ماں کو بتایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے اس کو خبر دی کہ بس تم منتخب ہو چکی ہو اللہ کی طرف سے اور اللہ نے تمہیں پاک بنا دیا ہے، تم عصمت مآب ہو، گناہوں سے پاک ہو، آپ بتول ہو جو خون عام عورتیں دیکھتی ہیں وہ آپ نہیں دیکھو گی، اللہ تعالیٰ نے اپنے زمانے کی ساری عورتوں پر تجھے برتر بنایا ہے اور تیرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ جیسا معجزہ کو وجود دیا ہے تو پھر مریم سے یہ کہا کہ دیکھو تم خالصتاً اللہ کی عبادت میں مصروف رہو، خضوع و خشوع میں رہو، سجدے کرو، رکوع کرو اور اس ذات کا

شکر بجالاو جس ذات نے تجھے عصمت اور طہارت عطا کی ہے۔ رکوع مطلق تذلل کے لیے آتا ہے، اپنے آپ کو ذلیل وخوار کمتر ظاہر کرنا اور تعظیم کے لیے جھکنا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس زمانے کی ساری عورتوں پر برتری دی ہے تو اس برتری کا شکر بھی بجالاؤ، اللہ کے آگے تعظیم کے لیے جھک جاؤ، اللہ کی عبادت کرو، اللہ کا ذکر و تسبیح کرو۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳

"اے مریم! اپنے رب کی بندگی کر اور سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر"۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝۴۴

"یہ غیب کی خبریں ہیں ہم بذریعہ وحی تمہیں اطلاع دیتے ہیں، اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب اپنا قلم ڈالنے لگے تھے کہ مریم کی کون پرورش کرے، اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب کہ وہ جھگڑتے تھے"۔

مریم کے واقعات اور زکریاؑ پر احسان

یہاں پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے زکریاؑ پر جو اپنا احسان کیا ہے اس کو بیان کیا ہے، رسول اکرم ﷺ کو بتایا جارہا ہے کہ یہ واقعہ از قسم اخبار بالغیب ہے زمانہ نزول قرآن تک لوگوں کو یہ بات یاد بھی نہیں رہی تھی، توریت میں موجود تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جس میں تحریف ہوچکی تھی اور جو تحریف شدہ موجود تھی تو اس کا کوئی اعتبار نہیں تھا رسول

اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہ ساری باتیں جو اس زمانے میں تجھے بتائی جارہی ہیں اور اس وقت نزول قرآن کے زمانے میں تو یہ غیبی خبر دینے کے مترادف ہے جس وقت قرعہ اندازی کی گئی تھی، ''قلم'' اس تیر کو کہتے تھے جو قرعہ کے لیے ڈالا جاتا تھا تو اس زمانہ میں مریم کی کفالت بارے بحث یہ ہو رہی تھی کہ مریم کا بابا تو فوت ہو چکا تھا تو اب اس کی کفالت کون کرے گا؟ اور یہ کام جیسا کہ زیادہ تر مفسرین نے کہا ہے کہ مریمؑ کی ولادت کے وقت ہی ہوا تھا لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ قرعہ کشی اس وقت ہوئی جب مریم جوان ہو گئی اور اس وقت زکریاؑ اس کی سرپرستی سے عاجز تھے تو اس زمانے میں تو اے میرے پیارے محمد ﷺ آپؐ تو وہاں موجود پر نہیں تھے وہاں جنجال اور جھگڑا ہو رہا تھا کہ اسکی سرپرستی کون کرے گا تو اس وقت قرعہ ڈالا گیا اور کفالت کی ذمہ داری حضرت زکریاؑ کے لیے قرار پائی اور یہ اللہ کی طرف سے حضرت زکریاؑ پر احسان تھا۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾

''جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تجھ کو ایک کلمہ (موجود) کی اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسٰی (وہ) بیٹا مریم کا ہوگا، دنیا اور آخرت میں مرتبے والا اور اللہ کے مقربین میں سے ہوگا''۔

وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور جب کہ وہ ماں کی گود میں ہوگا تو لوگوں سے باتیں کرے گا اور جبکہ وہ ادھیڑ عمر کا ہوگا تو صالحین سے ہوگا''۔

حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت

اس آیت میں حضرت مریمؑ کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے۔ قرآن مجید میں کلمہ ہر وہ چیز جو اللہ کے ارادے کو ظاہر کرے۔ کلمہ خدا یعنی اللہ کا امر تکوینی جس سے کوئی شئے وجود میں آ جائے۔ ''کلمہ'' کن وجودی ہے، ''کن فیکون'' یا کلمہ ''وحی'' جو پیغمبر کے لیے استعمال ہوتا ہے یا جس سے گفتگو ہو رہی ہے اس کے لیے اس کا معنی ظاہر ہوتا ہے۔ اس جگہ کلمہ سے مراد موجود خود عیسیٰ علیہ السلام کا وجود ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کن کے کلمہ کا مصداق ہیں یعنی اللہ کے ارادے کا مصداق ہے کیونکہ ان کی ولادت کے لیے معمول کا جو طریقہ تھا وہ استعمال نہیں ہوا ظاہری اسباب جو کسی بچے کی ولادت کے لیے ہوتے استعمال نہیں ہوئے بلکہ تکوینی کلمے سے ہی اس کا سلسلہ جڑا ہوا ہے مادی اور روایتی اسباب جو بچے کی ولادت کے لیے ضروری ہوتے ہیں وہ اس میں نہیں تھے اور اس بچے کا نام بھی بتا دیا کہ وہ مسیح ہے، عیسیٰ ہے مریمؑ کا بیٹا ہے۔

مسیح یعنی برکت اور خیر سے چھوا ہوا، گناہوں سے پاک کیا ہوا یا ولادت کے بعد زیتون کے روغن سے اس کی مالش کی گئی ہو اور اس بچے کو روغن زیتون سے متبرک کیا گیا ہو۔ یا بادشاہ اور مَلِکْ کے معنی میں ہے کہ جس کی کاہنوں نے زیتون کے تیل سے مالش کی ہو تاکہ اس کی سلطنت مبارک ہو۔ مسیح بادشاہ کے معنی میں بھی ہے اور مبارک کے معنی میں بھی ہے۔ کلمہ عیسیٰ اصل میں مشہور تھا جو مخلص کے معنی میں ہے، نجات دینے والے کے معنی میں بھی ہے۔ یا عیسیٰؑ کا معنی جو خوشی اور عیش کی زندگی گزارے۔ یہ نام اور یحییٰ کا نام آپس میں مناسبت رکھتے ہیں اور دونوں پیغمبروں کی آپس میں بہت زیادہ شباہت ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ عیسیٰؑ باپ کے بغیر ہیں اسی لیے اسے عیسیٰ مریم کا بیٹا کہا گیا ہے اس کا باپ نہیں ہے۔ وہ دُنیا و آخرت میں آبرو مند ہے، اللہ کے مقرب ہیں۔

وجاہت کا معنی قبول ہو جانا دنیا و آخرت میں اور اس کے اللہ کے قریب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو راستہ اللہ کے پاس لے جاتا ہے وہ طے شدہ ہے تمام انسانوں کے لیے، اس راستے پر انہوں نے سب سے سبقت لی اور یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ مقام اکتسابی ہو، یہ مقام عطائی بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ عمل اور جد و جہد سے وہ آگے بڑھے۔ جیسا کہ فرشتے ہیں وہ اللہ کی عطاء سے مقرب ہیں۔ یہاں وجیہ کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے استعمال کیا گیا تو یہ اللہ کی عطاء بھی ہے۔ ایک اور خصوصیت بتائی گئی کہ وہ جوانی میں بھی اور بچپن میں بھی اور بڑھاپے میں بھی اور انسانوں کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ گفتگو کرے گا، بات کرے گا انہیں سے بشارت دے گا۔ اور یہ بشارت دی گئی مریم کو کہ یہ نوزائید بچہ لمبی زندگی کرے گا بڑھاپے کو پہنچے گا اگرچہ عیسیٰؑ کی عمر انجیلوں میں جو لکھی گئی ہے وہ تینتس سال ہے، اس سے زیادہ زندگی بیان نہیں کی گئی۔ اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گھوارے میں بات کرنا؛ اس طرح بھی اشارہ موجود ہے لیکن اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ لمبی عمر کریں گے اللہ کے مقرب ہیں بڑی شان والے ہیں اور وہ صالحین سے ہیں۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

"مریم نے کہا اے میرے رب! مجھ سے بیٹا کیسے پیدا ہوگا حالانکہ مجھے کسی آدمی نے ہاتھ تک نہیں لگایا، فرمایا: اسی طرح اللہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے"۔

مریمؑ کا اپنی پاکدامنی اور بچے کی ولادت پر حیرانگی کا اظہار

یہاں ایک بات یہ ہے کہ مریمؑ کے پاس فرشتہ آیا ہوا تھا اس فرشتے سے بات ہو رہی تھی کیونکہ فرشتے نے بچے کی نوید سنائی تھی۔ لیکن مریمؑ نے اس سے بات نہیں کی بلکہ براہ راست اپنے رب سے عرض کیا کیونکہ مریمؑ یہ سمجھتی تھیں کہ جو بات کر رہا ہے وہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ اگرچہ یہ خطاب جو روح القدس کی شکل میں آدمی آیا ہوا تھا یا فرشتوں سے جو تھا لیکن وہ سمجھ رہی تھیں کہ یہ بات اللہ کی ہے لہٰذا اپنی فریاد اپنے رب سے کی اور کیونکہ اولاد والا ہونا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر دار ہو۔ مریم نے عرض کیا مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں تو میں اولاد والی کیسے ہو جاؤں گی وہ میرا بیٹا کیسے ہو جائے گا؟ تو یہاں پر جب یہ سوال مریم نے کر دیا تو روح اور فرشتہ جو آیا ہوا تھا اس نے اللہ کی جانب سے یہ جواب دیا کہ جب اللہ کا فیصلہ کسی شئے کی خلقت کے بارے میں ہو جاتا ہے تو وہ تو اس کی قدرت میں ہے، اس کی جو قدرت ہے اس کی کوئی محدودیت نہیں ہے اس کے لیے کوئی امر آسان یا دشوار نہیں ہے اور اس کا امر ظاہری اسباب کے تابع بھی نہیں ہے اسباب میں بھی تاثیر اسی نے رکھی ہے۔ اللہ کا کلمہ کُن وجود کا اشارہ، وہی ہستی بخشتی ہے اسی سے وہ شئے موجود ہو جاتی ہے۔ کلمہ کُن (ہو جا) کا ارادہ ہی شئے کا موجود ہو جانا ہے درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾

”اور اس کو کتاب سکھائے گا اور دانش عطا فرمائے گا اور توریت اور انجیل“۔

حضرت عیسیٰؑ کی خصوصیات

یہاں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان اور فضیلت کو بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر کتاب اُتارے گا، اس کے لیے اللہ کی جانب سے وحی ہو گی، جس سے لوگوں کی مشکلات اور مسائل حل ہوں گے اور اللہ اسے حکمت دے گا کہ ایسی دانائی اسے دے گا کہ جو انسان کے عقیدے اور عمل کے لیے فائدہ مند ہو۔ الف اور لام جنس کا ہے اور اس میں عمومیت ہے۔ تورات وہی تختیاں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھیں وہ مراد ہیں، جو یہود کے پاس موجود تھیں اور اُن کا اعتراف بھی تھا اور اس کی سند بابل کے بادشاہ اور فارس کے بادشاہ کے درمیانی فاصلے میں منقطع ہو گئی اور جو ان کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی سند حضرت موسیٰ علیہ السلام تک نہیں جاتی مگر یہ کہ جو مطالب تورایت میں موجود تھے ان مطالب کو بالکل رد نہیں کیا اور تورات کی کلی طور پر مخالفت نہیں کی بلکہ قرآن نے تورات کے بعض مطالب کو خود نقل کیا ہے۔ وہ جو تحریف شدہ تورات ہے تحریف کرنے والوں نے اسے بازیچہ بنایا، کھیل تماشہ بنایا، کیونکہ بعض چیزیں اصلی تھیں اور بعض مطالب جو ان کے مقاصد کو پورا نہیں کرتے تھے تو انہوں نے ان کو بدل دیا تھا تو حضور پاک ﷺ نے اس کی بالکل نفی نہیں کی۔

"انجیل" بشارت کے معنی میں ہے اس سے مراد وہ کتاب ہے جو وحی کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتری لیکن یہ جو انجیل متی، مرقس، یوحنا، وغیرہ ہیں یہ کتابیں ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں۔ انجیل ایک ہی تھی تورات بھی ایک ہی تھی، بعد میں یہودیوں اور عیسائیوں کے جو علماء تھے اُنہوں نے اسے تحریر کیا ہے اور اس میں ایسے مطالب ہیں کہ ان کو بدل دیا گیا جو ان کے اقتدار اور مفادات کے خلاف تھے ان مطالب کو نکال دیا اور اپنی مرضی کے مطالب کو باقی رکھا موجودہ اناجیل تحریف شدہ ہے۔ لیکن قرآن

نے تورات اور انجیل کی تصدیق کی ہے ان کے جو مطالب صحیح ہیں ان کو قرآن نے نقل کیا ہے اور جنہوں نے کتاب میں تحریف کی ہے ان کی مذمت بھی کی ہے اور ان کتابوں کی بالکل نفی نہیں کردی کیونکہ جو کتاب موجود ہیں ان میں بعض مطالب ایسے ہیں جو اسی اصلی کتاب کے ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو ان کتابوں میں تحریف کرنے والوں نے شامل کئے ہیں۔ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ انکے پاس توریت کتاب جو حضرت موسیٰؑ پر اتری تھی وہ بھی موجود تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو انجیل کتاب بھی عطا کی۔

وَ رَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۬ۙ اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ۙ اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ۴۹﴾

"اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گا (اور وہ کہے گا) بے شک میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانیاں لے کر آیا ہوں، میں تمہیں مٹی سے ایک پرندہ کی شکل بنا دیتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا جانور ہو جاتا ہے، اور مادرزاد (پیدائشی) اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردے زندہ کرتا ہوں، اور تمہیں بتا دیتا ہوں جو کھا کر آؤ

اور جو اپنے گھروں میں رکھ کر آؤ، (بے شک) اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم ایماندار ہو"۔

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے بتایا کہ ان کو نبوت اور رسالت کا منصب دیا گیا ہے اور یہ لوگوں کے لیے اللہ کے دین کے احکام بیان کریں گے اس کی تبلیغ کریں گے۔ رسالت کا مطلب یہ بھی ہے کہ حکم اوران لوگوں کے اختلافی مسائل کے درمیان فیصلہ دیں تاکہ لوگ سعادت مند ہوں۔اس طرح سعادت کا تسلسل باقی رہے اور لوگ ہلاکت سے بچے رہیں۔ رسالت پیغام رسانی کا عمل اس پیغمبر کے لیے ہوتا ہے جسے کسی خاص قوم کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام یہ دونوں نبی بھی تھے اور رسول بھی تھے اور ان کی نبوت تمام انسانوں کے لیے تھی، وہ دونوں صاحب کتاب تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزات دیئے تو آپ نے بنی اسرائیل کے پاس آکر انہیں اس کا حوالہ دیا کہ میں تمہارے پاس معجزات لے کر آیا ہوں اور میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں تمہیں ہدایت دینے کے لیے آیا ہوں۔

آپ نے اپنا پہلا معجزہ یہ بتایا کہ میں مٹی سے پرندے کی شکل بناؤں گا اور پھر اس بنے ہوئے مٹی کے ڈھانچے پر پھونک ماروں گا وہ پرندہ اللہ کے اذن سے اڑ پڑے گا آپ نے یہ بتایا کہ میں کوئی عدم سے کچھ نہیں بناؤں گا بلکہ مٹی سے بناؤں گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خلقت کی نسبت جو اپنی طرف دی ہے کہ میں پرندہ بناؤں گا اور میں پھونک ماروں گا اور روح جو زندگی کا ذریعہ ہے اس میں پھونک مارنے کا کہا ہے لیکن حیات بہ اذن اللہ ہے اسکا پرندہ بن کر اڑنا تو یہ اڑان اور اسکی حیات اللہ کے حکم سے ہونا ہے میرا اختیار اس میں نہیں ہے

دوسرا معجزہ بتایا کہ جو مادر زاد جو اندھے ہیں اور برص کے مریض ہیں میں اللہ کے اذن سے ان کو شفاء دے دُوں گا اور اللہ کی اجازت سے ان کی بیماری ختم ہو جائے گی۔ تیسرا معجزہ یہ ہے کہ میں مردوں کو بھی اللہ کے اذن سے زندہ کروں گا لیکن یہ سب اللہ کے اذن سے ہو گا۔ یہ تینوں الٰہی آیات اور معجزہ ہیں اللہ کی طرف سے طے شدہ ہیں اور ان کی جو تاثیر ہے وہ اللہ کی اجازت سے ہونا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میں اپنے ان تمام کاموں میں مستقل نہیں ہوں اور اس بات کا تکرار کیا ہے کہ یہ سب اذن اللہ سے ہونا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ کوئی توہم نہ کرے کہ وہ ان کاموں میں مستقل ہیں، الوھیت اللہ کے لیے ہے، اللہ ہی معبود ہے کوئی اور معبود نہیں ہے جو قدرت عیسیٰؑ کے پاس ہے وہ اللہ کی عطا کردہ ہے۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ میں تمہیں اس بارے بتادُوں گا، یعنی میں غیبی خبریں بھی جانتا ہوں جس کا تعلق اللہ سے ہے۔ اللہ اپنے رسولوں اور اپنے نمائندوں کو وحی کے ذریعے غیبی خبریں بتاتا ہے۔ اسے متعین نہیں کیا کیونکہ خبر دینا خلق اور زندہ کرنے اور شفاعت دینے کے علاوہ ہے اور یہ اصل میں اللہ کا فعل ہے اور خبر دینا اللہ کا فعل ہے بندہ اپنے اختیار سے جو کام کر رہا ہوتا ہے وہ اختیار اللہ ہی نے اسے دیا ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے تو اس معجزہ کے فعل کو اذن خدا سے مقید کیا لیکن خبر دینے کو اذن خدا سے مقید نہیں کیا جبکہ وہ جو خبر دے رہے ہیں وہ ان صلاحیتوں سے ہے جو اللہ نے ان کو دے رکھی ہیں اور کچھ بھی اللہ کی عطا کردہ قدرت کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ یہ سارے معجزات و نشانیاں ان کے لیے ہیں جو مومن ہوں کیونکہ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ پر ایمان لانا چاہیے اور اللہ کے دین پر ایمان لانا چاہیے۔ اور سب کچھ اللہ کی جانب سے قرار دینا چاہیے۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝

''اور مجھ سے پہلی کتاب جو تورات ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور تاکہ تم کو وہ بعض چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام تھیں، اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو''۔

حضرت عیسیٰؑ کا بنی اسرائیل کو خطاب

اس آیت میں ایک بات تو یہ بتائی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو آئے تو انہوں نے جو کچھ تورات میں تھا اس کی تائید کی، اس کی تصدیق کی کیونکہ اس وقت وہ کتاب یہودیوں کے پاس موجود تھی جس میں انہوں نے تحریف کر دی تھی آپ تحریف شدہ کی بات نہیں کر رہے۔ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جس کے بارے پہلے آچکا ہے کہ وہ پوری کتاب اس کی تمام تختیاں جو لکھی ہوئی ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس موجود تھیں اور بعض طیب چیزیں جو بنی اسرائیل پر حرام ہو چکی تھیں کیونکہ بنی اسرائیل نے اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا جس پر انکے لیے سزا ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتایا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، بعض حرام چیزیں جن کا استعمال تمہارے لیے جائز نہیں تھا اب میں ان کی حلیت کا حکم لے آیا ہوں آج کے بعد تم ان حرام شدہ چیزوں کو استعمال کر سکو گے۔

آخر میں یہ بھی بتایا کہ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اب جبکہ معجزہ تمہارے سامنے آگیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ میں اللہ کی طرف سے آیا ہوں تو تمہیں حق نہیں پہنچتا کہ تم میری مخالفت کرو۔ حرام چیزوں کو میں حلال تمہیں بتا رہا ہوں تو وہ اللہ کی جانب سے ہی بتا رہا

ہوں اور کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ میں اپنی طرف سے بتا رہا ہوں لہٰذا تمہیں میری اطاعت کرنی چاہیے اور اللہ کے غضب سے خود کو بچانا چاہیے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

''بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے سو اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے''۔

بنی اسرائیل کیلئے واضح فرمان

یہاں پر وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود سمجھنے لگ گئے تھے ان کی رد بھی ہے اور اس حوالے سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیب کی باتیں جانتے تھے تو یہ علم اللہ تبارک وتعالیٰ نے انکو دیا تھا لہٰذا براہ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو سمجھا رہے ہیں کہ میرا رب اور تمہارا رب بس اللہ ہے اور میں کسی کا رب نہیں ہوں اور اسی کی اطاعت واجب ہے اور یہ سیدھا راستہ ہے اس سے منحرف نہ ہونا۔ کیونکہ اس سے انحراف کروگے اس راستہ کو چھوڑوگے تو تمہارے لیے جہنم اور عذاب الٰہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کو معبود اور رب قرار دینا ہی صراط مستقیم ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

''جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ وہ لوگ کفر اختیار کر رہے ہیں تو بولے: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہوگا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں''

بنی اسرائیل کا امتحان

بنی اسرائیل کا باطنی کفر اتنا قوی ہو گیا تھا کہ اس کے آثار ان کے کردار اور عمل میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے اس بات کو جاننے کے لیے کہ وہ سب کافر ہوئے ہیں یا ان میں سے کچھ افراد ابھی حق پر باقی ہیں، ان کو مدد کے لیے پکارا تاکہ پتہ چلے کہ ان میں سے کون مومن ہے اور کون کافر۔ حضرت عیسی علیہ السلام کی اس آواز پر آپ کے حواریوں نے لبیک کہا اور کہنے لگے ہم اللہ کی راہ میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ہم خدا پر ایمان لائے ہیں اور تم اس بات پر گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ''حَوَارِیّ'' انسان کے بہت ہی قریبی افراد کو کہتے ہیں اس طرح کہ وہ اس فرد سے خاص ہوں۔ بعض کا کہنا ہے کہ حواری، حور سے لیا گیا ہے جو بہت زیادہ سفید کے معنی میں ہے۔ بہر حال بنی اسرائیل میں سے یہ قلیل تعداد حضرت عیسی پر ایمان لائے اور کہا: ہم اس راستے پر چلنے والے ہیں جو اللہ تک پہنچتا ہے۔ یہاں پر خدا کہ مدد سے مراد اللہ تک پہنچانے میں مدد کرنا مقصود ہے۔ اسلام سے اس چیز کے سامنے تسلیم محض ہونا مراد ہے جسے خدا چاہتا ہے۔ یہ بات مخلص مومنین سے مخصوص ہے۔ اس سے توحید اور نبوت کی گواہی دینے والا ہر فرد مراد نہیں ہے۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

''ہمارے رب! جو تو نے نازل فرمایا اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی قبول کی پس ہمارا نام بھی گواہوں کے ساتھ لکھ دے''۔

اللہ سے حواریوں کی درخواست

یہ حواریوں کا کلام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نقل قول کرنے کے بجائے صیغہ حاضر کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ مخاطب پر اس کا زیادہ اثر ہو۔ انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار! ہم

نے شریعت اور دین کو آپ کے رسول سے سیکھا ہے اور اس پر ایمان لائے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ پیغمبر جس چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے پہلے وہ خود اس پر عمل کرتا ہے۔ وہ ان احکام سے تجاوز نہیں کرتا ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کو ان کے اعمال پر گواہ قرار دے۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾

''ان لوگوں نے (عیسیٰ کے قتل کی) تدابیر سوچیں اور اللہ نے (بھی جوابی) تدبیر فرمائی اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے''۔

حضرت عیسیٰؑ کے خلاف سازش

اس آیت میں ''مکر'' کرنے والوں سے بنی اسرائیل مراد ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی مادر گرامی کے خلاف سازش کی اور ان پر ناروا تہمتیں لگائیں اور اس وقت کے بادشاہ بیلاطیس کے ہاں حضرت عیسی کی شکایت لگادی کہ وہ تمہاری حکومت کے خلاف لوگوں کو اکساتے ہیں۔ اس لیے ان کو سولی پر چڑھا کر ماردیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

''جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ اب میں تمہاری مدت پوری کر رہا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں (کی ناپاک سازشوں) سے پاک

کرنے والا ہوں اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے انہیں قیامت تک کفر اختیار کرنے والوں پر بالادست رکھوں گا، پھر تم لوگوں کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر اس وقت میں تمہارے درمیان (ان باتوں کا) فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو''۔

اللہ کا حضرت عیسیٰؑ کیلئے پیغام

''تَوَفِّیْ'' کسی چیز کو پورا پورا واپس لینے کے معنی میں ہے۔ موت کو اس لیے توفی یا وفات کہا جاتا ہے کیونکہ جب انسان مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو پورے طور پر اس کے بدن سے لے لیتا ہے۔ قرآن کریم میں ''توفی'' کا لفظ موت کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ کسی چیز کو لینے یا اس کی حفاظت کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری روح اور جسم کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔ (اس سے مراد حقیقی طور پر اٹھالینا ہے نہ کہ صوری طور پر اٹھالینا) اور تمہیں کفار سے دور کر کے ان کے کافرانہ معاشرے میں ان سے میل جول کرنے اور ان سے ملنے سے پاک کروں گا۔ اس سے یہ بتایا جارہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سازشیوں کے شر سے اللہ محفوظ رکھے گا اور وہ اسے مار نہیں سکیں گے۔ اللہ نے یہ خبر حضرت عیسیٰؑ کو دے دی کہ اے عیسیٰؑ! میں تجھے پورے طور پر اٹھالوں گا۔

عیسیٰؑ کے پیروکاروں کے غلبے کی بشارت

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو بشارت دی ہے کہ بہت جلد آپ کے پیروکار اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ اور ان کی یہ برتری اور ان کے غلبہ کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ یہاں پر حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں سے مراد ظہور اسلام سے پہلے

کے وہ عیسائی اور مسلمان ہیں جو حق کے راستے پر اور اسلامی عقائد اور احکام کی پیروی میں ثابت قدم رہے۔ کیونکہ اسلام کی پیروی حقیقت میں حق کی پیروی ہے اور ہر حق کی پیروی کرنے والا حضرت عیسیٰؑ کا بھی پیروکار ہے۔ آیت میں تفوق اور برتری سے ظاہری اور مادی برتری بھی مراد ہے اور منطق اور دلیل کے لحاظ سے برتری بھی مراد ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ برتری قیامت تک جاری رہے گی۔ ''ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ ---'' یہ خطاب حضرت عیسیٰؑ، آپ کے پیروکاروں اور اسی طرح ان کا انکار کرنے والوں سب سے ہے کہ تم سب نے اللہ کی جانب پلٹ کر جانا ہے۔ اور قیامت کے ان اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٥٦

''پس جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کو دنیا و آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی فریادرس نہ ہوگا''۔

کفر اختیار کرنے والوں کا انجام

کفار کو دو طرح کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک عذاب تو انہیں دنیا ہی میں ان پر مومنین کی برتری کی شکل میں ملے گا۔ اور دوسرا عذاب قیامت کے دن آتش جہنم کی صورت میں ملے گا۔ اس عذاب کو ان سے دور کرنے کے لیے ان کی شفاعت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ آیت کا یہ حصہ یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کے حتمی اور یقینی فیصلہ کو بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی جس وجہ سے دنیا میں انہیں ذلت اٹھانا پڑی اور آخرت میں انکے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ

لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اللہ انہیں ان کا پورا صلہ دے گا اور اللہ ظالموں سے ہر گز محبت نہیں کرتا''۔

نیک اعمال بجالانے والے مومنین کا صلہ

یہ آیت ان لوگوں کے لیے اچھے صلے کی خوشخبری ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی پیروی کرتے ہیں۔ آیت میں پیروکار کے بجائے ''اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے تاکہ اس بات کو سمجھایا جائے کہ سعادت اور اچھے انجام کا ملاک اور معیار ادعا کرنا اور کسی سے اپنے آپ کو منسوب کرنا نہیں بلکہ سعادت کا معیار یہ ہے کہ انسان حقیقی طور پر مومن ہو اور ایمان کے ساتھ خالصانہ طور پر عمل صالح بھی انجام دے۔ لہٰذا اجر کامل ،ایمان اور عمل خالص کے عوض ملے گا۔ جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ حقیقی مومن نہیں یا ایمان کے مطابق نیک عمل انجام نہیں دیتے تو ایسے لوگ ظالم ہیں اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا اور ظاہر ہے جو خدا کو پسند نہیں اسے اخروی اجر و ثواب سے کچھ نہیں ملے گا۔ ''وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾'' کو اس آیت کے آخر میں ذکر کرنے کا فلسفہ بھی یہی ہے۔ جبکہ اس طرح کی آیات مغفرت اور رحمت جیسے الفاظ پر مشتمل مطالب کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہیں۔اس جگہ آیت کا اختتام ظالموں سے اللہ کی ناپسندیدگی کے اعلان پر کیا گیا ہے تاکہ واضح کر دیا جائے کہ ظالموں کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

''یہ اللہ کی نشانیاں اور حکمت بھری نصیحتیں ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے واضح بتادیا کہ جو کچھ آپ کے لیے بیان کیا جاتا ہے اس میں بہت سارے فوائد ہیں، حکمتیں ہیں یہ سب اللہ کا قوی اور مضبوط بیان ہے۔ اس میں باطل نہیں ہے یہ مذاق بھی نہیں سنجیدہ کلام ہے اس میں دانائی ہے۔ ان واقعات میں فوائد پوشیدہ ہیں جن سے آگہی کے لیے یہ سب کچھ بیان کرتے ہیں۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾

''بیشک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اس نے پہلے اسے مٹی سے خلق کیا، پھر اسے حکم دیا: ہو جا اور وہ ہو گیا''۔

اللہ کی آیات کا بیان اور عیسیٰؑ کی خلقت

اگلی آیت میں اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی خلقت حضرت آدمؑ ابو البشر کی طرح غیر معمولی اور طبیعی قوانین سے ہٹ کر ہوئی ہے۔ اس بنا پر حضرت عیسیٰؑ بھی، حضرت آدم کی طرح انسان ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں اس سے بڑھ کر کسی قسم کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ماں باپ کے بغیر کلمہ ''کُنْ'' کے ذریعے خاک سے پیدا کیا تھا اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو بھی مٹی ہی سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کو ''کُنْ'' کہنے سے ہی وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی خلقت ایک لحاظ سے حضرت آدمؑ کی مانند ہے۔ حضرت آدمؑ بغیر ماں باپ کے کلمہ کن سے خلق ہوئے اور حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے کلمہ کن سے خلق ہوئے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾

''حق آپ کے رب کی طرف سے ہے، پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں''۔

قرآن کی حقانیت

اس آیت کا مضمون پچھلی آیات میں بیان شدہ مطالب کی تاکید اور رسول خدا ﷺ کو اطمینان دلانا ہے۔ یہ قرآن کریم کی ان نہایت ہی فصیح اور بلیغ آیات میں سے ہے جس میں حق کو ''مِنۡ'' ابتدائیہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ اگر ''مِنۡ ''کے بجائے ''اَلۡحَقُّ مَعَ رَبِّکَ'' کہا جاتا تو اس میں شرک اور عجز کا پہلو پایا جاتا تھا، گویا حق اور اللہ تعالیٰ دو الگ موجود ہیں جو ایک ساتھ ہیں۔ یا اس میں یہ احتمال تھا کہ حق اللہ تعالیٰ کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن ''مِنۡ ''میں ان میں سے کوئی بھی احتمال موجود نہیں ہے۔ یعنی عالم ہستی میں جو بھی حق اور حقیقت ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تمام بدیہی قضایا جن کو انسان نے واقعیت خارجی سے لیا ہے ان سب کا مرجع اور منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس طرح خیر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا اگر کوئی کام انجام دے تو اس وقت تک اس کی باز خواست نہیں ہوتی اور اس کا محاسبہ نہیں ہوتا جب اس کا عمل حق کے مطابق ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کا فعل کیونکہ وجود کی جنس سے ہے، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کا فعل عین وجود ہے تو اس کی علمی شکل اور صورت حق کے سوا کچھ اور نہیں جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعل عین حق ہے۔

فَمَنۡ حَآجَّكَ فِیۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمۡ وَ اَنۡفُسَنَا وَ اَنۡفُسَكُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِیۡنَ ﴿۶۱﴾

''آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (عیسیٰ کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہدیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو''۔

مباہلہ کا واقعہ

اس آیت میں مباہلہ کے واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔آیت کے شروع میں ''ف'' تفریع اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مباہلہ کی دعوت تعلیم الٰہی کے بعد ہے۔ یعنی جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کے بشر ہونے کے متعلق عقلی دلائل کو نہیں مانتے اور اس عقیدے کو وحیانی اور الٰہی عقیدہ نہیں مانتے ان سے کہہ دو کہ ''آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو''
اس آیت میں رسول خداﷺ کے بیٹوں سے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام اور عورتوں سے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور آپ کے نفس سے حضرت علی علیہ السلام مراد ہیں۔ اہل سنت کی کتابوں میں اہل البیت علیہم السلام کی شان میں بہت کچھ بیان ہوا ہے ،آیت مباہلہ بھی اہل البیتؑ کی شان میں ہے جبکہ آیتِ تطہیر میں اہل البیتؑ کا تعارف بیان ہوا ہے جیساکہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ سے نقل ہوا ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرم ﷺ کالے اون سے بنی عبا پہن کر تشریف فرما تھے اسی دوران امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام آپ کی عبا کے نیچے داخل ہوئے تو آیہ تطہیر نازل ہوئی۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا[1] (سورہ الاحزاب، آیت: ۳۳)

اس آیت میں مذکوران الفاظ کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے فریق کو اطمینان دلایا جائے کہ رسول خداﷺ حق پر ہیں، کیونکہ آدمی اس وقت ہی اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال کو میدان میں لاتا ہے جب اس کو اپنے حق ہونے کے بارے میں یقین ہو۔ "مباہلہ" ملاعنہ یعنی ایک دوسرے پر لعنت کرنے کے معنی میں ہے۔

جب پیغمبر اکرمﷺ نے عیسایوں کے ساتھ مباہلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تو آپؐ نے مباہلہ کرنے کے لیے صرف امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام کو ہی انتخاب کیا اور ان ہستیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اس واقعہ کو ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے۔ اس طرح آپؐ کے دشمنوں اور آپؐ کی حقانیت کا انکار کرنے والوں کا خاتمہ ہوا۔ "ابتھال" لعنت کرنے کے معنی میں ہے۔ پھر یہ لفظ ہر طرح کی دعا کے لیے استعمال ہوا جہاں مانگنے میں بہت زیادہ میں اصرار ہو، گڑگڑا کر مانگنا۔ جب نجران کے عیسایوں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرمﷺ اتنے مطمئن ہیں کہ صرف اپنے اہلبیت کے ساتھ آئے ہیں تو وہ مباہلہ کرنے سے پیچھے ہٹ گئے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اگر یہ ہستیاں ان کے نابود ہونے کی دعا کریں گی تو وہ سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اس آیت میں رسول خداﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا نفس قرار دیا ہے۔ اس آیت کے متعلق

---

[1] ۔ "اللہ کا ارادہ بس یہی ہے ہر طرح کی ناپاکی کو اہل بیت! آپ سے دور رکھے اور آپ کو ایسے پاکیزہ رکھے جیسے پاکیزہ رکھنے کا حق ہے"۔ سورہ احزاب، آیت، ۳۳۔

زمخشری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اہل کساء کی اس فضیلت میں کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

''یقیناً یہ برحق واقعات ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک اللہ ہی کی ذات غالب آنے والی، باحکمت ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی بیان کی گئی داستانیں حق ہیں

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق حق بات وہی ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اس بارے جو کچھ عیسائی کہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔اس آیت میں چند حرف تاکید جن میں ''اِن'' لام تاکید اور ضمیر منفصل "هُوَ" کو اس لیے لایا گیا ہے تاکہ رسول خداﷺ کو ان کی حقانیت کا اطمینان دلایا جائے اور آپؐ کو مباہلہ کرنے کی جانب تشویق کی جائے۔ تاکہ آپ اطمینان کامل اور وحی الٰہی کے بھروسے سے مباہلہ کرنے جائیں۔ ان سب الفاظ کے ذریعے تاکید کرنے کے بعد دوبارہ تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''وَمَامِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ'' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ یہ جملہ سابقہ داستانوں کے حق ہونے کا نتیجہ ہے، اور ان داستانوں کا حق ہونا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمہارا پروردگار حق کی تائید کرنے سے عاجز نہیں۔ وہ ایسا حکیم ہے کہ اس میں جہل کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ ایسا حقیقی معبود ہے جو کسی بھی قسم کا بے ہودہ کام انجام نہیں دیتا ہے۔ آپؐ کے دشمنوں نے جن کو اپنا خدا بنایا ہوا ہے ان میں آپؐ کے پروردگار کی صفات میں سے کوئی بھی صفت نہیں پائی جاتی ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع

"اگر یہ لوگ (قبول حق سے) پھر جائیں تو اللہ مفسدوں کو یقیناً خوب جانتا ہے"۔

حق کا انکار کرنے والے

ان کے حق سے پھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ مباہلہ کرنے سے ان کا مقصد حق کو آشکار کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ظاہری غلبہ چاہتے تھے۔ تاکہ اس طرح اپنی دیرینہ سنت اور رسم و رواج کو قائم رکھ سکیں اور اپنے نفسانی ھوا اور ھوس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ جبکہ یہ امر اس سعادت مند زندگی کے مقابلے میں ہے جس کا تقاضا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ یہ کام تباہی اور برائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، ان کے حق سے منہ پھرنے کی وجہ ان کا برا ہونا اور دوسروں کو برائی کی دعوت دینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حق سے پھر جانے کے نتیجہ میں یہ فساد کرنے والوں سے ہو گئے۔ اللہ انکے بارے خوب آگاہ ہے۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

"کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں، پس اگر نہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں"

توحید الوہی اور عبادی

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے اے میرے حبیب! اہل کتاب سے کہہ دو کہ آؤ اس کلمہ پر عمل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیں اور اس کو پھیلانے کی مل کر کوشش کریں۔ ''سَوَآءٍ'' دونوں اطراف کے برابر ہونے کو کہتے ہیں۔ اس کلمہ پر عمل کرنے میں ہم اور تم برابر ہیں۔ اس کلمہ سے توحید مراد ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ ہر طرح کے شرک کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے دور کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو الٰہ اور رب نہ بنایا جائے۔

''اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡئًا'' اس جملے میں غیر خدا کی عبادت اور کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دینے کی نفی کی گئی ہے۔ نہ تو اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت جائز ہے اور نہ ہی عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا ماننا یا ان کو الٰہ ماننا یا تین خداؤں (باپ، بیٹا اور روح القدس) کا عقیدہ رکھنا صحیح ہے۔

لہٰذا خدا کی عبادت اس وقت تک صحیح نہیں جب تک انسان کا عقیدہ صحیح اور خالص نہ ہو اور اس کا باطن باطل اور شرک آلود عقاید سے پاک نہ ہو۔ کیونکہ جب انسان کا عقیدہ خالص نہ ہو تو وہ جو بھی عبادت کرے گا وہ حقیقت میں ان معبودوں کی عبادت ہو گی جن کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتا ہے۔ وہ خدا جو ساری چیزوں کے کمالات کا سرچشمہ ہے اور خود اس کی ذات میں بھی تمام کمالات پائے جاتے ہیں تو اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ وہ یگانہ اور بے نیاز ہو اور اس کا دین ایسا فطری دین ہے جو فساد اور برائی کی نفی کرتا ہے۔ یہ دین انسانوں کی خود غرضی کی وجہ سے رونما ہونے والے ظلم و ستم کو مٹاتا ہے جو کہ انسان کی سعادت اور حق اور حقیقت کو ویران کرنے والے ہیں۔ اور یہ ہدف ظلم و ستم اور اختلاف کی جڑوں کو ختم کیے بغیر پورا نہیں ہو سکتا جو درج ذیل ہیں:

۱۔ طاقتوروں کا ضعیف اور کمزور لوگوں کو غلام بنانا

۲۔ ضعیف اور کمزور لوگوں کا طاقتوروں کی غلامی کرنا

۳۔ ناحق ظلم وستم کرنا

لہٰذا اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی پروردگار نہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ حقیقی توحید کی بنیاد درج ذیل چیزیں ہیں:

ا۔ سب انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم محض ہوں

۲۔ معاشرے میں عدالت قائم ہو اور معاشرتی حقوق میں سب انسان برابر ہوں

۳۔ سب انسان نیک ارادے اور نیک عمل انجام دینے میں آزاد ہوں

ایک دوسرے کو رب قرار دینے کی نہی

''وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ'' جب سب انسان، انسانی صفات میں برابر ہیں تو ظاہر ہے وہ حق حیات میں بھی مساوی اور برابر ہوں گے۔ اس لیے یہ بات درست نہیں ہے کہ ان میں سے بعض دوسروں پر اپنے میلانات کو مسلط کریں۔ صرف ایک صورت میں وہ اپنا ارادہ دوسروں پر مسلط کر سکتے ہیں جب وہ خود بھی اس مقدار میں دوسروں کے ارادے کے سامنے تسلیم ہو جائیں۔ اس کو حق حیات کے منافع حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا نام دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو بلکہ پورا معاشرہ ایک فرد کے میلانات کے سامنے سر تسلیم خم کرے یا ایک فرد دوسرے کے سامنے بلاوجہ تسلیم ہو جائے تو یہ حقیقت میں اس فرد کو رب ماننے کے مترادف ہے جس کے ارادے کے سامنے سب سر تسلیم خم ہیں۔ کیونکہ دوسروں نے اس فرد کو برابری کی حد سے بڑھایا ہے اور گویا انہوں نے اس کی عبادت کی ہے۔ یہ عمل فطرت کو باطل کرنے اور انسانیت کی بنیاد کو خراب کرنے کے مترادف ہے۔ آزاد انسان کی فطرت کبھی بھی اس کو بلاوجہ دوسروں کے سامنے خشوع اور خضوع کرنے کی

اجازت نہیں دیتی۔ اس جملے میں دو برہان اور دلیلیں ذکر ہوئی ہیں: ا۔ تمام انسان ایک ہی حقیقت کے مختلف افراد ہیں۔ ۲۔ ربوبیت، الوہیت کی خصوصیات میں سے ہے۔

جو الٰہ ہے وہی رب ہے

''فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ۝۶۴ '' یہ جملہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ توحید عبادی، اسلام کا لازمہ ہے، وہی اسلام جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس طرح تمہاری آپس کی دشمنی اور نفرت دور ہو جائے گی۔ صحیح بخاری کی ایک طولانی حدیث میں نقل ہوا ہے کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرقل اور قبطیوں کے بزرگ مقوقس کو خط لکھا تو اس میں مذکورہ آیت لکھی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کا ہرقل بادشاہ کو لکھے گئے اس خط کا ایک خطی نسخہ جسے خط کوفی میں لکھا گیا ہے اب بھی موجود ہے جو آپؐ سے منسوب ہے۔ چند سال پہلے اس خط کی فوٹو کاپی کرکے اس کو چھاپا گیا ہے جو اس وقت بہت سارے لوگوں کے پاس موجود ہے۔ یہ بات اسلام کی حقانیت پر دلیل ہے اور عیسائیوں کے خرافات کی نفی ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ مسیحی اور مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے جب ایسا ہے تو اللہ کی مخلوق سے کسی کو رب والٰہ نہ بنایا جائے۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَ الۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝۶۵

''اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں نزاع کرتے ہو حالانکہ توریت اور انجیل تو ابراہیم کے بعد نازل ہوئی ہیں؟ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''

ابراہیمؑ کے بارے اہل کتاب کا اختلاف

حضرت ابراہیمؑ کے بارے اہل کتاب کے اختلاف کا سبب یہ تھا کہ ان میں سے ہر کوئی آپؑ کو اپنا ہم مذہب مانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر خداﷺ سے فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ تورایت اور انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے بعد نازل ہوئیں ہیں، وہ کس طرح اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ ابراہیم یہودی یا عیسایی تھے؟! ان سے کہہ دو کہ حضرت ابراہیمؑ دین حق کے پیروکار تھے، ان کی شریعت اور ان کا آئین حنیف تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم محض تھے۔ ہم مسلمان بھی حضرت ابراہیمؑ کے اسی دین حنیف کے پیروکار ہیں۔ وہ اللہ کا کسی کو شریک قرار نہیں دیتے تھے عیسائی یا یہودی نہیں تھے وہ مسلم حنیف تھے۔

هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٦٦﴾

"جن باتوں میں تمہیں کچھ علم تھا ان میں تو تم نے جھگڑا کر ہی لیا، اب تم ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں؟ اور (یہ ساری باتیں) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

علم کے بغیر کسی بات پر جھگڑا کرنا

تم اگر ان چیزوں کے بارے میں بحث اور جھگڑا کرو جن کے بارے تمہیں علم ہے یہ بات تو کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے، تمہیں حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اور ان کے حالات زندگی کے بارے میں کسی حد تک علم ہے، تو تم اس بارے ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہو۔ یہودی اگر تمہارے ساتھ الوہیت اور تثلیث اور خدا کے فرزند کے بارے میں بحث کریں تو یہ بات بھی کسی حد تک صحیح ہے۔ لیکن تمہیں اس بات کا حق نہیں کہ تم حضرت ابراہیمؑ کے

یہودی یا عیسائی ہونے کے بارے میں ایک دوسرے سے گفتگو کرو۔ کیونکہ اس بارے تمہارے پاس علم اور آگاہی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے ماجرا کی حقیقت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، تمہیں اس بارے کچھ بھی علم نہیں ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

"ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسلم تھے اور وہ مشرکین میں سے ہرگز نہ تھے"۔

حضرت ابراہیمؑ کا تعارف

یہودیوں کا دعوی تھا کہ یہودیت ہی دین حق ہے، لہٰذا ان کا کہنا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے۔ جبکہ عیسایوں کا دعوی تھا کہ دین حق صرف عیسایت ہے اس بنا پر وہ حضرت ابراہیمؑ کو عیسائی مانتے تھے۔ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ دین حنیف کے پیروکار تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے۔ اسلام، اللہ کے سامنے تسلیم ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ دین گذرتے حالات اور لوگوں کی صلاحیتوں کے مطابق کامل ہوتا رہا ہے۔ مشرکین مکہ جو کہ بت پرست تھے ان کا دعوی تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف کے پیروکا ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال باطل کو بھی رد کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

”ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی لہٰذا یہ نبی اور اس پر ایمان لانے والے (زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ ابراہیم کے قریب ہیں) اور اللہ ایمان رکھنے والوں کا حامی اور وہی کارساز ہے“۔

ابراہیمؑ کے قریب ترین افراد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب سے مخاطب ہے اور فرمارہا ہے کہ تم حضرت ابراہیمؑ کے قریبی ترین افراد سے نہیں ہو۔ کیونکہ تم نے دین اسلام میں حضرت ابراہیمؑ کی پیروی نہیں کی۔ حضرت ابراہیمؑ کے قریبی ترین افراد وہ ہیں جو ان کی حیات میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے بعد رسول خداﷺ ہیں جو کہ دین حق لے کے آئے ہیں اور ان پر ایمان لانے والے ہیں یہ ہی ان کے قریبی ترین افراد سے ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم محض ہیں اور اسلامی روش کے پیروکار ہیں جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ تم لوگ جس ولایت کی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ کے قریبی ہونے کے دعویٰ کرتے ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو صرف مومنوں کے ولی ہیں نہ ان کے جنہوں نے کفر کیا اور حق اور باطل کو ملادیا ہے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

”اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تمہیں گمراہ کردے، دراصل وہ اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے“۔

مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی سازش

اہل کتاب کا ایک گروہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن انسان کا فطری طور پر حق کی جانب رجحان ان کے گمراہ ہونے کی راہ میں مانع اور رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اہل کتاب کی مومنوں کو گمراہ کرنے کی کوشش جو کہ حق کے راستے پر ہیں خود ان کی اپنی گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت میں وہ خود ہی ظاہری اور باطنی طور پر گمراہ ہو رہے ہیں لیکن اس بات کا ان کو علم نہیں ہے۔ اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں لیکن اس عمل میں وہ خود ہی گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

''اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟''

حق کی معرفت کے بعد اس کا انکار

اس آیت میں ''اٰیٰتِ اللّٰهِ'' سے الٰہی معارف مراد ہیں یعنی اے اہل کتاب تم کیوں الٰہی معارف کا انکار کرتے ہو اور ان کے متعلق کفر اختیار کرتے ہو۔ ان معارف میں پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت، عیسیٰؑ کا بندہ خدا اور اللہ کا رسول ہونا، حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی ہیں اور نہ عیسائی، خدا کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور وہ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کی قدرت لامتناہی ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ ان تمام حقائق سے اہل کتاب آگاہ تھے، اس بنا پر قرآن کی نظر میں اہل کتاب اللہ کے وجود کے منکر نہیں بلکہ وہ آیات الٰہی کے منکر ہیں۔ البتہ آیات الٰہی کے انکار کا لازمہ، اللہ کے وجود اور اس کے رسولوں کا انکار بھی ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر اللہ کے وجود، قیامت اور بعض پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ کافر ہیں۔

"وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ" سے مراد یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے گواہ ہیں کیونکہ آپؐ کی نبوت کی خبر ان پر نازل کی گئی آسمانی کتاب میں آئی ہے، اس کے باوجود وہ آپؐ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ حق کو جاننے کے بعد انہوں نے کہا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انکی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے کہ جو کچھ پیغمبرؐ اسلام لائے ہیں یہ برحق ہے۔

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۱﴾

"اے اہل کتاب! تم جان بوجھ کر حق کو باطل کے ساتھ کیوں خلط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو؟"

اہل کتاب کی سرزنش

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل کتاب سے مخاطب ہے اور فرمارہا ہے کہ اے اہل کتاب! کیوں شبہات اور اعتراضات کرکے حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہو اور باطل کو حق کی صورت میں پیش کرتے ہو؟ اور آیات الٰہی کی تحریف کرکے ان کو باطل بنا کر پیش کرتے ہو؟ اور کیوں حق کو چھپاتے ہو؟ جبکہ تمہیں اس کے بارے میں علم بھی ہے۔ تم لوگ کیوں دین کے صحیح معارف اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات کو چھپاتے ہو، تاکہ باطل کے مقابلے میں حق ضائع ہوجائے؟ جبکہ تم اس کی حقانیت سے آگاہ ہو۔ یہ سرزنش صرف ان کی نہیں جنہوں نے کتاب خدا کو تحریف کیا بلکہ تمام اہل کتاب کی سرزنش ہے، کیونکہ وہ سب ان کے عمل سے راضی تھے اور اس کے متعلق وہ سب خاموش تھے۔

وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

''اور اہل کتاب کا ایک گروہ (آپس میں) کہتا ہے: ایمان لانے والوں پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار کر دو شاید وہ (مسلمان) برگشتہ ہو جائیں''۔

اہل کتاب کا آیات الٰہی پر ایمان لانا اور پھر انکار

اہل کتاب میں سے بعض کہتے تھے کہ قرآن کی ان آیات پر ایمان لے آؤ جو تمہارے عقیدے کے مطابق ہیں اور دن کے شروع میں نازل ہوئی ہیں۔ اور جو آیات دن کے آخر میں نازل ہوئی ہیں ان کا انکار کرو۔ ان کی اس بات کا مقصد مومنین کے دلوں میں شک و تردید پیدا کرنا تھا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم تو قرآن کی آیات پر ایمان لائے تھے لیکن پیغمبر موعود کی جو صفات ہماری آسمانی کتاب تورایت میں بیان ہوئی ہیں، وہ تمہارے رسول میں نہیں پائی جاتیں۔ اس طرح وہ جاہل اعراب کے دلوں میں شک و تردید ایجاد کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اعراب، اہل کتاب کو دینی معاملات میں اپنے آپ سے زیادہ عالم سمجھتے تھے۔

'' لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ '' بہت سارے مفسرین نے آئمہ علیہم السلام کی روایات کی روشنی میں یہ کہا ہے کہ یہودیوں کی یہ باتیں تغییر قبلہ کے متعلق تھیں۔ کیونکہ جب صبح کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت المقدس کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی تو یہودیوں نے آپؐ کی تائید کی اور آپ کے اس عمل کو اپنے عقیدے کے مطابق جان کر مان لیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے قبلہ تبدیل ہوا اور آپؐ نے ظہر کی نماز کعبہ کی جانب رخ کرکے پڑھی تو یہودیوں نے قرآن کے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ لیکن آیت میں جو بات کہی گئی وہ مطلق

ہے کہ انکی عادت تھی کہ قرآن کی کچھ باتوں کو مان لیتے تھے اور پھر بعد میں دوسری باتوں کا انکار کردیتے تھے۔ اس رویہ سے ساہ لوح بدوؤں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم تو حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو ہم کو صحیح لگا وہ ہم نے مان لیا اور جو صحیح نہیں لگا ہم نے اسے نہیں مانا۔ وہ اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں انکے دین کے بارے شک و شبہ ایجاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

"اور (یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں) اپنے دین کے پیروکاروں کے سوا کسی کی بات نہ مانو، کہد یجئے: ہدایت تو بے شک وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہو، (لیکن اہل کتاب باہم یہ کہتے ہیں) کہیں ایسا نہ ہو جیسی چیز تمہیں ملی ہے ویسی کسی اور کو مل جائے یا وہ تمہارے رب کے حضور تمہارے خلاف حجت قائم کرلیں، ان سے کہد یجئے: فضل تو بے شک اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے، اور اللہ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے"۔

اہل کتاب کی چالیں

یہ اہل کتاب کی گفتگو کا بقیہ حصہ ہے جس میں وہ اپنے مذہب کے لوگوں سے کہتے تھے کہ تم قرآن کی ان آیات پر ایمان لے آؤ جو تمہارے عقیدے کے مطابق ہوں، لیکن ان آیات پر ایمان نہ لانا جو تمہارے عقیدے کے خلاف ہوں۔ انہوں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوا کہا کہ تم نے مسلمانوں کو ہرگز نہیں بتانا کہ قبلہ کا تبدیل ہونا حضرت محمد ﷺ

کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ تاکہ اس طرح تم پر حجت تمام ہو اور تمہاری حقانیت خطرے میں پڑ جائے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہدایت تو بے شک وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ہو'' لہٰذا مومنین دوسروں کی ہدایت سے بے نیاز ہیں کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت ملی ہوئی ہے۔ یہودی کہتے تھے اگر تم نے مسلمانوں کو بتادیا کہ قبلہ کا تبدیل ہونا حضرت محمد ﷺ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تو تمہاری طرح مسلمانوں کا الگ قبلہ ہوگا اور اس کے بعد تم مسلمانوں کے سامنے فخریہ انداز میں نہیں کہہ سکو گے کہ دنیا میں صرف یہودیوں ہی کا قبلہ ہے باقی سب ان کے قبلہ کے تابع ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی تمہارے لیے کوئی دلیل اور حجت باقی نہیں رہے گی کہ تم کہہ سکو کہ ہم اس چیز سے آگاہ نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں کہا:

1۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مومنین تمہاری ہدایت سے بے نیاز ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت دی ہے۔

2۔ دوسری بات یہ کہ قبلہ کا تبدیل ہونا مسلمانوں کے لیے اللہ کا فضل و کرم تھا اللہ تعالیٰ جسے چاہے وہ فضل اسے دے دیتا ہے۔ خواہ تم اس بات پر راضی ہو جاؤ یا راضی نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے کہ اگر کسی کو نہ چاہو تو اللہ کے فضل کے اس تک پہنچنے کے لیے رکاوٹ بنو۔ قبلہ کے تبدیل ہونے کو تم نہیں چھپا سکتے ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے فضل و کرم ہے۔ یہ ایسا امر نہیں ہے کہ تم اس کو روکنے پر اللہ تعالیٰ کو مجبور کر سکو۔ کیونکہ یہ فضل تو اللہ کا دیا ہوا ہے اور وہ جسے چاہے اپنا فضل دے دیتا ہے۔ کوئی بھی چیز اللہ کی مشیت اور ارادے کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتی ۔اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ سب کے حالات سے آگاہ ہے اور جانتا ہے کہ کون اس کے فضل و کرم کا مستحق ہے۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾

''وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص کرتا ہے اور اللہ عظیم فضل والا ہے''۔

فضل دینا اللہ کا اختیار ہے

اللہ تعالیٰ مالک مطلق ہے اور اس کی قدرت بھی لامحدود ہے وہ جس طرح چاہے اپنی ملکیت میں تصرف کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کا عظیم ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے فضل و کرم کا اختیار صرف اسی کے پاس ہو۔ دوسری بات یہ کہ اس کا فضل و کرم کبھی بھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ وہ اپنے بندوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے۔ فضل ایسے عطیہ کو کہتے ہیں جو واجب اور لازم نہ ہو، یہ رحمت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ ایک لحاظ سے یہ فضیلت ہے اللہ جسے چاہے اسے نواز دے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾

''اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر آپ اسے ڈھیر دولت کا امین بنادیں تو وہ آپ کو لوٹا دے گا، البتہ ان میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اگر آپ ایک دینار کا بھی امین بنادیں تو وہ آپ کو ادا نہیں کرے گا جب تک آپ اس کے سر پر کھڑے نہ رہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ناخواندہ (غیر یہودی) لوگوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمے داری نہیں ہے اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں''۔

اہل کتاب میں امانتدار اور خائن

یہ آیت اہل کتاب کے مختلف گروہوں کی جانب اشارہ ہے۔ ان میں سے بعض تو امانت دار ہیں اور ان کو اگر نہایت قیمتی اشیاء کا امین بنایا جائے تو بھی وہ اسے پورا پورا واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہیں اگر ایک دینار بھی امانتدی جائے تو اسے اس کے مالک کو واپس نہیں کرتے۔ وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کوئی بھی قوم اہل کتاب پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ غیر عرب اور غیر یہود ان پڑھ اور امی ہیں، وہ بنی اسرائیل پر حکومت کرنے اور ان پر مسلط ہونے کا حق نہیں رکھتے۔ وہ اس مسئلے کو مذہب کا رنگ دے کر دعوای کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خاص قوم بنا کر پیدا کیا ہے۔ اور ان کو دوسری اقوام پر برتری دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری اقوام پر حکومت کرنے کا حق صرف انہیں دے دیا ہے۔ اس لیے وہ ناحق دوسروں کا مال کھانے، ان سے سود لینے اور دوسروں کے حقوق پایمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور اس بات پر کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا حق بھی نہیں ہے۔ جبکہ یہ تمام برائیاں ان کے دین اور شریعت میں حرام تھیں۔ یہ برائیاں انسانیت کو مٹانے اور کسی بھی معاشرے کی ویرانی کا سبب ہیں۔ اسی لیے اسلام میں دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اب فرق نہیں کرتا ہے کہ صاحب حق مسلمان ہو یا کسی دوسرے دین کا پیروکار ہو۔ ''وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ'' اہل کتاب جو ناروا نسبتیں اللہ کی طرف دیتے تھے وہ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾

''ہاں! (حکم خدا تو یہ ہے کہ) جو بھی اپنا عہد پورا کرے اور تقویٰ اختیار کرے تو اللہ تقویٰ والوں کو یقیناً دوست رکھتا ہے''۔

عہد الٰہی کی پابندی، کرامت کا معیار

اس آیت میں یہودیوں کی اس بات کا جواب دیا گیا ہے جس میں وہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسروں پر برتری دی ہے اس لیے وہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ تقدم اور تسلط کا حق صرف اہل تقویٰ کو حاصل ہے۔ اس آیت میں ''عَھْد'' سے میثاق الٰہی مراد ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے وعدہ لیا ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئیں اور صرف اسی کی عبادت کریں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے نزدیک احترام اور بڑائی کا معیار صرف کسی چیز کا دعویٰ کرنا نہیں ہے، اللہ کے نزدیک وہ شخص محترم اور عظمت والا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے، اور اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے جو اس سے کیئے گئے وعدے کا پابند ہو اور تقویٰ اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی کرامت یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے کرامت دے وہ آزاد نہیں ہے کہ جو اس کا دل چاہے وہ انجام دے اور جو چاہے کہے اور اس طرح کا ناروا دعویٰ کرے کہ کوئی بھی بنی اسرائیل پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہم اللہ کے ولی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے معاشرہ ویران ہو جائے گا اور نسلیں اور فصلیں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

''بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اللہ قیامت کے دن ان سے نہ تو کلام

کرے گا اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

عہد الٰہی کو توڑنے والوں کا انجام

اس آیت میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو مال دنیا کے عوض آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں۔ بطور مثال یہودی پیسے لے کر کتاب خدا میں تحریف کرتے تھے، یا احبار اور ان کے علماء دین ناحق لوگوں کا مال کھاتے تھے اور اللہ کے راستے میں رکاوٹ ایجاد کرتے تھے۔ مسلمان علماء میں سے جو علماء یہود کی اس روش کو اپنائے وہ بھی اس آیت کے مصادیق میں سے ہوگا۔ اس بارے رسول خدا ﷺ سے حدیث نقل ہوئی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: اگر کوئی قسم کھائے اور اس قسم کو توڑنا چاہے تو اسے چاہیے کہ قسم توڑنے کے کفارہ کے طور پر کچھ مال ادا کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ گنہگار ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ان سے ناراض ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اس پر نظر کرم نہیں کرے گا اور ان کو اپنے کلام کا مخاطب ہونے کا شرف نہیں بخشے گا، اور دنیا اور آخرت میں ان کو عذاب دے گا۔ اس آیت کے مطابق آخرت میں پانچ خصوصیات مومنین کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں :۔

1۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص توجہ، 2۔ اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام کرنا، 3۔ ان پر نظر رحمت کرنا، 4۔ ان کا اللہ تعالیٰ کی بخشش سے بہرہ مند ہونا، 5۔ ان کو پاک و پاکیزہ کرنا۔ یہ پانچ چیزیں اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت کا نتیجہ ہیں۔[1]

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔

وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾

''اور (اہل کتاب میں) یقینا کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبان کو اس طرح پھیرتے ہیں کہ تمہیں یہ خیال گزرے کہ یہ خود کتاب کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب سے متعلق نہیں اور وہ کہتے ہیں: یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہوتی اور وہ جان بوجھ کر اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں''۔

اہل کتاب کی کلام الٰہی میں تحریف

اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اپنی باتوں کو کتاب خدا کی تلاوت کے انداز میں پیش کرتے تھے، تاکہ ان باتوں کی اللہ تعالٰی کی طرف نسبت دیں اور اس بارے لوگوں کو دھوکہ دیں اور اپنی لکھی ہوئی چیزوں اور اپنی باتوں کو اللہ کا کلام بنا کر پیش کریں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی باتوں کو اللہ تعالٰی کا کلام سمجھیں، جبکہ وہ اللہ کا کلام نہیں تھا۔ کیونکہ کلام خدا کا مقام ان کی باطل باتوں سے بہت زیادہ بلند اور رفیع ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حقیقی معبود حق بات کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔ اور وہ جان بوجھ کر اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہیں۔ جبکہ ان کو علم ہے کہ ان کی یہ نسبت جھوٹی ہے۔ اور یہ ایک جھوٹ کے بعد دوسرا جھوٹ ہے۔ کیونکہ جھوٹ بولنا یہودیوں کی زندگی کا حصہ ہے اور ان کا جھوٹ بولنا نادانی کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ اپنی باتوں کے جھوٹ ہونے سے آگاہ تھے اور جان بوجھ کر جھوٹ بولتے تھے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

"کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تو اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے کہے: اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہ کہے گا:) جو تم (اللہ کی) کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور جو کچھ پڑھتے ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم سچے ربانی بن جاؤ"۔

عبادت صرف اللہ کی ذات کیلئے ہے

کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمات کا کفران کرے اور لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی طرف دعوت دے دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے تمام معبودں کی عبادت باطل ہے، یہاں تک کہ توسل اور تقرب کے عنوان سے بھی اللہ کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کی عبادت اور پرستش باطل ہے۔ سورہ یونس کی آیت ۱۷ کے مطابق بت پرستوں کا یہی کہنا تھا کہ بت، اللہ کی بارگاہ میں ہمارے لیے شفاعت کرنے والے ہیں۔ کسی کی عبادت اسی صورت میں صحیح ہے جب وہ مستقل ہو اور کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو، اور یہ خصوصیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات میں پائی جاتی ہے۔ اللہ کی ذات کے علاوہ تمام موجودات نیاز مند ہیں۔ "اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور جو کچھ پڑھتے ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم سچے ربانی بن جاؤ" اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ تو اسی لیے مبعوث ہوئے تھے تاکہ لوگوں کا جن چیزوں کے بارے میں اختلاف تھا اس کو حل کرے اور ان سے پہلے جو چیزیں حرام تھیں ان میں سے بعض کو ان کے لیے حلال کرے

، اوران کو تعلیم اور تدریس جیسے واجبات پر عمل کرنے کی دعوت دے، لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمات کا شکر بجالاتے ہوئے خدائی بنیں اور ہمیشہ خدا کو یاد کریں۔

وَلَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"اور وہ تمہیں فرشتوں اور پیغمبروں کو رب بنانے کا حکم نہیں دے گا، کیا (ایک نبی) تمہیں مسلمان ہو جانے کے بعد کفر اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟"

اللہ کے سوا کوئی رب نہیں

جس طرح صابئی فرشتوں کو اپنا معبود بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے اور مشرکین مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے اور اپنے آپ کو دین حنیف کا پیرو مانتے تھے، پیغمبروںؑ کی عبادت بھی یہودیوں کی اس بات کی مانند ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے یا عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔" کیا (ایک نبیؑ) تمہیں مسلمان ہو جانے کے بعد کفر اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟" اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب ان تمام لوگوں سے ہے جو اپنے آپ کو پیغمبروںؑ کا پیرو مانتے ہیں جیسے اہل کتاب اور اعراب جاہلیت جو اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو مانتے ہیں۔ اس مقام پر اسلام سے دین توحید مراد ہے جو کہ تمام انبیاءؑ پر نازل کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اس آیت میں اہل کتاب سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور جناب عزیر کے متعلق باطل عقائد سے باز آئیں کیونکہ انبیاءؑ کبھی بھی تمہیں اپنی عبادت کی دعوت نہیں دے سکتے ہیں۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ

ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾

"اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کر دوں پھر آئندہ کوئی رسول تمہارے پاس آئے اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرے تو تمہیں اس پر ضرور ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہو گی، پھر اللہ نے پوچھا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے (عہد کی) بھاری ذمہ داری لیتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے اقرار کیا، اللہ نے فرمایا: پس تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ (اس امر پر) گواہ ہوں"۔

انبیاءؑ سے لیا گیا میثاق

اس آیت میں "میثاق" سے وہ عہد و پیمان مراد ہے جو انبیاءؑ سے لیا گیا ہے، اسی طرح لوگوں سے ان کے متعلق عہد و پیمان لیا گیا۔ لوگوں سے یہ پیمان لینے کا واسطہ بھی انبیاء ہی ہیں۔ اس عہد و پیمان میں لوگوں سے یہ عہد لیا گیا ہے کہ وہ انبیاءؑ پر ایمان لائیں، ان کی مدد کریں اور ان کے حکم سے سرپیچی نہ کریں اور انبیاءؑ سے وعدہ لیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو شرک کی طرف دعوت نہ دیں بلکہ لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دیں۔ "لَتُؤْمِنُنَّ" میں "لام" لامِ قسم ہے۔ اور یہ پورا جملہ اس میثاق کو بیان کر رہا ہے جس میں لوگوں سے وعدہ لیا گیا ہے کہ انہیں " پیغمبروںؑ پر ضرور ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہو گی"۔ اس پیمان کے بعد اللہ تعالیٰ نے پوچھا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے (عہد کی) بھاری ذمہ داری لیتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے اقرار کیا، اللہ نے فرمایا: پس تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب پیغمبروںؑ اور ان کی امتوں سے ہے اور یہ حکم ان سب کو شامل ہے۔ ''اِصر'' نہایت محکم اور قوی پیمان کو کہتے ہیں جو ایمان لانے اور عمل میں انبیاؑ کی مدد کرنے سے ہی متحقق ہو سکتا ہے، جس کے متعلق انہوں نے اقرار کیا تھا کہ وہ اس عہد کو پورا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اقرار کے بعد فرمایا: ''پس تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں'' اس گواہی میں انبیاءؑ اور امت دونوں شامل ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عہد پر انبیاءؑ کو بھی گواہ بنایا ہے اور ان کی امتوں کو بھی۔ ان آیات کا سیاق بتا رہا ہے کہ یہ آیات اہل کتاب کے متعلق ہیں اور ان آیات میں ان کی سرزنش کی گئی ہے کہ انہوں نے توحید کی طرف پیغمبروںؑ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا اور ان کی اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

''پس اس کے بعد جو (اپنے عہد سے) پھر جائیں وہی لوگ فاسق ہیں''۔

جو بھی اس محکم اور قوی عہد و پیمان کے بعد اس کو پورا نہ کرے بتحقیق وہ فاسقوں میں سے ہے۔ فاسق اسے کہتے ہیں جو سنگدلی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوامر کی نافرمانی کرے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

''کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے خواہاں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی موجودات نے چار و ناچار اللہ کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں اور سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے''۔

اللہ کا دین اسلام

اللہ کا دین ایک ہی ہے جس کے متعلق اس نے تمام انبیاءؑ اور ان کی امتوں سے عہد و پیمان لیا ہے۔ پس کیا وہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کے خواہاں ہیں جبکہ اسلام دین توحید ہے اور آسمانوں اور زمین کی موجودات نے چار و ناچار اللہ کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں۔ اس آیت میں تسلیم سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تکوینی طور پر تسلیم ہونا مراد ہے۔ لہٰذا اہل کتاب پر لازم ہے کہ تشریعی طور پر دین اسلام کے آگے تسلیم ہوں کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمیں میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کے سامنے تسلیم ہیں۔ اس کی دلیل " طَوْعًا اَوْ کَرْهًا " والا جملہ ہے۔ تمام موجودات یا تو اپنے بارے اللہ تعالیٰ کے ارادے اور جو کچھ اس نے ان کے متعلق لکھا ہے جیسے موت، فقر اور بیماری اور اس جیسی دوسری چیزوں سے راضی ہیں یا راضی نہیں۔ دونوں صورتوں میں تمام موجودات نے اللہ تعالیٰ کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے، یہ اس بات کی دوسری دلیل ہے کہ اہل کتاب کو دین اسلام جو کہ دین واحد ہے کی پیروی کرنی چاہیے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

"کہدیجئے: ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہماری طرف نازل ہوا ہے اس پر بھی نیز ان (باتوں) پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئی ہیں اور جو تعلیمات موسیٰ و عیسیٰ اور باقی نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے ملی ہیں

(ان پر ایمان لائے ہیں)، ہم ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں ہیں اور ہم تو اللہ کے تابع فرمان ہیں"۔

تمام انبیاءؑ پر ایمان

اس آیت میں رسول خدا ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ اپنی امت سے کہیں کہ پیمان الٰہی پر عمل کریں اور سابقہ تمام انبیاءؑ پر ایمان لائیں جن میں حضرت یعقوبؑ اور بنی اسرائیل میں سے ان کی نسل سے جو اسباط (اولاد) آئے جن میں حضرت داود، حضرت یونس اور حضرت ایوب علیہم السلام شامل ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیمات موسیٰ و عیسیٰ اور باقی نبیوںؑ کو ملی ہیں (ان پر ایمان لائیں اور ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہ ہوں اور اللہ کے حکم کے تابع ہوں۔ اس آیت میں "النَّبِيُّوْنَ" کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حکم تمام انبیاء کو شامل ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ پر نازل کیا ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" سے اسی بات کی تاکید کی گئی ہے جو آیت کے سابقہ حصے میں بیان کیا گیا ہے یعنی ہم، تمام انبیاءؑ کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم ہیں۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہاں ہوگا وہ اس سے ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا"۔

اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں

یہ آیت سابقہ آیات کی تاکید ہے جن میں عہد الٰہی کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جس کا عمل عہد الٰہی کے مطابق نہ ہو اس کا کوئی عمل قبول نہ ہو گا اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔ کیونکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے منہ پھیریں گے ظاہر ہے وہ خواہشات نفسانی کے مطابق بنائے گئے قوانین کی پیروی کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو تشریع کیا ہے اور نہ ہی ان پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس پر عمل روی زمین کے تمام انسانوں پر واجب ہے، کیونکہ اسلام، اللہ تعالیٰ کے آگے تسلیم ہونے کا دین ہے اس طرح تمام انسان ایک پرچم تلے جمع ہوں گے، جو اس دین کے علاوہ کسی اور دین کا خواہاں ہو وہ خسارے میں ہو گا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اللہ کیونکر اس قوم کو ہدایت کرے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئی ہے حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول برحق ہے اور ساتھ ہی ان کے پاس روشن دلائل بھی آ گئے تھے اور ایسے ظلم کے مرتکب ہونے والوں کو اللہ ہدایت نہیں کرتا"۔

ایمان لانے کے بعد کافر ہو جانا

اس آیت میں استفہام انکاری ہے جس کا مطلب اس چیز کو بعید جاننا ہے۔ یعنی بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کی ہدایت کرے۔ حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول برحق ہے، اس گواہی اور شہادت کے باوجود انہوں نے جان بوجھ کر اس رسول کو ماننے سے انکار کیا ہے تو اب اللہ ان کی ہدایت کیسے کر سکتا ہے۔ اگر کفار سے اہل کتاب مراد ہوں تو آیت کا معنی یہ ہو گا

کہ اپنی آسمانی کتابوں میں اس رسول کی نشانیوں کو دیکھ کر انہیں اس کے حق ہونے کا یقین تھا۔ اور اگر اس سے مرتد مراد ہوں تو ان کی گواہی کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے علمی اور زبانی طور پر رسول اکرم ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کے ہدایت نہ پانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم ہیں۔ اور یہ بات اس چیز سے منافات نہیں رکھتی کہ اگر وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہدایت دے گا۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾

"ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ، فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہے"۔

ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے دور ہونگے۔ اسی لیے سب انسان اور فرشتے اللہ تعالیٰ سے اس بات کی درخواست کرتے ہیں کہ ان کو اپنی رحمت سے دور کرے۔

خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾

"وہ ہمیشہ اس لعنت میں گرفتار رہیں گے، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی"۔

وہاں پر ان کو مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔ وہ بہت جلد اس جاودانہ عذاب کی جانب بڑھیں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

"سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی، پس اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے"۔

ارتداد کے بعد توبہ

اگر وہ ارتدار کے بعد توبہ کریں اور ان کی توبہ خلوص نیت کے ساتھ ہو تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول کرلے گا اور ایمان کے ذریعے ان کے باطن کو کفر کی پلیدی سے پاک کردے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مہربان اور بخشنے والا ہے۔ اس لیے ان کے گناہوں کو بخشتا ہے اور ان کی کوتاہیوں سے در گزر کرتا ہے اور توبہ کرنے کی صورت میں ان کو سزا دینے کی بجائے انہیں اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾

"جنہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر وہ اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہو گی، اور یہی لوگ گمراہ ہیں"۔

ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے والے

وہ لوگ جو حق کے آشکار ہونے کے بعد اور اتمام حجت کے بعد بھی کفر اختیار کرتے ہیں اور حق کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو ایسے افراد کے ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ایسے افراد کو ہدایت نہیں دیتا اور ان کی توبہ کو قبول نہیں کرتا کیونکہ انہوں نے اللہ کی طرف حقیقی معنوں میں اور خلوص دل کے ساتھ رجوع نہیں کیا۔ در حقیقت وہ گمراہی اور ضلالت میں غرق تھے اور ایسے افراد کی ہدایت اور ان کے نجات پانے کی کوئی امید نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

''جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کفر کی حالت میں مر گئے ان میں سے کسی سے اس قدر سونا بھی، جس سے روئے زمین بھر جائے، ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے فدیہ میں دے دیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہو گا اور ان کی مدد کرنے والے نہ ہوں گے''۔

کفر کی حالت میں مرنے والے

جو لوگ کفر اور ارتداد کی حالت میں مر جائیں یا جنہوں نے گناہوں سے توبہ نہ کی ہو تو ان کا انجام معلوم ہے۔ ان کے آخرت میں پچھتاوے اور توبہ کرنے کے بدلے اللہ تعالیٰ انہیں کچھ نہیں دے گا اور کوئی بھی چیز دنیا میں توبہ کرنے کا ازالہ اور تلافی نہ کر سکے گی۔ لہٰذا وہ آخرت میں دردناک عذاب کا شکار ہوں گے اور وہاں پر ان کی شفاعت کرنے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔ اور کچھ بھی ان کی سزا کا معاوضہ نہ ہو سکے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

''جب تک تم اپنی پسند کی چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یقیناً اللہ اس سے خوب باخبر ہے''۔

اللہ کی راہ میں بہترین چیزوں کا انفاق

''لَنۡ تَنَالُوا'' کا معنی ہے ''لن تصلوا'' یعنی تم کبھی نہیں پہنچ سکتے ہو۔ ''بِرَّ'' کار خیر میں انسان کے ہاتھ کھلے ہونے کے معنی میں ہے، یعنی نیک کام کرنے کے لیے انسان کے پاس وسیع قدرت اور وسائل موجود ہوں۔ یہاں پر کار خیر کا وسیع معنی مراد ہے اس سے قلبی اور بدنی کام دونوں مراد ہیں۔ قلبی کار خیر سے حق کا اعتقاد اور پاک نیت مراد ہیں اور بدنی اعمال میں اللہ کی راہ میں انفاق اور دوسرے نیک اعمال شامل ہیں۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو مال وہ اکھٹا کرتا ہے اسے اپنی ذات کا حصہ سمجھتا ہے اور بعض لوگوں کو جان سے زیادہ مال سے محبت ہوتی ہے، انہیں مال گنوانے پر جسم کے کسی حصہ کو کھونے جیسا دکھ ہوتا ہے۔اسی لیے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا دوسری تمام عبادات سے زیادہ دشوار عبادت ہے، اس بارے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے ''جب تک تم اپنی پسند کی چیزوں میں سے خرچ نہ کرو تب تک کبھی نیکی کو نہیں پہنچ سکتے'' اور اللہ کی راہ میں انفاق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان کو خوش کرنے کے لیے فرمایا ''جو کچھ تم خرچ کرتے ہو یقینا اللہ اس سے خوب باخبر ہے'' اور اللہ تمہارے خرچ کیئے گئے مال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَآ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾

''بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی ساری چیزیں حلال تھیں بجز ان چیزوں کے جو اسرائیل نے توریت نازل ہونے سے پہلے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں، کہد یجئے: اگر تم سچے ہو تو توریت لے آؤ اور اسے پڑھو۔''

بنی اسرائیل کے لیے کھانے کی حلال چیزیں

اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا نام تھا۔ ان کو اس نام سے پکارنے کی وجہ ان کا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ تورایت کے نازل ہونے سے پہلے سارے کھانے ان کے لیے حلال تھے، سوائے ان کھانوں کے جنہیں خود حضرت یعقوبؑ نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ بنی اسرائیل اس چیز کو نہیں مانتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "کہد یجئے: اگر تم سچے ہو تو توریت لے آؤ اور اسے پڑھو"۔ یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اور شریعتیں نسخ نہیں ہوتیں اس لیے وہ مسلمانوں کو کہتے تھے کہ تمہارے رسول جھوٹے ہیں کیونکہ وہ شریعت کے نسخ ہونے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر حلال کی گئی چیزوں کو حرام کیا ہے۔ جبکہ یہ حرام کی گئی چیزیں اس وقت تحریم کا مصداق بن سکتی ہیں جب وہ اس سے پہلے حلال ہوں، جو کہ یہودیوں کی نظر میں محال ہے۔

قرآن کریم نے ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ تورایت کے نازل ہونے سے پہلے سب کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے، اگر اس بات کو نہیں مانتے ہو تو تورایت کو لاؤ اور اسے پڑھو، تب پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کون سچا ہے۔

فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٩٤﴾

"اس کے بعد بھی جنہوں نے اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی وہی لوگ ظالم ہیں"۔

اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینے والے

اگر تم لوگ اس بات کو نہیں مانتے اور تورایت میں لکھی گئی چیزوں کو نہیں پڑھتے تو یقیناً تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو اور اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینے والا ظالم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جملے کو اپنے رسول کی تسلی خاطر کے لیے بیان فرمایا ہے کہ

تمہارے دشمن یعنی یہودی ہی ظالم اور ستمگار ہیں، کیونکہ انہوں نے اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی ہے۔اس جرم کی انہیں سزا ملے گی۔انکے پاس اپنی بات کا کوئی ثبوت نہ ہے۔

قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ ۟ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۹۵﴾

''کہہ دیجئے: اللہ نے سچ فرمایا، پس تم یکسوئی سے دین ابراہیمی کی پیروی کرو اور ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے''۔

دین ابراہیمی کی پیروی

اللہ فرمارہاہے میرے دین کے پیروکار بنو جو کہ حضرت ابراہیمؑ کا ہی دین ہے اور جو چیزیں دین ابراہیمؑ اور دین اسلام میں حلال ہیں جیسے اونٹ اور دوسرے حلال گوشت جانور، ان کے حلال ہونے کو مانو، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ظلم کی وجہ سے ان چیزوں کو تمہارے اوپر حرام کیا تھا۔تم ابراہیمی شریعت اپنالو، ابراہیمؑ مشرک نہیں تھے وہ توحید پرست تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۹۶﴾

''سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے جو عالمین کے لیے بابرکت اور راہنما ہے''۔

عبادت کے لیے بنایا گیا پہلا گھر

اس آیت میں اس گھر کو لوگوں کے لیے قرار دینے کا مطلب، اس کو عبادت کے لیے مخصوص کرنا ہے۔ یہ پہلا گھر ہے جو اس مقصد کے لیے بنایا گیا تاکہ لوگ اس کی طرف رخ

کرکے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ اس گھر سے خانہ کعبہ مراد ہے جسے بکہ (لوگوں کے بھیڑ کی جگہ) بھی کہا گیا ہے، کیونکہ لوگ اس گھر کے طواف اور حج کے اعمال بجالانے کے لیے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک ''بکہ'' حرم، مسجد یا طواف کرنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ ''مُبٰرَكً'' برکت سے لیا گیا ہے جو کہ خیر کثیر کے معنی میں ہے۔ "مکان مبارک" سے ایسی جگہ مراد ہے جہاں پر خیر کثیر نازل ہوتی ہو۔ اس سے دنیوی اور اخروی برکات مراد ہیں۔

'' هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٩٦ '' اس گھر کا عالمین کے لیے راہنما ہونا اس حوالے سے ہے کہ اس گھر کے بننے اور اس میں انجام دی جانے والی عبادات کو تشریع کرنے سے لوگوں کو اخروی سعادت کی جانب راہنمائی کی جاسکتی ہے اور لوگ اس کے ذریعے سے اللہ کا قُرب حاصل کرسکتے ہیں۔ لہٰذا کعبہ ہدایت کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے جن میں ذہنی تصور سے لے کر دنیا سے اپنا تعلق قطع کرنے اور عالم معنویت سے جڑنے تک ہدایت ہی ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ کعبہ امت کے افراد کے درمیان وحدت ایجاد کرکے ان کو دنیا اور آخرت کے مفاد کی طرف راہنمائی کرسکتا ہے۔ اس وجہ سے کہا گیا کہ کعبہ تمام پہلوؤں سے ہدایت ہے۔ اس کی ہدایت کسی خاص گروہ یا کسی خاص قوم وملت کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝٩٧

''اس میں واضح نشانیاں ہیں (مثلًا) مقام ابراہیم اور جو اس میں داخل ہوا وہ امان والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو (اس کا اپنا نقصان ہے) اللہ تو عالمین سے بے نیاز ہے''۔

کعبہ کی عظمت اور فریضہ حج

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے اس کی خصوصیات کو اس آیت میں بیان کیا ہے جن میں 1۔پہلی خصوصیت یہ ہے کہ : اس میں مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم ایک پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ کے پاؤں کے نشان ہیں، یہ پتھر مطاف کے اندر ملتزم کونے کے سامنے ہے۔ 2۔اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا وہ امان والا ہو گیا۔ یہ خصوصیت ایک تشریعی حکم ہے، نہ کہ تکوینی خصوصیت۔ کیونکہ اسلام سے پہلے بھی خانہ کعبہ حرم امن سمجھا جاتا تھا اس لیے یہ آیت یا تو اسی سابقہ حکم کی تشریع کو بیان کر رہی ہے یا تو اس سابقہ حکم کی تائید کر رہی ہے جو پچھلی امتوں میں بھی موجود تھا۔ 3۔کعبے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ زیارت کرنے کی استطاعت رکھنے والوں پر اس کی زیارت اور حج واجب ہے۔

لغوی اعتبار سے حج، قصد کرنے کے معنی میں ہے اور فقہی اصطلاح میں حج مخصوص اعمال کو کہا جاتا ہے جو حج کے موسم میں انجام دئے جاتے ہیں۔ حج بجالانے کا حکم اسلام میں تشریع نہیں ہوا بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں موجود حکم کی تائید ہے۔ آیت میں استطاعت سے مالی اور جانی توانائی مراد ہے۔ اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو (اس کا اپنا نقصان ہے) اللہ تو عالمین سے بے نیاز ہے۔ یہاں پر ''کفر'' سے اصول دین کا انکار مراد نہیں ہے بلکہ اس سے فروع دین کا انکار مراد ہے جیسے نماز اور زکات کا انکار ان اعمال کو انجام نہ

دینااور انکے وجوب کا انکار کرنا۔ لہٰذا جو بھی حج نہیں کرتا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرتا کیونکہ اللہ تو عالمین سے بے نیاز ہے جو فریضہ حج کا انکار کرے تو وہ کافر ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾

"کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! تم اللہ کی نشانیوں کا انکار کیوں کرتے ہو جب کہ اللہ تمہارے اعمال کا مشاہدہ کرنے والا ہے"۔

اللہ اہل کتاب کے اعمال کا شاہد

سابقہ آیات کی روشنی میں یہاں پر "نشانیوں" سے تورایت میں کھانوں کا حلال ہونا اور اسلام میں قبلہ کا کعبہ کی طرف پلٹنا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کیونکہ تمہارے سب اعمال سے آگاہ ہے اس لیے وہ تمہارے دلوں میں موجود اللہ کے راستے کو بند کرنے اور زمین میں فساد پھیلانے کے ارادے سے بھی آگاہ ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

"کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! تم ایمان لانے والوں کو راہ خدا سے کیوں روکتے ہو؟ تم چاہتے ہو اس راہ میں کجی آئے حالانکہ تم خود اس پر شاہد ہو (کہ وہ راہ راست پر ہیں) اور اللہ تمہاری حرکتوں سے غافل نہیں ہے"

اللہ کے راستہ سے روکنا

تم کیوں اللہ کے راستے سے منحرف کرتے ہو؟ جبکہ تمہیں اسلام کی حقانیت کا یقین ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال اور تمہارے کفر سے آگاہ ہے اور تم خود بھی اس چیز کو جانتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تم پر بھی گواہ ہے اور وہ اس چیز کی گواہی دیتا ہے کہ تمہیں جس چیز کی حقانیت کا علم تھا تم نے اس کا انکار کیا۔ اور یہ انکار بڑا جرم اور اللہ کے دین سے بغاوت ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

”اے ایمان والو! اگر تم نے اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی بات مان لی تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں کافر بنا دیں گے“۔

اہل کتاب کی اطاعت باعث کفر

اس گروہ سے یا تو سب یہودی مراد ہیں یا ان میں سے بعض مراد ہیں۔ یہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وہ تم سے حسد اور کینہ کی وجہ سے اور تمہارے دین سے نفرت کی وجہ سے تمہیں تمہارے دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں۔ اس جگہ مسلمانوں کو بتادیا کہ یہودی تمہیں دین سے منحرف کرنے کے درپے ہیں لہٰذا انکی باتوں کو مت مانو۔ انکے مخالف رہو وہ حق کے دشمن اور دین الٰہی کے انکاری ہیں۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور تم کس طرح پھر کفر اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہیں اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کا رسول بھی موجود ہے؟ اور جو اللہ سے متمسک ہو جائے وہ راہ راست ضرور پا لے گا''۔

آیات الٰہی سننے کے باوجود کفر اختیار کرنا

یہودیوں سے سوال کیا جا رہا ہے کہ تم کس طرح کفر اختیار کرتے ہو جبکہ تم نے اللہ کی واضح نشانیوں کا مشاہدہ بھی کر لیا ہے جو کفر اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور اللہ کا راستہ دکھانے والا رسول بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ جو بھی ہدایت الٰہی سے جڑا رہا اس نے راہ نجات پا لیا۔ یہ ہدایت ان سب کو شامل ہے جو ہدایت لیتے ہیں اور انہیں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ سیدھا راستہ سے ہمیشہ ثابت رہنے والا ایمان مراد ہے جس میں نہ تو اختلاف ہے اور نہ ہی تخلف، یہ ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والوں کو گمراہ ہونے سے بچاتا ہے اور ہدایت دیتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اے ایمان والو! اللہ کا خوف کرو جیسا کہ اس کا خوف کرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔

مومنین کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم

عذاب الٰہی کے خوف سے تقویٰ اختیار کرو اور گناہوں سے بچو، اوامر الٰہی کی پیروی کرو اور اس کے منع کئے ہوئے کاموں کو انجام نہ دو، اس کی دی ہوئی نعمات کا شکر بجا لاؤ اور

مصیبتوں پر صبر کرو۔ '' حَقَّ تُقٰتِهٖ '' سے اللہ تعالیٰ کی ایسی خالص عبادت مراد ہے جس میں کسی قسم کی غفلت اور خود پرستی نہ ہو۔ ایسی عبادت جس میں کسی بھی قسم کی معصیت نہ ہو، ایسا شکر جس میں کوئی کفر نہ ہو، ایسا ذکر جس میں غفلت اور فراموشی نہ ہو۔ یہ وہی اسلام ہے جس پر مرنے تک ثابت قدم رہنے کی تاکید کی گئی ہے اور تقویٰ کا اعلیٰ ترین درجہ بھی یہی ہے۔ تاکید کی گئی کہ مسلمان ہو کر مرنا، ایسا نہ ہو کہ مرنے سے پہلے کفر اختیار کر لو اور کافر ہو کر مرو۔

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳

''اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو اور تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالی اور اس کی نعمت سے تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا، اس طرح اللہ اپنی آیات کھول کر تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو''۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم

سابقہ آیت میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے تمسک کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے اللہ کی رسی سے ''اعتصام'' کرنے اور اس کو مضبوطی سے تھامنا مراد ہے۔ اس سے وہ رابطہ

اور وسیلہ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان قائم ہے، یہ آسمان کو زمین سے متصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ ”حبل اللہ“ یا تو قرآن کریم ہے یا رسول اللہ ﷺ ہیں یا آئمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ البتہ ان سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے جس کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ امت کے تمام افراد کو وحدت کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرے کی بنیاد وحدت، یگانگی اور افراد کے اجتماعی روابط کا ایمانی برادری پر استوار ہونا ہے۔

قرآن کریم کی روش یہ ہے کہ معارف کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی دلیل کو بھی بیان کرتا ہے۔ اور لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ قرآن کریم لوگوں کو اندھی تقلید پر مجبور نہیں کرتا۔ خدا جانتا ہے کہ تمام حقائق کا سرچشمہ توحید ہے۔ لیکن ہر صورت میں لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تسلیم ہوں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامیں اور آپس کے بھائی چارے اور دلوں کے نزدیک ہونے کی نعمت سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ مالک مطلق ہے اس لیے اس کے اوامر اور دستورات میں چون و چرا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بندوں کے مفاد کو خود ان سے بہتر جانتا ہے۔ ''شَفَا حُفۡرَةٍ'' پھسلنے کی جگہ کے کنارے کے معنی میں ہے۔ اگر ''النَّارِ'' سے آخرت کی آگ مراد ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا: تم کافر تھے اور تمہارے آتش جہنم میں گر جانے میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ اور اگر ''النَّارِ'' سے جنگ کی آگ مراد ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان الفت ایجاد کی اور تمہیں جنگ اور دشمنی کی آگ سے نجات دلا دی۔ کیونکہ یہ جنگیں نفسانی خواہشات اور ذاتی انا کی بنیاد لڑی جاتیں تھیں، اس طرح کی جنگیں انسانوں کو تباہی کے دھانے پر پہنچا دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں امن کی نعمت سے نوازا جس میں تمہاری جان، مال اور ناموس سب محفوظ ہیں۔ اس کے بعد تمہیں اس عظیم نعمت کی مٹھاس اور سعادت کی لذت چکھائی۔ اس طرح اللہ اپنی آیات کھول کر تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔ یہ آیات ایسا نور ہیں

جو دلوں کو روشن کر دیتی ہیں تا کہ تم اس نور کی روشنی میں ہدایت کے راستے پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکو۔

وَ لۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں''۔

امر بالمعروف اور نہی از منکر

اس آیت میں ''مِن'' تبعیضیہ ہے۔ عمل کا دار و مدار علم پر ہے اور اسی کے گرد گھومتا ہے، جب بھی انسان کا علم قوی ہوگا، اس کا عمل بھی قوی ہوگا۔ اور اس کے برعکس جتنا علم ضعیف ہوگا عمل بھی اتنا ہی ضعیف ہوگا۔ جب علم نیک اور صالح ہو جائے گا تو عمل بھی نیک اور صالح ہو جائے گا۔ اگر علم فاسد ہوگا تو عمل بھی فاسد ہو جائے گا۔ علم، عمل کی جانب دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا نیک اور صالح معاشرہ اپنی ثقافت اور علوم کی حفاظت کرتا ہے اور اس ثقافت کی خلاف ورزی کرنے والے افراد کو اس کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس بنا پر اسلامی معاشرے میں جو کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو تھامے ہوئے ہے، نیک عمل ''معروف'' اور برا عمل ''منکر'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیک عمل معروف ہے اور اس کو سب جانتے ہیں اور برا عمل اس میں منکر ہے اور کوئی بھی اس سے انس اور محبت نہیں رکھتا ہے۔ اس الٰہی فرض کو انجام دینے والے یعنی امر بالمعروف اور نہی از منکر کرنے والے لوگ ہی کامیاب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے معاشرے کی حفاظت اور اپنے پروردگار کا راستہ دکھانے کے لیے ایک ایسے واجب کو انجام دیا ہے جو سب پر فرض تھا۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾

''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو واضح دلائل آجانے کے بعد بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہوئے اور ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہوگا''۔

تفرقہ و اختلاف کا سرچشمہ

تفرقہ اور اختلاف کا سرچشمہ اعتقادات ہیں اور عقیدتی اختلاف جسمانی اور ظاہری اختلاف پر منتہی ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جو ایک جماعت کی صورت میں تھے وہ کئی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ دوسری جانب جسمانی اور ظاہری اختلاف، عقیدتی اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمانو! متحد رہو اور اہل کتاب کی مانند نہ بنو جو شروع میں جسمانی اور ظاہری لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے اور ان کا یہ تفرقہ عقیدتی اختلاف کا سبب بنا اور وہ ایک جماعت کی شکل سے خارج ہو کر مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔

اختلاف کرنے سے منع

اس لیے قرآن کریم اتحاد کی دعوت کی تاکید کرتا ہے اور اختلاف کرنے کی نہی میں بھی مبالغہ کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ امت اختلاف کا شکار ہوگی اور بہت جلد مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اسلامی تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ کیونکہ امت محمدی مختلف مذاہب میں تقسیم ہوگئی اور ان میں سے ہر ایک دوسرے مذہب والوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے مسلمانوں کے دو فرقوں کے درمیان اتحاد کے لیے قیام کیا تو وہ خود تیسرے فقہ کی بنیاد رکھنے لگا۔ بہر حال

رسول خداﷺ کی رحلت کے بعد منافقوں کے نفاق کی وجہ سے امت اسلامی اختلاف کا شکار ہوئی اور حکومتوں نے عوام کو اپنے ظالمانہ استبداد کا غلام بنایا اور ان کی سعادت کو شقاوت اور ہدایت کو ضلالت میں بدل دیا۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے اختلاف کی وجہ سے انہیں عذاب میں مبتلا کردیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے اعلیٰ مقام اور مرتبے سے گر گئے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں انس بن مالک سے روایت نقل ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرمﷺ نے فرمایا: عنقریب میرے اصحاب میں سے کچھ مرد حوض کوثر میں میرے پاس آجائیں گے، جیسے ہی وہ میرے نزدیک آجائیں گے اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آئیں گے اور بہت ہی تیزی کے ساتھ ان کو لے جایا جائے گا، میں کہوں گا: اے پروردگار! یہ تو میرے اصحاب ہیں! پس اللہ تعالیٰ کا خطاب ہوگا کہ تمہیں نہیں معلوم کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا؟ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی دوسری حدیث میں ابوہریرہ سے نقل ہوا ہے کہ رسول خداﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میرے اصحاب کا ایک گروہ (یا میری اُمت میں سے کچھ لوگ) میرے پاس آئیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دتکارتے ہوئے مجھ سے دور کیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا: اے پروردگار! یہ تو میرے اصحاب ہیں! اللہ تعالیٰ کا خطاب آئے گا تمہیں نہیں معلوم کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا تھا؟ اور تمہارے بعد یہ سب مرتد ہوگئے تھے، ان کے مردود ہونے کی وجہ یہی ہے۔

تفسیر در منثور میں ابوہریرہ نے عبداللہ بن عمر سے روایت نقل کی ہے کہ پیغمبر اکرمﷺ نے فرمایا: یہودی ۷۱ فرقوں میں بٹ گئے، عیسائی ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ نجات پائے گا باقی

سب جہنم کی آگ میں ہوں گے۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ ایک فرقہ کونسا ہے؟ توآپؐ نے فرمایا: جس مذہب پر آج میں ہوں جو اسی پر ہوگا وہ نجات پائے گا۔[1]

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾

"قیامت کے دن کچھ لوگ سرخرو اور کچھ لوگ سیاہ رو ہوں گے، پس روسیاہ لوگوں سے کہا جائے گا: کیا تم ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے تھے؟ تو اب اپنے اس کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو"۔

قیامت کے دن سرخرو اور سیاہ رُو لوگ

سابقہ آیات میں کفران نعمت کا تذکرہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی مناسبت سے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو کفران نعمت کے ساتھ مناسب ہوں۔ کفران نعمت ایک طرح کی خیانت ہے اور خیانت کے نتیجے میں انسان پستی، انفعال اور شرمندگی کا شکار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "قیامت کے دن کچھ لوگ سیاہ رو ہوں گے" آیت کے اس حصے میں سیاہ چہرے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو شرمندہ ہونے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ روسیاہ لوگوں سے کہا جائے گا: کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر لیا تھا؟ تو اب اپنے اس کفر کے بدلے عذاب چکھو" یہ خطاب امت اسلامی میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے دین میں بدعتیں ایجاد کیں یا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے رہے ہوں گے یا یہ خطاب اہل کتاب کے لیے ہے جنہوں نے رسول خدا ﷺ کو ماننے سے انکار کیا جبکہ آپؐ کے مبعوث بہ رسالت ہونے سے پہلے وہ آپؐ پر ایمان رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اس

---

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔

طرح کی خصوصیات کا حامل پیامبر آنے والا ہے۔ یا تو یہ خطاب تمام کفار کے لیے ہے جنہوں نے عالم ذر میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوںؐ پر ایمان لانے کا عہد کیا تھا اور دنیا میں آنے کے بعد اس عہد سے مکر گئے اور کافر ہو گئے۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِیۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمات سے بہرہ مند ہونگے وہ نعمات کی لذت اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے خوش اور مسکراتے اور سفید چہروں کے ساتھ ہوں گے، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے۔

تِلۡكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡكَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

"یہ ہیں اللہ کی نشانیاں جو صحیح انداز میں ہم آپ کو سنا رہے ہیں اور اللہ اہل عالم پر ظلم نہیں کرنا چاہتا"۔

آیات الٰہی کی تلاوت

ان آیات کے واضح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نہ تو یہ شیطانی ہیں اور نہ ہی باطل بلکہ ان آیات کے مقدمات ثابت شدہ اور سب کے لیے واضح ہیں۔ جس طرح ان کے نتائج بھی حق اور سچ ہیں۔ لہٰذا ان آیات کے متعلق کسی قسم کا شک نہیں ہے اور یہ آیات ہمیشہ حق ہیں۔

اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر کسی بھی قسم کا ظلم نہیں کرتا۔ اگر کافر کو سزا ملتی ہے تو یہ اس کے کفر کا نتیجہ ہے اور شکر کرنے والے کو ثواب ملتا ہے تو یہ بھی اس کے شکر بجالانے کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں تو سب لوگ برابر ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۟﴿۱۰۹﴾

”اور آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور تمام معاملات کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے“

سارے جہان کا مالک اللہ ہے

کیونکہ سارے جہاں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لیے وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں کا مالک علی الاطلاق وہی ہے۔ لہٰذا وہ ان میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کے بارے یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرے تا کہ ظلم اور تعدی کا مصداق بن جائے۔ عالم ہستی میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے۔ ظلم وہ کرتا ہے جسے کسی چیز کی ضرورت ہو اور وہ اس چیز کو دوسروں کے حقوق کو پایمال کئے بغیر حاصل نہ کر سکتا ہو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ بے نیاز مطلق ہے اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، سارے موجودات اس کے قبضہ قدرت اور اس کی ملکیت میں ہیں۔ دوسری طرف سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے موجودات کسی بھی چیز کے مالک نہیں ہیں اور ان کا کسی بھی چیز پر کوئی بھی اختیار نہیں ہے اس لیے معنی ہی نہیں رکھتا کہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی چیز چھین لے اور اس پر اپنا ارادہ مسلط کیا ہو تا کہ ظلم شمار ہو۔ اس بنا پر سب امور کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کیے گئے ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو خود ان کے لیے بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایمان والے ہیں لیکن ان کی اکثریت فاسق ہے''۔

بہترین اُمت

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تمہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔ تم سب ایک جسم کی مانند ہو اور کوئی بھی کام ایمان کے بغیر انجام نہیں پاتا اس لیے تم امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے ہو اور یہ سب اللہ تعالیٰ پر ایمان کا نتیجہ ہے۔ ''اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو خود ان کے لیے بہتر تھا'' یقینی طور پر ایمان انسان کی بہتر حالت کے لیے ضروری ہے لہٰذا اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یہ ان کی دنیوی زندگی کے لحاظ سے بھی ان کے لیے بہتر تھا، کیونکہ اس طرح وہ تفرقہ اور اختلاف سے بچ جاتے، اور ایمان لانا ان کی آخرت کے لحاظ سے بھی ان کے فائدے میں تھا کیونکہ اگر ایمان کی حالت میں مریں گے تو قیامت میں انہیں ان کے اعمال کی پاداش اور اس کا ثواب مل جائے گا، لیکن ان میں سے بہت کم لوگ ہی ایمان لائے جن میں عبد اللہ بن سلام جیسے افراد شامل تھے، ان کی اکثریت بندگی سے خارج اور کافر ہوئے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''یہ لوگ ایذارسانی کے سوا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اگر تمہارے ساتھ لڑائی کی نوبت آئی تو یہ تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر انہیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی''۔

ایذارسانی کرنے والے ناکام لوگ

''اَذًی'' کسی جاندار کے جسم، جان یا دنیوی یا اخروی سعادت کو پہنچنے والے کم نقصان کو کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شکست کھاجاتے اور اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کے شامل حال رہتی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو آزار واذیت پہنچاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و خوار کیا۔ جنگ میں وہ شکست کھاگئے اور انکی کہیں سے کوئی مدد نہ ہوئی۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''یہ جہاں بھی ہوں گے ذلت وخواری سے دوچار ہوں گے، مگر یہ کہ اللہ کی پناہ سے اور لوگوں کی پناہ سے متمسک ہو جائیں اور یہ اللہ کے غضب میں مبتلا رہیں گے اور

ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے، یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ ان (جرائم کے ارتکاب) کا سبب یہ ہے کہ وہ نافرمانی اور زیادتی کرتے تھے"۔

اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں کا انجام

'' الذِّلَّةُ '' توڑنے یا دشمن کے مقابلے میں تسلیم ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کے مقابلے میں "عزت" کا لفظ ہے جو دوسروں کے سامنے تسلیم نہ ہونے اور ان کا اثر نہ لینے کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں ذکر کی گئی ذلت سے اگر ذلت تشریعی مراد ہو تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں پر مسلمانوں کو غلبہ اور تسلط حاصل ہے اس لیے انہیں چاہیے کہ مجوسیوں کی طرح وہ بھی مسلمانوں کو جزیہ دیں۔ مگر یہ کہ وہ اسلام کے ذمہ میں داخل ہو جائیں یا یہودیوں کے علاوہ کسی دوسری قوم ان کو امان دے۔

لیکن اگر اس ذلت سے تکوینی ذلت مراد ہو تو آیت یہ بتانا چاہتی ہے کہ یہودیوں کے مقدر میں ذلت لکھی گئی ہے کیونکہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس زمانے میں یہودی ذلیل تھے اور وہ مجوسیوں اور عیسایوں کو جزیہ دینے پر مجبور تھے۔ '' ثُقِفُوْٓا '' وجدوا پانے کے معنی میں ہے۔ جہاں بھی ان کو پاؤ تو ان کا یہی حکم ہے۔ "حبل" سے ایسا سبب مراد ہے جس سے تمسک کرنے سے انسان ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔ '' بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ '' سے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر یا حکم تکوینی یا تشریعی مراد ہے۔ اور '' حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ '' سے لوگوں کا عملی تمسک مراد ہے۔ ذلت سے نجات پانے کے لیے یا تو مسلمان ہونا پڑے گا یا لوگوں میں سے کسی کی امان میں ہونا ضروری ہے۔ "اور یہ اللہ کے غضب میں مبتلا رہیں گے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے" '' بَآءُوْ '' اتخذوا کے معنی میں ہے وہ غضب الہٰی کی شکار ہوئے۔ '' الْمَسْكَنَةُ '' فقر کے آخری درجہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات

کا انکار کرتے تھے اور انبیاءؑ کو ناحق قتل کرتے تھے۔ ان (جرائم کے ارتکاب) کا سبب یہ ہے کہ وہ نافرمانی اور زیادتی کرتے تھے"۔ یہودیوں کی یہ بری عادت تھی کہ وہ زمین پر فساد پھیلاتے ، انبیاءؑ کو قتل کرتے اور آیات الٰہی کی تحریف کرتے ، ان جرائم کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہوئے۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ (لوگ) ایسے بھی ہیں جو (حکم خدا پر) قائم ہیں، رات کے وقت آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سر بسجود ہوتے ہیں"۔

سارے اہل کتاب برابر نہیں

اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں، اس لیے ظاہر ہے ان کی خصوصیات اور ان کے متعلق احکام بھی مختلف ہونگے۔ "قَآئِمَةٌ" کا مطلب خدا کے حکم پر ثابت قدم رہنا ہے۔ یہ لفظ معتدل اور حقیقی مذہب پر ہونا اور حق سے منحرف نہ ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کے لیے اٹھتے ہیں اور کتاب خدا کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کی حالت میں شب زندہ داری کرتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے نماز عشاء مراد ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے، نیک کاموں کا حکم دیتے، برائیوں سے روکتے اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی صالح لوگوں میں سے ہیں''۔

اللہ کے احکام کی تصدیق کرنے والے

بنیادی طور پر احکام الٰہی کی تصدیق کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے منکرات سے اپنے آپ کو بچانے سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ ''مسَارِعُة'' کسی کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جن میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا صحیح ہو۔ ''الْخَيْرٰتِ'' مطلق نیک اعمال کو کہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی صالحین میں سے ہیں، صالحین سیدھے راستے پر چلنے والے بھی ہیں اور انبیاءؑ، صدیقین اور شہداء کے دوست بھی ہیں۔ بعض روایات کے مطابق اس سے عبد اللہ بن سلام اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''اور یہ لوگ نیکی کا جو بھی کام انجام دیں گے اس کی ناقدری نہ ہو گی اور اللہ تقویٰ والوں کو خوب جانتا ہے''

یہ لوگ نیکی کا جو بھی کام انجام دیں گے اللہ تعالیٰ اس کی قدر کرتا ہے اور اس کے اجر و پاداش میں کمی نہیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ ان کے تمام حالات سے آگاہ ہے اس لیے ان کا اجر و پاداش ان کی حالت کے مطابق دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِىَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔـا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اللہ کے مقابلے میں ان کے اموال اور اولاد بلاشبہ کسی کام نہ آئیں گے اور یہ لوگ جہنمی ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

دعوت الٰہی کا انکار

آیت کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے اہل کتاب کا ایک گروہ مراد ہے جنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت حق کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ نہ صرف انہوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ اسلام کے خلاف شازشیں بھی کرتے اور اسلام کے نور کو بجھانے کے لیے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ایسے افراد کے پاس دنیا میں جتنا بھی مال اور اولاد ہو وہ سب متاع باطل اور فنا ہونے والا ہے اور یہ سب ان کے کسی فائدے میں نہیں ہے۔ کیونکہ ''یہ لوگ جہنمی ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے'' ان لوگوں نے دنیا ہی میں اپنے عمل کے ذریعے آتش جہنم کی طرف جانے کا سفر شروع کیا تھا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷

''وہ اس دنیاوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں تیز سردی ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کردے اور اللہ نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں''۔

اپنے اوپر ظلم کرنے والے

اس آیت میں انفاق کو ''هٰذِهِ الْحَيٰوةِ'' سے اس لیے مقید کیا ہے تاکہ اس چیز کو سمجھایا جائے کہ انہوں نے اپنے آپ کو آخرت سے بلکل الگ کیا ہوا ہے اور ان کے انفاق کرنے کا آخرت کی زندگی سے کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ ''صِرٌّ'' شدید سردی کو کہتے ہیں۔ ''تیز سردی ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ فاسد عمل کا اثر اور نتیجہ بھی فاسد ہی ہوا کرتا ہے۔ جو لوگ دنیا کے لیے سب کچھ کرتے ہیں تو ان کی سب کوششیں رائیگاں جائیں گی اور آخرت میں ان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا، آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اے ایمان والو! اپنوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ یہ لوگ تمہارے خلاف شر پھیلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے، جس بات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے وہی انہیں بہت پسند ہے، کبھی تو (ان کے دل کے کینہ و) بغض کا اظہار ان کے منہ سے بھی ہوتا ہے، لیکن جو (بغض و کینہ) ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ کہیں زیادہ ہے، بتحقیق ہم نے آیات کو واضح کر کے تمہارے لیے بیان کیا ہے۔ اگر تم عقل رکھتے ہو''۔

غیروں کو اپنا رازدار بنانے سے منع

اس آیت میں قریبی دوست اور رشتہ دار کو ''بِطَانَۃً'' یعنی استرہ کہا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جس طرح استرہ انسان کی جلد کے بہت قریب ہوتا ہے اسی طرح انسان کے قریبی دوست اور رشتہ دار بھی اس کے باطنی رازوں اور اس کے ما فی الضمیر سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ''لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا'' وہ تمہارے خلاف شر پھیلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ تمہیں اذیت دینے اور تمہارے خلاف سازشیں کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ پاگل پن کو اس لیے ''خَبل'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس دوران انسان کی حالت بگڑی ہوئی ہوتی ہے۔

''وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ'' جس بات سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچے وہ انہیں بہت پسند ہے، وہ چاہتے ہیں کہ تم ہمیشہ کسی مشکل میں پھنسے رہو اور تمہیں کوئی نہ کوئی نقصان پہنچتا رہے۔ کبھی تو بغض کا اظہار ان کے منہ سے بھی ہوتا ہے، لیکن جو (بغض و کینہ) ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اس قدر تمہارے دشمن ہیں کہ اپنی دشمنی کو چھپا نہیں سکتے۔ ان کی دشمنی ان کی زبان اور ان کے رفتار سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان کے دلوں میں موجود تمہاری دشمنی اس دشمنی اور بغض و کینہ سے بہت زیادہ ہے جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ دشمنی اتنی عظیم ہے کہ اس کو بیان بھی نہیں کیا جاسکتا اسی لیے اس کو مبہم بیان کیا گیا ہے۔ ''قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾'' بتحقیق ہم نے آیات کو واضح کر کے تمہارے لیے بیان کیا ہے۔ اگر تم عقل رکھتے ہو۔ ہم نے ان سے دوستی کرنے اور اپنے دلی راز ان کو بتانے اور اپنی حالت سے ان کو آگاہ کرنے کے خطرے سے تمہیں آگاہ کیا ہے۔ تاکہ تم غور و فکر کرو اور ان کے ہمدل اور ہمراز نہ بنو۔

هٰٓاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَ لَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾

”تم لوگ تو اس طرح کے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو جب کہ وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری (آسمانی) کتاب کو مانتے ہو (مگر تمہاری کتاب کو نہیں مانتے) اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں جاتے ہیں تو تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹ لیتے ہیں، ان سے کہد یجئے: تم اپنے غصے میں جل مرو، یقینا اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے“۔

یک طرفہ دوستی بے فائدہ

لہٰذا تم ایک طرفہ دوستی میں کس طرح ان کے دوست بن سکتے ہو؟ حالانکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، خدا نے تمہیں اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرنے سے منع کیا ہے۔ اس بارے سورہ مجادلہ کہ آیت ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے:

لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ لَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِيۡرَتَهُمۡ ؕ......

”آپ کبھی ایسے افراد نہیں پائیں گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے (بھی) ہوں لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے محبت رکھتے ہوں خواہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے ہی کیوں نہ ہوں“۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں اپنے عقائد اور عادتیں سکھائیں اور تمہیں دین حق سے منحرف کریں۔ تم قرآن اور ان کی آسمانی کتاب دونوں کو مانتے

ہو جبکہ وہ تمہاری آسمانی کتاب کو نہیں مانتے۔ اہل کتاب میں سے بعض منافق ہیں، جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو بغض، کینہ اور حسرت کی وجہ سے اپنی انگلیوں کو دانتوں سے کاٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ تم اپنے غصے میں جل مرو۔ یہ جملہ بظاہر امر کی شکل میں ہے لیکن در حقیقت ان پر نفرین ہے، گویا فرمانا چاہتے ہیں کہ بارالہا! ان کو ان کے بغض اور کینے کی وجہ سے مار دے۔ اے اللہ! توں تو انسانوں کے سینوں میں موجود رازوں سے آگاہ ہے۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

''اگر تمہیں آسودگی میسر آتی ہے تو (وہ) انہیں بری لگتی ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقوی اختیار کرو تو ان کی فریب کاری تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، بے شک اللہ ان کے تمام اعمال پر احاطہ رکھتا ہے''۔

مومنوں کے ساتھ منافقوں کا رویہ

'' تَمْسَسْكُمْ '' مسرت اور خوشی کا متضاد ہے۔ اس سے برا حال اور تکلیف مراد ہے۔ جب بھی تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ان کی دشمنی پر صبر کرو اور ان سے دوستی نہ کرنے کے حوالے سے تقویٰ اختیار کرو تو تم ان کے بغض و کینہ اور شر سے محفوظ رہو گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے محفوظ رہنے کو صبر اور تقویٰ سے مشروط کیا ہے اور آیت کے آخر میں فرمایا ہے: جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اسے آگاہ ہے، اللہ تعالیٰ

تمہارے اور تمہارے دین کے خلاف تمہارے دشمنوں کی سب سازشوں سے واقف ہے۔ اس سے مراد یا تو منافقین ہیں جو مومنوں سے دل میں بغض رکھتے ہیں انکی یہی کیفیت ہے جو آیت میں بیان ہوئی ہے یا یہودی مراد ہیں کہ انہیں اہل اسلام سے سخت دشمنی ہے۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

"اور (اے رسول! وہ وقت یاد کرو) جب آپ صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکل کر ایمان والوں کو جنگ کے لیے مختلف مورچوں پر متعین کر رہے تھے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے"۔

جنگ میں سستی کرنے پر مومنین کی سرزنش

آیت کا سیاق بتا رہا ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے اس واقعہ پر مومنین کی سرزنش کر رہی ہے جس میں انہوں نے سستی کا مظاہرہ کیا، مومنین کو شرمندہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیت کا مخاطب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری باتوں اور تمہارے باطن سے آگاہ ہے۔

جنگِ احد کے حالات

اس واقعہ کے متعلق تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب قریش کا لشکر اُحد کے مقام کے قریب پہنچا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات سو افراد پر مشتمل اصحاب کا لشکر تشکیل دیا۔ ان میں سے ۵۰ افراد کو عبد اللہ بن جبیر کی سربراہی میں ایک درے کی حفاظت کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ نے انہیں اس بات کا خیال رکھنے کی تاکید کی کہ دشمن اس درے سے لشکر اسلام پر حملہ آور نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ

اگر ہم نے دشمن کو شکست دی اور ان کو مکہ تک بھی پیچھے دھکیل دیا تو پھر بھی تم نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا ہے۔ اور اگر دشمن نے ہمیں شکست دی اور ہمیں مدینہ تک پیچھے دھکیل دیا تو پھر بھی تم نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا ہے اور اس درے کی حفاظت کرتے رہنا ہے۔

دوسری طرف ابوسفیان نے خالد بن ولید کو دو سو کے لشکر کے ساتھ اس درے سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ رسول خدا ﷺ نے اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کیا، جنگ کے پرچم کو امیر المومنین علی علیہ السلام کے سپرد کیا۔ انصار نے مشرکین قریش پر حملہ کیا اور ان کی صفوں کو کاٹ کر انہیں شکست دی۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے اصحاب نے ان کا پیچھا کیا۔ خالد بن ولید دو سو گھوڑ سواروں کے ساتھ اس درے کی جانب بڑھا تاکہ وہاں سے مسلمانوں کے لشکر پر حملہ کرے۔ وہاں پر موجود عبداللہ بن جبیر اور اس کے ساتھیوں نے ان پر تیر برسانا شروع کیا تو خالید بن ولید اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ دوسری جانب جب عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اصحاب مال غنیمت سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں تو انہوں نے عبداللہ بن جبیر سے کہا سب غنیمت سمیٹ رہے ہیں اور ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ عبداللہ بن جبیر نے کہا اللہ سے ڈرو کیونکہ رسول خدا ﷺ نے ہمیں اس جگہ کو نہ چھوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا کہنا نہ مانا اور ایک ایک ہو کر اس مورچہ کو چھوڑ کر چلے گئے اور عبداللہ بن جبیر کے ساتھ صرف بارہ افراد رہ گئے۔

مشرکین قریش کے لشکر کا پرچم طلحہ بن طلحہ عبدی کے پاس تھا جسے امام علی علیہ السلام نے واصل جہنم کیا تھا۔ اس کے بعد لشکر قریش کا پرچم ابوسعید بن طلحہ کے سپرد کیا گیا، امام علی علیہ السلام نے اسے بھی قتل کیا اور ان کا پرچم زمین پر گرا تو لشکر قریش کا پرچم مسافح بن ابی طلحہ کے ہاتھ آیا، امام علی علیہ السلام نے اسے بھی قتل کیا، یہاں تک کہ امام علیہ السلام نے بنی عبدالدار قبیلہ کے نو افراد کو قتل کیا جن کے ہاتھ میں پرچم دیا گیا تھا۔ آخر کار لشکر کا پرچم اس قبیلہ کے ایک غلام کو دیا گیا جس کا نام صواب تھا۔ امام علی علیہ السلام نے اس کا دائیاں

ہاتھ کاٹ دیا تو اس نے پرچم اپنے بائیں ہاتھ میں لیا امام نے اس کا بائیاں ہاتھ بھی کاٹ دیا تو اس نے پرچم کو اپنے سینے سے لگایا اور ابوسفیان سے کہنے لگا: کیا میں نے قبیلہ عبدالدار سے اپنی وفاداری پوری کر دی ہے؟ اسی اثناء میں امام علیؑ نے اس کے سر پر وار کیا اور اس کو بھی قتل کیا، یوں لشکر قریش کا پرچم زمین پر گرا۔ اس کے بعد لشکر قریش کے پرچم کو علقمہ کنانیہ کی بیٹی عمرہ نے سنبھالا۔ اس دوران خالد بن ولید نے درے سے عبد اللہ بن جبیر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ عبد اللہ بن جبیر کے ساتھی اسے چھوڑ کر فرار ہوئے لیکن وہ خود اور اس کے باقی بچنے والے ساتھیوں نے وہی پر جام شہادت نوش کیا۔ خالد بن ولید نے پیچھے سے لشکر اسلام پر حملہ کیا۔ قریش جو کہ میدان جنگ سے بھاگ رہے تھے، جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے پرچم کو بلند کیا گیا ہے تو وہ اس کے گرد جمع ہو گئے جبکہ اصحاب رسول خداﷺ میدان سے فرار ہو گئے اور لشکر اسلام کو بہت بڑی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

رسول خداﷺ نے جب اصحاب کو فرار ہوتے ہوئے دیکھا تو اپنا عمامہ اتارا اور ان سے فرمایا: میں رسول خداﷺ ہوں۔ خدا اور اس کے رسول کو چھوڑ کر کہاں بھاگ رہے ہو؟ عتبہ کی بیٹی ہند سرمہ اور سرمہ دان لیے لشکر قریش کے درمیان کھڑی تھی اور لشکر قریش میں سے کوئی بھاگتا تو اسے سرمہ پیش کرتی اور کہتی تھی لو سرمہ لگاؤ، تم مرد نہیں ہو۔ اس طرح ان کو میدان جنگ سے نہ بھاگنے کی تشویق کرتی تھی۔ حمزہؓ بن عبدالمطلبؑ بار بار لشکر قریش پر حملہ کرتے اور صف دشمن میں ان کا مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہ تھی۔ اس دوران ابوسفیان کی بیوی ہند نے وحشی نامی غلام کو رسول خداﷺ، امام علی علیہ السلام یا حضرت حمزہؓ میں سے کسی ایک کو شہید کرنے پر بہت بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ وحشی جو کہ حبشہ کا رہنے والا اور جبیر بن مطعم کا غلام تھا کہنے لگا: محمدﷺ کو تو مار نہیں سکتا، علیؑ بھی بہت چالاک آدمی ہیں ان پر بھی اچانک حملہ کرنا ممکن نہیں، لہٰذا حمزہؓ کو قتل کرنے کے لیے کمین کرتا ہوں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ حضرت حمزہؓ لشکر قریش کو تتر بتر کرنے اور ان کے کشتوں کے

پشتے لگانے کے بعد جب اس غلام کے قریب سے گزرے اور ایک پتھر پر پاؤں رکھا اور زمین پر گر پڑے تو اس وحشی غلام نے نیزہ سے آپ پر حملہ کیا اور نیزہ آپ کے بدن کو چیرتے ہوئے سینے سے باہر نکلا اور آپ زمین پر گرے۔ وحشی آپ کے پاس پہنچا اور آپ کا جگر نکال کر ہندہ کے پاس لے گیا، ہند نے اسے اپنے منہ میں رکھا اور اس کو چبانا شروع کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جگر کو ہڈی کی طرح سخت کر دیا اس لیے وہ اس کو کھا نہ سکی اور اس نے اسے دور پھینک دیا۔

اس موقع پر رسول خداؐ کے ساتھ امام علی علیہ السلام، ابو دجانہ اور سماک بن خرشہ کے سوا کوئی نہ رہا تھا۔ امام علی علیہ السلام نے نہایت دلیری کے ساتھ رسول خداؐ کا دفاع کیا یہاں تک کہ جب آپؑ کے جسم پر ستر زخم آئے تو جبرئیلؑ نے رسول خداؐ سے عرض کیا: مواسات اور برادری اس کو کہتے ہیں۔ ان کے جواب میں رسول خداؐ نے فرمایا: وہ مجھ سے ہے اور میں ان سے ہوں۔ جبرئیلؑ نے کہا: میں تم دونوں سے ہوں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: رسول خداؐ نے جبرئیل کو آسمان اور زمیں کے درمیان دیکھا کہ فرما رہے ہیں: ''لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار'' علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''(یہ اس وقت کی بات ہے) جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا اور مومنین کو چاہیے کہ اللہ پر توکل کریں''۔

جنگ میں اللہ کی مدد

''ھَمَّتْ'' کسی کام کے انجام دینے کے لیے پکا ارادہ کرنے کو کہتے ہیں۔ ''فشَل'' ارادے میں سستی کو کہا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جنگ کے حوالے سے مومنین کے ارادے سست ہوئے تھے۔ لیکن آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ان کی مدح اور تعریف کر رہی ہے، اللہ کی مدد کی وجہ سے ان کے ارادے سستی کا شکار نہیں ہوئے۔ ان دو گروہوں سے بنو حارثہ اور بنو سلمہ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس کلام کے ذریعے مومنین کو نصیحت کرنا چاہتا ہے کہ ان کے ارادوں میں سُستی نہیں آنی چاہیے۔ اس بنا پر اس آیت کا سیاق مدح نہیں بلکہ ملامت اور سرزنش ہے۔ کیونکہ مومنین کے لیے یہ بات مناسب نہیں کہ ان کے ارادوں میں سُستی آجائے جبکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور مددگار ہے۔ جو بھی اللہ پر توکل کرے گا اللہ اس کے لیے کافی ہے اور اس کے امور کو انجام تک پہنچاتا ہے اور اس کو ذلیل اور رسوا نہیں کرتا۔

سورہ طلاق کی آیت ۳ میں اس بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③

''اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے پس اللہ اس کے لیے کافی ہے، اللہ اپنا حکم پورا کرنے والا ہے، بتحقیق اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے''۔

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑫③

''بتحقیق بدر میں اللہ نے تمہاری مدد کی جب تم کمزور تھے، پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ''۔

جنگِ بدر میں مومنین کی نصرت

یہ آیت اس سرزنش کا تتمہ ہے جو سابقہ آیت میں کی گئی ہے اور بتا رہی ہے کہ مومنین کے لیے یہ بات مناسب نہ تھی کہ اس بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان کا ولی اور سرپرست ہے، ان کے ارادے سست ہو جائیں۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب جنگ بدر میں تم ذلیل تھے اور تمہارے دشمن کا بڑا رعب تھا تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی اور تمہیں فتح عطا کی تو اب بھی تمہارے لیے مناسب نہیں تھا کہ تمہارے ارادے میں سستی آجائے۔ شکر کا دار و مدار تقویٰ ہے اور تقویٰ شکر کا سبب بنتا ہے۔ اللہ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں مومنین کو اپنی نصرت یاد دلا کر ان کے حوصلے بڑھا رہا ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ تقویٰ تمہیں اللہ کا شکر کرنے والا بنا دے گا۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

”جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے: کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتے نازل فرما کر تمہاری مدد کرے؟“

جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ کی اس مدد کا مقصد مومنین کو اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہنے پر تشویق کرنا تھا۔ ”امداد“ دائمی مدد کے معنی میں ہے۔

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمن جب بھی تم پر اچانک حملہ کر دے تمہارا رب اسی وقت پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا''۔

اللہ کی مدد ملنے کی شرائط

اللہ تعالیٰ کی مدد کے حصول کے لیے 1۔ صبر، 2۔استقامت اور 3۔ تقویٰ ضروری شرائط ہیں۔ ''فور'' فَوَرَان سے لیا گیا ہے جو ابلنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ استعارہ کے طور پر جلدی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ''مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا'' یعنی اسی وقت مُسَوِّمِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ علامت لگائے گئے، دوسری آیت میں فرعونیوں کے عذاب کے بارے میں فرمایا: يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ''تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کرتے تھے'' اس آیت میں بھی پچھلی آیت کی مانند مومنین کے لیے اللہ کی مدد اترنے کو بیان کیا جارہا ہے تاکہ مومنین جنگ کے میدان میں سستی نہ دکھائیں اور دشمن کے سامنے کمزور نہ پڑیں۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾

''اور یہ بات اللہ نے صرف تمہاری خوشی اور اطمینان قلب کے لیے کی ہے، اور فتح و نصرت صرف اللہ ہی کی جانب سے ہے جو بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے''۔

ظاہری اسباب کی تاثیر اللہ کے اذن سے ہے

اس آیت میں ''عِنْدِ'' سے مقام ربوبی مراد ہے جہاں سے سب احکام اور دستورات صادر ہوتے ہیں۔ جس کے بغیر کوئی بھی سبب مستقل اور اس سے بے نیاز نہیں۔ آیت اس مطلب کو بیان کرنا چاہ رہی ہے کہ جو فرشتے تمہاری مدد کرنے پر مامور ہیں وہ اس کام

میں مستقل نہیں ہیں، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کو انجام دینے اور تمہارے دلوں کو سکون اور اطمینان پہنچانے پر مامور ہیں۔ تمہاری فتح اور نصرت ان کی مدد کی وجہ سے نہیں۔ ان کی مدد تمہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ حقیقی مدد اور نصرت تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جو عزیز و حکیم ہے یعنی نہ تو کوئی اس کو مغلوب کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے کاموں میں سے کوئی کام جہل و نادانی کی بنیاد پر ہے اور اس کی قضا و قدر اس کی حکمت کے مطابق جاری و ساری ہے۔ فتح و نصرت اللہ کی جانب سے ہے۔ مومنوں کو سمجھایا ہے کہ ظاہری اسباب پر بھروسہ نہ کرو کیونکہ اسباب میں تاثیر بھی اللہ نے رکھی ہے تمہارا اعتماد اللہ پر ہو۔ اور کامیابی اللہ ہی عطاء کرتا ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَآئِبِينَ ﴿۱۲۷﴾

”(اس مدد کا مقصد یہ ہے کہ) کافروں کے ایک دستے کو کاٹ دے یا انہیں ذلیل و خوار کر دے تاکہ وہ نامراد پسپا ہو جائیں“۔

کافروں کو شکست دینے کے لیے الٰہی امداد

”قَطَعَ طَرَف“ کفار کو قتل کرنے، قیدی بنانے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے اور ان کے اموال کو غنیمت میں لے کر ان کی افرادی قوت کو ضعیف کرنے، ان کی تعداد کم کرنے اور ان کو شکست دینے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔ ”کبت“ خوار و ذلیل کرنے اور غصہ دلانے کے معنی میں ہے۔ جنگ بدر میں کفار کے ۷۰ افراد مارے گئے اور ۷۰ قیدی بنائے گئے۔ ابو سفیان نے کفار سے کہا تھا اپنی عورتوں کو اپنے مرنے والوں پر رونے کی اجازت نہ دو تاکہ مسلمانوں کے خلاف ان کا بغض اور کینہ ختم نہ ہو سکے۔ جب جنگ احد میں انہوں نے مسلمانوں کو شکست دی تو تب اس نے عورتوں کو اپنے مرنے والوں پر

رونے کی اجازت دے دی۔اس آیت میں یہ بتایا گیاکہ اللہ کی مدد تمہارے لیے آئی تاکہ کافروں کو شکست دو اور انہیں ذلیل وخوار کرو اور جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا۔

لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَہُمۡ فَاِنَّہُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

”(اے رسول) اس بات میں آپ کا کوئی دخل نہیں، چاہے تو اللہ انہیں معاف کرے اور چاہے تو سزا دے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں“۔

سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں

یعنی قطع طرف اور کبت کے سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ان امور میں رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کچھ بھی عمل دخل نہیں ہے۔اس بنا پر فتح و نصرت ملنے پر رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کرنے اور شکست کھا جانے پر ان کی ملامت اور سرزنش کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ”اَوۡ یَتُوۡبَ“ والا جملہ ”لِیَقۡطَعَ طَرَفًا“ پر عطف ہوا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عمل اس لیے انجام دیا گیا تاکہ ان کو توبہ کی توفیق مل جائے یا ان کو عذاب دیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب امور کا مالک ہے۔ لہٰذا وہ جسے چاہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہے بخش دیتا ہے۔ان کو عذاب دینے کی وجہ ان کا ظالم ہونا ہے اس لیے وہ عذاب الٰہی کے حقدار ہیں۔ جیسا کہ بعد والی آیت میں مزید وضاحت کی گئی ہے کہ توبہ قبول کرنا یا توبہ رد کرنا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ اختیار کسی اور کا نہیں ہے۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

"اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، اللہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا بخشنے والا، خوب رحم کرنے والا ہے"۔

اس آیت میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ توبہ قبول کرنا اور بخش دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب اور عذاب سے وسیع تر اور مقدم ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٣٠﴾

"اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود نہ کھایا کرو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

سود کھانے کی ممانعت

اس آیت میں "اکل" "اخذ" یعنی لینے کے معنی میں ہے۔ سود اس بات کا باعث بنتا ہے کہ دوسروں کا مال لینے اور اس کو اپنے اصلی سرمائے سے ملانے سے مال میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے اور سود لینے والے کا مال کئی برابر ہو جائے۔ سود کھانے والا خواہ سود کی مقدار کم ہو یا زیادہ حقیقت میں اپنے پیٹ کو جہنم کی آگ سے بھر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان سے فرما رہا ہے کہ اس بُرے عمل کو ترک کرو، سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ سے ڈرے بغیر انسان کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بعد والی دو آیات میں بیان ہوا ہے کہ سود کھانے والے کافروں سے ہیں۔ اور سود خوری کے حکم سے عدول کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿١٣١﴾

"اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے"۔

اس آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ سود کھانے والا حقیقت میں کافر ہے۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ۚ

"اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

مومنین پر رحمت اتارنے کا وعدہ

اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر رحم کرنے کا وعدہ دیا ہے جس کے ذریعے وہ ان کو شرعی احکام کی پیروی کرنے کی ترغیب دلا رہا ہے۔ جس طرح پچھلے جملے میں وعید اور دھمکی دینے کے ذریعے سود کھانے اور اللہ کے حکم کی نافرمانی سے روکا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی نافرمانی انسان کے رحمت الٰہی تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ جو اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا مطیع و فرماں بردار ہوگا تو اس کے لیے اللہ کی رحمت ہے ،اللہ کے احکام کی نافرمانی انسان کو کفر میں لے جاتی ہے۔

وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾ۙ

"اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جانے میں سبقت لو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو اہل تقویٰ کے لیے آمادہ کی گئی ہے"۔

رب کی بخشش اور جنت کی طرف سبقت

جنت پاکیزہ جگہ ہے لہٰذا گناہوں کی پلیدی وہاں داخل نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے جو گناہوں کی پلیدی سے اپنے آپ کو آلودہ کرے گا وہ جنت میں جا نہیں سکتا۔ ایسا شخص صرف ایک صورت میں جنت میں جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں کی گندگی سے پاک

کردے۔ اس جنت کے اتنے مراتب اور درجات ہیں جو انسان کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے، یہ جنت مومنین کے لیے تیار کی گئی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے دور کیا ہوا ہے اور جنت ان کی منزل قرار دی ہے۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾

"(ان متقین کے لیے) جو خواہ آسودگی میں ہوں یا تنگی میں ہر حال میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

اللہ کے دوست

"السَّرَّآءِ" وہ چیز جس سے انسان خوش ہوتا ہے اور "الضَّرَّآءِ" ایسی چیز جس سے انسان کو نقصان پہنچے اور اس کے حالات خراب ہونے کا سبب بنے۔ متقین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ آسودگی اور تنگی دونوں حالتوں میں انفاق کرتے ہیں۔ غریبی بھی ان کے انفاق کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتی اور ان کا امیر ہونا بھی ان کے بخیل ہونے کا باعث نہیں بنتا۔ کیونکہ انہیں انفاق کرنے کے اجر و پاداش کا صحیح ادراک ہے اور وہ اسے واجب امر سمجھتے ہیں اس لیے وہ ہر حال میں انفاق کرتے ہیں خواہ غریب ہوں یا امیر۔ "**کظم**" پانی بھرنے کے بعد مشک کے منہ کو بند کرنے کو کہتے ہیں۔ "**غَيْظ**" طبیعت کے خلاف چیزوں کو دیکھ کر انتقام لینے کی خاطر ہیجان اور جذباتی حالت کے پیدا ہونے کو کہتے ہیں۔ اس بنا پر "**کظم غیظ**" غصے کی حالت کو ظاہر نہ کرنا اور غصے کو پی جانے کے معنی میں ہے۔ غصے کو پی جانے والے لوگ جب دوسروں سے ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ان کی مرضی کے مطابق

نہیں ہیں تو، وہ انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اپنے اعمال کو اس کی رضا کے لیے خالص کرتے ہیں، ایمان کے راستے میں استقامت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اعمال کو بہترین طریقے سے انجام دیتے ہیں۔

تفسیر در منثور میں امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ ایک دفعہ آپ وضو کر رہے تھے اور آپؑ کی کنیز پانی ڈال رہی تھی، اچانک اس کے ہاتھ سے پانی کا برتن گر گیا اور آپؑ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ امامؑ نے اپنا سر بلند کیا اور اس کی طرف دیکھنے لگے، اس نے فوراً کہا ''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ'' امام علیہ السلام نے فرمایا: میں نے غصہ پی لیا۔ کنیز نے اسکے بعد کہا: ''وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاس'' امامؑ نے فرمایا: میں نے تمہیں معاف کر دیا، خدا بھی تمہیں معاف کر دے۔ کنیز نے پھر کہا: '' وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ ''آپؑ نے فرمایا: جاؤ تمہیں اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔[1]

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ۗ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''اور جن سے کبھی نازیبا حرکت سرزد ہو جائے یا وہ اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھیں تو اسی وقت خدا کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کا بخشنے والا کون ہے؟ اور وہ جان بوجھ کر اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے ہیں''۔

---

[1]۔ یہ مطلب تفسیر المیزان کی اصل کتاب سے لیا گیا ہے۔

برائی کرنے کے بعد استغفار

''فَاحِشَةً'' ہر برے کام کو کہا جاتا ہے لیکن زیادہ تر یہ لفظ زنا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس سے گناہ کبیرہ مراد ہو۔ اس کے مقابلے میں اپنے آپ پر ظلم کرنا گناہ صغیرہ ہو۔ لیکن کلی طور پر اپنے آپ پر ظلم کرنے میں سب گناہ شامل ہیں۔ متقین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ گناہ کرنے کے بعد نہ صرف زبان سے نہیں بلکہ واقعی طور پر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور اللہ سے استغفار اور بخشش کی دعا کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے؟ یہ جملہ گنہگار مومنین کو شوق دلانے اور ان کو توبہ کی طرف ترغیب دلانے کے لیے ہے۔ اس مقام پر اللہ کی بخشش کو گناہ کے تکرار نہ کرنے سے مشروط کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے گناہ کے تکرار سے گنہگار کے نزدیک اللہ کا حکم خفیف ہو جاتا ہے اور ایسا شخص حرمت الٰہی کا پاس نہ رکھنے کی وجہ سے جری ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اوامر کے سامنے اپنے آپ کو بڑا بناتا ہے۔ ایسی صورت میں اس میں عبودیت اور بندگی کی کوئی نشانی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ اگر ایسا شخص اس حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد بھی کرے گا تو اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ '' وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ ''اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ظلم گناہان صغیرہ کو بھی شامل ہے۔

أُولَٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾

''ایسے لوگوں کی جزا ان کے رب کی مغفرت اور وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (نیک) عمل کرنے والوں کے لیے کیا ہی خوب جزا ہے''۔

متقین کا اجر و ثواب

اس آیت میں متقین اور نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے عظیم اجر و ثواب کا تذکرہ ہوا ہے۔ انہیں اللہ کی طرف سے ایسا اجر ملا ہے جس کہ وجہ سے ان کی چھوٹی موٹی کوتاہیاں بخش دی گئی ہیں۔ اجر اسی کو ملے گا جس نے عمل انجام دیا ہو۔ سب سے اچھا اور بہترین اجر وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے۔ ان آیات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہاں پر سبقت لے جانے سے ان چار چیزوں میں سبقت لے جانا مراد ہے: ۱۔ انفاق۔ ۲۔ غصہ پی جانا۔ ۳۔ لوگوں کی خطاؤں سے در گزر کرنا۔ ۴۔ استغفار اور اللہ تعالیٰ کی یاد۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

”تم سے پہلے مختلف روشیں گزر چکی ہیں پس تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا“۔

زمین پر گھومنے کا حکم

”سُنَن“ سنت کی جمع ہے جو ایسی روش اور طریقے کو کہتے ہیں جو معاشرے میں رائج ہے جس کی پیروی کرنا سب کا فریضہ ہے۔ زمین پر سیر کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ گذشتہ لوگوں کے آثار سے عبرت لی جائے۔ یعنی سیر کرنے کے نتیجے میں تم اس بات کو جان سکو کہ فرعون اور دوسرے سرکش افراد کا انجام کیا ہوا؟ ان کے بڑے بڑے محل اور لشکر ان کو کوئی فائدہ نہ دے سکے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کو نیست و نابود کر دیا۔ عبرت کے لیے ان کے آثار کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ ان کے آثار کی عظمت اور ان کے مجسموں کی بقاء ایک طرح کی بت پرستی ہے اس لیے قرآن کریم ایسے مسائل پر توجہ نہیں کرتا۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾

”یہ (عام) لوگوں کے لیے ایک واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے“۔

الٰہی آیات کی عمومیت

آیات الٰہی سب لوگوں کے لیے ہیں لیکن ان سے صرف اہل تقویٰ ہی ہدایت لیتے ہیں۔ یہ تقسیم بندی تاثیر گذاری کے اعتبار سے ہے۔ متقین وہ ہیں جو حدود الٰہی کی رعایت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا علم ہے کہ عصر حاضر اور آیندہ کے مکذبین اور جھٹلانے والوں کا انجام گذشتہ ادوار کے جھٹلانے والوں جیسا ہی ہوگا۔

وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾

”ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو کہ تم ہی غالب رہوگے بشرطیکہ تم مومن ہو“۔

غلبہ مومنین ہی کو حاصل ہوگا

”وہن“ ضعف کے معنی میں ہے۔ یہاں پر اس سے کفار کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے عزم وارادے کا ضعیف ہونا مراد ہے۔ ”حزن“ غم کے معنی میں ہے اور یہاں پر اس سے مومنین کا شکست کھانے اور مال غنیمت کے ہاتھ سے نکلنے کے سبب غمگین ہونا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنین سے کہہ رہا ہے کہ جنگ احد میں شکست کھانے کی وجہ سے غمگین اور سست مت ہو جاؤ، کیونکہ جنگ احد میں مسلمانوں کے ۷۰ دلیر سپاہی مارے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو تو تمہارے ارادے میں سستی نہیں آنی چاہیے اور تمہیں غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ برتری ہمیشہ ایمان کے ہمراہ ہے۔ ایمان کا لازمہ صبر اور تقویٰ ہے، فتح ونصرت کا ملاک اور معیار بھی یہی دو چیزیں ہیں۔

مسلمانوں کی برتری کو ایمان سے مشروط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جنگ اُحد میں انہوں نے ایمان کے تقاضوں یعنی صبر اور تقویٰ کو پورا نہیں کیا۔ اگر وہ جنگ اُحد میں ایمان کے تقاضے پورا کرتے تو ایمان اپنا اثر ضرور دکھاتا اور وہ اتنے سارے نقصانات کے متحمل نہ ہوتے اور ان کو کامیابی ملتی۔ اس آیت میں خطاب اگرچہ سب مومنین کو ہے لیکن ایمان کے درجات کے حوالے سے مومنین کے مختلف مراتب ہیں۔ در حقیقت یہ آیت حقیقی مومنین کے لیے حوصلہ افزائی، ضعیف مومنین کے لیے وعظ و نصیحت اور ان مومنین کے لیے جو ایمان کے نور سے بے بہرہ ہیں ملامت اور سرزنش ہے۔ کیونکہ واقعی مومنین فقط اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صرف راہ خدا کے پیرو ہیں اور سب انبیاء کے وصی اور وارث ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کا وارث بنایا ہے، لہٰذا ہمیشہ ان کو کفار پر برتری حاصل ہوتی ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

"اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مومن کون ہیں اور چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ کو گواہ کے طور پر لیا جائے، کیونکہ اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا"۔

الٰہی سنتیں

" قَرْحٌ" زخم کے اثر کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر اس سے وہ صدمات مراد ہیں جو جنگ احد میں مسلمانوں پر وارد ہوئے۔ آیت میں سب مسلمانوں کو ایک جسم کے مانند قرار دیا گیا

ہے گویا وہ سب ایک جسم کی مانند ہیں جس پر زخم آیا ہو۔ دوسرے صدمے سے مراد وہ صدمات ہیں جنہیں مسلمانوں نے جنگ بدر میں کفار پر وارد کیے تھے۔ ”اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مومن کون ہیں اور چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ کو گواہ کے طور پر لیا جائے، کیونکہ اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا“ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہمیشہ اسی طرح جاری رہی ہے کہ وہ لوگوں کو مختلف حالات سے دوچار کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک قوم ہمیشہ خوشحال رہے اور دوسری قوم ہمیشہ محروم۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت سب لوگوں کے مفاد میں ہے۔ البتہ تم ان میں سے بعض مفادات سے آگاہ ہو اور بعض کو نہیں جانتے ہو۔

بعد والی آیات میں ان میں سے بعض مفادات کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک مومنین کے ایمان کو ظاہر کرنا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ مومنین کے ایمان سے واقف ہے، ان کے باطن کو جانتا ہے اور ہرگز ان کے ایمان سے غافل نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ دوسری چیزوں کی طرح مومنین کے ایمان کو بھی اسباب اور مسببات کے ذریعے ہی ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ایسے امور فراہم کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ ہی نہیں ہے جن کے ذریعے ان کا ایمان ظاہر ہو جائے۔ دوسری چیز جو اس حوالے سے بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ لوگوں کے اعمال پر گواہ لیے جائیں۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾

”نیز اللہ ایمان والوں کو چھانٹنا اور کافروں کو نابود کرنا چاہتا ہے“۔

مومنین کی چھان پھٹک اور کافروں کی نابودی

”تمحیص“ کسی چیز کو ملاوٹ سے خالص کرنے کے معنی میں ہے۔ ”محق“ کسی چیز کو تدریجاً نابود کرنے کو کہتے ہیں۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس سنت

کے ذریعے اور لوگوں کو مختلف حالات سے دوچار کر کے مومنین کو ناخالصی سے پاک و پاکیزہ کرتا ہے اور کافروں کو نیست و نابود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو ان مصالح اور مفادات کی وجہ سے انجام دیتا ہے جو لوگوں کو مختلف حالات سے دوچار کرنے میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کفر، نفاق اور فسق کے اجزاء کو بتدریج مومنین سے زائل کر دیتا ہے تاکہ اس طرح ان کا ایمان خالص ہو جائے۔ دوسری طرف کافروں کے لیے کفر اور فسق کے علاوہ کوئی چیز نہیں بچتی۔ اس مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ :۱۔ اچھے اور برے دن لوگوں کے درمیان تقسیم ہوئے ہیں۔ ۲۔ اس تقسیم کا مقصد لوگوں سے امتحان لینا اور مومن کو کافر سے الگ کرنا ہے۔ ۳۔ بتدریج مومنین کے ایمان کو خالص کرنا اور کفر اور کفار کو نیست و نابود کرنا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

”کیا تم (لوگ) یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں یونہی چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون ہیں؟“

مشکلات کے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں

کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ جنت تم پر واجب ہے اور تم ہر گز مصائب اور مشکلات کا شکار نہ ہوں گے اور سیدھے جنت میں داخل ہوں گے؟ جنت کے حقدار کو غیر حقدار سے الگ کئے بغیر؟ بلند مرتبہ والے کو پست رتبہ والے سے الگ کئے بغیر؟ صبر اور استقامت کرنے والے شخص کو صبر اور استقامت نہ کرنے والے سے پہچانے بغیر؟ ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کسی چیز کو ایجاد کرنے سے پہلے والے علم اور اس چیز کو ایجاد کرنے کے بعد والے علم میں فرق

ہے۔ اس آیت میں علم سے کسی چیز کو ایجاد کرنے سے پہلے والا علم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے علم فعلی مراد ہے جو عینِ مخلوقات ہے یعنی مخلوقات کا وجود میں آنا۔

وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور موت کے سامنے آنے سے قبل تو تم مرنے کی تمنا کر رہے تھے، سو اب وہ تمہارے سامنے ہے جسے تم دیکھ رہے ہو''۔

جنگ سے پہلے کی کیفیت

جنگ سے پہلے تو تم شہادت کی آرزو کرتے تھے لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو تم اپنی آرزو کی طرف نہیں بڑھتے اور اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ جہاد کے لیے پیش قدم نہیں ہوتے ہو۔ بلکہ سستی اور کاہلی میں مبتلا ہو کے جنگ کرنے سے گریز کرتے ہو۔ پس کیا یہ صحیح ہے کہ تمہارے امتحان کے بغیر صرف تمہاری آرزو کی وجہ سے تمہیں جنت میں داخل کیا جائے۔ جس چیز کو تم زبان پر جاری کرتے ہو اور جو حقیقت اور واقعیت ہے ان میں جدائی ڈالے بغیر اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کئے بغیر؟ تفسیر کی کتابوں میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جنت میں شہداء جنگ بدر کے مقام سے مطلع کیا تو وہ سب اس مقام کے مشتاق ہوئے اور کہنے لگے: خدایا ہمیں بھی ایسی جنگ کی سعادت نصیب فرما۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ اُحد کی صورت میں ان کی دعا قبول کر لی لیکن ان میں سے سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ثابت قدمی عطا کی باقی سب اپنے سابقہ ارادے سے مکر گئے اور اللہ کی راہ میں پائیداری اور استقامت نہیں دکھائی۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو بس رسول ہی ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا"۔

محمدؐ فقط اللہ کے رسول ہیں

حضرت محمد ﷺ فقط اللہ کے رسول ہیں جو لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے پر مامور ہیں، اس کے علاوہ ان کی کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔ "بھلا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟" "موت" روح کے جسم سے خارج ہو جانے اور حیات کے باطل ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اور "قتل" کسی کو عمداً مارنے کے معنی میں ہے۔ فرماتے ہیں: اگر پیغمبر اکرم ﷺ وفات پا جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور اپنی پہلی حالت پر پلٹ جاؤ گے اور اللہ کے دین سے منہ موڑ کر کافر ہو جاؤ گے؟ "اور جو الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو جزا دے گا" جو شخص ہدایت پا جانے کے بعد دوبارہ گمراہ ہو جائے اللہ تعالیٰ کو اس کے کفر اور ایمان کا کوئی نقصان نہ ہوگا بلکہ اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔ اور جو لوگ ثابت قدم رہیں، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار کریں اور اس کا شکر ادا کریں، کافروں کی طرح اللہ کی نعمتوں کو نہ چھپائیں تو اللہ تعالیٰ ان کو جزای خیر دے گا۔ ان کے جزا اور پاداش کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے اسے آیت میں

اس کی تفصیل نہیں بتائی ہے، ان کے اجر و پاداش کی ارزش اور حقیقت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سدی سے نقل ہوا ہے کہ جنگ اُحد میں لوگوں کے درمیان یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ رسول خداﷺ مارے گئے ہیں۔ اصحاب صخرہ سے بعض نے کہا: اے کاش کسی کو عبداللہ بن ابوسفیان کے پاس بھیجتے تاکہ ہمارے لیے امان نامہ لے لیتا۔ وہ کہتے تھے اے لوگو! محمدﷺ مارے گئے ہیں لہٰذا اپنی قوم کی جانب پلٹ جاؤ اس سے پہلے کہ وہ تمہاری طرف آجائیں اور تم سب کو مار دیں۔ انس بن نضر کا کہنا تھا: اے لوگو! اگر محمدﷺ مارے بھی گئے ہوں تو اس کا اللہ تو زندہ ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیے کہ جنہوں نے محمدﷺ کو مارا ہے ان سے جہاد کرو۔ اس نے کہا: اے خدا! میں ان لوگوں کی ان باتوں کے متعلق تم سے معافی چاہتا ہوں، اور ان کی باتوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ اس نے تلوار اٹھائی اور جنگ کرنے لگا، یہاں تک اللہ کی راہ میں شہید ہوا اور یہ آیت اس کی شان میں نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۵

”اور کوئی جاندار اذن خدا کے بغیر نہیں مر سکتا، اس نے (موت کا) وقت مقرر کر کے لکھ رکھا ہے اور جو (شخص اپنے اعمال کا) صلہ دنیا میں چاہے گا اسے ہم دنیا میں دیں گے اور جو آخرت کے ثواب کا خواہاں ہو گا اسے آخرت میں دیں گے اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو اچھا صلہ دیں گے“۔

موت ایک قطعی الٰہی سنت

یہ آیت ان لوگوں کی باتوں کا جواب ہے جو کہتے تھے اگر شہداء جہاد پر نہ جاتے تو مارے نہ جاتے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان کی موت کا سبب جنگ نہیں بلکہ اللہ کے اذن سے اجل کا پہنچ جانا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک الٰہی اور تدبیر الٰہی باطل ہو جاتی۔ لہٰذا موت ایک حتمی اور قطعی الٰہی سنت ہے جس کا منشاء اور سرچشمہ قضاء الٰہی ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ آیت ان لوگوں کا جواب ہے جو کہا کرتے تھے: اگر جنگ کی سربراہی ہمارے سپرد کی جاتی تو یہ لوگ نہ مارے جاتے۔ سورہ آل عمران آیت ۱۵۴: "لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا" ان کی باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ایمان لانا اس لیے تھا تاکہ دنیوی مال اور اقتدار کے مالک بن جائیں۔ اور جہاد سے جن لوگوں کا مقصد اس قسم کی چیزیں نہ تھی وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے اجر و ثواب کے امیدوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک گروہ کو اس کی آرزو تک پہنچا دیتا ہے۔ جو لوگ فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کے طلبگار ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا احترام کرتا ہے۔ وہ حیوانیت کے پست مرتبہ سے ترقی کر کے اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے مقام اور مرتبے تک جا پہنچے ہیں۔ وہ اس طرح کے ایمان کے اثرات سے آگاہ ہیں۔ حقیقت میں انہیں دنیا اور آخرت کے ثواب سے کوئی کام نہیں ہے وہ تو فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کے طلبگار ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی ان کے اجر و ثواب کو پورا پورا ادا کرتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

"اور کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں جن کی ہمراہی میں بہت سے اللہ والوں نے جنگ میں حصہ لیا لیکن اللہ کی راہ میں آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے نہ وہ بددل ہوئے نہ

انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ وہ خوار ہوئے اور اللہ تو صابروں کو دوست رکھتا ہے''۔

انبیاءؑ کے ہمراہ جنگ میں شریک ہونے والے

''رِبِّیُّوْنَ'' ان لوگوں کو کہتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے مختص کیا ہوا ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ''کَاَیِّنْ'' کثرت کو بیان کرتا ہے اور کتنی دفعہ کے معنی میں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آنے والی سختیوں اور مشکلات پر سستی کا شکار نہیں ہوتے اور دشمن کے سامنے تسلیم نہیں ہوتے، ایسے لوگ جو پکے ارادے کے مالک ہوتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں ذلت قبول نہیں کرتے اور اہل صبر سے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ ایسے افراد بہت زیادہ ہیں جنہوں نے سابقہ انبیاءؑ کا ساتھ دیا۔ امن میں بھی ان کا ساتھ دیا اور جنگ کے ایام میں بھی ساتھ دیا۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

''اور ان کی دعا صرف یہ تھی: ہمارے رب! ہمارے گناہوں سے اور ان زیادتیوں سے درگزر فرما جو ہم نے اپنے معاملات میں کی ہیں اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما''۔

انہوں نے اپنی خطاؤں اور اپنے گناہوں کو اپنے سامنے مجسم کیا ہوا ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاؤں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔ ان کا سارا ہم و غم اللہ کے دین کو پھیلانا تھا۔ ان کا ہدف نہ تو نعمات الٰہی تھا اور نہ ہی مال غنیمت یا دنیا اور آخرت کا اجر و ثواب۔ ان کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے حضور ادب بندگی کو بجالانا تھا۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

”چنانچہ اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا بہتر ثواب بھی عطا کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے“۔

نیکی کرنے والے، اللہ کے پسندیدہ بندے

اس آیت میں مومنین کے لیے وعظ و نصیحت اور عبرت ہے تاکہ ان کو ”رِبِّيُّوْنَ“ کی اقتداء کرنے کی طرف تشویق کی جائے۔ اس طرح وہ دنیا اور آخرت دونوں کے اجر و ثواب سے بہرہ مند ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی ربیون کی طرح ان سے بھی محبت کرے۔ آخرت کے ثواب کے ساتھ حُسن کی صفت لائی ہے لیکن دنیا کے اجر کے بارے میں فرمایا ” ثَوَابَ الدُّنْيَا“ یہ اس بات کو بتانے کے لیے ہے کہ دنیا کا اجر و ثواب، آخرت کے اجر و ثواب کے ساتھ قابل مقایسہ نہیں ہے۔ آخرت کے اجر و ثواب کا مقام بہت بلند ہے۔ محسنین سے وہ لوگ مراد ہیں جو عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے نیک ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

”اے ایمان والو! اگر تم نے کافروں کی اطاعت کی تو وہ تمہیں الٹا پھیر دیں گے پھر تم بڑے خسارے میں پڑ جاؤ گے“۔

کافروں کی اطاعت کا انجام

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار جنگ اُحد کے بعد بار بار مومنین سے کہا کرتے تھے کہ اب دوبارہ جنگ نہ کرنا۔ اس طرح وہ مومنین کے درمیان اختلاف اور تفرقہ ایجاد کرتے اور ان کو دوبارہ کفر کی جانب لے جانا چاہتے تھے۔ مومنین اگر ان کی باتوں میں آجاتے تو یقینی طور پر کفر کی سرپرستی اور ولایت کو قبول کرکے ایمان لانے کے بعد دوبارہ گمراہی اور دنیا اور آخرت کے خسارے اور نقصان کا شکار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو متوجہ کیا ہے کہ وہ کافروں کی باتوں میں نہ آئیں اور ان کی ولایت وسرپرستی میں نہ جائیں وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾

''دراصل اللہ ہی تمہارا کارساز ہے اور وہی بہترین مددگار ہے''۔

تمہاری ولایت اور سرپرستی کا حق فقط اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور تمہارے اوپر ولایت اور سرپرستی کا حق نہیں رکھتا۔ اللہ کی ولایت مومنین کی فتح و نصرت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مددگار نہیں وہ بہترین مددگار ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾

''ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب بٹھائیں گے کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کے لیے بُرا ٹھکانا ہے''۔

کافروں کا انجام

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو ایک اچھا وعدہ دیا ہے کہ وہ دشمنوں کے دلوں میں ان کا رُعب ڈال کر ان کی مدد کرے گا۔ اہل سنت اور شیعہ روایات کے مطابق دشمنوں کے دلوں میں رُعب ڈالنا پیغمبر اکرم ﷺ کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے۔ بہت سارے ایسے مواقع پیش آئے ہیں جب باطل نے حق کے خلاف پرچم بلند کیا تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مدد کی اور کفار کو ذلیل و رسوا کیا اور وہ اسلام کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکے۔ لہٰذا کفار مومنین کے سامنے ذلیل و خوار ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی دلیل اور برہان کے دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ شرک کے بہت سارے درجات ہیں۔ اس کا ایک درجہ یہ ہے کہ غیر خدا سے خیر اور نفع طلب کی جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ غیر خدا کو اپنا ولی اور سرپرست بنایا جائے۔ اس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ عالَم کو بنانے والے کی نفی کر کے تاثیر اور تدبیر کو غیر خدا کی طرف نسبت دی جائے جس طرح مادیون اور دہریون اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ ''ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ ظالموں کے لیے برا ٹھکانا ہے'' ان کی یہ سزا ان کے اعمال کے مطابق ہے۔ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ (سورہ نباء آیت ۲۶) ترجمہ: ''یہ (ان کے جرائم کا) موزوں بدلہ ہے۔''

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور بے شک اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا جب تم اللہ کے حکم سے کفار کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ تم خود کمزور پڑ گئے اور امر (رسول) میں تم نے باہم اختلاف کیا اور اس کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمہاری پسند کی بات (فتح و نصرت) بھی تمہیں دکھا دی تھی، تم میں سے کچھ طالب دنیا تھے اور کچھ آخرت کے خواہاں، پھر اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہارا امتحان لے اور اللہ نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے''۔

ایمان والوں پر اللہ کا فضل

مومنین کے حق میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان کے دشمن کے دل میں رُعب ڈال کر محقق ہوا۔ '' حَسّ ''، مایوسی کے عالم میں قتل کرنے کو کہتے ہیں، اس طرح سے قتل کرنا جس سے نسلیں ختم ہو جائیں۔ روایات کے مطابق جنگ اُحد کے آغاز میں مسلمانوں کو کفار پر غلبہ حاصل تھا لیکن جب ان تیر اندازوں نے سستی کا مظاہرہ کیا جنہیں پیامبر اکرم ﷺ نے درے کی حفاظت کا حکم دیا تھا تو مسلمان شکست سے دوچار ہوئے۔ ان میں سے بہت کم تعداد نے استقامت کی اور باقی سنبھال غنیمت کی طمع سے عبد اللہ بن جبیر کو چھوڑ کر چلے گئے۔ جو باقی بچے تھے خالد بن ولید نے ان حملہ کرکے ان سب کو شہید کیا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح و نصرت کی بشارت دی تھی۔

آیت کے اس حصے میں کہا جا رہا ہے کہ جنگ اُحد میں تم میں سے کچھ مال غنیمت اور متاع دنیا کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور تم میں سے کچھ ایسے تھے جنہوں نے مال غنیمت اور دنیا پر قُربِ الٰہی کو ترجیح دیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے طلبگار گروہ کے عمل کی وجہ سے تمہیں کفار پر فتح و نصرت عطا نہیں کی تاکہ اس طرح تمہارا امتحان لے اور تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے ارادوں کو ظاہر کرے۔ اور تمہیں مرنے کی مشکل اور شکست کھا جانے کی سختی میں ڈال

کر تمہارا امتحان لے لے۔ اور منافق کو مومن سے الگ کرے اور استقامت کرنے والے مومنین کو تذبذب کا شکار مومنین سے جدا کرے۔ تمہارے اختلاف اور ضعف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا اور اللہ تعالیٰ کی یہ بخشش مومنین کے حق میں اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تھا۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

”(یاد کرو) جب تم چڑھائی کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھ رہے تھے، حالانکہ رسول تمہارے پیچھے تمہیں پکار رہے تھے، نتیجے کے طور پر اللہ نے تمہیں غم (رسول) کی پاداش میں غم دیا تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جائے اور جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمہیں دکھ نہ ہو اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے“۔

رسول خداؐ کو چھوڑ کر بھاگنے والوں کی سرزنش

”اصعاد“ افق کے کنارے کی طرف جانا اور نظروں سے اوجھل ہونے کے معنی میں ہے۔ اور ”صعود“ پہاڑ یا اس کے مانند کسی چیز پر اوپر چڑھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی تم لوگ ڈر کے مارے اس طرح فرار ہو رہے تھے کہ تمہیں کسی بھی چیز کا خیال نہ تھا۔ یہاں تک کہ تم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو بھی اکیلا چھوڑ دیا جبکہ وہ تمہیں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور میدان جنگ سے فرار ہونے سے منع کر رہے تھے۔ لیکن تم نے پیغمبر اکرم ﷺ کا کہنا مانا

اور مارے جانے کے ڈر سے انہیں مشرکین کے درمیان اکیلا چھوڑ کر صحرا کی طرف فرار ہوئے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کے ہاتھ سے جانے اور ساتھیوں کے مارے جانے کا غم بھی تمہارے دلوں میں ڈال دیا۔ یہ غم اس غم اور حسرت کے علاوہ تھا جو پہلے سے تمہارے دلوں میں موجود تھا کہ کیوں ہم نے رسول خداؐ کی مدد نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس غم کو تمہارے دلوں میں اس لیے ڈال دیا تاکہ تم پہلے غم کو بھول جاؤ۔ یہ دوسرا غم تمہارے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک طرح کی نعمت تھا۔ "فَاَثَابَكُمْ" اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجر و پاداش دیا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ رازوں، تمہارے ضمیر، تمہارے اعمال اور نفسانی خواہشات سے آگاہ ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

''پھر جب اس غم کے بعد تم پر امن و سکون نازل فرمایا تو تم میں سے ایک گروہ تو اونگھنے لگا، جب کہ دوسرے گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کر رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے: کیا اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ کہہ دیجئے: سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ لوگ جو بات اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں اسے آپ پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں: اگر (قیادت میں) ہمارا کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دیجئے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کے مقدر میں قتل ہونا لکھا ہے وہ خود اپنے مقتل کی طرف نکل پڑتے اور یہ (جو کچھ ہوا وہ اس لیے تھا) کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ کر واضح کر دے اور اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے''۔

جہاد کرنے والوں پر اللہ کی نعمتیں

''اَمَنَۃً'' امن و امان کی وجہ سے ملنے والے دلی سکون کو کہا جاتا ہے۔ ''نُعَاس'' ہلکی نیند کو کہتے ہیں۔ در حقیقت یہ ان مسلمانوں کے لیے عطیہ الٰہی تھا جو میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور اس کے بعد دوبارہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف واپس پلٹے تھے۔ یہ لوگ اپنے عمل پر نادم تھے اور درے کی حفاظت نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو میدان جنگ سے فرار ہوتے ہوئے تو نہیں بخش سکتا کیونکہ میدان جنگ کو چھوڑ کر بھاگ جانا گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے ایک طرح کے خوف میں مبتلا کر دیا اس کے بعد ان پر ہلکی نیند مسلط کر دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے عمل پر نادم ہوئے

اور رسول خداﷺ کی جانب واپس پلٹے۔ ان کا واپس پلٹنا اس امر کے بعد تھا جب انہوں نے یقین کر لیا تھا کہ رسول خداﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں۔

وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ

''جب کہ دوسرے گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی، وہ ناحق اللہ پر زمانہ جاہلیت والی بدگمانیاں کر رہے تھے، کہہ رہے تھے: کیا اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟''

یہ مومنین کا دوسرا گروہ تھا جنہیں فقط اپنی جان کی فکر تھی۔ انہوں نے سب کچھ فراموش کیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو اپنی خاص عنایت میں شامل نہیں کیا جس میں اس نے مومنین کے ایک گروہ کو اپنی بخشش اور غم کو امن اور نعاس ہلکی نیند سے نواز تھا۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا اس لیے وہ اپنے سوا سب کچھ بھول گئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں پر ان کے دشمنوں کے غلبے پر اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہے۔ وہ جو چاہے انجام دے سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بعض چیزوں کا اختیار خود ان کے پاس ہے۔ وہ یہ جاہلانہ سوچ بھی رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت کا وعدہ بغیر کسی قید و شرط کے پورا ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پیغمبر اکرمﷺ کبھی شکست نہیں کھاتے، وہ ہرگز رحلت نہیں فرماتے اور دین حق کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ یہ زمانہ جاہلیت کے بت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ سب امور کا ایک رب ہے جو اس کا انتظام چلاتا ہے اور تدبیر کرتا ہے۔ وہ پیغمبر اکرمﷺ کو بھی ایک طرح کا رب مانتے تھے کہ دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے خود ان کے سپرد کیا ہوا ہے۔ یقینی طور پر یہ شرک آمیز عقیدہ ہے۔

''قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ'' ''کہہ دیجئے: سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے''

مطلق حکمران فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس نے فتح و نصرت کا اختیار اپنی مخلوقات میں سے کسی کے سپرد نہیں کیا۔ اس نے اپنی زندہ مخلوقات میں

سے کسی کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ نہ مرے اور ہمیشہ زندہ رہے۔ جو بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہو وہ مشرک ہے۔ کیونکہ اسباب میں سے کوئی بھی مستقل نہیں ہے۔ علت و معلول کے نظام کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ جو علت قوی تر ہو گی اسی کا معلول ہی وقوع پذیر ہو گا، خواہ وہ حق ہو یا باطل، خیر ہو یا شر، مومن ہو یا کافر، پیغمبر ہو یا ابوسفیان۔ فقط ایک صورت میں اللہ تعالیٰ جاری نظام کے برخلاف کسی چیز کو خلق کرتا ہے جب حق کا ظہور اور حق کا غلبہ اس پر موقوف ہو۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حمایت کے لیے مافوق طبیعی طریقہ سے امور کو انجام دیتا ہے۔

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰهُنَا ۭ

"یہ لوگ جو بات اپنے اندر چھپائے رکھتے ہیں اسے آپ پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں: اگر ہمارا کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے"۔

منافقین ان باتوں کے ذریعہ مومنین کے اندر شک ایجاد کرنا چاہتے تھے جو درحقیقت رسول خداؐ پر اعتراض تھا۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ

"کہہ دیجئے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کے مقدر میں قتل ہونا لکھا ہے وہ خود اپنے مقتل کی طرف نکل پڑتے"۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: تم میں سے کچھ افراد کا راہ خدا میں مارا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تم حق پر نہیں ہو۔ ان افراد کا مارا جانا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر میں لکھا ہوا تھا کہ یہ لوگ اس جگہ مارے جائیں گے۔ "اجل مسمّٰی" سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تو پھر بھی جن کے مقدر میں اس مقام پر مارا جانا لکھا ہوا تھا وہ اسی جگہ مارے جاتے۔

وَ لِيَبۡتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾

"جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ کر واضح کر دے اور اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے"۔

تاکہ اس طرح ان کی باطنی حقیقت آشکار ہو جائے۔ اور یہ الٰہی سنت ہے کہ وہ ہر گروہ کو اس کے معین شدہ مقام اور مرتبے تک پہنچاتا ہے۔ تاکہ ان کی شقاوت اور سعادت آشکار ہو جائے اور اللہ تعالیٰ دلوں کے رازوں اور ان میں موجود ایمان سے آگاہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡكُمۡ يَوۡمَ الۡتَقَى الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّيۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا كَسَبُوۡا ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۵۵﴾

"دونوں فریقوں کے مقابلے کے روز تم میں سے جو لوگ پیٹھ پھیر گئے تھے بلاشبہ ان کے اپنے بعض کرتوتوں کی وجہ سے شیطان نے انہیں پھسلا دیا تھا، تاہم اللہ نے انہیں معاف کر دیا، یقیناً اللہ بڑا در گزر کرنے والا، بردبار ہے"۔

شیطان کے دھوکہ سے جہاد سے بھاگنے والے

اس آیت میں اس بات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد سے پیچھے ہٹ گئے در حقیقت شیطان نے ان کو پھسلا دیا تھا۔ اس کی وجہ ان کے برے اعمال اور خواہشات نفسانی کی پیروی کرنا تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ بندوں کی خطاؤں سے در گزر کرتا ہے۔ وہ برے اعمال انجام دینے والے بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس نے ان افراد کو بھی بخش دیا ہے کیونکہ وہ بڑا در گزر کرنے والا، بردبار ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

''اے ایمان والو! کافروں کی طرح نہ ہونا جو اپنے عزیز واقارب سے، جب وہ سفر یا جنگ پر جاتے ہیں تو کہتے ہیں: اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے، اللہ ایسی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت پیدا کرنے کے لیے سبب بنا دیتا ہے، ورنہ حقیقتاً مارنے اور زندگی دینے والا تو اللہ ہی ہے اور ساتھ تمہارے اعمال کا خوب مشاہدہ کرنے والا بھی اللہ ہی ہے''۔

مارنے اور زندگی دینے والا اللہ ہے

'' كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا '' سے کفار مراد ہیں، منافقین مراد نہیں۔ ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ '' سفر کرنے سے کنایہ ہے۔ ''غُزًّى'' غازی کی جمع ہے جو جنگجو کو کہتے ہیں۔ '' مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ'' والا جملہ ایک طرح کا بیان ہے اس بات کے لیے کہ موت اور زندگی کا سبب نہ تو گھر والوں اور رشتہ داروں سے دور ہونا ہے اور نہ ہی جنگ میں شریک ہونا۔

مارنا اور زندگی دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اس جملے میں موت کو قتل سے پہلے بیان کیا گیا ہے تاکہ لف و نشر کے قاعدے کی رعایت کی جائے۔ سابقہ جملے میں مسافرت پہلے ذکر ہوئی ہے جس میں معمولاً اگر کسی کی موت آجاتی ہے تو وہ طبیعی صورت میں آجاتی ہے۔ جبکہ دوسرے جملے میں جنگ پہلے ذکر ہوئی ہے جس میں موت معمولاً قتل کی صورت میں واقع

ہوتی ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ معمولاً موت طبیعی اور عادی امر ہے اس کو قتل پر مقدم کیا گیا ہے۔ ان کی یہ بات قلبی عتاب کا سبب بنتی ہے جو کہ عذاب الٰہی کا مقدمہ ہے۔

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

''حقیقتاً مارنے اور زندگی دینے والا تو اللہ ہی ہے اور ساتھ تمہارے اعمال کا خوب مشاہدہ کرنے والا بھی اللہ ہی ہے''

لہٰذا گھر والوں اور رشتہ داروں سے دور ہونا یا ان کے قریب ہونا نہ تو موت کا باعث بنتا ہے اور نہ ہی موت سے بچ جانے کا سبب۔ کیونکہ یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ خدا سے ڈرو اور کفار کی طرح نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''اور اگر تم راہ خدا میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی طرف سے جو بخشش اور رحمت تمہیں نصیب ہو گی وہ ان سب سے بہت بہتر ہے جو وہ لوگ جمع کرتے ہیں''۔

اس آیت میں قتل کو موت سے اس لیے پہلے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ راہ خدا میں مارا جانا اللہ کی مغفرت کے زیادہ قریب ہے۔ '' مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ '' سے مال اور اس کے متعلق دوسری چیزیں مراد ہیں جو کہ دنیوی زندگی کا اہم ترین ہدف ہیں۔

وَلَىِٕنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور اگر تم مر جاؤ یا مارے جاؤ آخر کار اللہ کی بارگاہ میں اکھٹے کیے جاؤ گے''۔

ہر صورت میں تمہاری بازگشت جوار الٰہی کی طرف ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَھُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ

لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''(اے رسول) یہ مہر الٰہی ہے کہ آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس ان سے در گزر کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کریں پھر جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

مومنین پر پیغمبرؐ کا نرم مزاج ہونا رحمت الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نتیجہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر مہربان اور نرم مزاج ہیں۔ آنحضرت اس قدر تم پر مہربان ہیں کہ جب تم ان پر کوئی اعتراض کرتے ہو اور کہتے ہو کہ تم نے ہمیں ہلاک کر دیا تو پھر بھی وہ تم سے سخت لہجے میں بات نہیں کرتے۔

وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠

ترجمہ: ''اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔''

'' فَظًّا '' بے رحم اور ستم کرنے والا اور '' غَلِيْظَ الْقَلْبِ '' سنگدل کو کہتے ہیں۔ یقینی طور پر اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنگدل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد جمع نہ ہوتے اور آپ کے پاس سے متفرق ہو جاتے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ

"پس ان سے در گزر کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کریں"۔

اے پیغمبرؐ! جب تم ان پر مہربان اور نرم دل ہو تو ان کی خطاؤں اور نامناسب اعمال سے در گزر کرو اور ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرو۔ اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے جنگی امور کے حوالے سے ان سے مشورہ کرو۔ تاکہ تمہاری یہ روش اور سنت باقی رہے۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

"پھر جب آپ عزم وفیصلہ کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں (اور اس کام کو کر گزریں)، بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

کیونکہ تم نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے تو اللہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ہی تمہارا یاور اور مددگار ہوگا اور اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو کبھی ذلیل اور رسوا نہیں ہونے دیتا۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِىْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

"(مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو پھر کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کو پہنچے گا، لہٰذا ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں"۔

مومنین اللہ کی نصرت پر بھروسہ کریں

مومنین سے کہا جارہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے ذریعے تمہاری تائید کرے تو کوئی بھی طاقت تم پر غلبہ حاصل نہ کر سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلق ہے۔

وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ

"اگر اللہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کو پہنچے گا"

اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد نہ کرے تو تم ذلیل ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سارے اسباب کا مالک ہے اور پورے عالم کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر خدا نہ چاہے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾ "لہٰذا ایمان والوں کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسہ کریں" کیونکہ مومن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یاور اور مددگار نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ فقط اللہ ہی پر اعتماد کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنۡ يَّغُلَّ ؕ وَمَنۡ يَّغۡلُلۡ يَاۡتِ بِمَا غَلَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾

"اور کسی نبی سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرتا ہے وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو (اللہ کے سامنے) حاضر کرے گا، پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔

نبی خیانت نہیں کرتا

یہ آیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کو خیانت سے پاک و منزہ قرار دیتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ پیامبر اپنے پروردگار یا لوگوں سے خیانت کرے۔ کیونکہ یقینی طور پر خائن نے ایک دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے اور وہاں پر وہ اپنی خیانت کی سزا بھگتے گا۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾

"پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"

دنیا میں جس نے جو کچھ انجام دیا ہے خواہ نیکی ہو یا بدی، قیامت کے دن اس کا پورا پورا بدلہ اسے ملے گا اور ذرہ برابر بھی اس پر ظلم نہ ہو گا۔ نبی امین ہوتا ہے، وہ اللہ کے پیغامات کو جس طرح وصول کرتا ہے اسی طرح آگے پہنچاتا ہے اس میں کچھ بھی کم و زیادہ نہیں کرتا۔ خیانت کار اللہ کا نبی نہیں ہو سکتا۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

"کیا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا تابع ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب میں گرفتار ہو اور جس کا ٹھکانا جہنم ہو؟ اور اسکا انجام تو بہت برا ہے"۔

اللہ کی اطاعت کرنے والا اور نافرمان برابر نہیں

مومن کا سارا ہم و غم اللہ تعالیٰ کی رضایت کا حصول ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور مال دنیا کو حاصل کرنے پر لگا ہوا ہے اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے پر اس کی کوئی توجہ نہیں ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ مومن اعلیٰ قدر کی تلاش میں ہوتا ہے وہ اس راہ میں مقابلہ کی کیفیت میں رہتا ہے، اپنی نفسانی خواہشات کو پاؤں تلے روندتا ہے اور اللہ کی رضا کی تلاش میں رہتا ہے تو ایسا شخص اسکی مانند کیسے ہو سکتا ہے جو خواہشات کا پیرو ہے اور اللہ کی ناراضگی کو مول لیتا ہے۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

"اللہ کے نزدیک ان کے لیے درجات ہیں اور اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے"۔

ہر کوئی اس درجہ اور مرتبے تک پہنچے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

"ایمان والوں پر اللہ نے بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے"۔

رسول اللہؐ کی بعثت مومنین پر اللہ کا احسان ہے

اس آیت میں احسان جتانے کی وجہ مومنین میں ایمان کی صفت کا ہونا ہے کیونکہ صفت مشعر علیت ہے۔ لہٰذا 1۔ پیغمبروں کا بھیجنا ایک نعمت ہے۔ 2۔ پیغمبروں کا بشر ہونا دوسری نعمت ہے۔ 3۔ آیات الٰہی کی تلاوت، 4۔ مومنین کا تذکیہ اور 5۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم بھی اللہ تعالیٰ کی نعمات ہیں۔ یقینی طور پر رسول خدا ﷺ سے پہلے لوگوں کا بہت بُرا حال تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ان پڑھ اور درک و شعور کی نعمت سے محروم تھے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے بعثت کے بعد لوگوں کو بت پرستی، فرسودہ خیالات اور شرک کی پلیدی سے پاک و منزہ کیا اور ان کو بتوں کی عبادت اور باطل شریعتوں کی پیروی کرنے سے منع کیا۔ ان کو ظالم حکام کے ظلم وجور سے بچایا۔ خرافات، باطل رسومات اور اندھی تقلید، مذہبی، خاندانی اور قبائلی تعصّبات سے ان کو نجات دلائی اور اور ان کو پستی سے نکال کر عزت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔

اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾

"مسلمانو!) جب تم پر ایک مصیبت پڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟ جبکہ اس سے دگنی مصیبت تم (فریق مخالف پر) پہنچا چکے ہو، کہدیجئے: یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

مشکلات انسان کے عمل کا نتیجہ ہیں

اس مصیبت سے مراد وہ مشکلات ہیں جو مومنین کو جنگ اُحد میں درے پر مامور سپاہیوں کے اس درہ کو چھوڑنے کی وجہ سے ۷۰ افراد کے مارے جانے کی صورت میں پیش آئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے رسول خداﷺ کے حکم کی نافرمانی کی تھی۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ: جنگ بدر میں تم نے ۷۰ کفار کو قتل کیا اور ان کے ۷۰ افراد کو قیدی بنایا، اس کے باوجود آج کی شکست کو بعید سمجھتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم حق پر ہیں تو ہمیں اس طرح کی شکست سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟

"قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

"کہدیجئے: یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی مصیبت ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"

اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ تم نے اپنی فتح و نصرت کے سبب کو ضائع کردیا اور جنگی معاملات میں اپنے رہبر کے حکم کی مخالفت کی۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم لوگ خود اس جنگ کا باعث بنے۔ کیونکہ جنگ بدر میں تمہارے پاس یہ اختیار تھا کہ یا تو کفار کے قیدیوں کو قتل کرو یا ان سے فدیہ لے لو یا ان کو آزاد کرو۔ تم نے فدیہ لینے کو انتخاب کیا تو یہی لوگ اگلے سال

تمہارے ساتھ جنگ کرنے آگئے اور تمہارے ۷۰ افراد کو قتل کر دیا۔ تمہارا کہنا تھا کہ آج کے دن فدیہ لینا ہمارے فائدے میں ہے، اگر اس کے نتیجے میں آنے والے وقتوں میں ہمارے ۷۰ افراد مارے بھی جائیں تو اس میں ہمارا نقصان نہیں بلکہ یہ معاملہ ہمارے فائدے میں ہے۔ لہٰذا ہر صورت میں جنگ میں شکست کھا جانے کہ وجہ تم ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرنے اور تمہیں کفار پر غلبہ دینے سے عاجز نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾

"اور فریقوں کے درمیان مقابلے کے روز تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اللہ کے اذن سے تھی اور (اس لیے بھی کہ) اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے مومن کون ہیں؟"

جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کا حوالہ

جس طرح جنگ بدر میں قیدیوں کے عوض فدیہ لینا تمہارے اختیار میں تھا، اسی طرح جنگ اُحد میں تمہیں امتحان اور آزمایش میں مبتلا کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تھا تا کہ حقیقی مومنین کو غیر مومنین سے جدا کرے۔

وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ ﴿١٦٧﴾

"اور یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ نفاق کرنے والے کون ہیں، جب ان سے کہا گیا: آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع کرو تو وہ کہنے لگے: اگر ہمیں علم ہوتا کہ (طریقے کی)

جنگ ہو رہی ہے تو ہم ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے، اس دن یہ لوگ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب ہو چکے تھے، وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ یہ لوگ چھپاتے ہیں اللہ اس سے خوب آگاہ ہے"۔

منافقوں کی بہانہ تراشیاں

ان کو جہاد کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا کہ اگر تم اللہ کی راہ میں جہاد نہیں کرنا چاہتے ہو تو کم از کم اپنے مال اور ناموس کا دفاع کرو۔ لیکن انہوں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا: ہم تو جنگ کے بارے کچھ نہیں جانتے ورنہ ہم ضرور تمہاری مدد کرتے۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۱۶۷﴾

"اس دن یہ لوگ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب ہو چکے تھے، وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ یہ لوگ چھپاتے ہیں تو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے"۔ "اَفْوَاہ" "فاہ" کی جمع ہے جو لفظ اس لیے لایا گیا ہے تاکہ بتایا جائے کہ جو بات وہ کرتے ہیں وہ زبان ہی کی حد تک ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو بات صرف زبان سے کی جاتی ہے وہ دل سے کی جانے والی بات کے مقابلے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ان کی سب باتوں سے آگاہ ہے خواہ زبان سے اس کا اظہار کریں یا اسے دل ہی میں پوشیدہ رکھیں۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

"یہ لوگ وہ ہیں جو خود (پیچھے) بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے: کاش! اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے، ان سے کہد یجئے: اگر تم سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال دو"۔

اگر سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال دو

''اِخْوَان'' سے ان کے نسبی بھائی مراد ہیں جو جنگ میں مارے گئے تھے۔ اس لفظ کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے ''قَعَدُوْا'' والے جملے میں بیان کی گئی سرزنش میں شدت پیدا کی جائے اور کہا جائے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کرنے میں کوتاہی کی اور گھروں میں بیٹھے رہے جس کے نتیجے میں ان کے بھائی میدان جنگ میں نہایت ہی دردناک طریقے سے مارے گئے۔

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ: "ان سے کہد یجئے: اگر تم سچے ہو تو موت کو اپنے سے ٹال دو"

تم دوسروں کی موت کے متعلق فکر مند ہو تو اگر کر سکتے ہو تو پہلے اپنے آپ سے موت کو ٹال دو۔ موت نے تو ہر صورت آنا ہے موت کا وقت مقرر ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ﴿۱۶۹﴾

"اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں قطعاً انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں"۔

راہ خدا میں مارے جانے والے زندہ ہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب یا تو پیغمبر اکرم ﷺ کو ہے یا سب لوگوں کو ہے۔ دونوں صورتوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ "موت" شعور اور فعل کے باطل ہونے کا نام ہے۔ جو شخص مرتا ہے نہ تو اس میں شعور باقی رہتا ہے اور نہ ہی درک کرنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے اور نہ ہی کوئی کام انجام دے سکتا ہے۔ اسی لیے "اَحۡیَآءٌ" کے لفظ کے بعد حیات کے بعض آثار ذکر ہوئے ہیں جن میں رزق کا کھانا اور شعور کے نمونے کے طور پر (فرحین) خوش ہونے کو ذکر کیا گیا ہے۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

"اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جو لوگ ابھی ان کے پیچھے ان سے نہیں جا ملے ان کے بارے میں بھی خوش ہیں کہ انہیں (قیامت کے روز) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے"۔

"فَرح" خوش ہونے اور لذت کو درک کرنے کے معنی میں ہے۔ "اِسۡتَبۡشار" یعنی خوش کرنے والی خبر سن کر خوش ہونا۔ یا بشارت اور خوشخبری کے ذریعے خوشی طلب کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں وہ دنیا میں موجود مومنین کے حالات سے آگاہ ہیں۔ بشارت سے مومنین کے اعمال کا ثواب مراد ہے جو حقیقت میں حزن اور خوف کا نہ ہونا ہے۔ حزن اور خوف کو اس لیے نکرہ لایا گیا ہے تاکہ اس کے عموم کو سمجھایا جائے۔ وہاں پر مومنین کسی بھی قسم کے خوف اور حزن کا شکار نہ ہوں گے۔ انہیں نعمت کے زائل ہونے کا کوئی خوف بھی نہ ہوگا۔ اور یہ رزق اور الٰہی نعمت سے بہرہ مند ہونا

ہے۔ یہ سب ان کے لیے بیان کیا جارہا ہے جو راہِ خدا میں شہید ہوئے ہیں۔ اس کے بعد والی آیت بھی اسی کے تسلسل میں آئی ہے۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۷۱

"وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت اور اس کے فضل پر خوش ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔

اس آیت میں ''استبشار'' عام ہے یعنی یہ بشارت اس بشارت کو بھی شامل ہے جو راہ خدا میں قتل ہونے والے مومنین کو دیتے ہیں، اسی طرح یہ بشارت خود ان کو دی جانے والی بشارت کو بھی شامل ہے۔ نعمت اور فضل کو اس لیے نکرہ لایا گیا ہے تاکہ سننے والے کا ذہن فضل اور نعمت الٰہی کے متعلق عموم کا معنی سمجھے۔

اجر وہاں پر استعمال ہوتا ہے جہاں اجر لینے والا اس کا حقدار ہو، اور فضل وہاں پر استعمال ہوتا ہے جہاں مستحق ہونے کے بغیر کوئی عنایت کی جائے۔ مومنین کو اجر کے علاوہ فضل الٰہی بھی ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو بھی ضایع نہیں کرتا۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۱۷۲

"انہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل کی، ان میں سے جو لوگ نیکی کرنے والے اور تقویٰ والے ہیں، ان کے لیے اجر عظیم ہے"۔

زخمی حالت میں نصرتِ رسولؐ پر قائم رہنے والے

اس آیت میں اللہ اور رسول کو الگ الگ ذکر کا مقصد شاید یہ ہو کہ کچھ مسلمانوں نے میدان جنگ سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاد کا حکم دیا تھا۔ دوسری طرف کچھ مسلمانوں نے رسول خداﷺ کے حکم کی مخالفت کی کیونکہ آپؐ نے ان کو درے کی حفاظت کرنے کا حکم دیا تھا، وہ آپؐ کی نافرمانی کرتے ہوئے درے کو چھوڑ کر فرار ہوئے۔ جبکہ واقعی مومنین نے اللہ اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے استقامت دکھائی۔

''قَرۡحٌ'' زخمی ہونے اور قتل ہو جانے کے معنی میں ہے۔ انہوں نے دوبارہ رسول خداﷺ کی آواز پر لبیک کہا اور مشرکین پر حملہ آور ہوئے۔ جبکہ ابوسفیان پھر سے مسلمانوں پر حملہ کرکے ان کو شکست دینا چاہتا تھا۔ جب مسلمانوں کو پتہ چلا کہ رسول خداﷺ زندہ ہیں تو وہ سب آپؐ کے ارد گرد جمع ہوئے اور آپؐ کی مدد کی۔

لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَاتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۲﴾

''ان میں سے نیکی کرنے والے لوگ اہل تقویٰ ہیں، ان کے لیے اجر عظیم ہے''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجر کو ان لوگوں سے مختص کیا ہے جنہوں نے نیکی کی ہے۔ کیونکہ عملی طور پر کسی کی آواز پر لبیک کہنے کا معنی یہ نہیں ہے کہ حقیقت میں بھی وہ نیکی اور تقویٰ کی صفت سے آراستہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا عظیم اجر حقیقی تقویٰ اور احسان کے مطابق ملتا ہے۔ زخمی حالت کے باوجود نیک اعمال انجام دیتے ہوئے تقویٰ کو اپنایا اور رسول اللہﷺ کی حفاظت کے لیے جان لڑانے پر آمادہ ہوئے۔

اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖۗ وَّقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ﴿۱۷۳﴾

''جب کچھ لوگوں نے ان (مومنین) سے کہا: لوگ تمہارے خلاف جمع ہوئے ہیں پس ان سے ڈرو تو (یہ سن کر) ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوا اور وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے''۔

اللہ مومنین کیلئے کافی ہے

اس آیت میں پہلے ''ناس'' سے منافقین اور دوسرے ''ناس'' سے دشمن اور مشرکین مراد ہیں۔ منافقین کی باتیں مومنین کے ایمان میں اضافے کا سبب بنیں۔ کیونکہ فطری بات ہے کہ جب انسان کو کوئی ایسا شخص جس کے بارے میں وہ حُسن ظن نہیں رکھتا کسی چیز سے منع کرے تو وہ اس چیز کے بارے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ اس کا یہ اشتیاق سبب بنتا ہے کہ اس کے اندر پوشیدہ انرجی اور زیادہ شعلہ ور ہو جائے اور اس کا عزم وارادہ اور زیادہ پکا ہو جائے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو وحی کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ مشرکین ان کے خلاف جمع ہوئے ہیں تو اس حوالے سے اس خبر کے سچ ہونے پر ان کا ایمان اور زیادہ قوی ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں انہیں بہت ساری تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح ان کی سرنوشت معلوم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے وعدے کے مطابق اپنی آرزو کو پہنچ جائیں اور ان کو فتح ونصرت مل جائے۔ اور یہ چیز جنگ کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جنگ کے لیے تیار ہوئے۔ ''وکیل'' اسے کہتے ہیں جو انسان کے امور چلانے والا ہوتا ہے۔ یقینی طور پر اللہ تعالیٰ بہترین وکیل ہے اور وہ ہی مومنین کے لیے کافی ہے۔[1]

---

[1]۔ ان افراد کا نمونہ کامل امیر المومنین علیہ السلام تھے جو جنگ اُحد میں آخری لحظے تک پیامبر اکرم ﷺ کا دفاع کرتے رہے۔ (مترجم)

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۷۴﴾

''چنانچہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ کر آئے، انہیں کسی قسم کی تکلیف بھی نہیں ہوئی اور وہ اللہ کی خوشنودی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

اللہ کی نعمت سے بہرہ ور ہونا

یہ نعمت ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدے کی تصدیق کی وجہ سے ملی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مومنین کی تعریف کرنا شروع کی اور فرمایا کہ ان کا پورا ہم و غم اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنے لامتناہی فضل اور احسان سے بہر مند کرتا ہے اور کامیابی ان کا مقدر بنتی ہے۔ میدانِ جنگ سے چلے جانے کے بعد انکا واپس پلٹ آنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کرنا مشرکین کا مقابلہ کرنا تو یہ اللہ کا ان پر انعام ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۵﴾

''یہ (خبر دینے والا) شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان لوگوں سے نہیں مجھ سے ڈرو''۔

انسان کی صورت میں شیطان

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جہاں پر قرآن کریم نے انسان کے لیے شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے انسی شیطان سے ان کے وسوسے مراد ہیں۔ آگے فرمایا ہے: ان

سے اس لیے نہیں ڈرنا چاہیے کیونکہ یہ شیطان ہیں، جو لوگ ان کی باتوں پر آجاتے ہیں در حقیقت وہ بھی ان شیاطین کے دوستوں میں سے ہیں اور مومنین کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے نہ ڈریں۔ جو بھی مومنوں کو مشرکین اور کافروں سے ڈرائے وہ انسان کی صورت میں شیطان ہے۔ ایسے شیاطین کی باتوں میں مومنوں کو نہیں آنا چاہیے۔ وہ فقط اللہ کا خوف اپنے دل میں رکھیں۔ کوئی بھی انہیں نقصان نہیں دے سکتا۔

وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''اور (اے رسول) جو لوگ کفر میں سبقت لے جاتے ہیں (ان کی وجہ سے) آپ آزردہ خاطر نہ ہوں، یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی ضرر نہیں دے سکیں گے، اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے نصیب میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے تو بڑا عذاب ہے''۔

کفار اللہ کو کچھ بھی ضرر نہیں دے سکتے

یہ آیت رسول خدا ﷺ کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ جو لوگ کفر اختیار کرنے اور نور خدا کو بجھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے رہے ہیں اور بڑھ چڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو نقصان دینے کے درپے ہیں اگر وہ ظاہری طور پر کامیاب بھی ہو جائیں تو بھی پیغمبرؐ کو اس بات پر غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہوا ہے کہ حق کو باطل پر غلبہ عطا کرے۔ ان کے کفر سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کا نقصان خود ان کو

ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں ہوں گے۔ ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تابع ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

"اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے نصیب میں ان کا کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے تو بڑا عذاب ہے"

قیامت کے دن ان کے اعمال ان کی حسرت کا سبب بنیں گے۔ وہ اپنے برے اعمال کے باعث عذاب الٰہی کا شکار ہوں گے۔کافروں کوانکے برے اعمال کی سزا عذاب کی شکل میں ملے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

"جنہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر خرید لیا ہے وہ بھی اللہ کو کوئی ضرر نہیں دے سکیں گے اور خود ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

ایمان کے بدلے کفر اختیار کرنے والے

انہیں چاہیے تو تھا ایمان لاتے اور نیک کاموں کو انجام دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت کی نعمت سے نوازا تھا۔ لیکن انہوں نے ایمان کی بجائے کفر کا انتخاب کیا اور ان کا یہ انتخاب دنیا اور آخرت میں خود ان کے نقصان میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ خدا ان کو ان کے کفر کی وجہ سے دردناک عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ انہوں نے ایمان کے بعد کفر اپنایا ہے ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے۔

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾

''اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں اور آخر کار انکے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا''۔

کافروں کیلئے ڈھیل دینا

یہ آیت بھی سابقہ آیت کا تتمہ ہے جس میں رسول گرامی اسلام ﷺ کو تسلی دی گئی تھی کہ کفار کا کفر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ارادے کا وقوع پذیر ہونا ہے جس کا نقصان فقط کفار ہی کو ہوگا۔ ان کے کفر اختیار کرنے میں ان کے لیے کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ آخرت میں وہ سعادت سے محروم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دے رہا ہے تاکہ وہ زیادہ گناہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں دی گئی بے شمار نعمات پر ناشکری کرنے پر ان کو ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔[1]

مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰى یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَیْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۹﴾

---

[1]۔ دربار یزید میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے یزید کے خلاف اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ (مترجم)

''اللہ مومنوں کو اس حال میں رہنے نہیں دے گا جس حالت میں اب تم لوگ ہو اور یہاں تک کہ پاک (لوگوں) کو ناپاک (لوگوں) سے الگ کر دے اور اللہ تمہیں غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرے گا بلکہ (اس مقصد کے لیے) اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں اجر عظیم ملے گا''۔

مومنوں کا امتحان سنت الٰہی ہے

اللہ تعالیٰ کی سنت امتحان ہمیشہ سے چلتی رہی ہے جس کے ذریعے وہ حقیقی اور ظاہری مومنین کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

''اور اللہ تمہیں غیب کی باتوں پر مطلع نہیں کرے گا بلکہ (اس مقصد کے لیے) اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے''

یعنی اللہ تعالیٰ حقیقی مومن کو غیر مومن سے الگ کرنے کا علم تمہیں نہیں دیتا کیونکہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ وہ اپنے منتخب بندوں کے علاوہ کسی اور کو یہ علم عطا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے فقط اپنے خاص بندوں کو علم غیب عطا کرتا ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

''پس تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں اجر عظیم ملے گا''

کیونکہ الٰہی سنتِ امتحان سے بچنا ممکن نہیں امتحان سے تو ہر ایک نے گزرنا ہے اس لیے تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تاکہ پاک لوگوں میں سے قرار پاؤ۔ البتہ یاد رہے کہ صرف ایمان کافی نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تقویٰ بھی ضروری ہے تاکہ

عمل، ایمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف اوپر لے جا سکے۔ اور تقویٰ ایمان کی حفاظت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا اجر و ثواب بھی ان دو ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر ملتا ہے۔ لفظ جلالہ (اللہ) کو تکرار کرنے کا مقصد ان امور میں اللہ تعالیٰ کے جمال اور جلال کی تاکید کرنا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور متصف نہیں ہو سکتا۔ ان امور میں غیب کا علم، انبیاء اور رسولوں کا انتخاب اور ایمان کی اہلیت دینا شامل ہیں۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

''اور جو لوگ اللہ کے عطا کردہ فضل میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں برا ہے، جس چیز میں وہ بخل کرتے تھے وہ قیامت کے دن گلے کا طوق بن جائے گی اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے''۔

اللہ کے عطاء کردہ فضل سے بخل کرنے والے

بخیل لوگوں کی حالت کفار جیسی ہے جن کو ملنے والی مہلت ان کے فائدے میں نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نقصان میں ہے۔ مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لینا اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا بھی کفر ہے۔ لہٰذا ان کا بخل ان کے فائدے میں نہیں ہے بلکہ ان کے نقصان میں ہے۔ کیونکہ قیامت میں ان کے لیے حسرت کا سبب بنے گا۔

قیامت کے دن ان کا بخل ان کے حسرت اور عذاب کا باعث بنے گا۔ اللہ تعالیٰ تو ان کے انفاق سے بے نیاز ہے۔ وہ بہت جلد نیکی کرنے والے کو ان کے نیک اعمال کا اجر اور برے کام انجام دینے والوں کو ان کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

"بتحقیق اللہ نے ان لوگوں کی سن لی ہے جو کہتے ہیں: بے شک اللہ محتاج اور ہم بے نیاز ہیں، ان کی یہ بات اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا بھی ہم ثبت کریں گے اور (روز قیامت) ہم ان سے کہیں گے: لو اب جلانے والے عذاب کا ذائقہ چکھو"۔

یہودیوں کے اعتراض کا جواب

یہودی جب اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو سنتے جس میں وہ انسانوں کو قرضہ دینے کی دعوت دے رہا ہے یا جب وہ مومنین کی غربت اور مفلسی کو دیکھتے تو مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے اگر ان کا اللہ امیر ہوتا تو ان کی یہ حالت نہ ہوتی اور ان کا اللہ ان کو امیر بنا دیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا فقیر ہے۔ جبکہ ہم امیر ہیں۔ یا وہ کہتے خدا ہمیں تو سود لینے سے منع کرتا ہے لیکن وہ خود ہم سے قرض مانگتا ہے اور اس کا چند برابر بدلہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ جبکہ اس نے ہمیں اس عمل سے منع کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا الفاظ سے کھیلتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں کسی بھی طرح کی جسارت اور بد تمیزی کرنے سے نہیں رکتے۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

''ان کی یہ بات اور ان کا انبیاءؑ کو ناحق قتل کرنا بھی ہم ثبت کریں گے اور (روز قیامت) ہم ان سے کہیں گے: لو اب جلانے والے عذاب کا ذائقہ چکھو''

ہم ان کے سارے گھناؤنے اعمال اور باتوں کو لکھتے ہیں، وہ سب ان کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں اور ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ انہوں نے یہ اعمال غلطی اور نادانی کی وجہ سے انجام نہیں دیئے بلکہ جان بوجھ کر انجام دئے لہٰذا ان کو ان کے بُرے اعمال کے بدلے جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۚ﴿۱۸۲﴾

''یہ خود تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہے اور بے شک اللہ تو اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔

عذاب، انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے

اس آیت میں بندوں کے اعمال کے لکھے جانے اور ان کو ملنے والے عذاب کی وجہ اور اس کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ بندوں کے اعمال کا نہ لکھا جانا نظام عالم کے متعلق بے توجہی کرنے کے مترادف ہے اور یہ خود ایک طرح کا بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ ظالم نہیں ہے لہٰذا ہر ایک کا عمل لکھا جارہا ہے اور جس کا جیسا عمل ہوگا اسے ویسا ہی بدلہ ملے گا، اچھے عمل کا نتیجہ اچھا ملے گا اور برے عمل کا نتیجہ برا ملے گا۔ ہر ایک کو اپنی کمائی ہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے ظلم سے پاک و منزہ ہے۔ وہ بندوں کے سارے اعمال بلکل ٹھیک طریقے سے ریکارڈ کرتا ہے۔ اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا و سزا دیتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾

”جو لوگ کہتے ہیں: ہمیں اللہ نے حکم دیا ہے کہ جب تک کوئی رسول ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ آ کر کھا جائے، ہم اس پر ایمان نہ لائیں، کہہ دیجئے: مجھ سے پہلے بھی رسول روشن دلیل کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور جس کا تم ذکر کرتے ہو وہ بھی لائے تو اگر تم سچے ہو تو تم لوگوں نے انہیں کیوں قتل کیا؟“

یہودیوں کے مطالبے کا جواب

یہودی کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم کسی پیامبر پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لے آئے جو آگ میں جل جائے۔ اس قربانی سے ان کی مراد ایسی چیز تھی جس کو ہدیہ دے کر وہ مقام قُرب تک پہنچنے کا عقیدہ رکھتے تھے۔

قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾

”کہہ دیجئے: مجھ سے پہلے بھی رسول روشن دلیل کے ساتھ تمہارے پاس آئے اور جس کا تم ذکر کرتے ہو وہ بھی لائے تو اگر تم سچے ہو تو تم لوگوں نے انہیں کیوں قتل کیا؟“

وہ اس قدر سنگدل تھے کہ انہوں نے آری سے حضرت زکریا علیہ السلام کے دو حصے کر دیئے، حضرت یحیٰ علیہ السلام کے سر کو تن سے جدا کیا اور اسے بنی اسرائیل کے ایک ظالم بادشاہ کو پیش کیا، لہٰذا ان کے یہ سارے دعوے جھوٹے ہیں۔ یہودی جو کہہ رہے تھے کہ قربانی کو آگ جلادے تو اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ سب کچھ تو تمہارے پاس آیا تھا لیکن تم نے اسکے باوجود انبیاءؑ کی بات کو نہ مانا بلکہ ان کو قتل کر دیا۔ اب تم کس منہ سے اسی بات کا مطالبہ کر رہے ہو جسے تم پہلے دیکھ کر اسکی مخالفت کر چکے ہو۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

"(اے رسول) اگر یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ) آپ سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو معجزات، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے"۔

پیغمبر اکرمؐ کو تسلی

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ کفار کے جھٹلانے سے غمگین نہ ہوں۔ کیونکہ ان لوگوں نے گزشتہ انبیاء کو بھی جھٹلایا تھا جو ان کے پاس خارق العادہ معجزات، آسمانی کتابیں جیسے کتاب نوح، صحف ابراہیم، زبور داؤد، توراۃ اور انجیل لے کر آئے تھے۔ یہ ان کی روش رہی ہے کہ وہ حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ "زبُور" حکمتوں اور وعظ و نصیحت پر مشتمل کتاب ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا
مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

''ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور تمہیں تو قیامت کے دن پورا اجر و ثواب ملے گا (در حقیقت) کامیاب وہ ہے جسے آتش جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے، (ورنہ) دنیاوی زندگی تو صرف فریب کا سامان ہے''۔

ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب اس کے وعدہ کی تصدیق کرنے والے مومنین اور اس کے وعید کو جھٹلانے والے کفار سے ہے کہ وہ ان کو ان کا اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ کچھ مفسرین نے اس آیت کے ذریعے دنیا اور آخرت کے درمیان عالَم برزخ کے موجود ہونے پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان کا پورا بدلہ تو قیامت کے دن دیا جائے گا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ میں بھی ان کو بدلہ دیا جائے گا لیکن یہ ان کے اعمال کا پورا بدلہ نہ ہوگا۔ یہ استدلال اچھا استدلال ہے۔[1]

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا
مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

---

[1] ۔ اگرچہ سورہ مومنوں کی آیت ۱۰۰ واضح طور پر عالم برزخ پر دلالت کرتی ہے۔ ''وَمِن وَرَائِهِم بَرزَخٌ إِلَىٰ يَومِ يُبعَثُونَ'' ''اور ان کے پیچھے برزخ ہے جہاں وہ اس دن تک رہیں گے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے''۔

"کامیاب وہ ہے جسے آتش جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے، (ورنہ) دنیاوی زندگی تو صرف فریب کا سامان ہے"

"زُحْزِحَ" دور کرنے کے معنی میں ہے۔ "فوز" آرزو پا لینے کو کہتے ہیں۔ یقینی طور پر جس نے اپنے اعمال کے ذریعے اپنے آپ کو جہنم سے دور کیا اور جنت میں داخل ہوا، اس نے حقیقی آرزو کو پا لیا۔ دنیا کی زندگی تو فریب کے سامان کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس طرح کی فانی زندگی کی جانب توجہ نہیں کرنی چاہیے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۗ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"(مسلمانو!) تمہیں ضرور اپنے مال و جان کی آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا اور تم ضرور اہل کتاب اور مشرکین سے دل آزاری کی باتیں کثرت سے سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے"۔

اللہ کی طرف سے آزمائش کا سامان

اللہ تعالیٰ کی امتحان اور آزمائش میں مبتلا کرنے کی سنت ہمیشہ سے رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی اس لیے مسلمانوں کو دکھ پہنچانے والی اہل کتاب اور مشرکین کی باتیں بھی جاری رہیں گی۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ معاملات میں عزم راسخ (کی علامت) ہے"

یعنی اگر مومنین صبر کریں اور تقویٰ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو خطاؤں، لغزشوں اور سستی سے محفوظ رکھے گا۔ تاکہ وہ اپنے عزم و ارادے پر ثابت قدم رہ سکیں۔ عزم و ارادے پر ثابت قدم رہنے والوں کو مشکلات اور سختیوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ مومنین کو صبر سے کام لینا چاہیے اہل کتاب کی طعنہ زنیوں اور اذیتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے؛ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں؛ اللہ انکی مدد کرے گا۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''اور (یاد کرنے کی بات ہے کہ) جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ تمہیں یہ کتاب لوگوں میں بیان کرنا ہو گی اور اسے پوشیدہ نہیں رکھنا ہو گا، لیکن انہوں نے یہ عہد پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا، پس ان کا یہ بیچنا کتنا برا معاملہ ہے''۔

اہل کتاب سے لیا گیا عہد الٰہی

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ انہیں کتاب لوگوں کو بیان کرنا ہو گی اور اسے پوشیدہ نہیں رکھنا ہو گا۔ لیکن انہوں نے یہ عہد پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ انہوں نے حق کو چھپایا جبکہ وہ جانتے تھے کہ دین اسلام حق اور صحیح ہے اور اسلام اور گزشتہ ادیان کی بنیاد ایک ہی ہے۔ اس سب کے باوجود انہوں نے عہد الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور دنیا کی تھوڑی قیمت کے بدلے کتاب خدا کو تحریف کیا تاکہ مادی مفادات حاصل کر سکیں

اور لوگوں پر حکومت کر سکیں۔ لہٰذا انہوں نے بہت کم مقدار دنیوی مفاد کے لیے عہد الٰہی کو توڑ دیا۔ ان کا یہ معاملہ (سودا) بہت برا معاملہ ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

''جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہیں اور ان کاموں پر اپنی تعریفیں سننا چاہتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے، لہٰذا آپ انہیں عذاب سے محفوظ نہ سمجھیں، بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا''۔

بغیر عمل کے اپنی ستائش چاہنا

''بِمَآ اَتَوْا'' اللہ تعالیٰ نے جو مال دنیا ان کو عطا کیا ہے اس میں سے انفاق کرنے میں بخل کرتے ہیں اور اس کام پر خوش ہوتے ہیں۔ ''مَفَازَةٍ'' نجات کے معنی میں ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ کیونکہ ان کے دل باطل کی طرف راغب ہیں۔ ان پر حق کی ولایت اور سرپرستی نہیں ہے۔ لوگوں سے ان کاموں پر اپنی تعریفیں سننا چاہتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے۔ قیامت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ قیامت کے دن تو جو کیا ہے اسی کا حساب ہوگا۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور (وہ بچ کر کہاں جائیں گے) زمین و آسمان اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اللہ ہر شے پر قادر ہے''۔

اللہ مالک و قادر ہے

اس آیت میں بیان شدہ اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی مالکیت مطلق اور قدرت مطلق، گزشتہ آیات میں بیان شدہ مطالب کی علت کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔جب ایسا ہے تو پھر اللہ کے ملک میں اللہ کی نافرمانی کرکے یہ کہاں جائیں گے اور خود کو اللہ کے عذاب سے کیسے بچا پائیں گے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾

”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں“۔

صاحبان عقل کیلئے اللہ کی نشانیاں

عالم ہستی پر حاکم نظام کی کیفیت اور اس کے آثار جس میں آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کا بدلنا ان سب میں صاحبان عقل کے لیے نشانیاں ہیں۔ صاحبان عقل سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی آنکھیں مادی چیزوں کی محبت میں بند نہیں۔اور زمین اور آسمانوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے سبق لیتے ہیں۔

الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

''جو اٹھتے بیٹھتے اور اپنی کروٹوں پر لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں، (اور کہتے ہیں:) ہمارے رب! یہ سب کچھ تو نے بے حکمت نہیں بنایا، تیری ذات (ہر عبث سے) پاک ہے، پس ہمیں عذاب جہنم سے بچا لے''۔

عقلمندوں کی خصوصیات

عقل مند وہ ہیں جو ہمیشہ اور ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور عالَم ہستی کے بارے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ امر اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کریں۔ اور عالَم ہستی کی خلقت سے اس کے خالق اور اس کے امور کو چلانے والے کے متعلق علم حاصل کریں۔ ان کا ہمیشہ کا ذکر یہی ہے۔ ''باطل'' اس چیز کو کہتے ہیں جس کا کوئی معقول ہدف اور غرض نہ ہو۔ انہیں یقین ہے کہ اس عالَم کے بعد ایک اور ابدی عالَم ہے جس میں اللہ تعالیٰ ان کو دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے۔ آخرت اور دوبارہ زندہ کرنے کے عقیدے کے بغیر عالَم ہستی کی خلقت باطل اور بے ہودہ امر ہے۔ اللہ تعالیٰ بے ہودہ کام کرنے سے پاک و منزہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے رحمت اور ان سے کیئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ کے ثواب و عقاب کی مصلحت سے کوئی بچنے والا نہیں ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

''اے ہمارے رب! تو نے جسے جہنم میں ڈالا اسے یقیناً رسوا کیا پھر ظالموں کا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا''۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۚ ﴿۱۹۳﴾

"اے ہمارے رب! ہم نے ایک ندا دینے والے کو سنا جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا: اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے، تو اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں سے در گزر فرما اور ہماری خطاؤں کو دور فرما اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما"۔

مومنوں کی دعاء

جو عذاب الٰہی میں مبتلا ہوگا وہ خوار و ذلیل ہوگا۔ اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیونکہ سارے امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے مومنین اس طرح اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہمارے رب تو نے جسے آگ میں ڈالا تو اسے رسوا کیا۔ اور ظالموں کے لیے سہارا اور مددگار نہیں ہے۔ بعد والی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو ایمان کی دعوت دے رہے ہیں۔ ایمان کے لفظ کے اندر تمام الٰہی معارف پوشیدہ ہیں۔ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حق کی آواز پر لبیک کہا تاکہ گناہوں، برائیوں اور کفر کی حالت میں مرنے سے ان کو نجات ملے۔ اور وہ سب جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نداء کو سنا اور قبول بھی کیا۔ اور وہ سب اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کی طرف راغب ہوئے۔

''رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ''

"ہمارے رب! ہمارے گناہوں سے در گزر فرما اور ہماری خطاؤں کو دور فرما اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما"

یہاں پر مومنین نے اللہ تعالیٰ سے اپنے وعدے کو پورا کرنے کی درخواست کی ہے جو گناہوں کی بخشش اور رحمت کو شامل ہے۔ رسول خدا ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے مومنین کو ان دو چیزوں کی ضمانت دی تھی۔

رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

"ہمارے رب! تو نے اپنے رسولوں کی معرفت ہم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ہمیں عطا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا، بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا"۔

رسولوں سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ

ہمارے رب! تو نے اپنے رسولوںؑ سے جو وعدہ کیا ہے اور آپ کے رسولوںؑ نے آپ کی اجازت سے ہمیں اس وعدے کی ضمانت دی ہے اس وعدے کو پورا کر دے اور اپنے وعدے کی خلافی نہ کر کیونکہ اگر ایسا ہو تو قیامت کے دن ہم ناکام اور محروم ہوں گے۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مناجات کرنے والے آسمان اور زمین کی نشانیوں پر غور کر کے اللہ تعالیٰ، قیامت اور نبوت پر اجمالی طور پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان امور کی جزئیات کا علم رسول خدا ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کے بعد انہیں حاصل ہوا ہے۔ لہٰذا وہ فطرت کے حکم کے مطابق فطری راستے ہی پر چلتے ہیں اور رسول خدا ﷺ کے بیان کردہ سارے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

”پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا:) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم ایک دوسرے کا حصہ ہو، پس جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے نیز جو لڑے اور مارے گئے ان سب کے گناہ ضرور بالضرور دور کروں گا اور انہیں ایسے باغات میں ضرور بالضرور داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، یہ ہے اللہ کی طرف سے جزا اور اللہ ہی کے پاس بہترین جزا ہے“۔

مومنین کی دعا کی قبولیت

اللہ تعالیٰ کا ان کی دعا کو قبول کرنا اس کی رحمت کے نازل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی یہ رحمت عام ہے اور سب کو شامل ہے اسی لیے فرمایا کہ میں کسی بھی عمل انجام دینے والے کے عمل کو ضایع نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک اعمال اور اعمال انجام دینے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے وہ سب اس کے نزدیک برابر ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ اور عمل ایک جیسا ہے۔ ”پس جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے نیز جو لڑے اور مارے گئے ان سب کے گناہ ضرور بالضرور معاف کروں گا اور انہیں ایسے باغات میں ضرور بالضرور داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی، یہ ہے اللہ کی طرف سے جزا اور اللہ ہی کے پاس بہترین جزا ہے“۔

اس آیت میں ہجرت سے ایمان اور عقیدے کی خاطر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا مراد ہے جو اسلام کے ابتدائی ایام کے مسلمان مہاجرین سے مخصوص ہے۔ لیکن اس حوالے سے کہ یہاں پر ہجرت کو مطلق ذکر کیا گیا ہے شاید ہر قسم کی ہجرت کو شامل ہو جس میں شرک سے دور ہونا یا رشتہ داروں اور گناہوں سے دور ہونا شامل ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں "سَیِّاٰت" گناہان صغیرہ کو کہتے ہیں۔ اس بنا پر مہاجرین وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں یا تو ان گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے صغیرہ گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ اس آیت میں نیک اعمال کی تفصل بیان کرتے ہوئے ان کے ثواب کو بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً وہ نیک اعمال جن کو اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے جن میں دین کو وطن پر فوقیت دینا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں آزار و اذیت کو برداشت کرنا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور شرک کی ساری علامات اور نشانیوں سے ہجرت کرنا (انہیں چھوڑ دینا) شامل ہے۔

لَا یَغُرَّنَّکَ تَقَلُّبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِی الۡبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾

"(اے رسول!) مختلف علاقوں میں کافروں کی آمد و رفت آپ کو کسی دھوکے میں نہ ڈالے"۔

کافروں سے دھوکہ نہ کھائیں

اس آیت میں مسلمانوں کی توجہ اس طرف جلب کی گئی ہے کہ کفار کا مختلف علاقوں پر مسلط ہونا تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کفار کے پاس جو کچھ ہے وہ مومنین کو دی جانے والی اللہ تعالیٰ کی نعمات کے مقابلے میں نہایت قلیل اور پست ہے۔

مَتَاعٌ قَلِیۡلٌ ۟ ثُمَّ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِہَادُ ﴿۱۹۷﴾

"یہ چند روزہ عیش و نوش ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا جو بدترین جائے قرار ہے"۔

بدترین ٹھکانہ

ان کے چند روزہ دنیوی مال کو دوام نہیں، ان کا مال زائل اور فانی ہونے والا ہے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانا ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

''لیکن (اس کے برعکس) جو لوگ اپنے رب کا خوف رکھتے ہیں ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے (ان کے لیے) ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہ سب سے بہتر ہے''۔

نیک لوگوں کیلئے اللہ کی ضیافت

''نُزُل'' کھانے پینے اور ضرورت کی ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو مسافر کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیار کی جاتی ہیں۔ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ اگر کفار کے پاس مال و جاہ و حشمت دنیا ہے تو اس کے بدلے آخرت میں ان کے پاس کچھ نہ ہوگا اور وہ بہشتی نعمات سے محروم ہوں گے۔ اس کے برعکس مومنین اور نیک لوگوں کو آخرت میں بہشت کی ہمیشہ رہنے والی نعمات ملیں گی۔ جنت میں اہل تقویٰ اور نیک لوگوں کو ایسی نعمتیں ملیں گی جن کو نہ تو گِنا جاسکتا ہے اور نہ تو وہ کسی کے وہم و خیال میں آسکتی ہیں۔

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

''اور اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ ان پر نازل کیا گیا ہے سب پر اللہ کے لیے خشوع کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نشانیوں کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہیں کرتے، انہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس اجر و ثواب ہے، بے شک اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے''۔

بعض اہل کتاب کیلئے اللہ کا اجر و ثواب

اہل کتاب میں سے کچھ ایسے ہیں جو اچھے اجر و پاداش میں مومنین کے ساتھ شریک ہیں۔ لہٰذا اخروی سعادت نام و نمود کی بنیاد پر نہیں ملے گی بلکہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے اور نیک عمل انجام دینے کی بنیاد پر ملے گی۔ اس لیے اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں گے تو اخروی اجر میں مومنین اور اہل کتاب کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔ آخرت کی سعادت کسی خاص قوم یا جنس سے مخصوص نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے اس لیے وہ بہت جلد لوگوں کا حساب لے گا اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو بدلہ دے گا۔ اس آیت میں ان اہل کتاب کو نوید سنائی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰

''اے ایمان والو! صبر سے کام لو استقامت کا مظاہرہ کرو، مورچہ بند رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم کامیابی حاصل کر سکو''۔

مومنین کیلئے خصوصی ہدایت

اس آیت میں مومنین کو واضح طور پر حکم دیا جارہا ہے کیونکہ اس آیت میں سارے افعال امری، مطلق اور قید کے بغیر بیان ہوئے ہیں ''اصْبِرُوْا'' ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، ایک دوسرے کا ساتھ دو، اور اللہ کا تقویٰ اپناؤاس لیے آیہ میں ذکر شدہ صبر، ہر طرح کی مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنا، اطاعت کو انجام دینا اور گناہ پر صبر کرنا، سب کو شامل ہے۔ اس کے بعد ''مصَابِرہ'' کا حکم دیا اور کہا کہ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلامی معاشرے کے افراد اپنے آپ کو ایک متحد قوت محسوس کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مشکلات اور سختیوں کو برداشت کر سکیں گے۔

معنی کے اعتبار سے ''مرَابِطه'' کا دایرہ ''مصَابِرہ'' سے وسیع تر ہے۔ کیونکہ ''مُصَابِرہ'' کا معنی ہے مشکلات اور سختیوں کے مقابلے میں افرادی قوت کا متحد ہو جانا۔ جبکہ ''مُرَابِطه'' کا معنی ہے زندگی کے تمام امور میں ایک اور متحد ہو جانا خواہ وہ دینی ہوں یا اجتماعی، مشکلات اور سختی کے حالات ہوں یا خوشی اور راحتی کے حالات ہوں۔ اس آیت میں ''مرَابِطه'' سے مراد یہ ہے کہ مسلمان دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اکیلا ہر فرد کا مال، علم اور صبر اس کی سعادت کے لیے کافی نہیں

ہے۔ اس سعادت سے کلی اور مکمل سعادت مراد ہے۔ اسی لیے آگے فرمایا: اگر تم تقویٰ اختیار کرو اور حدود الٰہی کی پابندی کرو تو حقیقی ہدف دنیا اور آخرت کی سعادت پا سکو گے۔

سورۃالنساء

مدنی۔کل آیات 176

سورہ کے مطالب

اس سورہ میں خواتین سے متعلق احکام ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جو قوانین تھے خواتین کے حوالے سے، شادی بیاہ کے حوالے سے اُن میں جو تبدیلی لائی گئی ان کا تذکرہ ہے اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا ذکر ہے۔ تقویٰ کا بیان ہے اور حیات آفرین نصیحتیں ہیں، وراثت کے احکام ہیں، عبادات اور معاملات، کاروباری معاملات بارے ذکر ہے، توحید کا تذکرہ، معاد کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ داری کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچو، بے شک اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے“۔

نسل انسانی کے پھیلاؤ کا تذکرہ

اس آیت کے ذریعہ پوری انسانیت کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان سب ایک ہی ہیں، بڑے چھوٹے، دولت مند، فقیر، مرد و عورت، طاقتور و کمزور میں فرق نہیں ہے۔ سب اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کریں اور ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، تمام انسان قدرت الٰہی کے کنٹرول میں ہیں اور خدا ہی سب پر حاکم ہے۔ اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تمہیں جو دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ نے تمہیں ایک جان، ایک نفس، ایک شخص سے خلق کیا ہے جو آدم علیہ السلام ہیں جو انسانوں کے باپ ہیں اور پھر اس نفس سے زوج بنایا اس سے مراد حوا علیہا السلام ہیں اور حوا علیہا السلام کو آدم علیہ السلام کے نفس سے ہی خلق کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی بیوی خود آدم علیہ السلام کی جنس اور نوع سے تھی نا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آدمؑ کی پسلی سے حوا علیہا السلام کو خلق کیا گیا، یہ معنی ٹھیک نہیں کیونکہ اس بات پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دو سے بہت سارے افراد پورے عالم میں پھیلا دیے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج پہلے طبقے میں آدم علیہ السلام کے بعد بہنوں اور بھائیوں میں تھا اور ازدواج مَحرم کے ساتھ حرمت کا قانون بعد میں آیا، اس وقت یہ قانون نہیں بنا تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، جس کے نام سے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، تم اللہ کی ناراضگی سے بچو۔ اللہ کے نام سے سوال کا مطلب اللہ کی قسم اُٹھا کر

[1] ۔ بعض تفاسیر میں یہ بات آئی ہے کہ ہابیل کی شادی ایک عورت سے ہوئی جو فرشتہ کی نسل تھی اور قابیل کی شادی ایسی عورت سے ہوئی جو جنات سے تھی۔ اللہ کا حکم شروع دن سے آخر دن تک ایک جیسا ہے لہٰذا یہ صحیح معلوم نہیں کہ بہن بھائیوں کی آپس میں شادی ہوئی ہو۔ فرشتہ اور جنات والی بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی کہ اللہ فرمارہاہے ہم نے آدمؑ اور حواؑ سے نسل انسانی کو پھیلایا۔

ایک دوسرے سے کوئی چیز طلب کرنا۔ کنایہ ہے کہ اللہ کی ذات بندگان کے درمیان محترم اور باعظمت ہے۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ رشتہ داروں کا پاس رکھو ان کے لیے اہتمام کرو، اُن کے حق میں کوتاہی نہیں کرو، رشتہ داروں سے مراد نسبی رشتہ دار ہیں۔رقیب کا معنی حفیظ، دیکھنے والا، نظر رکھنے والا۔ خدا محافظ ہے تمہارے اوپر ،اللہ تمہارے اعمال اور تمہاری حرکات و سکنات پر ناظر ہے وہ قسمیں جس کے ذریعے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ داروں کے بارے میں جو تمہیں کہا گیا ہے تم اس پر کتنا عمل کرتے ہو اس پر بھی اللہ کی نظر ہے اور یہ نظارت اور نگہبانی ضروری امر ہے تاکہ معاشرہ ظلم اور فساد میں نہ پڑ جائے اور ستم اور سرکشی میں نہ چلی جائے، امن میں خلل واقع نہ ہو، معاشرہ عدل وانصاف پر قائم رہے۔

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

”اور یتیموں کو ان کے اموال دے دو، اور ناپاک کو پاک سے نہ بدلو، اور نہ کھاؤ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر، بے شک یہ بڑا گناہ ہے“۔

یتیموں کے اموال کا حکم

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر تصرف نہ کرو اس میں بڑا گناہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایسا تھا کہ جو یتیم ہوتے تھے وہ بے ضرر تھے، لوگ ان کی ماؤں سے شادی کر لیتے تھے اور اس طرح یتیموں کے مال کو ہڑپ کر جاتے تھے ان کے اموال بارے عدالت اور انصاف کی رعایت نہیں ہوتی تھی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کے مال کھا لینے کے بعد اُن کی ماں کو طلاق دیدیتے تھے اور انہیں بے سرپرست چھوڑ دیتے تھے کیونکہ اب ان کے پاس مال نہیں بچا تھا لہٰذا ان کی رغبت بھی اس شادی میں نہیں رہی تھی، اسلام آیا تو اسلام

نے اس کام سے منع کر دیا کہ مسلمان یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور اُنہیں تنگی اور مشکل میں مت ڈالیں۔ اور کسی بھی حیلے بہانے سے انکے اموال میں تصرف نہ کریں۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳

"اور اگر تم یتیم لڑکیوں سے بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو، اگر تمہیں خطرہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی سے نکاح کرو یا جو لونڈی تمہارے مِلک میں ہو وہی سہی، یہ طریقہ بے انصافی سے بچنے کے لیے زیادہ قریب ہے"۔

تعدد ازواج کا حکم

اس آیت میں زمانہ جاہلیت میں جو رواج تھا اس کو سامنے رکھ کر بیان کیا جا رہا ہے کہ اس زمانہ میں جنگیں بہت ہوا کرتی تھی، خونریزی بہت زیادہ تھی جس وجہ سے یتیم بہت زیادہ تھے۔ قرآن نے پہلے تو یہ کہا کہ تم یتیموں کا مال مت کھاؤ اور اس وجہ سے مسلمانوں کو پریشانی ہو گئی لہٰذا بعد والی آیات آئیں کہ اگر ایسا ہو کہ تمہارے لیے مشکل آ رہی ہو تو پھر جو یتیم لڑکیاں ہیں اُن کے ساتھ شادی کر لو۔ لیکن اگر تم یہ دیکھو کہ عدالت نہیں کر سکو گے تو پھر یہ قانون نہیں ہو گا پھر ایک پر ہی اکتفاء کرنا ہو گا، اگر عدالت کر سکو تو ایک دو تین چار تک لے سکتے ہو۔ زمانہ جاہلیت میں اس کی کوئی حد نہیں تھی، جتنی عورتیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے رکھ سکتے تھے، اسلام نے اس پر پابندی لگا دی اور حکم دیا کہ تم ایک بیوی رکھو یا پھر کنیز جو آپ کے پاس ہے اور جو خیال کرتا ہے کہ وہ چند بیویوں میں عدالت نہیں کر سکے گا تو ایک پر اکتفاء کرے

اور جو اس کی کنیزیں ہیں اسی پر اکتفاء کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کنیزوں کے درمیان عدالت کے قانون کو جاری نہیں فرمایا۔ ''عول'' میل اور انحراف کے معنی میں ہے، موڑنے کے معنی میں ہیں۔ یہ عمل تمہیں میانہ روی اور اصل ہدف سے منحرف نہ ہونے دے اس طرح ایک پر ایک اکتفاء کروگے اور کنیزوں کا حکم علیحدہ ہے، کنیزیں کئی بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک بیوی پر اکتفاء کرنا ہوگا اگر ایک زائد بیوی لینے پر انصاف اور عدالت نہ کرسکے، تعداد ازواج مشروط ہے ۔یہ قانون انصاف پر مبنی ہے اور ظلم وستم کے خاتمہ کا ذریعہ ہے۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا ﴿۴﴾

''اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دو، پھر اگر وہ اس میں سے اپنی خوشی سے تمہیں کچھ معاف کر دیں تو تم اسے مزے دار خوشگوار سمجھ کر لے لو''۔

بیویوں کو حق مہر کی ادائیگی

یہاں پر ایک قانون تو یہ آگیا کہ شادی میں عورت کو حق مہر دینا ہوگا اور حق مہر بھی اس لیے تاکہ اُن کا دل مطمئن ہو اور ان کی خوشی حاصل کی جاسکے اور پھر اگر وہ خود اس سے کچھ واپس کرتی ہیں اور شوہر کو عطیہ کر دیتی ہیں تو یہ ان سے لے لو، حق مہر حقیقت میں عطیہ ہے جو اس عورت کو شوہر دیتا ہے بغیر کسی معاوضہ کے اور اسی میں عورت کے لیے خوشی اور سکون ہے۔ اگر وہ عورت اس میں سے کچھ واپس کرتی ہے تو پھر اس سے لے سکتے ہو اور اسے حلال اور جائز سمجھ کر کھا سکتے ہو۔ یہ جملہ جو ہے کہ ''فان طبن لکم شئی'' اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی بیوی کے مال میں تصرف نہیں کر سکتے مگر یہ کہ وہ اپنی مرضی سے،

اپنی خوشی سے اپنا مال دے دے تو پھر اس کا مال لے سکتے ہو۔ جس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اگر وہ راضی نہ ہو تو پھر اس کے مال سے تصرف نہیں کر سکتے۔

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۵﴾

''اور اپنے وہ مال بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، البتہ ان اموال سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو اور انہیں نصیحت کی بات کہتے رہو''۔

اپنے اموال ناسمجھ لوگوں کے سپرد نہ کرو

اس آیت میں ایک اور قانون بیان کیا جارہا ہے، وہ یہ ہے کہ پہلی بات یہ سمجھا دی کہ جو اموال اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قرار دیئے ہیں وہ تمہاری زندگی کے لیے ہیں، ''السُّفَهَآءَ'' کم عقل اور نہ سمجھ کے معنی میں ہے۔ آیت شریفہ میں یہ بات آئی ہے کہ جو کم عقل ہیں مال انکے سپرد مت کرو۔ انہیں اتنا دو جو اُن کی زندگی کی ضرورت ہے اس سے زیادہ مت دو جیسے اُن کا لباس، اُن کا کھانا پینا اور رہن سہن کی چیزیں وغیرہ۔ البتہ پہلے یتیموں کے بارے ذکر ہے تو یہاں ''السُّفَهَآءَ'' سے مراد یتامیٰ میں سے ایسے جو ابھی کم عقل ہیں ان کو ان کا مال نہیں دینا چاہیے۔ اور جو '' اَمْوَالَكُمْ '' کہا ہے، اس سے وہ اموال مراد ہیں جن اموال کا ایک لحاظ سے یتیم کے سرپرستوں سے رابطہ ہے۔

یتیموں کے اموال کو ''اَمْوَالَكُمْ'' کہا گیا ہے تو یہ ایسے ہے کہ عام طور پر انسانی معاشرے میں تمام اموال جو دُنیاوی ہیں وہ اسی معاشرے کے ہی ہیں، سوسائٹی کے ہی ہیں لہٰذا معاشرے کے ہر ہر فرد پر یہ ہے کہ وہ اس مال کے ضائع ہونے کے سامنے رکاوٹ بنے۔ عقل

مند افراد کم عقل افراد کے اموال کا ادارہ کریں اور اپنی تشخیص سے اسے تجارت میں لگائیں۔ جتنی ان کی ضرورت ہو ان کو اتنا دیں باقی ان کا مال اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ اُن کے اموال سے جو منافع ہوں ان سے اُن کی روزی، ان کا کھانا پینا، ان کا لباس، ان کی رہائش وہ ان کو دینا چاہیے۔ اس سے واضح ہوا کہ جو لوگ کم عقل کے سرپرست ہیں وہ اُن کے تمام معاملات کی سرپرستی کریں، اگر ان کا کوئی ولی اور سرپرست نہ ہو تو شرعی حکومت اس کی سرپرستی کرے۔ اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو صالح مومنین اس ذمہ داری کو لیں۔ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ کم عقلوں کے ساتھ برا سلوک نہ کریں ان کے ساتھ احسان کریں، ان سے نرمی برتیں، انکے ساتھ پیار اور محبت سے بات کریں، انہیں خوش رکھیں؛ کیونکہ وہ بھی باقی انسانوں کی طرح انسان ہیں اور انہیں بھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ اس آیت میں اجتماعی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے کہ جو افراد نہ سمجھ ہیں یا جو یتامیٰ ہیں اور خود اپنے اموال میں تصرف نہیں کرسکتے تو انکے اموال کی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ضائع نہ ہونے دیں۔ انکے اموال کی حفاظت کریں اور انکے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

وَ ابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَ لَا تَاۡکُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّ بِدَارًا اَنۡ یَّکۡبَرُوۡا ؕ وَ مَنۡ کَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَ مَنۡ کَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡکُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا ﴿۶﴾

''اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر ان میں ہوشیاری دیکھو تو ان کے اموال ان کے حوالے کردو، اور ان کا مال نہ کھاؤ،

فضول خرچی میں یا جلدی میں کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (اور اپنا مال لے لیں گے)، اور جسے ضرورت نہ ہو تو وہ یتیم کے مال سے بچے، اور جو حاجت مند ہو تو مناسب مقدار میں کھا لے، پھر جب ان کے مال ان کے حوالے کرو تو اس پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے"۔

یتیموں کے بلوغ کے بعد ان کے اموال کا حکم

اس آیت میں ایک اور قانون بیان کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ یتیموں کی کب تک سرپرستی کی جائے؟ انکی سرپرستی جاری رہے گی یہاں تک کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنے امور کو خود سنبھال سکیں یعنی وہ بالغ اور نکاح کے قابل ہو جائیں۔ جب ایسا ہو تو پھر آپ اُن کا مال انہیں واپس پلٹا دو۔ رشد عقلی، پہلے کہا بالغ ہو جائیں، جسمانی طور پر بالغ ہو۔ پھر ان کی آزمائش کرو اگر وہ اچھے برے کی تمیز رکھتے ہیں، اپنے نفع و نقصان کو سمجھتے ہیں ان میں رشد آگیا ہے کیونکہ مال میں تصرف کے لیے رشد عقلی اور بلوغ جسمی دونوں معتبر ہیں۔ جب ایسا ہو تو ان کے اموال انہیں واپس لوٹا دو۔

اسلام میں عبادت کے لیے، شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے، دیت اور قصاص کے لیے جسمانی بلوغ شرط ہے لیکن مالی تصرفات میں جسمانی بلوغ کے ساتھ عقلی رشد اور عقلی بلوغ بھی شامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اجتماعی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سارے معاملات فاسد اور تباہ ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ اس ڈر سے کہ جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو آپ سے اپنے اموال کا مطالبہ کریں گے تم ان کے مال میں بے تحاشا تصرف کرو اور ان کے مال کو ضائع کرو یا اس میں غلط تصرف کرو کیونکہ جو ولایت یتیموں پر ہے یہ سرپرستی ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہے اور ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ہے، ان کے مال کو

نقصان سے بچانے کے لیے ہے نہ یہ کہ وہ ولی اور سرپرست ان کے مال کا حیف و میل کرے اور ان کو نقصان دے اور ان کے مال کو ضائع کرے۔

یتیم کے اموال کو اپنی ذات کے لیے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہے البتہ اگر ولی فقیر ہے جیسے پہلے بتایا گیا ہے تو متعارف طریقے سے اموال کی نگرانی کے حوالے سے وہ اپنے لیے ایک مقدار حاصل کر سکتا ہے۔ اس جگہ ایک اور ضابطہ بتا دیا کہ جب یتیموں کے مال واپس کر رہے ہو تو اس واپسی پر گواہ اپنے لیے لے لو۔ قرآن چاہتا ہے کہ بندگان کے جو ظاہری احکام ہیں ان کا دقیق حساب ہونا چاہیے، یہ قانون سازی اسی حوالے سے کی گئی ہے اور تربیت دینی توحید پر مبنی ہے۔ قرآن کی روش یہ ہے کہ تمام مالی مسائل میں گواہ رکھا جائے جیسے قرض دینے کے لیے کہا گیا ہے کہ گواہ رکھو۔ یہاں پر بھی مالی مسائل ہیں لہٰذا گواہ رکھنے کا کہا ہے۔ مالی مسائل میں لکھنا ضروری ہو لکھا جائے۔ جب سرپرست یتیم کا مال واپس کر رہا ہے تو وہ اس واپسی پر گواہ بنائے کہ وہ یتیم کا مال واپس دے رہا ہے، سب کو پتہ ہو کل کو کوئی انکار نہ کر دے اس کے پاس گواہ موجود ہوں کہ اس نے یتیم کا مال واپس کیا تھا۔

یتیموں کے ساتھ اچھی روش رکھو، ان سے نیک سلوک کرو اور تمام احکام کی بنیادیں توحید پر مبنی ہیں، عملی احکام، اخلاقی احکام، قرآن نے جو بتائے ہیں اُن کی ہر جگہ حکمرانی ہونی چاہیے۔ شرعی احکام، اخلاقی معاملات کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ دینی تربیت کی بنیاد اخلاقیات پر ہے لہٰذا آخر میں فرمایا تم ان دستورات اور احکام کی پابندی کرو لیکن اس کا حساب لینے والا اللہ ہے۔ اللہ ہی اس سلسلے میں کافی ہے کہ اس سرپرست نے کیا کیا ہے اور کس نے کونسا رویہ اپنایا ہے اور وہ بہترین احتساب کرنے والا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

''مردوں کا اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اگرچہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر ہے''۔

وراثت کے احکام

یہاں پر وراثت کے قانون کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ''نصیب'' کا معنی حصہ ہے۔ حکم یہ ہے کہ اولاد لڑکے ہوں یا لڑکیاں، مرد ہوں یا عورتیں جو بھی ماں باپ چھوڑ جاتے ہیں تو ان میں اُن کا حصہ ہے وراثت انہیں ملے گی چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اس میں فرق نہیں پڑتا۔ البتہ اس کی ترتیب ہے وہ بعد میں آئے گی اس پر ارث کے احکام جاری ہوں گے، ہر ایک کا حصہ معین اور مخصوص ہے اور یہاں پر ایک عمومی حکم ہے اور وہ یہ ہے کہ اسی سے بعض نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جو ترکہ ہے یہ آیت اس کو بھی شامل ہے لہٰذا جو حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو چھوڑ گئے وہ صدقہ ہے تو وہ حدیث باطل اور جھوٹی ہے کیونکہ جو حدیث قرآن کے صریح حکم سے ٹکرا جائے تو اسے نہیں ماننا چاہیے۔

اسی طرح اسی آیت سے یہ استدلال بھی ہوا ہے کہ میراث میں عدم عول ہے، میراث کے حصوں میں عول نہیں ہے۔ "عول" جہاں پر وارثان کے جو حصے ہیں اُن سے مال زیادہ ہو جائے تو اُن حصوں کو کم کرکے اور توڑ کر تمام سہام میں اسے شامل کیا جائے۔ اس آیت کی روشنی میں عول کا نظریہ صحیح نہیں، عول کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

''اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے کچھ انہیں بھی دے دو اور ان کو معقول بات کہہ دو''۔

میراث کی تقسیم کے آداب

جو رشتے دار مساکین و فقیر ہیں اس لحاظ سے کہ جو طبقات پہلے آتے ہیں وہ تو ارث لیں گے جو بعد والے ہیں وہ ارث نہیں لیں گے۔ لیکن وہ مرنے والے کے رشتہ دار ہیں، جب وراثت تقسیم ہو رہی ہو تو اگر وہ وہاں پر موجود ہوں تو ورثاء کو چاہیے کہ اس مال سے جو ارث ملا ہے اس سے کچھ نہ کچھ ان کو بھی دے دیں۔ اب سوال ہوا ہے کہ کیا ایسا کرنا واجب ہے یا مستحب ہے تو بہر حال اجمالی طور پر یہی ہے کہ جو وہاں پر میراث کی تقسیم کے دوران ان کے رشتہ دار ہیں جو فقیر و محتاج ہیں اُن کو کچھ نہ کچھ دیا جائے، یہ مہربانی کے طور پر ہے اور اچھائی کے طور پر ہے، احسان کے طور پر ہے اور ان کے ساتھ بات اچھے انداز سے کریں، سخت لہجہ نہ اپنائیں۔ یہ وراثت کی تقسیم کے آداب سے ہے۔

وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

''اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اپنے بعد چھوٹے چھوٹے ایسے بچے چھوڑنے والے ہوں جن کی انہیں فکر ہو تو پھر ان لوگوں کو چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں''۔

یتیم بچوں کی فکر مندی

یہاں ایک اور قانون بیان کیا جا رہا ہے، "خشیت" کا معنی ہے کہ انسان کے دل میں ایک قسم کا خوف اور ڈر محسوس ہو، البتہ ایسا تاثر جس کی کوئی اہمیت بھی ہو۔ "سدید" سیدھا ،درست مراد ہے۔ اگر لوگوں میں انسانیت ہو تو ان کے دل میں یہ ڈر ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے بارے میں جو کہا ہے وہ اس بارے خوف کھائیں کیونکہ لوگوں کے یتیم بالکل اسی طرح ہیں جس طرح خود ان کے اپنے یتیم ہوں۔ جو اولاد کمزور ہے اس پر رحم اور مہربانی ہونی چاہیے، ان کے حالات پر نظر بھی رکھنی چاہیے اور ان کے حالات کے بارے پریشان بھی ہونا چاہیے اور ان پر کوئی مصیبت نہیں آنی چاہیے کیونکہ اگر آج کسی اور کے یتیموں کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے تو کل آپ کے یتیموں کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ قول سدید ایسا عمل جو درست اور صحیح ہو ان کے بارے صحیح نظریہ رکھو اور ان کے ساتھ اچھا عمل کرو۔ چھوٹے بچے شفقت اور مہربانی کے مستحق ہیں۔

جو نیک عمل کرتا ہے تو اسکے اپنے لیے ہے اور جو برا کرتا ہے تو وہ بھی اسکے اپنے لیے ہے (سورہ فصلت، آیت 456)

یہاں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ کمزوروں کے ساتھ مہربانی کرو، یتیموں کے سر پر دست شفقت پھیرو ان کے اموال کا خیال رکھو اور ان کا حق تمہارے سامنے ضائع نہ ہو ، ان کے ساتھ ایسا سلوک کرو ایسے سمجھو کہ وہ تمہارے اپنے یتیم ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۠﴿۱۰﴾

"بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں، اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے۔ اور پھر عنقریب جہنم کی آگ میں ان کو ڈالا جائے گا"۔

یتیم کے حق کا پاس رکھا جائے

یہ آیت بیان کر رہی ہے کہ یتیموں کا حق ضائع نہیں ہونا چاہیے اور وراثت میں جو ان کا حصہ ہے وہ ان کے لیے طے شدہ ہے وہی انہیں ملنا چاہیے، ابھی وہ نابالغ ہیں لہٰذا جو انکے ولی ہیں وہ ان کی دیکھ بھال کریں اور اگر کوئی یتیموں کا مال کھا جاتا ہے ان کے مال میں خرد برد کرتا ہے تو ایسے ہے جیسے وہ آگ پیٹ میں بھر رہا ہے اور آتش جہنم اس کے لیے ہے وہ اس سزا کو پہنچے گا اور جس کی آگ اس کو جلا کر راکھ کر دے گی قیامت کے دن وہ بچ نہیں سکے گا۔ یہاں پر یہ قانون ہے کہ یتیموں کا مال نہیں کھانا، یتیم کے مال کھانے کا بڑا جرم ہے اور اس کی سخت سزا ہے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝١١

"اللہ تمہاری اولاد کے حق میں تمہیں حکم دیتا ہے، ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، پھر اگر دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو ان کے لیے دو تہائی حصہ چھوڑے گئے مال میں سے ہے، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے، اور اگر میت کی اولاد ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو کل مال کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے، اور اگر اس کی کوئی اولاد نہیں اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہیں تو اس کی ماں کا ایک تہائی حصہ ہے، پھر اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے، (یہ حصہ ہوگا) اس کی وصیت یا قرض کی ادائیگی کے بعد، تمہارے باپ یا تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہیں زیادہ نفع پہنچانے والے ہیں، اللہ کی طرف سے یہ حصہ مقرر کیا ہوا ہے، بے شک اللہ خبردار حکمت والا ہے"۔

وراثت کی تقسیم کا ضابطہ

اس آیت میں میراث کے احکام بیان کئے جارہے ہیں۔ "ایصاء" ایسی وصیت کو کہتے ہیں جس میں نصیحت اور خیر خواہی ہو۔ اولاد سے مراد بیٹے اور بیٹیاں ہیں کہ جو میت سے بغیر واسطہ پیدا ہوئے ہوں۔ اس سے پوتے یا نواسے مراد نہیں ہیں۔ "ابن" میں کوئی ایسی دلالت نہیں کہ پوتے مراد لیے جائیں۔ زمانہ جاہلیت میں ایسا تھا کہ عورتیں ارث نہیں لیتی تھیں۔ قرآن فرما رہا ہے کہ مرد عورتوں کی طرح ارث لیں گے لیکن مرد کے لیے دو برابر ہے۔ عورت کی وراثت کو اصل قرار دیا ہے اور اُس کے طفیل مرد کا ذکر کیا ہے۔[1]

---

[1] ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر کا خرچہ مردوں پر ہوتا ہے جبکہ عورتوں پر ایسا خرچہ نہیں ہوتا لہٰذا اگر مرد دو حصے لیتا ہے تو ایک حصہ وہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے اور ایک حصہ گھر والوں پر، اپنی عورتوں پر خرچ کرتا ہے، بیوی پر، ماں پر، بہن پر خرچ کرتا ہے

اس جگہ یہ بات بتائی ہے کہ اگر میت کے وارثوں میں فقط عورتیں ہوں تو اس کا حکم یہ ہے دو ہوں تو 2/3، تو ½ اس کا مال ہوگا۔ اولاد ہو تو ۱/۶ ہے، اگر اولاد نہ ہو تو پھر ماں باپ کو ہی وراثت ملے گی۔ ماں باپ عطف ہوا ہے اولاد پر، اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ اولاد کے طبقہ میں وراثت لینے میں ہم پلہ ہیں جبکہ برادران دوسرے طبقے میں آتے ہیں اگر بھائی ہوں میت کی اولاد نہیں بھائی ہیں تو بھائیوں کی صورت میں ماں کا 1/6 ہے اگر میت نے کوئی وصیت کی ہے تو پہلے اس پر عمل کیا جائے گا، اس کے کل ترکہ سے 1/3 پر وصیت جاری ہو گی اور اگر اس کے ذمہ قرض ہے تو اصل ترکہ سے پہلے قرض ادا کئے جائیں گے جو بچ جائے اس پر وصیت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

قرض کو وصیت پر مقدم کیا ہے۔ قرض دینے کے بعد جو ترکہ بچ جائے اس سے 1/3 وصیت کے مطابق الگ کر لیا جائے باقی ترکہ ورثاء میں تقسیم ہوگا۔[1] البتہ اس آیت میں بھائیوں کا ذکر ہوا ہے لیکن دوسری آیت سے اس حکم کو نسخ کر دیا گیا۔ یہ سارے احکام جو وراثت کے متعلق ہیں یہ فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین شدہ ہے، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس کا کیا فائدہ ہے اور کون کس کے لیے خیر بنتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی طور پر جو خارجی حقیقت ہے اس کے مطابق قانون سازی ہوئی ہے کیونکہ انسان اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے والدین کی بہ نسبت، لیکن والدین وجودیت اعتبار سے انسان کے زیادہ قریب

تو اس کے لیے اپنے لیے ایک ہی حصہ رہ جاتا ہے اور عورتوں کے پاس جب اسکا حصہ آتا ہے تو وہ اس کے پاس ہی رہتا ہے۔ (مترجم)

[1] ۔ فقہی کتابوں میں آیا ہے جب تک طبقہ اول موجود ہے تو طبقہ دوم کو وراثت نہیں ملے گی اس جگہ بھائیوں کی بات ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بعد میں بھائیوں کے بارے جو حکم آیا تو اس آیت میں جو بھائیوں کے لیے حکم تھا وہ ختم ہو گیا کیونکہ جب پہلا طبقہ موجود ہو جیسے ماں باپ تو سارا ترکہ انہی کو ملے گا بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ (مصحح)

ہیں اولاد کی بہ نسبت، کیونکہ والدین سبب بنتے ہیں اس کے وجود میں آنے کا (اس آیت میں عمومیت ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ترکہ چھوڑا یہ قانون اسے بھی شامل ہے، شیعہ سنی کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی جو چھوڑتا ہے وہ وراثت ہوتی ہے، یا وہ صدقہ ہوتا ہے اور وارثوں کو کچھ نہ ملے گا۔ لیکن اس آیت کا معنی واضح ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو چھوڑتے ہیں وہ ارث ہوتا ہے، صدقہ نہیں ہوتا۔ اور آیت کے صریح حکم کو حدیث کے ذریعہ منسوخ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی عمومی قانون وراثت کو محدود کیا جاسکتا ہے کہ عام لوگوں کے لیے اور قانون ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دوسرا قانون ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر قرآن میں اسکا واضح قانون بیان ہوتا جبکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بہت ساری آیات میں انبیاءؑ کی اولاد کے وارث بننے کا تذکرہ موجود ہے جو اس عمومی قانون کی تائید کرتا ہے۔)

وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ
لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ
دَيْنٍ ؕ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ
لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ
دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ
شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ
وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾

”جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اس میں سے تمہارا آدھا حصہ ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی اولاد ہو تو اس میں سے ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جو وہ چھوڑ جائیں، اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں یا قرض کے بعد، اور عورتوں کے لیے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو تم چھوڑ کر مرو بشرطیکہ تمہاری اولاد نہ ہو، پس اگر تمہاری اولاد ہو تو جو تم نے چھوڑا اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے، اس وصیت کے بعد جو تم کر جاؤ یا قرض کے بعد، اور اگر وہ مرد یا عورت جس کی یہ میراث ہے اس کے والدین یا اولاد نہیں ہے لیکن اس میت کا ایک بھائی یا بہن ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے، پس اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہیں، اس وصیت کے بعد جو ہو چکی ہو یا قرض کے بعد بشرطیکہ اوروں کا نقصان نہ ہو، یہ اللہ کا حکم ہے، اور اللہ جاننے والا تحمل کرنے والا ہے“۔

بیوی اور شوہر کی میراث کے احکام

اگر بیوی مر جائے تو اس کی وراثت اس کے شوہر کو ملے گی۔ اگر اس بیوی کی اولاد نہ ہو۔ نہ اسی شوہر سے اور نہ ہی سابقہ شوہر سے تو شوہر کو 1/2 حصہ ملے گا۔ اگر اولاد ہے تو پھر شوہر کو 1/4 ملے گا البتہ جو وصیت اور قرض ہے وہ اصل ترکہ سے نکالنے کے بعد۔ قرض ادا کرنا وصیت پر مقدم ہے، پہلے قرض ادا کیا جائے گا پھر وصیت 1/3 پر لاگو ہو گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہو گی۔ اولاد میں فرق نہیں ہے کہ اولاد بیٹا ہو یا بیٹی۔ اگر شوہر مر گیا اور اس کی بیوی موجود ہے تو جو شوہر چھوڑ گیا ہے، اگر تو اولاد نہیں تو وہ شوہر کی جائیداد سے 1/4 لے گی، اگر اولاد ہے تو پھر 1/8 لے گی چاہے وہ اولاد اسی سے ہو یا دوسری عورت سے ہو مرنے والے کی اولاد مراد ہے۔ قرض اور حق وصیت دینے کے بعد۔ اگر کوئی مرد مرتا ہے یا عورت

مرتی ہے تو اس کا ایک بھائی ہے یا بہن ہے تو اس میں ہر ایک کا 1/6 ہے۔ ''کلالہ'' مصدر ہے جو میت کو بھی شامل ہے اور میت کے ورثاء کو بھی۔ کلالہ کا عنوان اولاد اور ماں باپ کے علاوہ باقی ورثاء کے لیے ہے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کے بارے پوچھا کہ جو شخص مر جائے اور اس کی اولاد بھی نہ ہو والدین بھی نہ ہوں تو ہر صورت میں بہن یا بھائی تو ان کا حصہ 1/6 ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ وراثت کے 1/3 میں شریک ہیں حق وصیت اور قرض دینے کے بعد۔ وصیت ایسی ہو جو ورثاء کو نقصان دینے والی نہ ہو یعنی کل مال سے 1/3 سے زائد نہ ہو اور وہ سبب نہ بنے کہ ورثاء وراثت سے محروم ہو جائیں۔ یہ ایسا حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے جاری کیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور ان کی مصلحتوں کو بھی جانتا ہے اور اسی حوالے سے حکم جاری کرتا ہے اور تمہارے جو نفسانی خیالات ہیں اللہ ان سے آگاہ ہے اور بردبار ہے یعنی اللہ تمہیں تمہارے برے اعمال کی سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾

''یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے (اللہ) اسے بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہی بڑی کامیابی ہے''۔

اللہ کی حدود کا لحاظ رکھنا

"حد" رکاوٹ کو کہتے ہیں، دو چیزوں کے درمیان جو فاصلہ آ جائے۔ اللہ کی حدود یعنی اللہ نے وراثت کے جو احکام بتائے ہیں اور جو فرائض متعین کئے ہیں ان کے مطابق عمل کیا جائے۔ حد سے مراد اللہ کے جو احکام وراثت کے بارے میں ہیں وہ مراد ہیں۔ اللہ نے جو فرائض اور سہام معین کئے ہیں اسی کے مطابق وراثت تقسیم ہونی چاہیے اس میں تبدیلی نہ کی جائے "فوض" کامیابی، ہدف تک پہنچ جانا۔ تو جب اللہ کے احکام کی اطاعت کی جائے گی اور اللہ کی حدود کی پابندی کی جائے گی تو یہی وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جو عمل کریں گے اور پیروی کریں گے تو ان کو کامیابی کی نوید سنائی گئی ہے وہ جنت میں ہوں گے اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

"اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے نکل جائے (اللہ) اسے آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت کا عذاب ہے"۔

اللہ کی حدود کی مخالفت کا انجام

اللہ تعالیٰ کی جو حدود ہیں وہ معاشرے کے امور کو منظّم کرنے کے لیے اور ان کی بہتری کے لیے ہیں، جو ان حدود کو توڑتا ہے تو گویا معاشرہ کے نظام اور سسٹم کو درہم برہم کرتا ہے۔ اور یہ معاشرہ کے افراد کی دنیاوی سعادت کے لیے ہے لہٰذا ان کی مخالفت سے انکے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ جو بھی ایسا کرتا ہے تو اس کے لیے سخت سزا ہے اور وہ دوزخ کا

عذاب ہے جو ایسا عذاب ہے کہ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ وہ ہے کہ جو اللہ کے فرائض کو اپنے لیے مشکل جانے اور ان پر عمل نہ کرے اور سمجھے کہ ان پر عمل کرنا میرے اوپر بوجھ ہے۔ جبکہ یہ تو اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے آسانی ہے۔ اللہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جس میں لوگوں کے لیے مشکل ہو۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

”اور تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی بدکاری کرے ان پر اپنوں میں سے چار مرد گواہ لاؤ، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے“۔

زانیہ عورتوں کی سزا کا قانون

”فَاحِشَة“ بہت ہی گھٹیا اور برا عمل ہے۔ عام طور پر یہ لفظ زنا کے لیے استعمال ہوتا ہے یا لواط کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لواط مرد، مرد کے ساتھ ہم جنسی کرے یا عورت عورت سے مساحقہ کرے، اسے بھی فاحشہ کہا گیا ہے۔ اگر چار مرد گواہ ہوں، اور اس کو گواہی پر مجبور نہ کیا ہو تو یہ گواہی زنا کے متحقق ہونے پر دلیل ہوگی۔ اس میں یہ سمجھا یا گیا ہے کہ یہ حکم ہمیشہ کے لیے نہیں ہے بلکہ بہت جلد یہ حکم نسخ ہو جائے گا اور اس آیت کا حکم سورہ نور کی آیت 2 سے نسخ ہو گیا، وہاں زنا کا حکم مشخص کر دیا گیا یہاں پر جو قید کرنے والی بات ہے وہ نسخ ہو گئی۔ سورہ نور میں زنا کی سزا کا حکم آنے سے پہلے یہی حکم رائج تھا کہ زانیہ عورت کو قید و حبس میں رکھا جاتا تھا۔

وَ الَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

''اور تم میں سے جو دو اشخاص بدکاری کریں، تو ان کو تکلیف دو پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں چھوڑ دو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے''۔

بدکاری کرنے والے مَردوں کا حکم

یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ کیونکہ پچھلی آیت میں فقط عورتوں کا حکم بیان ہوا تھا اس آیت میں زناکار کا حکم بھی آیا ہے اور آیت میں مرد اور عورت دونوں کے لیے شکنجہ دینے کا حکم ہے، اگر حقیقی توبہ کرلیں اور اپنے رویہ کی درستگی کرلیں تو یہ سزا ان سے اٹھ جائے گی توبہ زبان سے نہیں ہوتی بلکہ سچی توبہ یہ ہے کہ جو گناہ کیا ہے اس پر ندامت اور آئندہ کردار کی درستگی، تو اس صورت میں اُن کی سزا اُٹھ جائے گی البتہ عورت کو قید میں رکھنا باقی رہے گا البتہ سورہ نور اُتری تو یہ حکم بدل گیا۔ اس آیت میں مرد بدکاری کرنے والے کو شکنجہ دینے کی بات کی گئی ہے۔ جبکہ عورت کو حبس میں رکھنے کی بات اس سے پہلے والی آیت میں ہے لہٰذا عورت کی وہ سزا باقی رہے گی جو بعد میں سورہ نور میں بیان شدہ سزا سے بدل گئی۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓىِٕكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷﴾

''اللہ پر توبہ قبول کرنے کا حق انہیں لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے برا کام کرتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں ان لوگوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا ہے''۔

توبہ کی قبولیت بارے

''توبہ'' بندے کا پلٹ جانا پشیمانی کے ساتھ جو اس سے ہوا ہے اور خدا کی طرف رجوع کرنا کہ اس سے جو غلطی ہوئی ہے اللہ اسے معاف کر دے تو بندے کو توبہ کی توفیق دینا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ دو توبہ ہیں، ایک خدا کی جانب سے اس کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کو توبہ کی توفیق ملے، کیونکہ توبہ بندے کی طرف سے حسنہ ہے حسنہ اور نیکی محتاج ہے ایک طاقت اور قوت کی اور خدا ہی ہے جو اسے حسنہ اور اچھائی کی طاقت دیتا ہے اور اس عمل کی توفیق دیتا ہے اس کے لیے اسباب مہیا کرتا ہے اور بندہ توبہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور لہٰذا اس سے جو گناہ ہوا ہے اور وہ اس گناہ کے گڑھے میں چلا گیا تھا وہاں سے نکلتا ہے اور اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آتا ہے جب یہ موفقیت بندے کو حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ محتاج ہوتا ہے کہ خدا کی جانب سے ایک اور رجوع کا، کہ اللہ اپنی رحمت کے وسیلے سے اپنے لطف اور مغفرت سے اس کے دل کو گناہ کی گندگی سے پاک کر دے اور اس کی توبہ کو قبول کر لے۔

سورہ توبہ، آیت 18 : پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف رجوع کر لیا تاکہ وہ توبہ کریں۔

جو فرمایا ''عَلَی اللہِ'' خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وعدہ دیا ہے کہ ان کی توبہ کو قبول کرے گا۔ تو اس حوالے سے چند نکات کی جانب توجہ ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوئے ہوں، حق کے ساتھ سرکشی مد نظر نہ ہو اور اس کے بعد اسے جو موقع ملا ہے توبہ کا تو وہ اس میں دیر نہ کرے فوراً توبہ کر لے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے حال سے آگاہ ہے ان کی کمزوری سے آگاہ

ہے، جہالت سے آگاہ ہے۔ توبہ کا دروازہ ان کے لیے کھلا رکھا ہے اللہ حکیم ہے اور دانا ہے اور اللہ کا ہر کام حکمت کے تحت ہوتا ہے اور اپنے بندگان کے امور کی اصلاح اور نظام کی پختگی کے لیے جو ضروری ہے وہ اس سے آگاہی رکھتا ہے خدا اپنے علم اور حکمت کی وجہ سے جو ظواہر ہوتے ہیں اس سے دھوکہ نہیں کھاتا بلکہ اللہ اپنے بندگان کے دلوں کے باطن سے بھی آگاہ ہے اور اس کی روشنی میں بندگان کا محاسبہ اور احتساب کرتا ہے لہٰذا بندگان کو چاہیے کہ وہ ظاہری توبہ سے پرہیز کریں بلکہ حقیقی توبہ کریں اور اللہ کے حضور گناہ کو ہمیشہ کے لیے ترک کرنے کا ارادہ کریں اور جو گناہ کر چکے ہیں اس سے واپسی کا ارادہ کریں کہ پھر گناہ نہیں کریں گے۔ توبہ خالی زبان سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے پختہ ارادہ ہوتا ہے کہ وہ پھر گناہ نہیں کرے گا، اللہ دل کے حالات سے آگاہ ہے کہ اس نے کس نیت سے توبہ کی ہے۔

وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

"اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو برے کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس وقت کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور اسی طرح ان لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہے جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے"۔

گناہ نہ چھوڑنے والوں کی توبہ

یہاں پر "السَّیِّئَاتِ" کا کلمہ جمع لایا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے تمام گناہوں کا شمار رکھتا ہے۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ جو برائی پر برائی کرتے ہیں اور جب موت کا

وقت آتا ہے تو اس وقت تک گناہ کئے جا رہے ہوتے ہیں، ان کی سستی اور توبہ کو حقیر سمجھنا اور توبہ نہ کرنا، اور جب موت کے آثار نظر آئیں تو کہیں کہ میں نے توبہ کر لی تو اللہ فرماتا ہے کہ ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں۔ ہر روز کہنا کہ کل توبہ کرلوں گا پرسوں توبہ کرلوں گا اور زبان سے توبہ کرتے ہیں اور چاہ رہے ہیں کہ ان کے برے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ اس سے بچ جائیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لفظ سے توبہ نہیں ہوتی، دل سے توبہ چاہیے۔ دل سے توبہ قبول ہے اور جو ہمیشہ کافر رہے ہیں، کفر کی حالت میں گئے ہیں تو اُن کی بھی توبہ نہیں ہوتی اور ایسا شخص جو مومن ہے تو اُس کے مرنے کے بعد بھی اس کے لیے ایک موقع ہے کہ اللہ کی طرف سے توبہ اور واپسی، مغفرت اور رحمت کا امکان اس طرح ہے کہ مرنے کے بعد شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کے شامل حال ہو لیکن جو کافر ہیں اُن کے لیے یہ چیز موجود نہیں ہے۔

روایت ہے کہ شیطان نے جب آدم علیہ السلام کے جسد پر سجدہ نہ کیا اور جب ابھی وہ خالی جسد تھا روح اس میں نہیں ڈالی گئی تھی تو اس نے کہا تیری عزت کی قسم کہ جب تک اس کے بدن میں روح ہے میں اس سے خارج نہیں ہوں گا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے فرمایا میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں جب تک روح اس کے جسم میں ہے میں اس کی توبہ کے درمیان حائل نہیں ہوں گا لیکن جن کو توبہ کی توفیق نہیں ملتی تو اللہ تعالیٰ نے ''اُولٰٓئِكَ'' کے ذریعہ اشارہ کیا ہے کہ وہ اللہ کے قرب سے دُور رہیں گے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ کافروں کے لیے عذاب ہے اور جو توبہ کی فرصت ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں ان کے لیے عذاب ہے یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ نافرمانوں کے لیے جہنم ہے اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ

بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾

''اے ایمان والو! تمہیں یہ حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کو میراث میں لے لو، اور نہ ان کو اس واسطے روکے رکھو کہ ان سے کچھ اپنا دیا ہوا مال واپس لے سکو مگر (تب لے سکتے ہو) اگر وہ کسی صریح بدچلنی کا ارتکاب کریں، اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح سے زندگی بسر کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تمہیں ایک چیز پسند نہ آئے مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھی ہو''۔

عورتوں کے حقوق

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایسا رویہ تھا کہ عورتیں اپنے شوہر کے مرنے کے بعد وراثت میں تقسیم ہوتی تھیں۔ جو مہر ان کے لیے ہے وہ ان کو نہیں دیتے تھے۔اس جگہ فرمایا ''لاتعضلوھن'' ان کو روکے رکھنا، اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ ان کو ازدواج سے محروم رکھنا اور گھر میں پابند کر دینا اس طرح ان کے اموال کو وراثت میں لے لینا ٹھیک نہیں۔

شادی کرنا ان عورتوں کا حق ہے، جس کا شوہر مر گیا ہے تو وہ دوسرا شوہر بھی کر سکتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں پر سختی مت کرو اور انہیں زبردستی اس بات پر آمادہ نہ کرو کہ وہ اپنا مہر جو انہیں دیا گیا ہے وہ آپ کو واپس کر دیں۔ روزگار کی تنگی کی وجہ سے وہ ایسا کریں مگر یہ کہ عورت برا کام کرے، زنا کرے تو اس صورت میں شوہر اس پر سختی کر سکتا ہے اور اس سے پیسے لے کر اسے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اچھا رویہ اپناؤ، ان

کے ساتھ حسن معاشرت کرو اگر وہ تمہیں پسند نہیں ہیں تو تمہیں پتہ ہونا چاہیے جو چیز تمہیں اچھی نہیں لگ رہی اللہ نے اس میں تمہارے لیے خیر کثیر رکھا ہے۔

معروف ہر وہ کام جس کو معاشرے والے پہچانتے ہیں اور اسلامی معاشرے میں حتمی طور پر اسے خیر سمجھا جاتا ہے۔ معاشرے میں متعارف یہ ہے کہ ایک آدمی کا پوری سوسائٹی کو بنانے اور سنوارنے میں کردار ہے۔ ہر شخص اپنی وسعت کے مطابق کام کرتا ہے اور معاشرہ جس چیز کا محتاج ہوتا ہے وہ اس کو پورا کرتا ہے اور دوسروں کے ساتھ تعاون کر رہا ہوتا ہے اور دوسروں کے کام کا نتیجہ اس کو بھی پہنچتا ہے اور اس کے کام کا نتیجہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔ سوسائٹی کے سارے افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ایک دوسرے کی خدمات وہ دوسروں کے لیے مفید ہوتی ہیں۔

عورت اور مرد دونوں انسانی معاشرے کا حصہ ہیں دونوں معاشرے کی ضرورت ہے ، دونوں کا اثر ہے اور دونوں کی قدر برابر ہے ، اگرچہ طبیعی اور اجتماعی حوالے سے تھوڑا فرق ہے طاقت اور کمزوری، علم اور جہل، سمجھداری اور نا سمجھی، ریاست اور موروثیت، پستی اور بلندی۔ یہ فرق عورت اور مرد کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ معاشرے کے اندر چاہے مرد ہو یا عورت ہو اس میں ایسا سلسلہ جاری ہے۔ لہٰذا وہ حکم جو ایک صحیح سوسائٹی اور معاشرے کے فطری تقاضے سے ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص ایک لحاظ سے کہ وہ مستقل ہے لہٰذا وہ دوسروں پر ظلم نہ کرے اور حد اور حدود میں رہے ، دوسروں کے حقوق کی معرفت رکھے اور اس کا جو حق ہے وہ اس کو ملے۔ اس کو کہتے ہیں حُسن معاشرت۔ اگر تم اپنی ان عورتوں کو ناپسند کرتے ہو تب بھی ان کے ساتھ حُسن معاشرت رکھو۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے اور معلوم ہے کہ شک اور احتمال کی صورت میں اس کا اظہار کیا ہے ، تعصب اور غضب حاوی نہیں ہونا چاہیے اور اس سے روکا گیا ہے۔

تفاسیر میں آیا ہے کہ جب زمانہ جاہلیت میں ایک مرد مر جاتا تھا اور اس کی بیوی موجود ہوتی تھی تو جو بھی آکر اس عورت کے سر پر کپڑا رکھ دیتا تو بغیر مہر دینے کے وہ اسے اپنی زوجہ بنا سکتا تھا گویا کہ اسے اپنی وراثت میں لے لیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ابو قیس بن سلت مر گیا، محسن جو ابو قیس کا بیٹا تھا اس نے اپنی چادر اپنے بابا کی بیوی کے سر پر رکھی اور وہ کبیسہ معصر بن معبد کی بیٹی تھی تو اس نے اسے وراثت کے تحت اپنے نکاح میں لے لیا پھر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا نا اس سے مقاربت کی نہ اس کا خرچہ دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ عورت پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی اور آکر شکایت کی کہ میرا شوہر مر گیا ہے اور میرے شوہر کے بیٹے نے مجھے اپنی بیوی بنایا۔ اب وہ نہ مجھ سے مقاربت کرتا ہے اور نا ہی نفقہ دیتا ہے نہ آزادی دیتا ہے تاکہ میں اور شوہر کرلوں یا اپنے خاندان کے ساتھ ملحق ہو جاؤں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا تم اپنے گھر واپس جاؤ۔ جیسے ہی اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو وہ حکم تمہیں بتا دُوں گا۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! یہ عورتیں تمہارے پاس امانت ہیں اور اللہ کی امانت کو لے لو اور اللہ کے نام سے اپنے لیے حلال کرو اور اس کا جو حق ہے وہ اسے دو تاکہ وہ تمہارے غیر کے قریب نہ جائے اور تمہارے اچھے اعمال کی نافرمانی نہ کرے۔ اگر ایسا کروگے تو تمہاری روزی اور تمہارے لیے مناسب لباس اور ان کی روزی ان کا لباس، کپڑے اور ان کی غذا تم مہیا کرو اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، ان سے برا سلوک نہ کرو۔ تو اس مناسبت سے یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں یہ نئی ہدایت مسلمانوں کو دی گئی۔ عورتوں کے حقوق اور ان سے حُسنِ معاشرت کا حکم دیا گیا اور یہ کہ ان کو اپنی وراثت میں مت لو۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۲۰﴾

"اور اگر تم ایک عورت کو دوسری عورت سے بدلنا چاہو، اور ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اس پر بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے اس سے وہ مال واپس لوگے"۔

شوہر کا بیوی سے نباہ نہ ہونا

اس آیت میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اگر ایک شخص کی اپنی بیوی سے اس کی نہیں بنتی اور وہ اس بیوی کو چھوڑنا چاہتا ہے تو اس نے جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے واپس نہیں لے سکتا چاہے وہ مہر بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عمل بہتان کا ہے ایسی بات اور ایسا عمل جس سے دیکھنے والا اور سننے والا حیران و پریشان ہو جائے اور زیادہ تر لفظِ بہتان جھوٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس جگہ مقصد یہ ہے کہ ایسا عمل جو بے جا ہے اور زیادتی ہے اور گناہ بھی ہے۔ تو اس کے لیے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مہر دیتے ہو تو اس مہر کو واپس نہیں لے سکتے چاہے وہ زیادہ کیوں نہ ہو۔ جو چیز بیوی کو دے دی تو وہ اس کی ملکیت ہے، اس سے اگر واپس لوگے تو یہ ظلم ہوگا اور یہ قبیح اور برا عمل ہے اس سے روکا گیا ہے۔ یہ احکام ہیں خدا کی جانب سے اور ان کی پابندی ہر مسلمان پر فرض کی گئی ہے۔

وَ كَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ﴿۲۱﴾

''تم اسے کیونکر لے سکتے ہو جب کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکا ہے اور وہ عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں''۔

حق مہر کی واپسی بارے حکم

یہاں پر جو سوال اٹھایا گیا ہے یہ دوسروں کی حیرت اور تعجب کو ابھارنے کے مقصد سے ہے کہ کس طرح تمہارا تو تعلق تھا اپنی بیویوں کے ساتھ اور تم دو ایک کے حکم تھے اب تم کیسے اپنی بیوی پر ظلم کرتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ مہر اس سے واپس لے لو۔ یہ تو گویا کہ تم اپنے اوپر ظلم کر رہے ہو کیونکہ تم اور تمہاری بیوی ایک جان تھے دو جسموں میں، پس کس طرح تم اس بات پر راضی ہوتے ہو کہ اس کا حق تم اس سے لے لو تمہارا تو معاہدہ تھا۔ ''غلیظ'' سے مراد وہ تعلق اور ارتباط ہے جو ازدواج کے عقد کے ذریعے عورت اور مرد کے درمیان قائم ہوتا ہے اور اُس عہد اور معاہدے کے لوازم میں سے مہر کا مسئلہ ہے کہ عقد کے دوران جب نکاح پڑھا جا رہا ہوتا ہے تو مہر معین ہوتا ہے اور عورت شوہر سے مہر کی طلبگار ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ میثاق سے مراد حلیت کا حکم ہے، حلال ہونے کا۔ یا معروف اور متعارف طریقے سے اپنے پاس رکھنے کا یا نیکی اور احسان کے ساتھ اسے آزاد کرنے کا۔ لیکن یہ جو آخری بات ہے ظاہری عبارت سے مناسبت نہیں رکھتی۔ نکاح میں جو معاہدہ مرد اور عورت کے درمیان ہوا جس میں عورت کے لیے مہر رکھا گیا تھا، اس کی پابندی کرنا ہوگی۔

وَ لَا تَنۡکِحُوۡا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّ مَقۡتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۲۲﴾

''ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر جو پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے)، بے شک یہ بے حیائی ہے اور غضب کا کام ہے، اور برا چلن ہے''۔

باپ کی منکوحہ سے شادی کا حکم

زمانہ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ جب باپ مر جاتا تھا تو لڑکا اپنے باپ کی بیوی سے جو بیوہ ہو چکی ہوتی تھی اس سے شادی کر لیتا تھا یا اگر باپ اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو اس کا بیٹا اس کی طلاق شدہ بیوی سے شادی کر لیتا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے واضح کر دیا کہ یہ برا اور ناپسندیدہ عمل ہے اور یہ عمل غضب الٰہی کا سبب ہے، ایسا ہر گز نہ کرو۔

حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ وَ بَنٰتُکُمۡ وَ اَخَوٰتُکُمۡ وَ عَمّٰتُکُمۡ وَ خٰلٰتُکُمۡ وَ بَنٰتُ الۡاَخِ وَ بَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَ اُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَکُمۡ وَ اَخَوٰتُکُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِکُمۡ وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ ۙ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۲۳﴾

''تم پر حرام ہیں تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور جن ماؤں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں اور تمہاری عورتوں کی بیٹیاں جنہوں نے

تمہاری گود میں پرورش پائی ہے (ایسی عورتیں) جن کے ساتھ تم نے جنسی تعلق قائم کیا ہو، اور اگر جنسی تعلق قائم نہ ہوا ہو تو پھر (ان کی بیٹیوں کے ساتھ) نکاح میں کچھ گناہ نہیں، اور تمہارے سگے بیٹوں کی عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں)، اور دو بہنوں کو اکٹھا کرنا (ایک نکاح میں حرام ہے) مگر جو پہلے ہو چکا، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

حرام رشتے

اس آیت میں بیان شدہ حکم اگرچہ بظاہر مردوں کے لیے بیان کیا گیا ہے لیکن یہ عورتوں کو بھی شامل ہے کیونکہ خواستگاری مردوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ حرام رشتے سات ہیں؛ مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں۔ ماؤں کے حوالے سے جتنا نسب اوپر چلا جائے ان سے ازدواج حرام ہے اور بیٹیوں کے حوالے سے نسب جتنا نیچے چلا جائے۔ نسبی محرمات کے علاوہ سببی و رضاعی عنوان سے بھی حرام رشتے ہیں اور وہ چھ ہیں:۔

1۔ ایسی عورتیں جن کا تم نے دودھ پیا ہے۔

2۔ جس ماں کا دودھ پیا ہے اس کے ساتھ جو لڑکیاں دودھ پینے والی تھیں، رضاعی بہنیں۔

3۔ تمہاری بیویوں کی ماں، چاہے اس عورت سے نزدیکی کی ہو یا نہ کی ہو۔ خالی آپ کے نکاح میں آ گئی تو اس کی ماں سے تم نکاح نہیں کر سکتے۔

4۔ ربیبہ، یعنی وہ لڑکی جس کی ماں سے تم نے مقاربت کی ہے اور وہ تمہارے گھر میں بڑی ہوئی ہے، تو اس سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔

5۔ صلبی بیٹے کی بیوی۔

6۔ بیوی کی بہن یعنی سالی۔ شرط یہ ہے کہ دونوں بہنوں کو ایک وقت میں رکھو۔ لیکن اگر ایک کو طلاق ہو جائے تو پھر اس کی دوسری بہن سے شادی کر سکتے ہو۔

7۔ باپ کی بیوی جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

یہ حکم اس لحاظ سے نہیں کہ گذشتہ اعمال سے متعلق اور مربوط ہو جو شریعت کے قانون سے پہلے کے ہیں انکو شامل نہیں بلکہ یہ اس کے شرعی آثار کے اعتبار سے ہے کہ ابھی وہ باقی ہیں۔ یہ استثناء متصل ہے منقطع نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ اس استثناء کو ہم جو اوپر فقرے اور جو جملے آیت میں بیان ہوئے ہیں اس کی طرف پلٹائیں اور اسے عورت کی بہنوں کے ساتھ نکاح کرنے کے حوالے سے خاص نہ کریں۔ پس اسلام چاہتا ہے کہ اسلام سے پہلے جو اس قسم کی شادیاں ہوئی ہیں اُن سے جو بچے پیدا ہوئے ہیں اُن کی طہارت کا حکم لگا دیں لیکن پہلا پوائنٹ ٹھیک ہے کہ یہ استثناء فقط عورت کی بہن کے ساتھ ازدواج سے متعلق ہے اور آخری جملہ استثناء کے حوالے سے آیت میں وجہ بیان کی ہے کہ یہ ایسے موارد سے ہے کہ جس میں اُن گزرے ہوئے اعمال کی مغفرت کا کہا گیا ہے نا کہ خود عمل غلط تھا لیکن شریعت کے اس قانون کے آنے سے پہلے ہو چکا ہے لہٰذا اُس گناہ کو معاف کر دیا گیا ہے۔

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

''اور خاوند والی عورتیں (بھی حرام ہیں) مگر جن (لونڈیوں) کے تم مالک بن جاؤ، یہ اللہ کا قانون تم پر لازم ہے، اور ان کے سوا تم پر سب عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ انہیں اپنے مال کے بدلے میں طلب کرو لیکن نکاح کرنے کے لیے نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لیے، پھر ان عورتوں میں سے جسے تم کام میں لائے ہو تو ان کے لیے جو حق مقرر ہوئے ہیں وہ انہیں دے دو، البتہ ایسے سمجھوتے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو مہر کے مقرر ہو جانے کے بعد آپس کی باہمی رضامندی سے ہو جائے، بے شک اللہ خبر دار حکمت والا ہے''۔

شوہر دار عورتوں سے شادی کا حکم

اس آیت میں حرمت والی بات مزید بیان کی جارہی ہے کہ ایسی عورتیں جو شوہر دار ہیں اُن سے شادی کرنا حرام ہے سوائے وہ جو تمہاری کنیزی میں آئی ہیں پہلے اُن کے شوہر تھے تو استبراء کے بعد یعنی ایک مدت گزر جائے تو پھر تم ان کو اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور جو 16 گروہ بتائے گئے ہیں جن کے ساتھ نکاح حرام ہے لیکن ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں ان سے نکاح حلال ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں سے

استفادہ اور ہمبستری تین طریقوں سے معمول تھا 1۔نکاح تھا، 2۔کنیز کی خریداری تھی، 3۔زنا تھا۔

اس جگہ تاکید کی ہے کہ ہم نے جو آپ کو بیان کر دیا ان کے علاوہ مال سے تم ان عورتوں کو اپنے لیے لے سکتے ہو البتہ ایک اور حکم دے دیا کہ جو پہلے بات ہو رہی تھی اسی پر ہی اس کو مرتب کیا ہے اور جو مجموعاً حکم بیان ہوا ہے اس کی فرع اور اس کی ایک جزو یہ ہے جس کو بیان کیا ہے۔ پہلی بات تھی کہ بے عفتی، زنا نہ کیا ہو اس سے شادی کرو۔ دائمی ہو یا مؤقت۔ اس جملہ میں ازدواج مؤقت کا قانون بیان ہوا ہے اور یہ شریعت کے قانون سے پہلے عربوں میں عام رواج تھا، مرسوم تھا۔ ازدواج موقت میں اجرت دینا شرط ہے اور دوسرا یہ ہے کہ اس عورت سے استفادہ کیا جائے۔ یہ استفادہ معین مدت کے لیے ہو۔ لیکن عقد دائمی میں ایسا نہیں، عقد موقت میں اجرت دی جائے گی جب اس سے مقاربت کی جائے لیکن عقد دائمی میں ہے کہ جب عقد ہو جاتا ہے تو آدھا مہر شوہر پر دینا واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اسے دے دے، آدھا مہر اس وقت واجب ہوتا ہے جب وہ اس سے مقاربت کرے۔

لہٰذا یہ آیت نکاح موقت کے قانون کو بیان کر رہی ہے۔ اب جب مہر معین ہو گیا کم ہو یا زیادہ ہو تو تمہارے اوپر گناہ نہیں ہے۔ یہ اللہ کے احکام ہیں یہ قانون ہے شریعت کا، خدا کا قانون حکمت اور مصلحت کے تحت ہے اور اللہ کے علم کے تحت ہے۔ صحیح ترمذی سنن نسائی، سنن بیہقی اور کتاب امام الشافعی میں محمد بن عبداللہ سے یہ بات نقل ہوئی ہے کہ سعد بن ابی وقاص، ضحاک بن قیس اور معاویہ سب نے حج میں متعہ کیا ہے۔ ضحاک نے کہا کہ جاہل آدمی کے سوا ایسا عمل کوئی نہیں کرتا۔ میں نے کہا اے بھائی کیا کہہ رہے ہو؟ ضحاک نے کہا کہ عمر ابن خطاب نے اس کام سے روکا تھا۔ سعد نے کہا: اللہ کے رسول نے متعہ حج انجام دیا تھا اور ہم اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لیکن عمر ابن خطاب نے دو قسم کے متعہ کو حرام قرار دیا

ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حلال تھے اور اس کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے۔ ایک متعہ حج اور دوسرا عورتوں کے ساتھ متعہ۔[1]

وَ مَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ وَ اٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیۡہِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ ؕ وَ اَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾ؑ

"اور جو کوئی تم میں سے اس بات کی طاقت نہ رکھے کہ خاندانی مسلمان عورتیں نکاح میں لائے تو تمہاری ان لونڈیوں میں سے کسی سے نکاح کرلے جو تمہارے قبضے میں ہوں اور ایماندار بھی ہوں، اور اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے، تم آپس میں ایک ہو، اس لیے ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرلو اور دستور کے موافق ان کے مہر دے دو لیکن یہ کہ وہ نکاح میں آنے والیاں ہوں

[1] - وفی الصحاح عن عمر: متعتان کانتا محللتین فی زمن رسول اللہ و انا احرمهما و قال المامون من انت یا جعل۔ (مصحح)۔ خلیفہ دوم سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا: دو قسم کے متعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حلال تھے اور میں انہیں حرام قرار دے رہا ہوں۔

آزاد شہوت رانیاں کرنے والیاں نہ ہوں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں، پس جب وہ قید نکاح میں آجائیں تو پھر اگر بے حیائی کا کام کریں تو ان پر آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں پر مقرر کی گئی ہے، یہ سہولت اس کے لیے ہے جو کوئی تم میں سے تکلیف میں پڑنے سے ڈرے، اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

عورتوں سے نکاح کرنے کے احکام

یہاں ''محصنات'' سے آزاد عورتیں مراد ہیں، پاک دامن مراد نہیں ہیں کیونکہ محصنات جوان لڑکیوں کے مقابلے میں آیا ہے اور ''مما ملکت ایمانکم'' سے مراد دوسرے مومنوں کی کنیزیں ہیں اور مومنات کی قید اس لیے لگائی ہے کہ مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ غیر مومنہ سے ازدواج کرے اور نکاح سے مراد دائمی نکاح ہے اور اس میں ذمہ داری کی ادائیگی میں آسانی مد نظر ہے۔ ایمان کا تعلق کیونکہ دل سے ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ اللہ تمہارے ایمان سے زیادہ آگاہ ہے اور باطن کی بات اللہ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی ازدواج میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ تم اُن عورتوں کے ایمان کی حقیقت اور واقعیت کو جانو، ظاہری امر ہی کافی ہے۔ یہ کام فقط اللہ کا ہے، اللہ باطن سے واقف ہے۔ تم اس بات پر معمور ہو کہ جو ظاہری اسباب ہیں اس کے مطابق عمل کرو لہٰذا جس نے کلمہ شہادتین پڑھ دیا مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہو گیا عمومی دینی فرائض جو انجام دے رہے ہو تو یہی کافی ہے اس سے تمہاری ذمہ داری ادا ہو جاتی ہے۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ کنیزوں سے ازدواج کرنا پست اور گھٹیا عمل ہے یا شان کے خلاف ہے۔ اللہ اس جملے کے ذریعے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ کرامت اور عزت کا معیار آزاد ہونا یا غلام ہونا

یا کنیز ہونا نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ تم سب ایمان کے لحاظ سے ایک دوسرے کی طرح ہو چاہے کنیز ہو یا آزاد ہو۔

یہاں پر ایک اور حکم دیا ہے کہ کنیز کے مولا کی اجازت سے اس کی کنیز سے شادی کر سکتے ہو اور ان کا مہر اس کے مولا کو دیدو۔ مولا کی یہاں تعبیر اہل سے کی ہے تاکہ یہ سمجھایا جائے کہ یہ کنیز مولا کے گھرانے کا ایک حصہ ہے اور مومن ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ مہر کے بارے معروف کی قید لگائی ہے تاکہ کسی بھی لحاظ سے مہر کم نہ ہو یا آج کل دینے کے بہانے نہ بنائیں۔ بلکہ جو معروف طریقہ ہے اسکے مطابق انکا مہر بھی ادا کرو۔ البتہ کنیز کا مہر اس کے مالک کو دیا جائے۔

جس کی عادت ہو کہ وہ فحاشی کے لیے اپنا دوست دوسرے کو بنائے تو وہ پھر ایک دو پر اکتفاء نہیں کرتے وہ اسی طرح سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں اس لیے ایسی عورت سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پاکدامن کی شرط لگائی گئی ہے۔ دوسروں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ کنیزیں جو شوہر کرنے کے بعد بھی گناہ کرتی ہیں تو ان کے لیے سزا ہے، البتہ تازیانہ یعنی کوڑے کی سزا ہوگی کہ وہ آدھے ہو سکتے ہیں سنگسار مراد نہیں۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے یہاں کلمہ محصنات سے مراد آزاد عورتیں ہیں نا کہ شوہر دار عورتیں کیونکہ شوہر دار عورتوں کے زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ آیت 24 کے صدر میں یہ ہی مراد تھا، آیت کا معنی یہ ہے کہ کنیز جو شوہر دار ہے اس کی جو شرعی حد ہے وہ بغیر شوہر کے جو آزاد عورتیں ہیں اُن کی جو شرعی حد ہے وہ اس کا آدھا ہے یعنی سو کی بجائے پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔

اس جگہ ایک ہدایت کی گئی ہے کہ وہ افراد جن کو یہ خوف ہے کہ اگر وہ کنیز کے ساتھ شادی نہیں کریں گے تو وہ زنا میں جا پڑیں گے تو یہ اُن کے لیے حکم ہے کہ وہ کنیز سے شادی کریں لیکن اگر صبر کریں تو بہتر ہے، خدا معاف کرنے والا ہے۔ ''اَلْعَنَتَ'' کا معنی تکلیف، کوشش، مشقت، ہلاکت۔ یہاں پر زنا مراد ہے یعنی اگر زنا کا ڈر ہو تو اگر تم صبر کرو تو بہتر ہے۔

اس جگہ دو احتمال ہیں، اگر کنیز کے ساتھ ازدواج اور زنا، دونوں پر صبر کرو یعنی زنا بھی نہ کرو اور کنیزوں کے ساتھ ازدواج بھی نہ کرو تو اس سے تقویٰ کا ملکہ تمہارے اندر پیدا ہوگا اور تمہارے اندر پاکیزگی آئے گی یہ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ جو کنیز کا مولا ہے وہ جب چاہے تو استبراء کے بعد اس کا حق شوہر ہونے کا موجود ہے۔ لہٰذا اگر اولاد ہو گئی تو وہ اس کی اولاد میں مولا شریک ہوگا۔ زنا پر صبر کا مطلب یہ ہے کہ زنا نہ کرو، برداشت کرو اور کنیزوں کے ساتھ نکاح کرنا تو وہ بھی نہ کرو۔ اس کی وجہ واضح ہے، اللہ داناتر ہے کیونکہ ایسی کنیز جو کسی کی ملکیت ہے اس سے جب تم شادی کر رہے ہو تو اس کا مولا بھی تو حق رکھتا ہے کہ اس سے ہمبستری کرے۔ تو اللہ داناتر ہے، تم سے بہتر جانتا ہے اللہ بخشنے والا بھی ہے۔ وہ زنا کے برے اثرات محو کر دیتا ہے اور جو متقین ہیں اُن کے لیے مغفرت اور رحمت دیتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

"اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (قوانین) بیان کرے اور تمہیں پہلوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

توبہ کی حقیقت

دین کے جو احکام ہیں ان میں تمہارے لیے دُنیا و آخرت کی بہتری ہے جسے اللہ تمہارے لیے بیان کرتا ہے تمہاری راہنمائی کرتا ہے اور تمہیں ماضی کے لوگوں کی زندگی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ انبیاءؑ اور ان کی جو نیک اُمتیں تھیں وہ کس طرح زندگی گزارتے تھے کہ اللہ کی رضا میں اُنہوں نے کیسے وقت گزارا، وہ کچھ تمہیں بیان کرتا ہے تاکہ اس کے نتیجے میں دُنیا و آخرت کی سعادت تم بھی حاصل کر سکو۔ خداوند تبارک و تعالیٰ چاہتا ہے کہ اُن کی روش

کو اجمالی طور پر تمہیں بتا دے کہ وہ صحیح تھیں یا نہیں تھیں اور بتانے کے بعد پھر جو یہ کہا گیا ''وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ'' کہ اللہ تمہاری طرف پلٹتا ہے یعنی تمہیں نعمت اور رحمت دیتا ہے اور قانون دیتا ہے تمہارے لیے حقیقت کو بیان کرتا ہے، تمہیں ہدایت دیتا ہے کہ تم صحیح راستے پر رہو یہ سب اللہ کا تمہاری طرف رجوع کرنا ہے۔ جس طرح بندے کی توبہ قبول کرنا اور اس کے گناہ کے جو اثرات ہیں ان کو ختم کرنا تو یہ اللہ کی طرف رجوع ہے یہ اس کو بھی شامل ہے۔ خداوند علیم ہے، جاننے والا ہے، دانا ہے۔ یہ سارے فقرات اسی آیت سے مربوط ہیں نہ فقط اس کا آخری حصہ بلکہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

''اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت سے متوجہ ہو اور جو لوگ اپنی لذات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے بہت دور ہٹ جاؤ''۔

شہوات میں گھرے لوگ

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ دین کے احکام اور قانون کو جو بیان کرتا ہے ،اللہ کی قانون سازی اور شریعت کا بیان یہ تمہاری طرف اللہ کا پلٹنا ہے کہ اس کی تمہارے اوپر مہربانی ہے۔ جو شہوت پرست ہیں وہ تو اللہ کی حدود کو پامال کرتے ہیں، اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ساری سرحدات کو توڑتے ہیں جو اللہ نے قرار دی ہیں اور محارم جن کے ساتھ نکاح حرام ہے ان سے نکاح کرتے ہیں تاکہ جو صحیح نسبتیں ہیں وہ ختم ہو جائیں اور معاشرہ میں زنا جاری رہے ازدواج اور نکاح کی سنت اور طریقہ ختم ہو جائے۔ تو یہ میل عظیم ہے ،بڑی لغزش ہے، بڑا گناہ ہے۔ اللہ اس سے روکتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸

''اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کر دے، اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے''۔

انسان کے لیے آسانی

انسان میں شہوانی قوتیں موجود ہیں جو اسے محرمات کی طرف مائل کرتی ہیں، انسان خود کمزور ہے خداوند تبارک و تعالیٰ اس کی کمزوری کو جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان کیا ہے اور اس کے لیے شہوتوں کو حلال طریقے سے استعمال کرنے کا راستہ دکھایا ہے، دائمی نکاح، کنیز اور نکاح مؤقت، تاکہ اس طرح اس کے اندر جو جنسی خواہش ہے وہ پوری ہوسکے اور خاص کر ازدواج مؤقت کی اجازت دے کر اسلام نے اس مسئلے کو آسان کیا ہے کہ نکاح دائمی کی وجہ سے جو مشقت ہے کہ اس میں مہر بھی ہے نفقہ بھی ہے وراثت بھی ہے وغیرہ وغیرہ، اس سے بچایا ہے۔ یہ ایک حتمی طور پر انسان کے لیے تخفیف و آسانی ہے اللہ کی جانب سے کہ اللہ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اور اللہ اپنے بندگان پر سختی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ مگر یہ کہ آپس کی رضامندی سے تجارت ہو، اور آپس میں کسی کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر مہربان ہے''۔

ایک دوسرے کے جان و مال کا احترام

یہاں پر اموال کے حوالے سے بات ہو رہی ہے کہ ایک دوسرے کے مال کا احترام کرو، دوسرے کے مال پر اپنا اختیار نہ بنالو اور دوسرے کے مال کا خود مالک بن جانا۔ لوگوں کے درمیان دوسروں کے اموال کو غلط طریقے سے حاصل کرنا تو اس سے منع کیا ہے۔ جتنے بھی غلط قسم کے سودے ہیں کاروبار ہیں جیسے سود خوری ہے، جواء ہے، دھوکہ ہے، ملاوٹ ہے تو یہ جائز نہیں کیونکہ اس سے معاشرہ اور سوسائٹی کی تمام بنیادیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گی۔ تجارت ایسا سرمایہ ہوتا ہے جس میں تصرف منفعت کی غرض سے کیا جاتا ہے لہٰذا حکم دیا ہے کہ باہمی رضایت سے آپس میں تجارت کرو۔ خریدار اور بیچنے والا دو طرف ہوتے ہیں انکے درمیان جو معاملہ طے ہوتا ہے وہ فطرت کے مطابق ہے اور اس سے دل کو سکون ملتا ہے، اس کی اجازت ہے۔ اس طرح کسی کا مال ناجائز طور پر تصرف میں نہ آئے گا۔ اسلام میں مال کا احترام ہے کوئی بھی دوسرے کے مال کو صاحبِ مال کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتا۔

مال کی حرمت کے بعد جان کی حرمت بارے بیان

ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ناجائز طریقے سے مال کھانا، اپنے آپ کو قتل میں ڈالنے کے برابر ہے، سارے مومنین ایک فرد کی مانند ہیں۔ ایک حصے کو نقصان پہنچانا گویا کہ سارے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے اور یہ نہیں قتل نفس، خودکشی اور دوسرے کو قتل کرنے کو شامل ہے کیونکہ خداوند تبارک و تعالیٰ تمہارے اوپر مہربان ہے لہٰذا تمہیں اس کام سے منع کرتا ہے جو تمہارے نقصان میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تمہارے اوپر مہربانی ہے، رحمت ہے، خودکشی بھی نہ کرو اور دوسرے کو قتل بھی نہ کرو۔ اللہ نے یہ حکم اس لیے دیا ہے کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالے۔ مال اور جان دونوں محترم ہیں۔ دوسروں کا ناجائز

طریقہ سے مال کھانا بھی منع ہے اور دوسرے کو قتل کرنا بھی منع ہے اس جگہ خود کشی کرنا بھی شامل ہے کہ وہ بھی ناجائز ہے۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

''اور جو شخص تعدّی اور ظلم سے یہ کام کرے گا تو ہم اسے آگ میں ڈالیں گے، اور یہ اللہ پر آسان ہے''۔

اللہ کے قوانین کی مخالفت کی سزا

جو بھی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے ''اللہ کے احکام کو پامال کرے'' اللہ کے قوانین کو اپنے پاؤں تلے روندے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے اور یہ اللہ کے لیے آسان امر ہے تم جو ایک دوسرے کا مال کھاتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے منع کیا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں قتل سے منع کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا لطف اور مہربانی ہے تمہارے اوپر اگر اللہ تمہیں نہ روکتا اور تم ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے اور وہ تمہیں آگ میں ڈالتا تو یہ اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن اس نے تمہیں سمجھایا کہ تم ایسا مت کرو اور اللہ کے سمجھانے کے بعد اگر تم نے اس جرم کا ارتکاب کیا تو اس پر اللہ کا بیان آیا ہے کہ اگر تم پھر ایسا کرو گے تو پھر اس کی سخت سزا تمہیں بھگتنا پڑے گی۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچوگے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کردیں گے''۔

بڑے گناہوں سے بچنے کا فائدہ

لفظ ''اجتناب'' جنب سے ہے جو آدمی کے پہلو پر بولا جاتا ہے۔ جب انسان کسی چیز سے نفرت کرتا ہے تو اسے اپنی سائیڈ سے موڑ دیتا ہے اور خود اس چیز سے دُور ہو جاتا ہے اس طرح اجتناب کا معنی ترک کرنا ہے، چھوڑ دینا ہے۔ "کبائر" کبیرہ کی جمع ہے یہ گناہان صغیرہ کے مقابلے میں ہے، "تکفیر" کفر سے ہے جس کا معنی پردہ ڈالنا، چھپانا کے ہیں۔ "سئیات" سے مراد گناہان صغیرہ ہیں، ''مدخل'' وارد ہونے کی جگہ، یہاں مراد بہشت یا قرب الٰہی ہے۔

اللہ کا یہ وعدہ اس بات کا سبب نہ بنے کہ انسان جری ہو جائے اور گناہان صغیرہ انجام دینا شروع کر دے کیونکہ بے پرواہی اور گناہ کو معمولی سمجھنا اور چھوٹے گناہ کرتے رہنا یہ امر سرکشی کا سبب بنتا ہے امر الٰہی کو معمولی قرار دینا خود بڑے گناہوں سے ایک بڑا گناہ ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے خود کو محفوظ رکھے تو پھر خدا اسے چھوٹے گناہوں کے شر سے محفوظ رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ انسان کی کمزوری سے آگاہ ہے اور جانتا ہے کہ انسان جاہل ہے لہٰذا اللہ کے وعدے مردہ دلوں میں نور اُمید کو لاتے ہیں اور اسے زندہ کر دیتے ہیں۔ مولا علی علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ گناہ کبیرہ سات ہیں: 1۔ اللہ کا شریک بنانا، 2۔ آدمیوں کو قتل کرنا، 3، 4۔ پاک دامن عورتوں کی طرف بالخصوص شادی شدہ عورتوں کی طرف زنا کی تہمت لگانا، 5۔ یتیم کا مال کھانا، 6۔ جنگ سے فرار کرنا، 7۔ کفر چھوڑنے کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹ جانا۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ استغفار کے وسیلے سے کوئی گناہ کبیرہ باقی نہیں رہتا اور

جب چھوٹے گناہ کو بار بار کیا جائے تو وہ صغیرہ نہیں رہتا بلکہ چھوٹے گناہ پر اصرار سے وہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

''اور مت ہوس کرو اس فضیلت میں جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے، مردوں کو اپنی کمائی سے حصہ ہے، اور عورتوں کو اپنی کمائی سے حصہ ہے، اور اللہ سے اس کا فضل مانگو، بے شک اللہ کو ہر چیز کا علم ہے''۔

ہر ایک اپنی حدود میں رہے

اس میں ایک اخلاقی پہلو ہے جس کی طرف اللہ تبارک و تعالیٰ متوجہ کر رہا ہے کہ تم یہ نہ کہو کاش فلاں چیز جو فلاں کے پاس ہے وہ میرے پاس بھی ہوتی۔ یہ فضل اور برتری اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر دی ہے، خداوند نے ہر ایک کے لیے روزی کا سامان مہیا کیا ہے اور اس سے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے پاس جو کچھ ہے اس میں طمع ولالچ کرے۔ یہ اس لیے ہے کہ شر اور فساد کی جڑ کاٹ دی جائے کیونکہ حسد فساد کا سبب بنتا ہے۔ قرآن کی یہ روش ہے کہ وہ مسائل کو اس کی بنیادوں کے ساتھ دیکھتا ہے لہٰذا عورتیں یہ نہ سوچیں کہ جو وراثت کا حصہ ان کے لیے ہے وہ کم ہے اور مرد کا حصہ زیادہ ہے اور تعدد زوجات مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس پر حد نہ کریں تمام امور مصلحتوں کے تحت ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر عورت اور ہر مرد کے جو جو کام ہیں اسکا ثمر اسے ملنا ہے، اس میں کوئی کسی کے لیے کمی نہیں کی جائے گی ہے۔ یہ قانون سازی اجتماعی زندگی کی موفقیت اور

کامیابی کے لیے ہے۔ ''اکتساب'' کا معنی کوئی بھی انسان جو اپنے لیے فائدہ حاصل کرتا ہے اور اس سے استفادہ کرتا ہے۔ لفظ کسب، اکتساب سے عام ہے جو انسان کے اپنے منافع کو بھی شامل ہے اور اسی طرح وہ جو کچھ دوسرے کے لیے حاصل کرتا ہے وہ بھی کسب ہے اس سے عام تر کہ اختیاری عمل ہو کہ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا عمل کیا ہو جیسے صنعت وحرفت جو انسان کو صاحب منفعت بنا دیتا ہے، منفعت مالی ہو یا منفعت غیر مالی۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک عمل اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا بلکہ اللہ کے فضل سے اس سے وہ عمل ہو گیا تو گویا لہٰذا اگر کوئی خواہش رکھتے ہو تو اللہ سے اس بارے درخواست کرو وہ ہر بات کا دانا ہے۔ دوسرں کے ساتھ حسد نہیں ہونا چاہیے، دوسروں کے اچھے حالات دیکھ کر ان سے کینہ اور بغض نہیں ہونا چاہیے، رشک کریں کہ اللہ میرے لیے بھی ایسے حالات بنا دے نا یہ کہ اس کے پاس کیوں ہے؟! یہ میرے پاس ہونا چاہیے۔ اس کا احترام زیادہ کیوں ہے؟ یہ تو میرا ہونا چاہیے یوں نہ سوچیں۔ اپنے لیے اللہ سے مانگو اور خود کو اللہ سے بے نیاز مت قرار دو خود کو اللہ کا محتاج سمجھو، خدا نے جو تمہارے درمیان فرق قرار رکھا ہے اس سے پریشان نہ ہو اور نہ ہی دوسروں کے ساتھ حسد کرو اور جو کچھ تمہارے باطن میں ہے اور جو تمہارے ظاہر میں ہے اللہ سب سے آگاہ ہے اور تمہارے جو منافع ہیں، جو تمہارے فائدے کی باتیں ہیں اللہ ان سے جاہل نہیں ہے اور اللہ اپنے حکم اور فیصلے میں خطاء بھی نہیں کرتا۔ اس بات کی طرف اگر کوئی متوجہ رہے گا تو پھر وہ کسی سے حسد بھی نہیں کرے گا۔ ہر ایک کو اپنی حدود میں رہنا چاہیے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾

''اور ہر شخص کے لیے ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں اس مال کے جو ماں باپ یا رشتہ دار چھوڑ کر مریں، اور وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو انہیں ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے''۔

اموال میں وراثت کا قانون

پہلے جو آیا ہے یہاں پر اس کی مزید بات کی جا رہی ہے۔ موالی، مولا کی جمع ہے اور یہ ولی سے ہے یعنی تم میں سے ہر ایک چاہے وہ مرد ہے یا عورت، وہ وراثت میں جوان کے اولیاء اور سرپرست ہیں جوان کے بڑے ہیں یا جوان کے رشتے دار اور قریبی ہیں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے حصہ معین کر دیا ہے کہ جو کچھ تمہارے مال سے پیچھے باقی رہ گیا ہے جو ترکہ تم نے چھوڑا ہے تو اس سے جو اپنا حصہ تمہارے لیے طے کیا ہے وہ لے لیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ جو آپ کے ماں باپ اور رشتے دار چاہے نسبی رشتہ دار ہوں یا غیر نسبی رشتہ دار ہوں (غیر نسبی رشتہ دار بیوی اور شوہر کے باہمی رشتہ منعقد ہو جانے کے بعد اس تعلق کی بنا پر بنتے ہیں) ان کا حصہ بھی دو، خدا ہر چیز پر گواہ ہے، اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝۳۴

''مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، پھر نیک عورتیں تابعدار ہوتی ہیں کہ مردوں کی غیر موجودگی میں اللہ کی مدد سے (ان کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں، اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا خطرہ ہو تو انہیں سمجھاؤ اور بستر میں انہیں جدا کر دو اور مارو، پھر اگر تمہارا کہا مان جائیں تو ان پر الزام لگانے کے لیے بہانے مت تلاش کرو، بے شک اللہ سب سے اوپر بڑا ہے''۔

شوہروں کا بیویوں پر اختیار

اس آیت میں مَردوں کے حوالے سے بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورت کا قیم اور سرپرست بنایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض کو بعض پر اللہ نے برتری دی ہے اور اس کا حوالہ بھی یہ ہے کہ مرد عورتوں کا خرچہ دیتے ہیں ان کے لیے حق مہر دیتا ہے، اُن کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کی نگہبانی بھی کریں، ان کے امور کو سنبھالیں۔ قیم اس کو کہتے ہیں جو دوسرے شخص کے امور کو انجام دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مرد عورتوں کے مسائل کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ اضافی ذمہ داری مردوں کو دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سخت عمل کرنے، محنت و مشقت کرنے اور عقلی امور کی استعداد و طاقت ہو، اس میں دشمن سے جنگ کرنے، اپنا دفاع کرنے کی قوت عورت سے زیادہ ہے۔

عورتوں میں حساسیت کا وصف ہے، اس کے مزاج میں لطف ہے اور مہربانی ہے، شفقت ہے، نرم خو ہے۔ اس آیت میں عمومی حکم ہے کیونکہ عورتوں کی نوع پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے جیسے حکومت اور قضاوت، جس پر معاشرے کی زندگی کا دارومدار ہے ایسے امور کا انجام دینا مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بعض کو دوسرے بعض پر برتری دی ہے اور یہ کہ مرد اپنے مال سے عورتوں پر خرچہ کرتے ہیں۔

عورتوں کے اخراجات دینا مرد کے ذمہ ہوتے ہیں، مہر یہ بھی وہی دیتا ہے عورتوں کی تمام ضروریات مرد پوری کر رہے ہوتے ہیں۔ جو عورتیں نیک ہیں فرمانبردار ہیں، مردوں کی غیر موجودگی میں ان کی ناموس کی محافظ ہیں تو اللہ نے ان کے منافع کی حفاظت فرمادی ہے۔

نیک عورتیں اپنے شوہروں کی اطاعت کرتی ہیں ان کے آگے جھک کر رہتی ہیں۔ اس حکم کا معنی یہ ہرگز نہیں کہ عورتوں کے جو انفرادی حقوق ہیں یا اجتماعی حقوق ہیں وہ ان کی بجاآوری اور حفاظت میں مستقل نہیں یا صاحب اختیار نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ زنانہ امور ہیں کہ شوہر کو اپنے جسم کے قریب آنے کی سہولت دینا کہ وہ اس سے ہر طرح کا استفادہ کر سکے۔ اس میں وہ شوہر کی اطاعت کرتی ہیں اگر شوہر غائب ہو تو اس کی آبرو اور عزت میں خیانت نہیں کرتیں۔ اس کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہ امور متعین کر دیئے ہیں، مردوں کو عورتوں کا قیم قرار دیا ہے اور عورتوں پر ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں اُن کو اجازت ہو کہ وہ اُن سے جیسے چاہیں لطف اٹھا سکیں۔ ان کی غیبت میں عورتوں پر واجب ہے کہ اُن کے مال کی بھی حفاظت کریں، آبرو کی بھی حفاظت کریں۔ جو عورتیں اس میں نصیحت قبول کرتی ہیں تو ٹھیک ہے اور اگر نافرمان ہو جائیں تو اس کے لیے نشوز کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہے شوہر کی بات نہ ماننا، نافرمانی کرنا، غرور کرنا۔

''خوف نشوز'' یہ ہے کہ تدریجاً آہستہ آہستہ نافرمانی کی نشانیاں ظاہر ہوں اور معلوم ہو جائے کہ عورت مرد کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے تو اس صورت میں ہے کہ اسے سمجھاؤ کہ ہم دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں۔ ہماری زندگی مشترکہ ہے آگے ہماری اولاد ہے تو آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ باز آ جائے نافرمانی سے رک جائے تو ٹھیک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نافرمانی سے روکنے کے یہاں تین علاج بتائے ہیں، 1۔ نصیحت ہے، 2۔ غصے ہو جانا، 3۔ مار، یہ بالترتیب ہیں عورت سے ناراضگی کا اظہار اس طرح کرے کہ اس سے اپنا بستر الگ کر لے۔ یہ بھی ایک طرح سے غصے کی نشانی ہے کہ میں تیرا شوہر ہوں اور تجھ

سے ناراض ہوں۔ شوہر بیوی سے ناراضگی کا اظہار اس طرح کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ اس ناراضگی پر بھی وہ بے پرواہی سے کام لے رہی ہے اور شوہر کو منانے کے لیے نہیں آ رہی ہے اور ویسی ہی غلط سلط باتیں کر رہ تو آخری بات ضرب یعنی ہلکی مار ہے۔ اگر یہ سارے امور مفید واقع نہ ہوں تو پھر آپ کو کوئی بہانہ جوئی نہیں کرنی چاہیے۔ عورتوں پر جو برتری اور طاقت ہے وہ مرد کو مغرور نہ بنادے اور اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کے لیے مطلق برتری ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ آ جاتا ہے کہ جب حالات بالکل ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر اگلا حل بیان کیا ہے۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵

''اور اگر تمہیں کہیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا خطرہ ہو تو ایک منصف شخص کو مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف شخص کو عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو، اگر یہ دونوں صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان دونوں میں موافقت کر دے گا، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے''۔

شوہر اور بیوی کے درمیان مصالحت کروانا

''شقاق'' ناراض ہونا، دشمنی اور جدائی کے معنی میں ہے۔ ایسی صورت میں کہ ہر دو طرف سے ایک ایک بندہ لیا جائے وہ ثالث بنے اور شوہر اور بیوی کے درمیان صلح صفائی کروادیں۔ یکطرفہ بات نہ ہو اور اسی لیے دونوں طرف کے بندے ہوں، دونوں کے خاندان سے ایک ایک آدمی لیا جائے۔ دونوں اپنی ذمہ داری سمجھیں گے اور جھگڑے کو سلجھادیں لیکن یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اُن کے درمیان دشمنی اور ہٹ دھرمی نہ ہو، ضد نہ ہو، اصلاح کا ارادہ

ہو اور جو دو بندے ہیں ان کے پاس اصلاح اور فیصلے کا اختیار ہو، وہ اس مسئلہ کو سلجھانے کے لیے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیں تو یقینی بات ہے اللہ مدد کرے گا اور ان دو منصفوں کی وجہ سے میاں بیوی میں اتحاد پیدا ہو جائے گا، اور گھر اجڑنے سے بچ جائے گا۔ اللہ اصلاح چاہتا ہے ،بگاڑ نہیں چاہتا۔ اللہ اپنے بندوں کے امور سے آگاہ ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۙ﴿۳۶﴾

"اور اللہ کی بندگی کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور قریبی ہمسایہ اور اجنبی ہمسایہ اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر اور اپنے غلاموں کے ساتھ بھی (نیکی کرو)، بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اِترانے والے بڑائی کرنے والے شخص کو"۔

معاشرہ کے مختلف طبقات سے حسن سلوک کا حکم

معاشرے میں یکجہتی ایجاد کرنے کے لیے چند چیزیں اہم ہیں:۔

1۔ پہلی بات یہ ہے کہ عبادت فقط اللہ کی کی جائے، اور اللہ کی رضا کے لیے نیک اعمال انجام دیئے جائیں اور اللہ کو کسی کا شریک نہ بنائے، اپنی خواہشات کو اللہ کی اطاعت کے سامنے رکاوٹ نہ بنائے اور خدا کا شریک کسی کو قرار نہ دے کیونکہ غیر خدا کی عبادت قبول نہیں۔

2۔جو اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کوئی فیصلے دیتے ہیں تو وہ فیصلے قبول نہیں ہیں۔ جو خواہشات نفسانی سے نظریات پھوٹتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے جیسے قبائلی تعصّبات، قومی تعصّبات، وطنی تعصّبات۔انسان کو چاہیے کہ وہ اس پر یقین رکھے کہ تمام امور میں بالاتر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔

معاشرہ میں موجود افراد سے تعلقات بنا کر رکھے جیسے ماں باپ جو انسان کے وجود کا آخری سبب ہیں وہ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو انسان کے دنیا میں آنے کا سبب بنتے ہیں۔معاشرہ کے طبقات میں سب سے پہلے ماں باپ کا ذکر کیا ہے کہ ان پر احسان کرو پھر انکے بعد دوسرے افراد و طبقات کو بیان کیا ہے۔''جَارِ الْجُنُبِ''سے مراد سفر کا ساتھی یا کسی جگہ اکٹھے ٹھہرے ہوں اور وہ جو راستے میں رہ گیا ہو اور سفر میں اس کے پاس خرچہ کم پڑ گیا ہے تو گویا سفر کے راستے میں جو بھی ساتھی ہو یا راستے کا بھائی ہو، غلام ہو کنیز ہو سب افراد مراد ہیں۔ترتیب سے بیان کیا ہے کہ اُن سب کا احترام کرو ان پر احسان اور نیکی کرو۔ماں باپ کے بعد رشتہ دار ہیں پھر بالترتیب یتامٰی، مساکین، قریبی ہمسایہ، دور کا ہمسایہ، سفر کا ساتھی ،کارواں سرائے کا ساتھی، سفر میں زادِراہ ختم کر بیٹھنے والا، اپنے زیر دست غلاموں اور کنیزوں کی بابت تم معاشرہ کے ان سب افراد کے ساتھ نیکی کرو۔ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو ان کے ساتھ تعاون کرو۔

''مختال'' کا معنی خیالات کا قیدی ہونا، اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ایسا جو ظاہری اسباب سے دل لگائے اور اللہ کو بھول جائے، اللہ کی اطاعت نہ کرے ۔ اس لفظ سے اسکی طرف اشارہ ہے۔اللہ تعالیٰ مغرور اور متکبر کو پسند نہیں کرتا۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾

”جو لوگ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل سکھاتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے“۔

دوسروں کے ساتھ تعاون نہ کرنے والے

وہ لوگ معاشرہ کے گھٹیا اور پست افراد ہیں جو اللہ کے دیے ہوئے مال میں کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ وہ بھی کنجوسی کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے۔ بخیل وہی ہوتا ہے کہ جو دوسروں کے لیے کسی قسم کی مدد دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی اس سے تعاون مانگے تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اور اپنے بارے کہتا ہے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں میں تو خود فقیر محتاج ہوں حالانکہ اس کے پاس سب کچھ اللہ کا دیا ہوتا ہے۔ وہ اس لیے اپنا مال چھپاتا ہے کہ کہیں لوگ اس سے امداد کی اپیل نہ کردیں اور وہ اس طرح اس کا مال لے جائیں یا زبردستی اس پر چڑھائی کردیں تو اس ڈر سے خود کو فقیر کہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمات کو چھپاتا ہے یہ خود پرستی، خود سری، خود پسندی اور کنجوسی گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے افراد کو ذلیل و خوار کرنے والا عذاب دے گا۔ اس جگہ کفر سے اللہ کی نعمات پر پردہ ڈالنا مراد ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

”اور جو لوگ اپنے اموال کو لوگوں کے دکھانے میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور جس کا شیطان ساتھی ہوا تو وہ بہت برا ساتھی ہے“۔

دکھاوے کیلئے مال خرچ کرنا

اس آیت سے پہلی آیت میں ان کے بارے بتایا گیا جو کنجوسی کرتے ہیں۔ اس جگہ پر ان کی بات ہو رہی ہے جو مال تو خرچ کرتے ہیں لیکن اس میں انکی رضائے خدا مراد نہیں ہوتی۔ اور وہ اللہ کے لیے خرچ نہیں کر رہے ہوتے بلکہ معاشرے میں اپنا نام بنانے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ جبکہ ریاکاری خود شرک ہے لہٰذا ایسے لوگ اپنے اس عمل کی وجہ سے مشرک ہیں عقیدے میں شرک نہیں بلکہ عمل میں شرک ہے۔ درحقیقت ان کا آخرت پر ایمان نہیں لہٰذا یہ لوگ آخرت کے ثواب کے لیے مال خرچ نہیں کر رہے ہوتے۔ ان کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں ان کا نام اچھا ہو اور لوگ ان کی تعریف کریں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس بیان سے اُن کی حقیقت بیان کر دی ہے کہ یہ شیطان کے ساتھی ہیں شیطان ریاکار کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے وہ ایسے کا قریبی ساتھی ہے۔ وہ اسی کے ساتھ جہنم جائیں گے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

"اور اگر یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے تو ان کا کیا نقصان تھا، اور اللہ انہیں خوب جانتا ہے"۔

اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہ لانا

یہاں حیرت اور تعجب سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اسے سب کچھ تو اللہ نے دیا ہے اور جب سب کچھ اللہ نے دیا ہے تو اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اللہ کی راہ میں خرچ کیوں نہیں کرتے مال خرچ نہ کرنا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کے اندر ایمان نہیں ہے، اگر ان میں ایمان ہوتا تو اس کی نشانیاں بھی ہوتیں اور ایمان کی نشانیاں یہی ہیں کہ عمل میں اللہ کے

آگے تسلیم ہوں، اللہ کی راہ میں خرچ کریں، کسی سے تعریف کی توقع نہ رکھیں، آخرت کے ثواب کے لیے خرچ کریں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ تو سب حالات سے واقف ہے اور خدا ان کے ایمان اور انفاق کو بھی جانتا ہے کہ وہ کیا خرچ کر رہے ہیں اور کیوں خرچ کر رہے ہیں اور جو کچھ ان کے دلوں میں فتور کرتا ہے اللہ کو اسکا بھی علم ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

"بے شک اللہ کسی کا ایک ذرہ برابر بھی حق نہیں رکھتا، اور اگر نیکی ہو تو اس کو دگنا کر دیتا ہے اور اپنے ہاں سے بڑا ثواب دیتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک سرخ لکیر کھینچ دی ہے کہ تھوڑا سا اور ذرہ برابر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں ظلم نہیں ہے۔ اور اللہ کے ہاں کسی سے زیادتی نہیں ہوتی اور اللہ کے تمام فیصلوں میں کہیں بھی ظلم نظر نہیں آئے گا۔ ظلم تو وہی کرتا ہے جس میں کچھ کمزوری ہو یا اسے کچھ اضافے کی ضرورت ہو۔ اللہ تو ہر شئے کا مالک ہے، اللہ نے ہر شئی کو بنایا ہے اور سب کچھ اللہ کا عطا کردہ ہے۔ اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کریں اللہ تو آگاہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کر رہے ہیں یا کس نیت سے خرچ کر رہے ہیں۔ ان کا آخرت پر ایمان نہیں ہے، اللہ اس سے آگاہ ہے۔ تو ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، ان کا اجر بھی ضائع نہیں ہوگا، ان کو ثواب بھی پورا ملے گا بلکہ جو نیک کام کیا ہے اس کا دوگنا ثواب ملے گا اور انکے عمل کا ثواب چند در چند ہو جائے گا۔ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایک قسم کی نوید دی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؁۴۱

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے گواہ بلائیں گے اور تمہیں ان پر گواہ کر کے لائیں گے''۔

رسول اللہؐ کا اُمت پر گواہ ہونا

یہاں پر پیغمبر اکرم ﷺ کو خطاب ہے کہ جو ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی راہ پر خرچ نہیں کرتے ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اس وقت ہر شخص نے جو عمل کیا ہے تو اُس کے عمل کے گواہ موجود ہوں گے کہ اس نے کیا عمل کیا ہے۔ جتنی اُمتیں پہلے گزر چکی ہیں ان کے اعمال کے گواہ بھی آئیں گے اور اس اُمت کی گواہی کے لیے حضور پاک ﷺ موجود ہوں گے اور بتائیں گے کہ انہوں نے حضور پاک ﷺ کی دعوت قبول کی تھی اور جو پیغام آپؐ نے انہیں دیا تھا اس پر انہوں نے عمل کیا تھا یا اس پر عمل پیرا نہیں ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ فقط اپنی امت پر گواہ نہ ہوں گے بلکہ باقی امتوں پر بھی گواہ ہوں گے کہ کس کس نے اللہ کے رسولوںؑ کی باتوں پر عمل کیا، تاکہ تم سب انسانوں پر گواہ بنو (سورہ البقرہ، آیت 143)

رسول اللہ ﷺ جہاں سابقہ اُمتوں کے حالات پر بھی گواہی دیں گے تو اپنی اُمت کے بارے میں بھی گواہی دیں گے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ؁۴۲

’’جن لوگوں نے کفر کیا تھا اور رسول کی نافرمانی کی تھی وہ اس دن کی آرزو کریں گے کہ زمین کے برابر ہو جائیں، اور اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے‘‘۔

قیامت کے دن کافروں کی خواہش

قیامت کے دن وہ لوگ جو دُنیا میں رہ کر اللہ کی دعوت کو ٹھکراتے تھے اور کفر اختیار کیا، رسول اللہ ﷺ جو انہیں حق کی طرف بلاتے تھے ان کی نافرمانی کرتے رہے، جب وہاں پر عذاب کو دیکھیں گے تو اس وقت کہیں گے اے کاش ہم نے وہاں پر نافرمانی نہ کی ہوتی ہم خاک ہوتے ہماری کوئی ذمہ داری نہ ہوتی ہم انسان ہی نہ ہوتے۔

اس جگہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کا مطلب رسول اللہ ﷺ جو دستورات اللہ کی طرف سے لے کر آئے ان کو نا ماننا یا ان کا جو مقام ولایت تھا آپ کی رہبریت اور آپ کی طرف سے جو احکام صادر ہوتے تھے ان کی نافرمانی کرنا، آپ کی شریعت کو قبول نہ کرنا مراد ہے۔ یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ کچھ بھی نہ ہوتے اور زمین کے ساتھ خاک و مٹی ہوتے کیونکہ وہ سارے اللہ کی جناب میں حاضر ہوں گے اور ان کے اعمال سب کے سامنے کھلے ہوں گے۔ اسی طرح اُن کے بدن کے اعضاء اُن کے خلاف گواہی دیں گے ان کے اعمال ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے فرشتے ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے، انبیاءؑ انکے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے ان کی دنیا میں جو کارستانیاں تھیں ان کو بتا رہے ہوں گے تو وہ کافر اس سارے منظر کو دیکھ کر آرزو کریں گے کہ کاش! ہم نیست و نابود ہو جاتے اور کچھ بھی نہ ہوتے اور دنیا میں خدا کی نافرمانی نہ کرتے اور اللہ کے پیغام کو نہ چھپاتے لیکن اس جگہ اس افسوس کرنے کا ان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

''اے ایمان والو! جس وقت تم نشہ میں ہو تو نماز کے نزدیک نہ جاؤ یہاں تک کہ سمجھ سکو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں سفر کے علاوہ (نماز پڑھو) یہاں تک کہ غسل کر لو، اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا عورتوں کے پاس گئے ہو پھر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اسے اپنے مونہوں پر اور ہاتھوں پر ملو، بے شک اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے''۔

نماز کیلئے طہارت و پاکیزگی کا حکم

اس آیت میں طہارت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ پہلی بات نماز کے بارے میں بتائی گئی ہے کہ نشے کی حالت میں نماز نہیں پڑھنی۔ یہاں تک کہ نشہ زائل ہو جائے۔ اسی طرح جب غسل جنابت تمہارے اوپر ہے تو جنابت کی حالت میں بھی نماز نہیں پڑھ سکتے یہاں تک کہ غسل کرو۔ اور یہیں سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں داخل مت ہو یہاں پر صلوٰۃ سے دونوں معنی مراد لیے گئے ہیں مسجد اور نماز۔ اگر شراب پینے سے منع کیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ نماز کی حالت میں اللہ رب العالمین کے حضور

انسان پیش ہو رہا ہوتا ہے اور جب کوئی شخص نشے میں ہوتا ہے تو اسے یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ نشہ عام طور پر عمل کے زائل ہونے کا سبب بنتا ہے۔

اس طرح مزید طہارت کے حوالے سے بتایا ہے۔ اس جگہ وضو یا غسل کرنے کا امکان نہ ہو تو ان کے بدلے تیمّم کا حکم بیان ہوا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اگر تمہارے پاس پانی نہ ہو تو پھر پاکیزہ مٹی کسی اوپر والی جگہ سے مہیا کرو جہاں نجاست کا امکان نہ ہو۔ پہلے دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مارو اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی کا مسح کرو اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی پشت پر مسح کرو۔ یہ حکم تمہارے لیے تخفیف ہے اور کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ہے۔ اللہ مہربان ہے، بخشنے والا ہے اور اگر تم مریض ہو اور پانی کا استعمال تمہارے لیے نقصان دہ ہے یا تم سفر میں ہو اور پانی نہیں مل رہا یا وضو تھا لیکن قضائے حاجت کے لیے چلے گئے ہو اور اب پانی موجود نہیں اسی طرح اگر عورتوں کے ساتھ مقاربت کی ہے، غسل جنابت واجب ہو گیا ہے اور پانی موجود نہیں تو پاک و پاکیزہ مٹی سے تیمّم کرو۔ پہلے اپنے چہرے کو مسح کرو اور پھر ہاتھوں کا مسح کرو، انگلیوں سے لے کر ہاتھ کی مچ تک۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَۃَ وَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا السَّبِیۡلَ ﴿ؕ۴۴﴾

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کچھ حصہ کتاب سے ملا ہے وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ گم کر دو''۔

کتاب سے گمراہی حاصل کرنا

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے کہ ان کے پاس ہدایت کا انتظام تھا، کتاب ان کے پاس آئی لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود اُنھوں نے بے راہ روی کا راستہ اپنایا اور اصل

راستہ گم کر بیٹھے، صراط مستقیم کو چھوڑ دیا۔ اب وہی لوگ مومنین کے پاس آکر مودت اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، مومنوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں، مومنوں کو آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے اموال سے خرچ نہ کریں کنجوسی کریں وہ چاہ رہے ہیں کہ مومنین کو تکلیف میں ڈالیں اور وہ کامیاب نہ ہوں لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اے مومنو! تم ان کی باتوں میں نہ آؤ اور ان لوگوں سے بچو اور ان کی باتوں پر کان نہیں دھرو۔ یہ تمہارے لیے خطرناک ہیں خود تو انہوں نے اللہ کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی کتاب کے بعض مطالب کو بیچ کر گمراہی مول لی۔ اب وہ تمہیں بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ڭ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۴۵

”اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، اور تمہاری حمایت اور مدد کے لیے اللہ ہی کافی ہے“۔

دشمنوں کی شناخت

اس آیت میں اللہ یہ بتارہا ہے کہ دیکھو جو لوگ ظاہر میں آپ کے ساتھ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور آپ کے بڑے خیر خواہ بنتے ہیں ان کا مقصد سوائے گمراہ کرنے کے اور کچھ نہیں۔ خداوند تم سے بہتر جانتا ہے کہ تمہارے خیر خواہ کون ہیں اور تمہارے دشمن کون ہیں۔ لہٰذا ہوشیار رہو۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کی کیفیات اور حالات سے آگاہ ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روکنے والے اور کنجوسی کرنے والے ہیں، دکھاوے کے لیے عمل کرتے ہیں، حیلے بہانے بناتے ہیں، اللہ کے احکام سے فرار کرتے ہیں۔ لہٰذا تم ان سے بچ کر رہو، ان کی باتوں میں نہ آؤ، ان کو اپنا دوست مت بناؤ۔ جب خدا تمہارا یاور و مددگار ہے تو تمہیں ان یہودیوں سے مدد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ان سے دوستی رکھنے کی ضرورت ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ
عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ
وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ
اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

''یہودیوں میں بعض ایسے ہیں جو الفاظ کو ان کے محل سے پھیر (بگاڑ) دیتے ہیں اور وہ کہتے ہیں ہم نے سن تو لیا ہے اور ہم نے معصیت کی ہے (سن کر عمل نہیں کیا) اور (وہ کہتے ہیں) سنو! تمہیں نہ سنایا جائے اور (کہتے ہیں) ''راعنا'' اپنی زبان کو مروڑ کر اور دین میں طعن کرنے کے خیال سے ایسا کرتے ہیں اور اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے سنکر مان لیا اور توں سن اور ہم پر نظر کر تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا لیکن ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر لعنت کی سو ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائیں گے''۔

یہودیوں کی بے راہ روی

یہودی ہمیشہ انحرافی باتیں کرتے ہیں، ''لو'' کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایسی آرزو جس کا حصول محال ہو۔ ان سے یہ محال ہے کہ وہ ایسی غلط باتوں سے ہاتھ اٹھا لیں۔ کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی اور غلط باتوں سے ہاتھ اٹھا لیں ان سے یہ توقع رکھنا غلط ہے کہ وہ اللہ کے لیے خضوع و خشوع کریں گے اور حق کہیں گے باطل سے ہٹ جائیں گے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ باتیں یہودیوں کے بارے مومنین کو بتا کر سمجھایا ہے کہ تم ان یہودیوں کے ایمان بارے مایوس رہو یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں، ان کے کفر اور ان کی باطل پر مبنی گفتگو

اور ان کی طرف سے اللہ کے کلمات اور بیانات میں تحریف سبب ہوئی کہ اللہ نے ان پر لعنت بھیجی۔ بہت تھوڑی تعداد ان میں ایسی ہے جو ایمان لائیں گے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اصلیت واضح کی ہے۔ یہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں، دین پر اعتراض کرتے ہیں۔ بات کو سنکر اس پر عمل نہیں کرتے۔ان کے بیان اور عمل میں تضاد ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝۴۷

''اے کتاب والو! اس پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل کیا ہے جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم بہت سے چہروں کو مٹا ڈالیں پھر انہیں پیٹھ کی طرف الٹ دیں یا ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے ہفتے کے دن والوں پر لعنت کی تھی، اور اللہ کا حکم تو نافذ ہو کر ہی رہتا ہے''۔

اہل کتاب کے لیے راہنمائی

''نطمس'' نشان کو مٹانے کے معنی میں ہے کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ اس آیت میں اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب قرآن پر ایمان لے آئیں۔ یہ ایسی کتاب ہے جو پچھلی کتاب کی تائید کرتی ہے۔ پس اس کتاب کو نا ماننا اور اس کا کفر کرنا یہ عقل مندی نہیں۔ قبل اس کے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو تبدیل کر دے اور تم فطرت سے ہٹ جاؤ تو ایسا انداز اپناؤ کہ جس میں تمہاری سعادت مند زندگی کی ضمانت ہے اس کی طرف توجہ کرو اور اس کے مخالف نا جاؤ، ایمان لے آؤ کیونکہ انسانی فطرت کی بنیاد دنیا اور آخرت کی سعادت کی طرف توجہ دینا ہے لیکن انہوں نے اللہ کی دعوت ٹھکرا دی تو پھر اللہ کی

لعنت ان پر آئی کیونکہ وہ فطرت سے پیچھے کی طرف مڑ گئے جس بنا پر دنیا و آخرت کی سعادت ان کو نہ مل سکی، اہل کتاب کو ایک واقعہ یاد دلایا ہے۔

ہفتہ کے دن ان کے لیے شکار کرنا منع تھا لیکن یہودیوں نے اس کے لیے ایک راستہ بنا لیا اور وہ اس طرح کہ ایک گڑھا کھود لیا مچھلیاں ہفتہ کے دن اس گڑھے میں آجاتی تھیں اور وہ اتوار کو شکار کر لیتے تھے۔ اللہ نے اس جرم کی سزا کے طور پر ان سب کو مسخ کر دیا اور وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں ہو گئے۔ اُن کے اعمال حقیقت میں اُن کی حیوانیت، کمینگی، پلیدی اور نجاست پر دلالت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے باطن سے واقف ہے اس لیے ان یہودیوں پر لعنت کی گئی اور اللہ ان سے دُنیا میں بھی ناراض ہے اور آخرت میں بھی ناراض ہے اور ان کے اندر آپس میں دشمنی کی روش قیامت تک رہے گی۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کریں گے ان کی یہ حالت اس لیے بیان کی جارہی ہے تاکہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے کہ اے مسلمانو! تم اُن کے ہتھکنڈوں میں نہ آؤ، ان کے جال میں نہ پھنسو اور ان کی شرارتوں سے آگاہ رہو۔ اُن کے اعمال پر توجہ رہے کہ یہ خداوند تبارک و تعالیٰ کی دعوت کو ٹھکرانے والے ہیں اور انبیاءؑ کو قتل کرنے والے ہیں اور ان کی دعوت کو ماننے والے نہیں۔ جو کتاب ان کے پاس بھیجی گئی اس کتاب میں حق موجود تھا لیکن انہوں نے اس حق کو قبول نہیں کیا، آخری پیغمبرؐ کی بشارت موجود تھی تو اس میں انہوں نے تحریف کر دی حقیقت پر پردہ ڈال دیا تو اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان پر قیامت تک اللہ کی لعنت برستی رہے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

''بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا جو اس کا شریک ٹھہرائے اور شرک کے علاوہ دوسرے گناہ جسے چاہے بخشتا ہے، اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا ہی گناہ کیا''۔

شرک ناقابل معافی جرم

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مخاطب کیا کہ تم ایمان لے آؤ اور جو کتاب قرآن ہے تو یہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر تم قرآن پر ایمان نہیں لاؤ گے اور مشرک رہو گے تو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شرک کے جرم کو بالکل معاف نہیں کرتا اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ کی ناراضگی ہے اور اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر سزا اور عذاب طے ہے۔ اللہ تمہارے چہروں کو مسخ کر دے گا، تمہاری حیثیت ختم ہو جائے گی تم پیچھے کی طرف چلے جاؤ گے اور تمہارے اوپر لعنت ہے۔ اور دُنیاوی معاملات میں بھی شرک کی وجہ سے تمہیں نقصان ہو گا۔ مغفرت بغیر کسی معیار کے حاصل نہیں ہو جاتی، اگر مغفرت نہیں ملتی تو اس کی وجہ ہوتی ہے۔ اور اگر مغفرت ملتی ہے تو اس کی بھی وجہ ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی حکمت کے تحت ہے۔ پوری کائنات اللہ کی رحمت سے عبارت ہے لہٰذا پوری مخلوق کو اللہ کی عبدیت میں آنا چاہیے۔ سب خالق کی ربوبیت کو تسلیم کریں۔ اگر شرک ہو گا تو رب تعالیٰ کی عبودیت باقی نہیں رہے گی، شرک کا معنی وسیع تر ہے۔ اہل کتاب کو مشرک نہیں کہا گیا، اگرچہ اُن کا قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے کفر اختیار کرنا ایک طرح کا شرک ہی ہے۔

یہ جو فرمایا گیا کہ اللہ '' وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ '' تو اس توہم کو دور کرنے کے لیے ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جب وہ شرک نہیں کریں گے تو ہر صورت اللہ ان کے سارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ پر ایسا کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس توہم کو دور کر دیا کہ اللہ انہیں معاف کرے گا جنہیں چاہے گا اللہ کسی کا پابند نہیں اور نہ ہی اللہ پر کوئی حکم چلانے والا ہے، حاکم علی الاطلاق اللہ ہے باقی سب اللہ کے محکوم ہیں۔ غالب اللہ ہے باقی مغلوب ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت جس کو چاہے معاف کرے اور جس کو چاہے معاف نہ کرے، جس کے لیے چاہے شفاعت دے، جس کے لیے

چاہے شفاعت نہ دے، جس کو چاہے اعمال صالح کی وجہ سے اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور جس کے بارے میں نہ چاہے تو پردہ نہ ڈالے۔ معیار اللہ کا اپنا طے کردہ ہے، اللہ کے طے شدہ معیارات و اصولوں میں کسی اور کو مداخلت کا حق نہیں ہے۔ اللہ کا ہر عمل حکمت اور مصلحت کے تحت ہوتا ہے۔ بغیر مصلحت اور بغیر حکمت کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُزَکُّوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَ لَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۴۹﴾

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی کا دم بھرتے ہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے اور ان پر باریک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہ ہوگا"۔

تزکیہ کے بارے بیان

انسان کا تزکیہ دو طرح کا ہوتا ہے:

1۔ عمل کا ہے، جس کا عمل اچھا ہو گیا تو اس نے اپنا تزکیہ کیا۔ خود کو پاکیزہ بنالیا، یہی پسندیدہ ہے۔ " قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ﴿۹﴾ " جس نے اپنے نفس کا تذکیہ کیا تو وہ کامیاب ہو گیا (سورہ الشمس، آیت 9)

2۔ بغیر عمل کے زبان سے تذکیہ، خود اپنی تعریف کرنا، خود ستائی یہ ناپسندیدہ ہے (سورہ النجم آیت 32)۔

اپنی تعریف مت کرو، خود ستائی مت کرو، اپنے آپ کو پاکیزہ مت ٹھہراؤ۔ یہودی کہتے تھے ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ کی محبت ہمارے لیے ہے۔ یا وہ کہتے تھے کہ آگ تو بس چند روز کے لیے ہوگی پھر ہم آزاد ہو جائیں گے اور آرام میں آ جائیں گے وہ خود کو باقی لوگوں سے جدا قرار دیتے تھے کہ ہم ہی اللہ کے پسندیدہ ہیں اور اللہ کی محبت ہمارے لیے ہے اور ہم ہی اللہ

کے اولیاء ہیں۔ تو اللہ فرماتا ہے جو خود اپنی تعریف کرے اور اپنا تزکیہ بیان کرے اور اپنے آپ کو پاکیزہ قرار دے تو خالی دعویٰ سے ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اگر انسان پسندیدہ صفات سے آراستہ ہو تو یہ اللہ کی مدد اور فضل سے ہوگا۔ اور جو خود کو مستقل جانے تو گویا اس نے الوھیت اور ربوبیت میں اللہ کا شرک قرار دیا ہے۔ انسان تو کمزور ہے وہ مچھر کو تو اپنے سے دُور نہیں کر سکتا وہ کس طرح خود کو اس مقام پر لے جا سکتا ہے جو تمام موجودات کا خالق ہے۔ "فتیل"، نازک باریک دھاگہ جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معمولی سی زیادتی کسی کے ساتھ نہیں ہوگی۔ جنہوں نے جو عمل کیا ہے تو اسے اس کے عمل کا پورا بدلہ ملے گا ان پر معمولی سا ظلم بھی نہیں ہوگا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۠﴿۵۰﴾

''دیکھو یہ لوگ اللہ پر کیسا جھوٹ باندھتے ہیں، یہی صریح اور کھلا گناہ کافی ہے''۔

اللہ پر جھوٹ باندھنا

یہودیوں کی خود ستائی اور ان کا خود کو اللہ کے بیٹے قرار دینا اور خود کو اللہ کا اولیاء جاننا تو یہ اللہ پر بہت بڑی تہمت اور افتراء ہے۔ اگر کوئی فضیلت ہے جس کی وہ اپنی طرف نسبت دیتے ہیں تو وہ فضیلت نظر بھی آنی چاہیے اور انہوں نے یہ خدا پر افتراء باندھا ہے کیونکہ اگر ایسی فضیلت اللہ نے ان کو دی ہے تو بھی وہ مستقل یا اللہ سے بے نیاز نہیں۔ خود ستائی کرنا اور اپنے آپ کو بڑا بنانا تو یہ خدا کا شریک قرار دینا ہے۔

''اللہ کی مملکت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔'' (سورہ الاسراء، آیت: 111)

اس خود ستائی میں خدا پر افتراء باندھنے کے علاوہ ان کا کوئی اور گناہ نا بھی ہو تو یہی ایک جرم ہی کافی ہے کیونکہ خود ستائی بڑا واضح گناہ ہے۔ ''اثم'' قابل مذمت عمل، ایسا عمل جو انسان کو نیکیوں سے روکتا ہے۔ ''اثم'' اس معصیت کے لیے مناسب عنوان ہے۔ شرک

ایسا گناہ ہے جو رحمت کے اترنے میں رکاوٹ ہے اور کفر مغفرت کے حصول میں مانع اور رکاوٹ ہے۔ یہودیوں کی خود ستائی رکاوٹ ہے کہ انہیں اللہ کی مغفرت اور رحمت نصیب ہو۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡجِبۡتِ وَ الطَّاغُوۡتِ وَ يَقُوۡلُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا هٰٓؤُلَاۤءِ اَهۡدٰى مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا سَبِيۡلًا ﴿۵۱﴾

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا وہ بتوں اور شیطانوں کو مانتے ہیں اور کافروں سے کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں سے زیادہ راہِ راست پر ہیں"۔

یہ آیت ایک واقعہ کی خبر دے رہی ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ نے مشرکین کے حق میں اور مومنین کے برخلاف فیصلہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ مشرکین مومنین سے زیادہ ہدایت پر ہیں، کیونکہ مومنین کے نزدیک تنہا توحید ہے اور قرآن پر ایمان ہے جبکہ مشرکین ان سے زیادہ ہدایت پر ہی۔ اللہ کی جگہ جس کی پوجا کی جا رہی ہو اسے جِبت کہتے ہیں۔ اہل کتاب جِبت پر ایمان لے آئے۔ ہر وہ جو دین اور شریعت الٰہی کے مخالف ہو طاغوت ہے۔ مشرکین کے بارے کہا گیا کہ وہ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انکا کسی پر ایمان نہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبت اور طاغوت کی نسبت اہل کتاب کی طرف دی ہے کیونکہ انہوں نے مشرکین کی طرف میلان ظاہر کیا اور ان کو مومنین سے زیادہ ہدایت پر قرار دیا، اپنے اس بیان سے وہ حقیقت میں جبت اور طاغوت کے گرویدہ ہوئے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ يَّلۡعَنِ اللّٰهُ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ نَصِيۡرًا ﴿۵۲﴾

''یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے، اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کا تو کوئی مددگار نہیں پائے گا''۔

اللہ کی لعنت کے مستحق

ان یہودیوں کی بداعمالیاں اور اللہ کی نافرمانیاں اللہ پر افتراء اور جھوٹ باندھنا، دھوکہ دہی یہ سبب بنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا۔ جو اللہ کی رحمت سے دُور ہو جائے تو یقینی بات ہے کہ اس کا کوئی مددگار اور یاور نہیں ہوگا کیونکہ اللہ ہی سب کا مالک ہے اور اللہ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا ہے اور اللہ کے سوا کوئی کسی کا یاور و مددگار نہیں ہو سکتا۔ یہ انجام ہے ان کا جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، اللہ پر افتراء باندھا، خود ستائی کی، دوسروں کو دھوکہ دیا۔ جس پر اللہ کی لعنت ہے اسکا کوئی یاور و مددگار نہیں۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

''کیا سلطنت میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے، پھر تو یہ لوگوں کو ایک تِل کے برابر بھی نہیں دیں گے''۔

یہاں پر استفہام انکاری ہے یہ لوگ (یہودی) خیال کرتے ہیں کہ وہ ملک اور مملکت کے مالک ہیں۔ ملک سے مراد مادی اور معنوی امور میں سلطنت ہے، بالا دستی مراد ہے۔ اسی لیے یہ امر نبوت، ولایت اور ہدایت کو شامل ہے۔ بندوں کی مالکیت کو بھی شامل ہے۔ مال اور دولت کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی مملکت یا ایسا اختیار کسی کو نہیں دیا۔ یہ اختیار فقط اللہ کے لیے خاص ہے پھر اللہ نے اپنے انبیاءؑ کے لیے اس سرپرستی اور رہبریت کا عنوان رکھا ہے۔ اگر اہل کتاب میں سے کسی کے پاس ایسی مالکیت ہوتی تو ان میں بخل جو

شدید شکل میں ہے تو وہ اس سے کم ترین فائدہ بھی لوگوں کو نہ پہنچاتے۔ ان کا مزاج ہی ایسا ہے وہ تو نقصان ہی نقصان دیتے ہیں۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ۝۵۴

''یا لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس بات پر جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے، ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی ہے اور ان کو ہم نے بڑی بادشاہی دی ہے''۔

آل ابراہیمؑ پر اللہ کا فضل وانعام

اس آیت میں مومنین کا حوالہ دیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو کتاب دی ہے، دینی معارف کا علم عطاء کیا ہے اور بعد والی کلام نشانی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آل ابراہیمؑ سے تھے۔ اور یہ آیت یہودیوں کی سازشوں اور شرارتوں کے تسلسل میں ہے کہ وہ مومنین پر مشرکین کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ فرما رہا ہے ہم نے اپنے فضل سے آل ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت اور بڑا ملک دیا تو انہوں نے اس پر حسد کیا اور حسد کی وجہ سے ان کی مایوسی تھی کیونکہ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کتاب وحکمت ان کے علاوہ کسی اور کے پاس چلی جائے۔ حسد کرتے ہوئے انہوں نے چاہا کہ آل ابراہیمؑ کے ہاتھ سے یہ نعمت چلی جائے۔ اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تم یہ چاہتے ہو تو پھر غضب اور غصہ کی شدت میں مر جاؤ۔ یہ حسد تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آل ابراہیمؑ کو جو فضل دیا ہے اُن کے لیے جو عزت اور کرامت عطاء کی ہے اس نے ختم نہیں ہونا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ملک سے مراد مادی ملک سے وسیع تر ہے۔ اس جگہ فقط مادی مملکت مراد نہیں ہے۔ یہ نبوت اور ولایت کو بھی شامل ہے، امامت کو بھی شامل ہے اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ نے اس ملک کو عظیم قرار دیا ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ تو دُنیاوی ملک کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا وہ عارضی ہے۔ اللہ جب دُنیاوی مملکت کسی کو دیتا ہے تو یہ دُنیاوی مملکت اسے معنوی فضیلت اور دینی منقبت کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے۔ اس آیت میں مراد رسول اللہ ﷺ ہیں جو کہ آل ابراہیمؑ سے ہیں اور یہودیوں کو حسد اس وجہ سے تھا کہ وہ کہتے تھے کہ نبی تو ہم سے ہونا چاہیے تھا یہ ابراہیمؑ کی نسل سے کیوں آگیا۔ وہ سمجھ رہے تھے موسوی نسل سے آئے گا۔ اسی لیے انہوں نے جو بشارتیں اپنی کتاب میں پڑھی تھیں ان پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا اور انحراف میں چلے گئے جو انکی بدبختی کا سبب بنا۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

"پھر ان میں سے کوئی تو اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے ہٹ گیا، اور (اس کے لیے) دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے"۔

یہودیوں کی تھوڑی تعداد کا ایمان لانا

یہودیوں میں سے تھوڑی تعداد ہی ایمان لے آئی اور ان کی اکثریت نہ فقط ایمان نہیں لائے بلکہ دعوت الٰہی کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کیں اور پوری کوشش کی کہ وہ دوسروں کو ایمان لانے سے روکیں اور ایمان لانے کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کریں اور لوگوں کو پھسلا ورغلا کر راہ حق سے ہٹائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اُنہیں دھمکی دے رہا ہے کہ آتش جہنم تمہارے لیے تیار ہے تم جو لوگوں کو اللہ کی کتاب پر ایمان لانے سے روکتے ہو اور

رسول اللہ ﷺ اور مومنین کے لیے فتنے کی آگ بھڑکاتے ہو تو اس کی سزا تمہارے لیے ہے کہ تمہیں جہنم کی آگ میں جھونکا جائے گا اور اس میں ہمیشہ رہو گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۵۶

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم انہیں ہم آگ میں ڈال دیں گے، جس وقت ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کے لیے اور کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ مسلسل عذاب چکھتے رہیں، بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے"۔

الٰہی آیات کا کفر کرنے والوں کی سزا

یہاں پر عذاب الٰہی ان کے لیے بتایا گیا ہے جو اللہ کی دعوت کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں مومنین کو راہ حق پر جانے سے روکتے ہیں ان کے لیے آتش جہنم ہے اور وہ ایسی آگ ہے کہ جس میں یہ جائیں گے اور جل جائیں گے کوئلہ ہو جائیں گے پھر دوبارہ ان کے جسم پر جلد اور چمڑی آجائے گی پھر وہ جلے گی اور اسی طرح یہ جلتے مرتے رہیں گے۔ مریں گے بھی نہیں جئیں گے بھی نہیں اور یہ عذاب ان کے گناہ کے مطابق انہیں ملے گا اور یہ عذاب ان سے جدا نہیں ہو گا اور یہ جہنم کی آگ کا مزہ چکھیں گے اور کافروں کے لیے یہ عذاب اللہ کی حکمت کے تحت ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا
الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدۡخِلُهُمۡ
ظِلًّا ظَلِیۡلًا ﴿۵۷﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے انہیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، ان کے لیے وہاں صاف ستھری پاکیزہ عورتیں ہوں گی، اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں رکھیں گے''۔

صالح مومنین کیلئے انعامات

پچھلی آیت میں مشرکین کا انجام بتا دیا گیا اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ جو ایمان لائے ہیں اور ایمان کے بعد عمل صالح بھی کیا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے پھر اس جنت کی کیفیت بتائی ہے کہ جن کا عقیدہ اچھا تھا، عمل بھی اچھا تھا تو یہ لوگ جنت میں جائیں گے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گے۔ بڑا خوبصورت منظر ہوگا اور وہاں ہر شئے آمادہ و تیار ہے۔ یہ لوگ رحمت کے سائے تلے ہوں گے، کبھی گرمی یا سردی محسوس نہیں ہو گی اور ان کے لیے خوب رو اور خوش رو حوریں اور بیویاں ہوں گی جن سے وہ لطف اندوز ہوں گے انہیں وہاں کوئی تکلیف ہو گی نہ کوئی غم ہو گا نہ کو اکتاہٹ ہو گی وہاں پر آرام ہی آرام ہو گا۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمۡتُمۡ بَیۡنَ
النَّاسِ اَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۵۸﴾

”بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، بے شک اللہ تمہیں نہایت اچھی نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے“۔

انصاف اور امانت داری پر مبنی فیصلے کا حکم

” اَمَانَاتِ “ کا لفظ ہر قسم کی امانت کو شامل ہے۔ پیغام رسانی بھی اللہ کی طرف سے امانت ہے اور اسی طرح اللہ کی قائمقامی زمین پر اور یہ بھی امانت ہے کہ جو انسان کو دی گئی ہے کہ اللہ کا نظام جو ہے اسے اللہ کی زمین پر نافذ ہونا چاہیے۔ اور شرک اور غیر خدا کی عبودیت کے مظاہر کا خاتمہ ہونا چاہیے اور جاہلانہ نظام جیسے قومی تعصّبات، وطنی تعصّبات، قبائلی تعصّبات انکا خاتمہ ہونا چاہیے۔ عدل کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب تمہارے پاس شکایات آئیں اور فیصلے کے لیے تم کرسی پر بیٹھو تو مالی احکام میں معنوی احکام میں عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔ فیصلہ قانون کے مطابق دو، جو قانون اللہ نے اُتارا ہے اور اللہ کا حکم توحید پرستی ہے اور توحید پرستی ہی میں معاشرے کی سعادت ہے اور رفاہ عامہ اسی میں ہے اور ظلم و کفر کا خاتمہ ہے۔ اس آیت کو جب پچھلی آیات سے ملا کر پڑھیں تو معنی اس طرح بنتا ہے کہ یہودی امانت داری میں اچھے نہیں تھے بلکہ ہر امانت کے خلاف انہوں نے کام کیا۔ اللہ کے احکام میں تحریف کی، یہ بھی ایک طرح کی خیانت تھی، پیغمبر اکرم ﷺ کی نشانیاں تورات میں تھی ان کو چھپایا یہ بھی خیانت تھی۔ جب مومنین اور مشرکین کے درمیان فیصلے دینے لگے تو بھی عدل کے راستے سے نکل گئے اور ظلم اور جور کا راستہ اپنایا اور مشرکین کے حق میں رائے دی کہ مشرکین مومنین سے بہتر ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ بہترین نصائح یہ ہیں کہ امانت دار بنو۔ عدل پر مبنی فیصلے دو جو اللہ کا قانون ہے اس پر چلو۔ خدا پر یہودیوں نے جو افتراء باندھا ہے وہ باقی افتراء باندھنے والے

سب کے بارے آگاہ ہے۔ اللہ سے کوئی بات بھی مخفی نہیں وہ آگاہ بھی ہے، سننے والا بھی ہے اور وہ اپنے بندگان کی خیر چاہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ میرے بندگان کی خیر کس میں ہے اور نقصان کس میں ہے وہ اسی کے مطابق فیصلے دیتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے انعام ہے اور یہ بہترین اقدام ہے جو اللہ نے اپنے بندگان کے لیے کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۠ ﴿۵۹﴾

"اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں، پھر اگر آپس میں کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو، یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے"۔

اللہ، اللہ کے رسولؐ اور اُولوالامر کی اطاعت

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ حق حاکمیت کس کا ہے۔ حق حاکمیت اللہ کا ہے لہٰذا اسی کی اطاعت ہونی چاہیے، غیر خدا کی اطاعت اللہ کے احکام کے علاوہ کسی اور کے قوانین پر عمل کرنا اور غیر اللہ کو اپنے لیے معبود بنانا اور اللہ سے شرک کرنا یہ جائز نہیں ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی اطاعت بھی فرض ہے اس لیے کہ وہ اللہ کی رسالت اور اللہ کے پیغام پہنچانا ان کی ذمہ داری ہے اور اسی بنیاد پر توحیدی سوسائٹی قائم ہوتی ہے جس کی بنیاد احسان پر ہے لہٰذا جتنے بھی آپس کے جھگڑے ہیں وہ سب اسی قانون کے تحت نبٹائے جائیں۔ یہ اہداف اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اولو الامر کی اطاعت اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی

اطاعت کا تسلسل ہے۔[1] اولوالامر کے پاس وحی نہیں ہوتی اور اُن کا کام قرآن و سنت سے اخذ شدہ احکام کے مطابق فیصلے کرنا ہے۔ ان کے اقوال اور ان کے فیصلہ جات کی اطاعت بھی لوگوں پر فرض ہے لیکن اُن کے پاس یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ نئے قوانین بنائیں یا طے شدہ قوانین جو اللہ کی طرف سے ہیں ان کو منسوخ کریں۔ لیکن اُن کا امتیاز باقیوں پر یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ان کے سپرد ہوا ہے۔

اطاعت کا وجوب مطلق ہے۔ یہ اولوالامر حکومت کرنے والے ایسے ہوں جن میں عصمت ہو کیونکہ مطلق اطاعت کہی گئی ہے۔ جب اطاعت واجب ہے اور ان کی خلاف ورزی نہیں کرنی تو ایسے اولوالامر مراد ہوں گے جو خود معصوم ہوں کہ ان سے غلطی کا امکان نہ ہو، بھول چوک کا امکان نہ ہو۔ ان کی اطاعت اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہے۔ اولوالامر کے حکم کی مخالفت نہیں کی جا سکتی اور ان کا حکم اللہ کے احکام کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ اللہ کے احکام کو نسخ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی نیا قانون بنا سکتے ہیں۔ بلکہ اُن پر لازم یہ ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے راستے پر چلیں اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہی حق ہے اور مومنین پر ہے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ سورہ حشر آیت 7 میں ہے: جو رسولؐ تمھیں دے دے اسے لے لو اور جس سے تمھیں روک دیں تو اس سے رک جاؤ۔

بعض مفسرین نے خیال کیا ہے کہ اولوالامر میں عصمت شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اولوالامر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو کسی بھی معاشرے میں حاکم بن جائے۔ اگر اس کے احکام شریعت کے مطابق ہوں تو اس کی اطاعت کرنا واجب ہو گی، اگر شریعت کے مطابق نہ ہوں تو اس کی اطاعت واجب نہیں کہ پھر یہ حدیث ہے مخلوق کی اطاعت اللہ کی معصیت میں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس صورتحال میں پھر معاشرے کے افراد کو اس کی مخالفت کرنا ہو گی

---

[1]۔ بہت ساری روایات من جملہ روایت جابر بن عبداللہ انصاری میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا اولی الامر سے آپ کے بارہ جانشین مراد ہیں اور آپؐ نے ان سب کا نام بھی ذکر کیا۔ (مترجم)

اور یہ کہ وہ اس کا حکم قبول نہ کریں کیونکہ جو فیصلہ وہ دے رہا ہے وہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکام کے خلاف ہے۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ اس آیت میں اطاعت کا حکم مطلق ہے، مقید نہیں ہے۔ اور امر کے صیغے سے ہے رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت لوگوں پر فرض ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولوالامر میں عصمت کا ہونا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں تمام احکام میں اس کی اطاعت واجب ہو گی۔ بعض مفسرین نے جو نظریہ پیش کیا ہے اولوالامر ہر حاکم کو شامل ہے اس میں خلفاء، علماء اور ہر قسم کے حکمران اور امراء آ جائیں گے اور حجاج بن یوسف جیسے ظالم بھی شامل ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ نظریہ درست نہیں ہے اور یہ حدیث ثقلین کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔

اس حدیث کے مطابق ''انی تارك فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی اهل بیتی''۔[1] سنی شیعہ دونوں کے حدیثی منابع میں یہ حدیث متواتر ہے اور کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ اس سے عصمت مآب لوگ ہی مراد ہیں جو قرآن کے ہم پلہ ہیں اور خود پیغمبرؐ نے ان کا تعارف کروایا ہے۔ اور '' اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ '' میں اس حکم کی مزید تاکید کی گئی ہے اور اس پر عمل کرنے کی سختی کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان جب اللہ پر ہے، اللہ کے رسولؐ پر ہے تو اُس میں اگر تم مومن ہو اور باطن میں کفر نہیں چھپا ہوا، نفاق نہیں ہے تو پھر اولوالامر کی اطاعت کرنی چاہیے۔ جب جھگڑا ہوتا ہے تو جھگڑے کے حل کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے بہتر کہاں سے فیصلہ مل سکتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت ہی بہتر ہے۔ ''تاویل'' مصلحت کے معنی میں ہے حقیقی مصلحت جو اس جھگڑے والے

---

[1]۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں باقی چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر ان سے تمسک کرو گے ان سے رابطہ میں رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میرے اہل بیتؑ، میری عترت ہے۔

معاملے میں فیصلہ ہے تو حقیقت پر مبنی فیصلہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے بتائے ہوئے قوانین سے ملتا ہے اسی پر عمل ہو گا تو بندگان کا حقیقی مفاد ہو گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس چیز پر ایمان لانے کا دعوی کرتے ہیں جو تجھ پر نازل کی گئی ہے اور اس چیز پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا فیصلہ شیطان سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اسے نہ مانیں، اور شیطان تو چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور جا ڈالے''۔

ایمان کا دعویٰ کافی نہیں

''زعم'' کسی چیز کا عقیدہ رکھنا، یہ عقیدہ واقعہ کے مطابق ہو یا واقعہ کے مطابق نہ ہو۔ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق ہوتا ہے تو وہ علم کے تحت ہوتا ہے اس میں شک نہیں ہوتا۔ یہ لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ مومن ہیں لیکن وہ تو اللہ کی اطاعت سے نکل گئے اور اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے گئے، ''طاغوت'' اسم فاعل ہے یا مصدر ہے اس کا معنی طغیان اور سرکشی ہے۔ اصطلاح میں جابر و سرکش حاکم کو کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص اللہ کی بندگی کے شرائط سے پھرا ہوا ہو۔ یا ہر وہ معبود جو غیر خدا ہے غیر خدا پر لفظ طاغوت بولا جاتا ہے ان سے کہا گیا تھا کہ تم اللہ کے پاس اپنا فیصلہ لے کر جاؤ، اللہ کے رسول ﷺ کے پاس فیصلہ لے کر جاؤ، یا اولوالامر کے پاس فیصلہ لے جاؤ جو قرآن کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔ لیکن وہ تو طاغوت کے پاس فیصلے لے گئے حالانکہ آسمانی کتابوں میں بھی ان کو حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں لیکن انہوں

نے اس بات پر عمل نہ کیا اور اپنے جھگڑے نپٹانے کے لیے طاغوت کے پاس گئے۔ اس عمل سے کہ انہوں نے اللہ کی کتابوں کو لغو و بے فائدہ بنا دیا اور شریعت کے قوانین کو باطل کر کے رکھ دیا۔ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ شیطان ان کو بڑی گمراہی میں لے جاتا ہے یہ جملہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس قسم کے لوگ جب طاغوت کے پاس جاتے ہیں تو یہ شیطانی القاء ہوتا ہے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی ہوتی ہے شیطان نے ان کو اغواء کیا ہوتا ہے اور شیطان کی تو غرض ہی یہ ہے کہ وہ انہیں اللہ کی اطاعت سے نکال کر دور لے جائے ۔ شیطان اپنے پیروکاروں کو بڑی گمراہی میں لے جاتا ہے اس طرح اسکی پیروی کرنے والے نجات اور سعادت سے دُور ہو جاتے ہیں، شیطان انہیں اللہ کا باغی اور مخالف بناتا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو چیز اللہ نے نازل کی ہے اس کی طرف آ جاؤ اور رسول کی طرف آؤ تب توں منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے پہلو تہی کرتے ہیں''۔

منافقین کی نشانی

''تَعَالَوْا'' تعالیٰ سے ہے اس کا معنی بلندی کیا جاتا ہے۔ آؤ اللہ کے حکم پر جو بلند ہے اور اس کے حکم اور فیصلے کے پابند ہو جاؤ۔ طاغوت کے پاس مت جاؤ، ظلم کے آگے مت جھکو، رب العالمین اور اس کی عدالت کی جانب آؤ۔ لیکن منافقین اس بات کو نہیں مانتے جب ان کو اس بات کی دعوت دی گئی بظاہر تو وہ ایمان کی بات کرتے ہیں لیکن اندر سے وہ ایمان نہیں لائے، زبان پر ایمان کا کلمہ ہے اندر سے منافق ہیں ۔ منافق کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ کے

فیصلے اور اللہ کے رسول ﷺ کے دیے ہوئے فیصلے پر عمل نہیں کرتے لہٰذا وہ کس طرح مومن کہلا سکتے ہیں؟

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾

"پھر کیسے (معذرت خواہ) ہوتے ہیں جب ان کے اپنے ہاتھوں سے لائی ہوئی مصیبت ان پر آتی ہے پھر تیرے پاس آ کر خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہمیں تو سوائے بھلائی اور باہمی موافقت کے اور کوئی غرض نہ تھی"۔

منافقین کی بہانہ تراشیاں

منافقین کے رویوں کی بات ہے کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حکم سے انحراف کرتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں، غیر خدا سے، طاغوت سے اپنا فیصلہ لیتے ہیں، لیکن جب ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو پھر معذرت کرنے کے لیے پیغمبر ﷺ کے پاس آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم جو فلاں طاغوت کے پاس چلے گئے تھے تو ہمارا کوئی برا نظریہ نہیں تھا بلکہ ہم تو یہ چاہتے تھے کہ جھگڑا ختم ہو جائے اور آپس میں توافق ایجاد ہو جائے اور اس بنا پر انکے حکم کو قبول کیا تھا لیکن ہماری نیت نیک تھی، ہماری نیت بری نہیں تھی۔ یہ منافقوں کا اندازِ بیان ہے لیکن اللہ ان کے اس انداز کو قبول نہیں کرتا اور اللہ کے احکام سے منہ موڑنا اُن کی ہلاکت ہے دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی ہے اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

أُولَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ يَعْلَمُ ٱللَّهُ مَا فِى قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِىٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، پس توں انہیں نظر انداز کر اور انہیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے''۔

عذر پیش کرنے والوں کو جواب

یہ جملہ عذر پیش کرنے والوں کو جھٹلانا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان کی نیت میں فتور ہے اور اُن کے اندر منافقت کی جو بیماری ہے اللہ اسے جانتا ہے لہٰذا اے میرے رسولؐ تم اُن سے رُوگردانی کرلو، ان سے منہ موڑے رکھو۔ البتہ انہیں نصیحت ضرور کرو اور ایسا انداز اپناؤ کہ ان کے دل میں بات بیٹھ جائے اور وہ سمجھ جائیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور متوجہ ہو جائیں کہ ان کی روش ٹھیک نہیں ہے اور اس کے پیچھے مفاسد ہیں اور انہیں پتہ ہونا چاہیے کہ منافقت عذاب کا سبب ہے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اس وجہ سے ہوتی ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۶۴﴾

''اور ہم نے کبھی کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اللہ کے حکم سے اس کی تابعداری کی جائے، اور جب انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا تو تیرے پاس آتے پھر اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کی معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً یہ اللہ کو بخشنے والا، رحم کرنے والا پاتے''۔

رسول بھیجنے کا ہدف اور طلبِ مغفرت کا انداز

اس آیت میں دو باتیں بتائی جا رہی ہیں،1۔منافقین کے سارے اعمال کا رَد موجود ہے کیونکہ اُن کے سارے اعمال میں اور کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی مخالفت موجود ہے۔ جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ یہ فرمارہا ہے کہ رسول بھیجا ہی اسی لیے جاتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے تاکہ لوگ سعادت کو پہنچیں۔ پہلی بات تو یہ ہو گئی کہ رسول کی اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ نے ہی فرمایا ہے کہ ان کی بات مانی جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے پر ظلم و زیادتی کی ہے بعد میں انہیں سمجھ آ گئی ہے اور وہ اپنے انحراف سے واپس آ گئے ہیں اپنی روش کو بدل دیا ہے اور عبدیت ، اللہ کی اطاعت اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت میں آ گئے ہیں لیکن بجائے گناہ کے بارے عذر پیش کرنے کے "عذر گناہ سے بھی بدتر" غلط روش اپنائی ہے۔اگر وہ صدق دل سے اپنے کئے پر نادم ہوتے اور استغفار کرتے تو پیغمبر اکرم ﷺ بھی ان کے لیے سفارش کرتے کہ اے اللہ ! ان کو معاف کر دے تو پھر اللہ بھی ان کی توبہ قبول کرلیتا وہ بڑا مہربان ہے۔ بات یہ ہے کہ سچے دل سے اپنے غلط کاموں کی بخشش کے لیے اللہ سے رجوع کریں۔اگر ایسا نہ کریں گے تو پھر انکا عذر پیش کرنا اصل گناہ سے بدتر ہے،انکی توبہ قبول نہ ہو گی۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

"سو تیرے رب کی قسم ہے یہ کبھی مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تجھے منصف نہ مان لیں پھر تیرے فیصلہ پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور خوشی سے قبول کرلیں"۔

رسول اللہؐ کے فیصلہ کو قبول کرلینا

حاکمیت کا منبع اللہ کی ذات ہے اس بات کو اس آیت میں بتایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں ہے۔ قانون شریعت کے سوا دوسرا کوئی قانون قابل قبول نہیں ، جو اللہ نے قوانین وضع کئے ہیں وہی لاگو اور رائج ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر یہ بات کہی ہے اور ایمان کی شرط یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مومن ہے تو مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر خدا کے قانون کی نفی کرے۔ منافقین جو خود کو مومن کہتے ہیں لیکن طاغوت ''غیر خدا'' کے پاس اپنے فیصلے لے جاتے ہیں تو یہ لوگ مومن نہیں ہیں اور ان کا ایمان کامل نہیں ہے۔ اس وقت ان کا ایمان کامل ہوگا جب وہ پیغمبر اکرم ﷺ ''جو اللہ کی طرف سے ہیں'' کو اپنا حَکَم بنائیں انہیں ایسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیں ، باطنی طور پر بھی اور ظاہری طور پر بھی ان کے سامنے تسلیم ہوں اور اس فیصلہ پر افسردہ نہ ہوں۔ انہیں اس فیصلہ پر اندر سے رنج نہ ہو، پیغمبرؐ جو فیصلہ دے دیں وہ اسے قبول کرلیں کیونکہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے ناراحت ہوں گے اور انکا فیصلہ انہیں پسند نہیں آئے گا تو گویا کہ انہوں نے اللہ کے فیصلے کو ناپسند کیا ہے۔ اللہ پر ایمان کی شرط ہی یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اطاعت کی جائے اور اُن کے حکم کو نافذ العمل جانا جائے۔ تسلیم کا معنی باطنی، قلبی اور ظاہری طور پر جھک جانا، قبول کرلینا اور کوئی اعتراض نہ کرنا اور دل میں بھی اُس فیصلے کے بارے ناراضگی نہ ہو۔ رسولؐ کے فیصلہ پر معترض نہ ہوں کیونکہ اگر وہ اللہ کے احکام اور قوانین پر ہونے والے فیصلے کو رد کریں گے تو یہ شرک ہوگا۔

''ان میں اکثریت خدا پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ وہ مشرک ہوتے ہیں'' (سورہ یوسف، آیت: 6)

یعنی ظاہری طور پر، زبانی ایمان کافی نہیں۔ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کے قوانین کو قبول نہیں کرتے۔ مشرک ہی رہیں گے۔ شرک سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے قوانین کو ظاہر اور باطن میں قبول کریں۔

وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ﴿۶۶﴾

''اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ تم اپنی جانوں کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے بہت ہی کم آدمی اس پر عمل کرتے، اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہوتا اور (دین میں) زیادہ ثابت رکھنے والا امر ہوتا''۔

اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا

اس آیت میں یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اگر اُن کے اجتماعی سسٹم میں، ان کی سوسائٹی ان کے لیے فیصلہ دیا جاتا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں یا اپنی اس جگہ کو چھوڑ دیں تو تھوڑی تعداد اس حکم کو مان جاتی، اکثریت نہ مانتی۔ اللہ نے یہ استثناء اس لیے کیا ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ سارے انسانوں میں ایسا ہی ہے اور کوئی ایک بھی اللہ کے حکم کو ماننے والا نہیں۔ قتل کی بات بھی اجتماعی طور پر ایک دوسرے کو قتل کرنا ہے نا کہ ایک آدمی اپنے آپ کو قتل کرے اس حکم سے یہ مراد نہیں ہے۔ گھر سے باہر نکلنا وطن چھوڑنے کے معنی میں ہے یعنی ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاؤ، خالی ایک آدمی کا گھر چھوڑنا مراد نہیں بلکہ پوری سوسائٹی کی بات ہو رہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اُن کو جو بھی نصیحت کی جاتی ہے یا جو حکم دیا جاتا ہے اس پر وہ عمل نہیں کرتے۔ اگر وہ اس پر عمل کریں تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا اور اُن کے لیے زیادہ استحکام کا سبب بنتا۔ یہ امر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے احکام اگرچہ ظاہری طور پر وجوب اور امر کی صورت میں ہیں اور بہتری اور سعادت کے لیے ہیں اور مستقیم راستے پر قائم رہنے کے لیے ہیں۔ ان اعمال میں اُن کی دنیا و آخرت کی خیر ہے۔ ان کے دل ایمان ہی سے استوار ہو سکتے ہیں۔ تو یہ سمجھایا گیا ہے کہ اُن کو جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ اس پر عمل کریں تو یہ اُن ہی کے لیے بہتر ہے، ایسا کرنا اُن کے ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ ہے اور انکے ایمان کا ثبوت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ کریں تو پھر یہ اُن کے اپنے نقصان میں ہے۔

وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾

"اور اس وقت البتہ ہم ان کو اپنے ہاں سے بڑا ثواب دیتے"۔

وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

"اور البتہ انہیں سیدھا راستہ دکھاتے"۔

اطاعت کرنے والوں کیلئے انعام

جب صراط مستقیم کے بارے ہم نے بتادیا ہے کہ یہ اُن کا راستہ ہے جن پر ان کو چلنا ہے اور اللہ تعالٰی نے یہ نعمات جن کو عطا کی ہیں جیسے انبیاءؑ، صدیقین، صالحین ہیں۔ یہ اُن کا راستہ نہیں جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے اور گمراہوں کا راستہ بھی نہیں۔ جیسا کہ سورہ حمد میں گزر چکا ہے۔ تو صراط مستقیم وہی راستہ ہے " اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ " جن پر تو نے انعام کیا ہے، مہربانی کی ہے۔ ایسے لوگ جو نصیحتوں کو قبول کرلیں اور جو کچھ اُن سے کہا گیا ہے وہ اُس پر

عمل کریں اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کریں تو یہی ان کے لیے صراط مستقیم کی ہدایت ہے۔اور یہ اللہ کا اطاعت گزاروں کے لیے بڑا انعام ہے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ﴿۶۹﴾

”اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا فرمانبردار ہو تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحین میں سے ہیں، اور یہ رفیق کیسے اچھے ہیں“۔

اللہ اور رسولؐ کے پیروکاروں کے رفقاء

اس آیت میں پچھلی بات ”صراط مستقیم“ کی ہدایت کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے احکام اور قوانین کو لیتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے آگے تسلیم ہوتے ہیں تو اُن افراد کے ساتھ اُن کا الحاق ہو گا کہ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہوا ہے جنہیں اپنی نعمت دی ہوئی ہے، اگرچہ یہ خود ان میں سے نہیں ہیں لیکن پہلی آیت کے مطابق کہ اللہ نے انہیں صراط مستقیم کی ہدایت کر دے گا، جب صراط مستقیم کی ہدایت ہو جائے گی تو جیسا کہ سورہ حمد میں آیا ہے یہ لوگ صراط مستقیم پر ہونے کی وجہ سے انعام یافتہ ہو جائیں گے۔ انعام یافتہ اس آیت میں انبیاءؑ ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ صدیقین ہیں جو بہت سچے ہیں، عمل میں، گفتار میں صدق کا غلبہ ہے، عقیدے کی صداقت، عمل کی صداقت، گفتگو کی صداقت۔ شہداء جو اعمال پر گواہ ہیں، ان سے جنگ میں قتل ہونے والے مراد نہیں۔ صالحین ہیں ایسے نیک لوگ جو ایسی نعمت حاصل

کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ ایسے افراد بہت اچھے ساتھی ہیں، لائق تعریف ساتھی ہیں۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت پانے والوں کے رفقاء یہ چار گروہ ہوں گے انبیاءؑ، صدیقین، شہداء، صالحین۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝

''یہ اللہ کی طرف سے احسان ہے، اور اللہ کافی ہے جاننے والا''۔

فضیلت اللہ کی جانب سے ہے

یہ سب کچھ اللہ کا فضل ہے۔ یہ بات تمام فضائل کی جامع ہے یہ سب فضائل کو شامل ہے۔ اس آیت کو اللہ کے علم پر ختم کیا ہے، یہ اس لیے ہے کہ آیت میں جو گفتگو ہوئی ہے یہ ایمان کے درجات اور مراتب کے بارے میں ہے، علم الٰہی کے سوا کوئی امر اس کو نہیں جانتا۔ علم الٰہی کے علاوہ کسی اور کے ذریعے اس کی تشخیص بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کے لیے کیا فضیلت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝۷۱

''اے ایمان والو! اپنے ہتھیار لے لو پھر جدا جدا فوج ہو کر نکلو یا سب اکٹھے ہو کر نکلو''۔

جنگی حکمت عملی

''حذر'' چوکنا رہنے کا ذریعہ، اس سے مراد اسلحہ ہے۔ ''نفر'' کسی مقصد کے لیے کوچ کرنا۔ اس کا معنی جماعت کا متفرق ہونا۔ آیت میں کہا جا رہا ہے کہ اپنے بچاؤ کا ذریعہ اسلحہ اٹھاؤ اور باہر جانے کے لیے تیاری کرو، دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے گروہ گروہ جاؤ یا اکٹھے جاؤ پورا لشکر دشمن کی طرف حرکت کرے۔ تمہارے اس طرح نکلنے کی کیفیت کا تعلق دشمن کی

کمزوری اور طاقت اور ان کی تعداد سے مربوط ہے، اگر دشمن کی تعداد کم ہو، کمزور ہو تو پھر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جائیں۔ اگر دشمن زیادہ ہوں تو پھر اکٹھے ہو کر نکلو۔ دشمن شناسی کرو اور پھر اسی مناسبت سے تیاری کر کے نکلو۔

وَ اِنَّ مِنۡکُمۡ لَمَنۡ لَّیُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنۡ اَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَالَ قَدۡ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیَّ اِذۡ لَمۡ اَکُنۡ مَّعَہُمۡ شَہِیۡدًا ﴿۷۲﴾

''اور بے شک تم میں ایسا شخص بھی ہے جو (لڑائی سے) جی چراتا ہے، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ تھا''۔

جنگ سے جی چرانے والے

''منکم'' سے مراد وہ منافقین ہیں کہ جو جنگ کی بات جب بھی آتی تو بہانے بناتے تھے اور جنگ میں اگر شکست ہو یا کچھ قتل ہو گئے تو وہ کہتے ہیں خدا نے ہمارے اوپر انعام کیا خدا کا شکر ہے کہ ہم میدانِ جنگ میں موجود نہیں تھے ورنہ ہم بھی مارے جاتے۔ اللہ نے ہمارے اوپر رحم کیا کہ ہم جنگ میں نہیں گئے مومنین کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ ان کی یہ بات حقیقت میں اللہ کی نافرمانی ہے، اللہ کے فرمان کا مذاق ہے اور مومنین کی توہین ہے جو مجاہدین ہیں، منافقین ہی ایسا کہہ سکتے ہیں اور ان کی مذمت کی گئی ہے۔ منافقین کی سوچ قابل مذمت ہے۔

وَ لَئِنۡ اَصَابَکُمۡ فَضۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ لَیَقُوۡلَنَّ کَاَنۡ لَّمۡ تَکُنۡۢ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہٗ مَوَدَّۃٌ یّٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ مَعَہُمۡ فَاَفُوۡزَ فَوۡزًا عَظِیۡمًا ﴿۷۳﴾

''اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو وہ اس طرح کہنے لگتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان دوستی کا کوئی تعلق ہی نہیں کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑی مراد پاتا''۔

جنگ میں کامیابی کے بعد منافقین کا اظہارِ خیال

اگر جنگ میں کامیاب ہو جاؤ، مال غنیمت مل جائے تو وہ کہتے ہیں کاش! ہم بھی موجود ہوتے کیونکہ سارے مومنین ایک ہاتھ کی مانند ہیں اور اُن کے درمیان ایمان کا رابطہ مضبوط ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان، اللہ کی آیات پر ایمان اور یہ تمام روابط سے بڑا مضبوط رابطہ ایمان کا رابطہ ہے باپ بیٹے اولاد اور رشتہ داروں کے تعلق سے زیادہ مضبوط ایمانی مودت ہے، باقی سب رشتے اس کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں منافقین کے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہیں حالانکہ ان کے درمیان مومنین کا کوئی رابطہ اور تعلق موجود ہی نہیں خالی آرزو کرتے ہیں، کاش! ہم بھی ان میں سے ہوتے۔ ان کا ایمان کمزور ہے جب غنائم ملیں اور بڑی کامیابی ہو تو اس وقت وہ ایسی بات کرتے ہیں اور اگر مومنوں پر کوئی مصیبت آجائے وہ قتل ہو جائیں، زخمی ہو جائیں تو کہتے ہیں شکر ہے کہ ہم موجود نہیں تھے ہمارے اوپر اللہ نے کرم کر دیا۔ منافقوں کے اندازِ بیان کو یہاں بیان کیا جارہا ہے اور یہ سمجھایا جارہا ہے کہ منافقین کا رویہ خدا پسند رویہ نہیں ہے اور ان کا یہ انداز ان کی منافقت کی وجہ سے ہے۔ انہیں اس قسم کی آرزو کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۷۴

''پھر چاہیے کہ اللہ کی راہ میں وہ لوگ لڑیں جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے بیچتے ہیں، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا غالب رہے تو اسے ہم بڑا ثواب دیں گے''۔

اللہ کی راہ میں جنگ کا ثواب

اس آیت میں مومنوں کو ابھارا جا رہا ہے، ان کو شوق دلایا جا رہا ہے کہ جہاد کے معاملے میں سستی نہ کریں، بہانے بازی نہ کریں جو دنیا کے بدلے آخرت لینا چاہتا ہے تو اللہ کی راہ میں وہی جہاد کرتا ہے وہ اگر اس جہاد کے راستے میں قتل ہو گا یا غالب آئے گا۔ دونوں طرف اس کے لیے بڑا اجر اور ثواب ہے، ہر صورت بڑا ثواب ان کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں جو دو چیزوں میں سے ایک پر منتج ہو گا، دونوں امر پسندیدہ ہیں یا تو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں گے تو یہ بھی پسندیدہ عمل ہے یا دشمن پر غالب آجائیں گے تو یہ بھی پسندیدہ عمل ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے دونوں حالتوں میں بڑا ثواب ہے۔ اللہ کی راہ میں قتل ہونے کو دشمن پر غلبہ سے پہلے بیان کیا ہے کیونکہ قتل ہونے کا ثواب زیادہ ہے اور پائیدار تر ہے کیونکہ جو دشمن پر غالب ہوتا ہے اس کے لیے بڑا اجر ہے لیکن اس کا یہ اجر خطرے میں رہتا ہے کیونکہ ممکن ہے اس پر غرور آجائے یا وہ کچھ اور گناہ کر بیٹھے جس سے اس کا وہ اجر ہاتھ سے جاتا رہے۔ جس طرح اور اعمال میں بھی ہوتا ہے لیکن اگر راہ خدا میں قتل ہو جاتا ہے تو قتل ہونے کے بعد دنیاوی زندگی تو ہے ہی نہیں تاکہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہو اور شہادت کا ثواب زائل ہو جائے۔ لہٰذا شہادت کا ثواب پائیدار تر ہے اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ جنگ سے فرار کرنے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ جو مجاہد فی سبیل اللہ ہے وہ کبھی جنگ سے فرار نہیں کرتا، جنگ سے وہی فرار کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نہیں گیا ہوتا، مال غنیمت جمع کرنے کے لیے جاتا ہے، جب گھمسان کی جنگ ہو رہی ہوتی ہے اور وہ خود کو خطرہ میں دیکھتا ہے تو وہ

میدانِ جنگ سے فرار کر جاتا ہے لہٰذا ایسے کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ جنگ سے فرار کرنے والے نامراد اور ناکام ہیں۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝٧٥

''اور کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور ہمارے لیے اپنے ہاں سے کوئی حمایتی کر دے اور ہمارے لیے اپنے ہاں سے کوئی مددگار بنا دے۔''

مظلوم اور بے سہارا لوگوں کی امداد

اس آیت میں سب مومنین کو خطاب ہے البتہ ایسے مومنین مراد ہیں جو طاقتور اور مضبوط ہوں انکا ایمان پختہ ہو۔ وہ مومنین جو کمزور ہیں، بے سہارا ہیں انکا اللہ پر ایمان ہے، اللہ کی ربوبیت پر ایمان ہے لیکن مظلوم اور بے چارہ ہیں لوگ اُن کو اذیتیں دے رہے ہیں اور وہ فریادی ہیں، مدد مانگ رہے ہیں۔ ایمان ایسا رشتہ ہے جو دوسرے تمام نسبی، قومی، علاقائی تعلقات سے بالاتر ہے۔ عقیدتی رابطہ ہی حوالہ ہے لہٰذا مومنوں کو چاہیے کہ ایسے افراد کی نجات کے لیے قدم اٹھائیں اُن کا ایمان اتنا مضبوط ہے کہ وہ فقط اللہ سے مدد مانگ رہے ہیں اور اللہ سے کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ ! ہمارے لیے کوئی یاور و سرپرست بھیج دے ، اپنے

دوستوں سے یا اپنے خاندان سے مدد نہیں مانگ رہے، خدا سے مدد کے طالب ہیں۔ لہٰذا مومنوں سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ایسے بے سہارا اور مظلوم مومنوں کی مدد کے لیے نہیں جاتے۔ اس اندازِ بیان سے تاکید کی گئی ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

"جو ایمان والے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، اور جو کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں سو تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو، بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے"۔

مومنوں اور کافروں کے درمیان فرق

اس آیت میں مومنوں اور کافروں کا تقابل کیا گیا ہے۔ مومنین کا منتہیٰ نظر اللہ تعالیٰ ہے اور وہ کفار کے راستے کے مخالف ہیں۔ کفار کا راستہ طاغوت پر جا ختم ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مومنین کی جنگ کافروں کے ساتھ ہے، مومنین کو آمادہ کیا جارہا ہے کہ وہ غیر اللہ سے جنگ کریں جبکہ کافر شیطان کے دوست ہیں۔ وہ اللہ کی ولایت سے باہر ہیں ان کا کوئی مولا نہیں ہے۔ شرک اور کفران کا سبب ہے کہ وہ شیطان کے شکنجے میں ہیں جبکہ شیطان کی تمام منصوبہ بندیاں کمزور ہیں کافروں کی جو روش طاغوت والی روش ہے اور طاغوت والی روش شیطان کی مکاری ہے اور یہ رویہ کمزوری کے سوا کچھ نہیں کیونکہ جو اللہ اور اللہ کے راستے میں کھڑے ہیں وہی غالب ہیں جبکہ اللہ قادر مطلق ہے۔

"اللہ ہی کے لیے ہے ہر قسم کی طاقت اور قوت" (سورہ البقرہ، آیت: 165)

راہ خدا کی نسبت شیطان کی جو سازشیں ہیں وہ کمزور ہیں اگرچہ جو ہوا پرست، خواہشات کے پجاری ہیں اُن کے حوالے سے شیطان کی سازشیں بڑی مضبوط ہوتی ہیں وہ انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں لیکن شیطان جب مومنوں کے مقابلے میں آتا ہے تو اللہ کی منصوبہ بندی کی وجہ سے اس کی ساری منصوبہ بندی کمزور پڑ جاتی ہے۔ مومنوں پر شیطان کا بس نہیں چلتا۔ اللہ کی قدرت مطلقہ سے شیطان ناکام ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۷﴾

”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ دو، پھر جب انہیں لڑنے کا حکم دیا گیا اس وقت ان میں سے ایک جماعت لوگوں سے ایسا ڈرنے لگی جیسا کہ اللہ کا ڈر ہو یا اس سے بھی زیادہ ڈر، اور کہنے لگے اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں فرض کیا، کیوں نہ ہمیں تھوڑی مدت اور مہلت دی، ان سے کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے، اور ایک باریک دھاگے کے برابر بھی تم سے بے انصافی نہیں کی جائے گی“۔

مسلمانوں کی عمومی حالت زار

اس آیت میں مسلمانوں کی عمومی حالت کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو مسلمان شروع شروع میں کہتے تھے کہ ہمیں حکم دیں ہم ان کافروں پر ٹوٹ پڑیں گے ان کو ماریں گے تو حضور پاک ﷺ فرماتے تھے نہیں! تم ابھی تلوار مت اُٹھاؤ یہاں تک کہ اسلام اس میں طاقت آجائے اور اُن کو فرماتے تھے کہ تم ہی نماز پڑھو اور اپنے مال سے زکوۃ دو اور اسلام کو مضبوط کرنے میں مصروف رہو لیکن جب اللہ نے جنگ کا حکم صادر کر دیا تو وہ کافر جو خود انہی کی طرح انسان ہی تھے وہ اُن سے اتنے ڈرے کہ اللہ سے اتنا نہیں ڈرتے تھے حالانکہ انہیں تو چاہیے تھا کہ ان میں اللہ کا ہی خوف رہتا اور اپنے جیسے انسانوں سے خوف نہ کھاتے وہ یہ کہنے لگے کہ اے اللہ! ہم پر تو نے جہاد واجب کر دیا ہمیں اسی دُنیا میں رہنے دیتے تو کیا ہو جاتا ،ہم اسی سے فائدہ اٹھاتے رہتے اور ہمیں موت آجاتی۔

ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں کیوں تھوڑی عمر دی ہے ہم اسی دُنیا میں رہ کر فائدہ اٹھاتے رہتے۔ ہمارے اوپر تو نے جہاد فرض کر دیا، گویا وہ فرض کر چکے کہ جیسے ہی وہ جنگ میں جائیں گے تو مارے جائیں گے وہ سمجھنے لگے کہ جہاد کے ذریعے ہماری موت قریب کر دی گئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو یہ جو دُنیاوی فائدے ہیں یہ تھوڑے وقت کے لیے ہیں آخرت تمہارے لیے بہتر ہے اس کے لیے تم تقویٰ اختیار کرو اور وہاں پر تمہارے اوپر کوئی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی جو کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ دُنیاوی زندگی بے ارزش اور بے حیثیت ہے اور جہاد کی جو کرامت اور عظمت ہے اس کا مقابلہ کسی اور سے نہیں کیا جا سکتا، اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا بہت بڑا اجر ہے اور اب جن کا قبلہ دُنیاوی اُمیدیں تھیں اور اُسی پر ان کی ساری توجہ تھی انسان کے تکامل اور ارتقاء پر ان کی نظر نہیں تھی۔ تو اللہ فرما رہا ہے کہ اگر انسان میں تقویٰ ہو تو آخرت میں یہی تقویٰ کامیابی کا ذریعہ بنے گا اور خداوند تبارک معمولی

رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا، دنیا میں جو نیکی اور اچھائی کی ہے آخرت میں اس کا بدلہ پائیں گے اور انہیں بڑا اجر اور ثواب ملے گا پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تمہیں اجر نہ دے۔ یہ دُنیا کا معمولی سا فائدہ ہے اس کو اختیار کرو اور آخرت کے جو بڑے فوائد ہیں اس کو چھوڑ دو یہ ٹھیک نہیں۔ان مسلمانوں کی جو سوچ تھی اسے رد کیا گیا ہے اور انہیں سمجھایا گیا ہے کہ جہاد کے جو فائدے ہیں وہ تمہیں کسی اور عمل سے حاصل نہیں ہوں گے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

"تم جہاں کہیں ہوگے موت تمہیں آ ہی پکڑے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو، اور اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے، کہہ دو کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی"۔

موت کا ہر حال میں آنا

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ پکے پختہ گنبدوں اور میناروں میں چھپ بیٹھو، تو بھی موت تمہیں آلے گی، موت سے تم بچ نہیں سکتے، موت حتمی چیز ہے اور جتنے انسان بھی ہیں اُن کے اوپر موت لکھی جا چکی ہے، اگر موت سے فرار کرکے جہاں بھی پناہ لینا چاہو تم ان سے

بھاگ نہیں سکتے یہ خیال دل سے نکال دو، لہٰذا جنگ میں حاضر ہوں یا جنگ میں حاضر نہ ہو موت سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی حالت بتا رہا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟ اگر اچھائی مل جائے، مالی فائدہ مل جائے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے آیا ہے اور اللہ کا ہمارے اوپر کرم ہو گیا۔ اگر بیماری آ جائے یا تکلیف آ جائے تو کہتے ہیں یہ تمہاری وجہ سے ہے۔ یہاں ان کی دو لغزشیں بیان کی جا رہی ہیں کہ مسلمانوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ وہ اعتراض کرتے ہیں جیسے یہودی اپنے نبیوںؑ پر اعتراض کیا کرتے تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا۔ سورہ البقرہ آیت 119 کہ ان کے دل اُنہی کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔ان کے دلوں میں بھی وہی خیالات آتے ہیں جو ان کے دلوں میں تھے۔

بہر حال اس آیت کے ضمن میں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ نیکی اور اچھائیاں، جیسے جنگ میں کامیابی ہو گئی اور غنیمت مل گئی تو وہ کہیں گے کہ یہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر قتل ہو گئے یا زخمی ہو گئے یا قیدی ہو گئے تو پھر کہیں گے کہ یہ تو تمہاری وجہ سے ہے۔ اچھے حالات کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں اور برے حالات کی پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ ان کا ایسا اندازہ لگانا کسی بھی حال میں ٹھیک نہیں۔انکا یہ کہنا کہ مدیریت اچھی نہیں تھی منصوبہ بندی اچھی نہیں تھی اس لیے ہمیں نقصان ہو گیا، ورنہ ہم شکست نہ کھاتے۔ مومن کو معلوم ہونا چاہیے کہ جتنے بھی حادثات و واقعات ہوتے ہیں وہ سب اللہ کے ارادے سے ہوتے ہیں اسی کے طے شدہ نظام کے تحت انجام پاتے ہیں۔ پوری کائنات کے نظام کا ناظم اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کی ایجاد میں، اُن کی بقاء میں، اُن کی حرکات و سکنات میں، جو بھی واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں اُن سب کے پیچھے اللہ کا ارادہ اور اللہ کی مشیت موجود ہے۔ ساری کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے ارادے کے تحت اپنا اپنا کام کر رہا ہے اور یہ ان کا جمود فکری ہے اور ان کی عقلیں سوئی ہوئی ہیں کہ وہ ایسی باتیں کر رہے

ہیں۔ یہ ان کی ناسمجھی اور حقیقت کا ادراک نہ کرنا ہے۔ لہٰذا انہیں کیا ہوا ہے کہ وہ اس قسم کے مطالبات کی بات کر رہے ہیں؟

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فتح وکامرانی اور شکست و ناکامی اللہ کے ارادے اور مشیت کے تحت ہے اور ہر بات اور ہر کام ایک سبب کے تحت انجام پا رہا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ ناکامی کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی مدیریت اور صحیح منصوبہ بندی نہ کرنا ہے ایسا ہرگز نہیں۔ انکی ایسی بات کرنا بے عقلی اور بے ناسمجھی ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٧٩﴾

"(اور کہہ دو کہ) تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور تجھے جو برائی پہنچے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے، (اے رسول) ہم نے تجھے لوگوں کو پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور اللہ کی گواہی کافی ہے"۔

اچھائی اور برائی کی نسبت دینا

اس آیت میں ان مومنوں کو خطاب ہے، جو کمزور دل والے ہیں۔ بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے لیکن اصل میں کمزور ایمان والوں کو سمجھانا مقصود ہے۔ وہ مومنین جن میں اللہ کے کلام کو درک کرنے کی لیاقت ہی نہیں ہے اچھائیوں ور برائیوں کی حقیقت کا جو بیان ہے وہ اس کو سمجھ ہی نہیں پائے اور یہ کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اسے وہ درک نہیں کر سکے۔ منشاء اور مبداء تو اللہ سے ہے لہٰذا رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ کوئی بھی مستقل نہیں، سارے انسان چاہے رسول ہو یا غیر رسول ہو سب کو اللہ کی طرف سے اچھائیاں، منافع مل رہے ہیں۔ کوئی عافیت ہے، نعمت ہے، امنیت ہے، آسائش ہے سب اللہ

سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اگر وہ امور جو انسان کی طبیعت اور مزاج کے خلاف ہیں جیسے بیماری ہے، ذلت ہے، فقر ہے، بیچارگی ہے، فتنہ ہے، نا امنی ہے تو یہ خود انسانوں کے اپنے کئے دھرے کا نتیجہ ہوتا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ تو نہیں چاہتا کسی کو تکلیف پہنچائے۔ یہ تکالیف جو انسان کی طرف آتی ہیں تو یہ ان کے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہیں، اس میں کوئی منافات نہیں۔

ہر کام سبب کے تحت ہے، اسباب کا خالق اللہ ہے لہٰذا اچھائی، برائی اللہ کی طرف سے ہے لیکن برائی کے اسباب کا انتخاب تو خود انسان کرتا ہے۔ اس وجہ سے برائی اور نامساعد حالات خود انسان کے اپنی طرف سے ہیں۔ انکا انتخاب ہی غلط تھا اللہ نے تو ایسا نہیں چاہا کہ وہ برے نتیجے والے سبب کا انتخاب کرے۔ ہم نے تجھے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے اور تیری رسالت کی حقانیت کی گواہی کے لیے اللہ ہی کافی ہے لہٰذا آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے تم ہمارے رسول ہو اور تو کوئی سمت آپ کے پاس نہیں ہے اور مخلوق کے جو اعمال ہیں وہ تیرے ہاتھ میں تو نہیں تاکہ وہ ناپسندیدہ اعمال کو تیری طرف نسبت دیں اور نا ہی تو اچھائیاں اور خوبیاں ان کو دے سکتا ہے۔ یہ تو سب ایک نظام کے تحت ہے سارا سلسلہ اس نظام کے تحت چل رہا ہے۔ آپ کا کام تو فقط یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے تم مبلغ ہو اللہ کے پیغامات کو پہنچانا آپ کا کام ہے ۔جس نے وہ پیغام مان لیا تو اس کے فوائد وہ ہی حاصل کرے گا اور جس نے نہ مانا تو اسی کا نقصان ہو گا۔ اللہ اس کے بارے گواہی دے رہا ہے وہی میرے لیے کافی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ شاہد اور گواہ ہے ظاہر پر بھی اور باطن پر بھی۔ جو حسنہ اور اچھا کام ہے اس کا اجر دیتا ہے اور جو برا کام ہے اللہ اس پر سزا دیتا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ﴿۸۰﴾

''جس نے رسول کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا، اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا''۔

رسول اللہؐ کی بات کو ماننا

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا گیا کہ آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے، مانیں یا نہ مانیں۔ اگر مان جاتے ہیں تو تیری اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے، اگر تیری بات کو نہیں مانتے تو اب تیری ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ ان کے اوپر محافظ اور نگہبان بن کر کھڑے ہو جائیں۔ تیرا کام یہی تھا کہ آپ نے میری بات ان تک پہنچا دی، ہم نے تجھے ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا، اگر بات نہیں مانی تو اس کا نقصان خود انہوں نے اُٹھانا ہے۔

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

''اور کہتے ہیں کہ قبول کیا پھر جب تیرے ہاں سے باہر جاتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورہ کرتا ہے، اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں، پس تو ان کی پروانہ کر اور اللہ پر بھروسہ کر، اور اللہ کارساز اور کافی ہے''۔

رسول اللہؐ کے بارے منافقوں کی سازش

یہاں پر منافقین کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ بظاہر تو جب وہ آپ کی باتیں سنتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تیری اطاعت کریں گے لیکن جب گھروں کو جاتے ہیں رات ہوتی ہے تو اکٹھے

بیٹھ کر سازشیں تیار کرتے ہیں اور جو کچھ تجھ سے کہا ہوتا ہے اس کے برعکس کرتے ہیں۔ مخفیانہ طور پر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اُن کے دل کی نیتوں سے آگاہ ہے اور اللہ جانتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف منصوبہ بندی اور سازشیں تیار کرتے ہیں، اللہ ان کے اعمال کے صحیفے میں اُن کی تمام تدبیروں اور ان سازشوں کو تحریر میں لے آتا ہے یعنی فرشتے سب کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے یہ دستور دیا کہ ان سے رُخ موڑ لو اور ان سے خیر کی توقع نہیں۔ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ رکھو جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا ہی اس کے لیے کافی ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے، اور اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت اختلاف پاتے"۔

قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے کا واضح ثبوت

"تدبر" کا مطلب کسی امر پر پوری دقت سے غور کرنا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز کے بعد وصول کرنا اور قرآن کی جتنی آیات ہیں ایک کے بعد دوسری آیت ہے اس میں دقت کرنا اور اسے غور سے پڑھنا اور ایک کے بعد دوسری آیت کو دیکھنا، اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو جیسے ہی ایک کے بعد دوسری آیت میں غور کرتے تو انہیں آیات میں بہت سارا اختلاف نظر آتا۔ اس بات سے لوگوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ قرآن میں غور کریں اس میں تدبر کریں اس میں توجہ سے دیکھیں تاکہ اُن کے لیے واضح ہو جائے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے اس میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ

جملہ استدلال کے حوالے سے بہت ہی مضبوط ہے اپنے ظاہری بیان کے حوالے سے بھی بہت ہی متین اور پختہ اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کیونکہ اگر انسانوں میں سے ایک فرد اپنے بارے میں اپنے اقوال کے بارے اپنے اعمال کے بارے دیکھے تو وہ اختلاف سے بچا ہوا نہیں۔ اگر قرآن میں اختلاف موجود نہیں ہے تو یہ ثبوت ہے کہ یہ قرآن انسانوں کا بنایا ہوا نہیں اللہ کی جانب سے ہے۔ بلکہ انسانوں کے درمیان جو اختلافات اور جھگڑے موجود ہیں ان کے حل کے لیے اور انکے تنازعات کو دور کرنے کے لیے قرآن اترا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ان کے پاس امن یا ڈر کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو وہ اسے مشہور کر دیتے ہیں، اور اگر اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو وہ اس کی تحقیق کرتے جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو البتہ تم شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے چند لوگوں کے"۔

بغیر تصدیق خبر پھیلانے میں جلدی نہ کرنے کا حکم

اس آیت میں ایسے مومنین کی بات کی جا رہی ہے جو سست ایمان ہیں اور کافروں کی بے تکی باتیں جب ان کے پاس آتی ہیں جو مومنین کے درمیان نفاق پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں

وہ ان کی باتیں سن کر فوراً اسے نشر کر دیتے ہیں اور یہ سوچتے نہیں کہ یہ خبریں مسلمانوں کی ہمت کو کمزور کر دیں گی اور ان میں سستی لے آئیں گی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انہیں اس عمل سے منع کر رہا ہے کہ ایسا کرنا شیاطین کی پیروی ہے اور اس طرح جو سازشیں کرنے والے ہیں وہ مومنین کو ذلت و خوارگی میں لے جائیں گے۔ یہ آیت بدر صغریٰ کے حوالے سے ہے اور ان آیات کے ذریعہ لوگوں کو آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ کافروں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار رہیں۔ اسی لیے انہیں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی بات تم تک پہنچتی ہے تو فوراً اس کو آگے مت بتاؤ بلکہ اُس کے بارے میں دقت کرو اور خود آ کر رسول اللہ ﷺ کو بتاؤ یا جو تمہاری کمانڈ کر رہا ہے اس کو بتاؤ۔ "استنباط" کا معنی کسی بات کو ابہام اور پیچیدگی سے نکالنا اور اسے معرفت کے مرحلے میں پہنچانا۔ "نبط" وہ پہلا پانی ہوتا ہے جو کنوئیں سے نکلتا ہے لیکن وہ کون ہے جو مختلف باتوں کو سن کر ان سے صحیح بات کو نکال سکے اور حقائق کو صحیح سمجھ سکے؟ تو وہ پیغمبر اکرم ﷺ ہی کی ذات ہے یا اولوالامر ہیں کہ جو اللہ کی جانب سے محفوظ عن الخطاء ہیں۔ یہاں اولوالامر سے مراد معصوم افراد ہیں جو اہل البیت علیہم السلام سے ہیں، نا وہ جو اہل تقویٰ نہیں تھے یا منافقین سے تھے جیسے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی اور وہ جو جنگ میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر اللہ کا فضل اور کرم ان پر نہ ہوتا تو انگلیوں پر گنے چنے چند افراد، انگشت شمار بدر صغری میں باقی رہتے۔

یہاں بدر صغری کی طرف اشارہ کہ ابوسفیان نے نعیم بن مسعود کو مدینہ بھیجا تھا وہاں پر جا کر غلط قسم کی خبریں پھیلائے اور مسلمانوں کے درمیان پریشانی ڈال دے اور اُنہیں جنگ میں شرکت سے روکے اور اس کی سازش سے کوئی بھی نہ بچا سوائے پیغمبر اکرم ﷺ اور آپ کے خاصان کے۔ ''الا قلیلا'' اسی طرف اشارہ ہے۔ شیطان کی پیروی سے مراد کافروں کی خبروں کی تصدیق کرنا ہے اور ان سے اثر لینا ہے۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

''سو تم اللہ کی راہ میں لڑو سوائے اپنی جان کے توں کسی کا ذمہ دار نہیں، اور مسلمانوں کو تاکید کر، قریب ہے کہ اللہ کافروں کی لڑائی روک کر دے، اور اللہ لڑائی میں بہت ہی سخت ہے اور سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے''۔

اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کا حکم

اس آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے کہ لوگ تو جہاد کرنے میں سستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ وہ جنگ میں شرکت کریں اور تجھے تنہا چھوڑتے ہیں تو اے پیغمبر ﷺ تم خود کافروں کے مقابلے میں نکل کھڑے ہو اور ان کی سستی اور ان کا نہ چلنا اور انکے پیچھے رہ جانے سے پریشان نہ ہوں کیونکہ دوسروں کے جو فرائض ہیں یا ان کی جو ذمہ داریاں ہیں اُس کا آپ سے تعلق نہیں ہے۔ آپ اپنی ذمہ داری کو ادا کریں آپ کی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ انہیں جہاد کے حوالے سے شوق دلائیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

یہاں ''تکلیف'' کا لفظ مشقت کے معنی میں ہے یعنی اپنے آپ کو مشقت پہنچاؤ، دوسروں کو آمادہ کرو کہ وہ جنگ کے لیے نکلیں۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کافروں کی مضبوطی اور اُن کا جو استحکام ہے اللہ اس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کر دے گا اور خدا سخت تر بھی ہے اور اس کا عذاب زیادہ سخت ہے۔ یہاں لفظ ''عسی'' اللہ کے لیے آیا ہے ''امید کی جاسکتی ہے'' یہ معنی مراد نہیں کیونکہ اُمید رکھنا اللہ کے حوالے سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اُمید اور خواہش تو مخاطب کی طرف ہو سکتی ہے۔ یہاں پر مخاطب رسول اللہ ﷺ اور مومنین ہیں، اس جگہ

''عسی'' کہہ کر یہ کہا جارہا ہے کہ تم یہ امید رکھو کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اُن کی طاقت کے سامنے رکاوٹ ڈال دے اور اللہ کی طاقت تمام طاقتوں پر فوقیت رکھتی ہے اور اللہ کا ایسا عذاب بھی ایسا ہے کہ کوئی اور ایسا عذاب نہیں دے سکتا۔ اللہ کے عذاب کو کسی نے دیکھا ہی نہیں اور جو دوسرے مکلفین ہیں اُنہیں کافروں کی سزا سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور دنیاوی عیش و عشرت کی ہوس میں اللہ نے جو جنگ و قتال کا حکم دیا ہے اس سے تخلف نہ کریں۔ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کافروں کے مقابلہ کے لیے جنگ میں نکلیں۔

''تنکیل'' ایسا عذاب جس سے بچا نہیں جا سکتا۔ باقی مکلفین اور پیچھے رہنے والے کافروں کی سزا کو دیکھ کر یا اسے جان کر عبرت حاصل کریں اور اللہ کے حکم کی نافرمانی نہ کریں۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

''جو کوئی اچھی بات میں سفارش کرے اسے بھی اس میں سے ایک حصہ ملے گا، اور جو کوئی بری بات میں سفارش کرے اس میں سے ایک بوجھ اس پر بھی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

شفاعت بارے بیان

''کفل'' اور ''نصیب'' دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یہ دو لفظ شفاعت و وساطت کے معنی ہیں۔ جس شخص میں کوئی کمزوری رہ گئی ہو شفاعت کے ذریعہ وہ کمزوری کو اس سے دُور کیا جاتا ہے، اُس نقص کو شفاعت کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے اور یا کوئی اضافی چیز حاصل کی

جاتی ہے۔ گویا واسطہ سبب بن رہا ہوتا ہے کہ زندگی کے امور کی اصلاح ہو جائے۔ اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے، اس میں شفاعت کا معنی یہ ہے کہ یا تو ثواب بڑھ جائے گا اور یا جس کی شفاعت کی جارہی ہے اُس پر کسی وجہ سے سزا آنے والی تھی تو وہ سزا اس سے کم ہو جائے گی یا رُک جائے گی یا سزا ختم کر دی جائے گی تو خود جو شفیع ہوتا ہے اس کا بھی اس میں حصہ ہوتا ہے کہ وہ خیر کے لیے واسطہ بنا ہے لہٰذا وہ اس خیر میں شریک ہو جاتا ہے۔ اور شر اور برائی کے لیے واسطہ بنا ہے تو وہ اس میں شریک ہوتا ہے لہٰذا مومنین کو چاہیے کہ کافروں یا منافقوں کے لیے سفارشی نہ بنیں۔ انہوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی انہیں معاف کر دیا جائے۔ ظالموں کے لیے شفاعت اور سفارش کرنا اور فسادیوں کے حوالے سے واسطہ بننا، منافقوں اور مشرکوں کے لیے واسطہ بننا یہ فساد کو عام کرنے کا سبب ہو گا کیونکہ ایسے لوگ جو مفسد فی الارض ہیں، زمین میں فساد پھیلانے والے ہیں۔ انکی سفارش معاشرہ کو نقصان دے گی اور عمومی امنیت کو نقصان پہنچے گا۔

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

"اور جب تمہیں کوئی دعا دے تو تم اس سے بہتر دعا دو یا اس جیسی ہی کہو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے"۔

تحیت وسلام کا جواب

یہ آیت تحیت اور سلام کے حوالے سے ہے اور یہ کہ کس طرح تحیت اور سلام کا جواب دیا جائے۔ یہ عمومی حکم ہے جو تمام تحیات کو شامل ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت یہ سلام اور مسالمت و صلح کے حوالے سے ہے کہ جو مسلمان ایک دوسرے سے وصول کرتے ہیں۔ صلح سے مراد جنگ میں صلح کرنا ہے اسلام صلح اور سلامتی کا دین ہے، اسلام

بلاوجہ جھگڑے میں نہیں پڑتا اور نہ ہی اسلام زبردستی کا حامی ہے۔ اسلام پھیلانے میں جبر واکراہ نہیں جب اسلام پھیل جائے گا تو زمین پر ہر جگہ سلامتی آجائے گی اور مشرکین خود ہی باقی نہیں رہیں گے، معاشرہ میں جب صلح و سلامتی نہ رہے تو پھر فساد ہے۔ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ کب ضروری ہے کہ متحارب اطراف آپس میں صلح کریں۔ سلام دینے کے بارے ہے کہ جب کوئی کہتا ہے "السلام علیک" تو جواب میں کہو" وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔ اس بارے میں بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ سلام کا جواب دینا واجب ہوتا ہے۔ سلام دینے کی 69 نیکیاں ہیں جبکہ جواب دینا واجب ہے جس نے آپ کو دعاء دی ہے کہ سلامتی و خیر آپ کے لیے ہو تو آپ اس سے بہتر اسے دعائیہ کلمات کہیں سلام کرنا اسلام کی شناخت ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک اللہ قیامت کے دن تم سب کو جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے''۔

قیامت کا حتمی ہونا اور سب کا اکٹھا ہونا

اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں سفارش اور شفاعت اور واسطہ بننے کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ واسطہ اچھائی کا بھی ہے اور برائی کا بھی ہے اور اس کے لیے تمہیں تکلیف اور ذمہ داری دی ہے اور جو بھی تمہارے اوپر سلام کرتا ہے تو اس کا جواب بہتر دو لیکن باطل الفاظ سے جواب نہ دو۔ یہ بات تمہارے لیے آگے بھیجی گئی روزی ہے اور خداوند تبارک و تعالیٰ تمہیں اُس دن جمع کرے گا جو قیامت کا دن ہے اور اس نے

ضرور آنا ہے اور اس عمل کا بدلہ تمہیں دیا جائے گا۔ اگر تم نے اللہ کی دعوت کو قبول کیا ہے تو تمہارے لیے جزائے خیر ہے اور اگر اللہ کی دعوت کو رد کیا ہے تو پھر تمہارے لیے سزا ہے۔ یقینی امر ہے کہ کوئی بھی آدمی اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا نہیں ہو سکتا، اللہ ہی ہے جو سب سے سچا ہے اور وہ جو کہتا ہے وہ سچ ہے، یہ بیان حقیقت ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے جو ہر صورت پورا ہونا ہے کہ قیامت کا دن ضرور آئے گا اور اس دن سب اکٹھے ہوں گے ۔ اور سب کو انکے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

”پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقوں کے معاملہ میں دو گروہ ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کے اعمال کے سبب سے انہیں الٹ دیا ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو اسے راہ پر لاؤ، اور جسے اللہ گمراہ کرے اس کے لیے تو ہر گز کوئی راہ نہیں پائے گا“۔

منافقین قابل رعایت نہیں

اس آیت میں اللہ فرما رہا ہے کہ ہم نے جب تمہیں وضاحت کر دی ہے کہ ایک شفاعت اور واسطہ ایسا ہے جو ناپسندیدہ ہے اور اگر تم برائی میں واسطہ بنو گے تو خود شفاعت کرنے والے کو بھی وہ برائی پہنچے گی پس اے مومنین تم منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں کیوں تقسیم ہو گئے ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن کے ساتھ جنگ کی جائے اور بعض اُن کے سفارشی بن گئے ہیں اور کہتے ہیں اُن کے ساتھ جنگ نہ کرو انہیں معاف کر دو۔ اللہ فرما رہا ہے

یہ گروہ فساد کی جڑ ہے اور منافقین کے ساتھ نرمی کرنے سے وہ اور بڑھیں گے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ خدا نے جن کو گمراہ کیا ہے وہ گمراہی سے واپس آ جائیں اور ہدایت پر آ جائیں تو ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ نے جن کو گمراہ کر دیا ہے تو وہ ہدایت نہیں پا سکتے۔ جو مومنین منافقین کی شفاعت کر رہے ہیں وہ اصل میں سمجھتے نہیں ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب اپنے پیغمبر کو کیا ہے اور اس طرح مومنوں کو متوجہ کیا ہے کہ منافقوں سے نرم رویہ نہ اپنائیں ۔اس قسم کی باتیں ٹھیک نہیں جو تم انکے بارے سوچ رہے ہو کہ انکے ساتھ نرمی کرنے وہ راہِ راست پر آ جائیں گے تو ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ایک جان ہونا چاہیے اور منافق کے بارے میں دو گروہ نہ بنیں، سب کی رائے ایک ہو۔ منافقوں سے خیر کی توقع نہیں لہٰذا مومنوں کو منافقوں کے لیے واسطہ نہیں بننا چاہیے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾

”وہ تو چاہتے ہیں کہ جیسے وہ کافر ہوئے ہیں تم بھی کافر ہو جاؤ پھر تم سب برابر ہو جاؤ، اس لیے ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرکے نہ آ جائیں، پھر اگر وہ اس بات کو قبول نہ کریں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور قتل کرو، اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ“۔

کافروں سے دوستی بارے

اس آیت میں پہلے والی آیت کی بات کو آگے بڑھایا جا رہا ہے کہ کس طرح تم اُن کی ہدایت کر سکتے ہو۔ جو گمراہی کے اسباب ہیں ان کو تو انہوں نے خود اختیار کیا ہے اور کفر اپنا لیا

ہے اللہ کی منع کردہ چیزوں کو انہوں نے خود اختیار کیا ہے وہ تو یہ چاہ رہے ہیں کہ تمہیں بھی اپنی طرف کھینچ کر لے جائیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مانند کافر ہو جاؤ، پس تم اُن سے دوستی مت کرو مگر یہ کہ وہ کفر سے ہاتھ اُٹھا لیں اسلام کی طرف آ جائیں۔ اگر وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے تو پھر تمہارا فریضہ یہ ہے کہ جہاں بھی انہیں پاؤ انہیں پکڑ لو، قیدی بنا لو اور انہیں قتل کر دو اور اُن کی سرپرستی اور اُن سے محبت مت کرو۔ یہ مومنوں کا فریضہ ہے کہ مشرکین جو ان کے پہلے سے دوست تھے اب اُن کو آمادہ کریں کہ وہ اسلام کی طرف آ جائیں۔ اگر وہ اسلام کی طرف آ جائیں تو اپنی دوستی کو جاری رکھو اور اگر اسلام میں نہ آئیں تو پھر اُن کو چھوڑ دو اور اُن کے ساتھ وہی کرو جو اللہ نے کہا ہے، انہیں پکڑو اور قتل کر ڈالو کیونکہ وہ خود بھی مسلمان نہیں ہوئے اور دوسروں کے لیے بھی رکاوٹ بنیں گے کہ وہ مسلمان ہوں لہٰذا جو اسلام کے آگے رکاوٹ لیں ان کا خاتمہ کر دو۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ یَصِلُوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ اَوۡ جَآءُوۡکُمۡ حَصِرَتۡ صُدُوۡرُہُمۡ اَنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ اَوۡ یُقَاتِلُوۡا قَوۡمَہُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَہُمۡ عَلَیۡکُمۡ فَلَقٰتَلُوۡکُمۡ ۚ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡکُمۡ فَلَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ وَ اَلۡقَوۡا اِلَیۡکُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ عَلَیۡہِمۡ سَبِیۡلًا ﴿۹۰﴾

"البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو یا وہ جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں نہ تم سے لڑتے ہیں اور نہ اپنے لوگوں سے، اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا ہے پھر وہ تم سے لڑتے ہیں، سو اگر وہ تم سے ہٹ کر رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہیں ان پر (لڑائی کی) کوئی راہ نہیں دی"۔

مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے والے منافقین کا حکم

اس آیت میں پچھلے حکم سے استثناء بیان کیا جارہا ہے۔ پچھلی آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین کو پکڑو اور انہیں قتل کرڈالو۔ یہاں فرمایا ایسے مشرکین جن کے درمیان یا ان کی بعض اقوام کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہے جس میں قسم اُٹھائی ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے تو ایسے مشرکین کہ جن کی خواہش نہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کریں اور نہ ہی وہ مشرکین جو ان کی قوم سے ہیں اُن کی طاقت بنتے ہیں بلکہ کسی بھی وجہ سے وہ ان سے علیحدہ ہیں یعنی نہ مسلمانوں کے خلاف ہیں اور نہ اپنی قوم والوں کے ساتھ ہیں، تو پہلے حکم سے ان کو استثنٰی دیا گیا ہے۔ خدا نے تمہارے لیے جنگ کو نہیں چاہااور ایسے افراد تمہارے ضرر میں کچھ نہیں کریں گے۔ جب وہ مسلمان نہیں ہوئے اور وہ تمہارے دشمن کے ساتھ بھی نہیں تو اس صورت میں تمہارے پاس اُن کے خلاف جنگ کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ خدا نے تمہیں اُن پر کسی قسم کا تسلط اور غلبہ کا حق نہیں دیا۔ یہ حکم بڑا واضح ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ تمہارا ایک معاہدہ ہے تو اس معاہدہ کی پابندی کرنا ہوگی اس معاہدہ کو توڑنا نہیں مگر یہ کہ وہ خود اس معاہدہ کو توڑ دیں تو پھر دوسری صورت بن جائے گی کہ معاہدہ توڑنے والوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِیْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْكُمْ وَ یُلْقُوْۤا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ وَ یَكُفُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۹۱﴾

''ایک اور قسم کے منافق تم دیکھو گے جو چاہتے ہیں تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، جب کبھی وہ فساد کی طرف لوٹائے جاتے ہیں تو اس میں کود پڑتے ہیں، پھر اگر وہ تم سے ہٹ کر نہ رہیں اور تمہارے آگے صلح پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں پاؤ انہیں پکڑو اور مار ڈالو، اور ان پر ہاتھ اٹھانے کے لیے ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے''۔

دغا باز منافقین

اس آیت میں خبر دی ہے کہ ایسے بھی ہیں جن کا آپ کا رابطہ ہو گا تو وہ بھی ان دو گروہوں کی مانند ہیں جو چاہیں گے کہ آپ انہیں محفوظ راستہ دیں اور وہ اپنی قوموں کو بھی شر اور نقصان سے بچائیں لیکن خدا خبر دے رہا ہے کہ یہ منافق ہیں، ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور وہ امن اور صلح کی جو بات کر رہے ہیں تو ان کا ایسا بیان جھوٹا اور غلط ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ غیر جانبدار رہیں گے تو ایسا نہیں بلکہ یہ لوگ فتنے میں گھسے ہوئے ہیں یہ گروہ تمہارے ساتھ دشمنی اور تمہارے خلاف جنگ سے ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے اس صورت میں تمہارے اوپر لازم ہے کہ ایسوں کا بھی مقابلہ کرو اور انہیں جہاں پاؤ پکڑو اور قتل کر دو، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ان پر مسلط ہے اور تمہیں اس کا اختیار دیا گیا ہے اور اسلام کی طاقت اُن پر غالب آئے گی۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ

مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهۡلِهٖۤ وَ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ ۫ تَوۡبَةً مِّنَ اللّٰهِ ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۹۲﴾

''اور مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر غلطی سے، اور جو مسلمان کو غلطی سے قتل کرے تو ایک مسلمان کی گردن آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے مگر یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں، پھر اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم میں سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہے تو ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے، اور اگر وہ مقتول مسلمان کسی ایسی قوم میں سے تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا، پھر جو غلام نہ پائے وہ لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے اللہ سے گناہ بخشوانے کے لیے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے''۔

مومن کے قتل کا بدلہ

اس آیت میں یہ قانون بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص مومن ہو جائے اور ایمان کے دائرے میں آ جائے تو اس کا خون محفوظ ہو جاتا ہے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اسے نقصان پہنچائے۔ جس طرح اسے خود کو نقصان پہنچانے کا حق نہیں اسی طرح وہ مومن کو قتل نہیں کر سکتا۔ اگر کسی وجہ سے غلطی سے مومن کا اس سے قتل ہو جائے۔ مومن جان بوجھ کر کسی دوسرے مومن کے قتل کا ارادہ نہیں کرتا اور اسی سے کنایہ نہی کا ہے اور یہ استثنٰی متصل ہے تو اس غیر عمدی قتل کے جرم میں ایک غلام کو آزاد کرنا ہے اور دیت سے مراد ایسا مال ہے جو قتل کے بدلے میں دیا جاتا ہے یا اگر اُس کا کوئی عضو کاٹا گیا ہے تو اس کے بدلے میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ مراد ہے۔

مقتول کے ورثاء سے دیت اسے دی جائے گی جو مجروح ہوا ہے اور جس کا عضو کاٹا گیا ہے تو پھر اسی کو اس کا تاوان دیا جاتا ہے مگر یہ کہ مقتول کا خاندان دیت معاف کر دے یا جو زخمی ہوا ہے وہ تاوان بخش دے۔ اس جگہ ایک اور صورت کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جو مومن قتل ہوا ہے اگر وہ کافر قبیلہ سے ہو تو پھر اس کافر قبیلہ کو تاوان نہیں دینا، کیونکہ کافر مومن سے وراثت نہیں لیتا۔ اس صورت میں مومن غلام کو آزاد کرنا کافی ہے لیکن اگر مومن مقتول مومن قبیلہ سے ہو یا ایسے قبیلہ سے ہو کہ تمہارے اور اس قبیلے کے درمیان عہد و پیمان موجود ہے تو دیت دینا ہو گی یعنی مومن مقتول کے بدلے میں غلام کو آزاد بھی کرنا واجب ہے اور اسکے خاندان کو دیت بھی دینا ہو گی۔ جس کے پاس مال نہیں ہے اور وہ غلام کو آزاد نہیں کر سکتا تو اس کے لیے ہے کہ غلام آزاد کرنے کی جگہ دو مہینے پے در پے روزے رکھے اور یہ اللہ کی جانب سے حکم ہے جو مہربانی و رحمت ہے اور اللہ اسکی مصلحت کو جانتا ہے اور ہمارے حالات سے بھی واقف ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ساری دُنیا کو ویران کرنا آسان ہے اس سے کہ ایک مسلمان انسان قتل ہو جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر مشرق میں ایک مومن قتل ہو اور دوسرا مومن مغرب میں موجود ہو اور وہ اس کے قتل پر خوش ہو تو یہ دوسرا مومن اس کے خون بہانے میں شریک ہے۔ اسلام نے قتل کے سلسلے میں بہت سخت احکام دیئے ہیں اور اس میں کسی قسم کی رعایت نہیں دی۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

''اور جو کوئی کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا ہے''۔

قتل عمد کی سزا

سورہ زمر آیت 53: اللہ تعالیٰ ان سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے جو انسان سے سرزد ہوتے ہیں کیونکہ گناہ کرنے میں بھی انسان کا ارادہ شامل ہوتا ہے تو یہ گناہ کی معافی کا اعلان عمومی ہے جو عمدی قتل کو بھی شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم کی ہمیشگی کو ٹالنے کے دو راستے ہیں۔

1۔ اس کا پہلا راستہ توبہ کرنا ہے۔

2۔ دوسرا راستہ شفاعت ہے، شفاعت کی وجہ سے اسے معافی مل جائے۔

اصول کافی اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ کیا اس مومن کی توبہ قبول ہو گی جس نے دوسرے مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا ہے؟ تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر اُس نے اسے بے جرم اور اس وجہ سے کہ وہ مومن ہے قتل کیا ہو تو اس کی توبہ قبول نہیں ہے۔ لیکن اگر ناراضگی، غصہ کی شدت یا دنیاوی مفادات کی خاطر اُس کو قتل کیا ہو نہ کہ اس لیے قتل کیا ہو کہ وہ ایمان کی دولت سے مالامال ہے یعنی قتل کرنے کا سبب اُس کا مومن ہونا نہ ہو بلکہ قتل کرنے کا سبب دُنیاوی مفادات ہوں یا اس سے ناراضگی ہو تو اس صورت میں اس کی توبہ یہ ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے کہ قتل کے بدلے قتل اس سے قصاص لیا جائے۔

اگر قاتل کے بارے معلوم نہ ہو کہ کس نے قتل کیا ہے تو قاتل کو چاہیے کہ وہ خود مقتول کے ورثاء کے پاس جائے اور کہے اس کے ہاتھوں یہ شخص قتل ہوا ہے، اگر وہ اسے معاف کر دیں اور اس سے قصاص نہ لیں تو ان کو خون بہا دے کر اللہ کے حضور توبہ کرے اسے قتل کا کفارہ بھی دینا ہو گا جو ایک غلام کو آزاد کرنا یا پھر دو ماہ پے در پے روزے رکھنا یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔ اس کے ساتھ درگاہ الٰہی سے اس عظیم گناہ کی معافی مانگے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ ۚ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿٩٤﴾

''اے ایمان والو! جب اللہ کی راہ (جہاد) میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم پر سلام کہے تو اس کو (کافر سمجھ کر اور غنیمت کا مال لینے کے لیے) مت کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے، تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں، تم بھی تو اس سے پہلے ایسے ہی تھے پھر اللہ نے تم پر احسان کیا اس لیے تحقیق سے کام لیا کرو، بے شک اللہ تمہارے کاموں سے باخبر ہے''۔

سلام کرنے والوں کو غیر مسلم مت کہو

یہاں پر ''ضَرب'' سے مسافرت مراد ہے اور ''فِي سَبِيلِ اللّٰهِ'' کی قید اس لیے لائی گئی ہے تاکہ بتایا جائے کہ سفر جہاد کے لیے ہو۔ ''تَبَيَّن'' تمیز، جدا سازی، چھان پھٹک کرنے کو کہتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ مومن ہے کافر نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر وہ اسلامی

تہیت السلام علیکم کہہ کر آپ کو سلام کرتا ہے تو پھر اُس کو قتل کرنے کے در پے نہ ہو اور اس کی طرف کفر کی نسبت نہ دو تاکہ کفر کی نسبت دے کر کہو کہ یہ مسلمان نہیں ہے اور اس کو قتل کر دو تاکہ اس کے مال پر قبضہ کر سکو۔ یہ نہ کہو کہ اس نے اپنی جان کے ڈر سے ایمان کا اظہار کیا ہے، تم بھی تو پہلے اسی طرح کافر تھے، تم بھی دُنیاوی اموال کی جستجو میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا اور تمہیں اسلام کی نعمت سے نوازا۔

لہٰذا انہیں قتل کرنے اور اُن کے اموال پر قبضہ جمانے سے پہلے تحقیق کرلو تاکہ حقیقت واضح ہو جائے اور یہ بھی جان لو کہ اللہ کے ہاں جو فوائد اور منافع ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اس کا تقابل دُنیاوی منافع سے نہیں کیا جا سکتا۔ تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے۔ یہ آیت ایک قسم کی نصیحت ہے کہ جاہلانہ دور کے اعمال کا ارتکاب نہ کرو اور ایک تنبیہ اور سرزنش بھی ہے اور مومنوں سے کہا جارہا ہے کہ اب تک تمہارے ذہن اور تمہارے رویوں میں وہی باتیں کیوں ہیں جو ایمان لانے سے پہلے تھیں۔

تفسیر قمی میں ہے یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول خدا ﷺ جنگ خیبر سے واپس آرہے تھے۔ اُسامہ بن زید ایک فوج کا دستہ لے کر یہودی بستیوں کی طرف فدک کی جانب گئے تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ ان بستیوں کے قریب ایک بستی میں مرداس بن نھیک فدکی نامی شخص رہتا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے فوجی قریب آرہے ہیں تو وہ اپنے گھر والوں اور اپنے مال کو لے کر ایک پہاڑی میں چلا گیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ ان کے رسول ہیں۔ اس کے بعد اُسامہ بن زید نے جب وہ ایک طرف ہوا تو اسے نیزہ مارا اور قتل کر دیا اور جب اُسامہ رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس آیا اور وہ واقعہ سنایا تو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کیا اس بندے نے اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی گواہی دی تھی؟ اور پھر تو نے اسے قتل کر دیا؟ اسامہ نے کہا یارسول اللہ ﷺ اس نے قتل ہونے کے ڈر سے یہ آواز دی تھی۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے اس کے دل کا پردہ چاک کر کے دیکھا تھا کہ اس نے دل سے نہیں کہا زبان سے کہا ہے؟ اس نے زبان سے جو بات کہی تم نے اسے مانا نہیں اور باطن کے بارے میں تمہیں خبر ہی نہیں تھی۔ تو پھر اُسامہ نے قسم اُٹھائی کہ آج کے بعد جو بھی کلمہ پڑھے گا، شہادتین پڑھے گا، ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھے گا تو وہ اسے قتل نہیں کرے گا۔ وہ اسی بہانے سے جو جنگیں امیر المومنین علیہ السلام کے زمانے میں ہوئیں ان جنگوں میں شریک نہیں ہوا تاکہ وہ جو اس نے قسم اُٹھائی تھی اس قسم کو پورا کر سکے۔ جبکہ یہ اس کی غلطی تھی کیونکہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی اطاعت فرض تھی البتہ وہ اس زمانے والا بہانہ بنایا کرتا تھا حالانکہ امیر المومنین علیہ السلام کے خلاف بغاوت کرنے والے در حقیقت رسول اللہ ﷺ کے خلاف بغاوت کر رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

''کسی عذر کے بغیر گھر بیٹھے رہنے والے مسلمان ان کے برابر نہیں جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا بیٹھنے والوں پر درجہ بڑھایا دیا ہے، اگرچہ ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھنے والوں سے اجر عظیم میں زیادہ کیا ہے''۔

مجاہدین اور گھر بیٹھے رہنے والے برابر نہیں

''ضرر'' یہاں وجود میں کمی کے معنی میں ہے، ایسی کمی جو جہاد میں شرکت سے مانع ہو، مثلاً اندھا ہونا، شل ہونا یا بیماری۔ اموال سے جہاد کرنے کا معنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا تاکہ دشمنوں پر اسلام کا غلبہ ہو اور جہاد بہ نفس یعنی خود جنگ کے میدان میں شرکت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بالادستی اور کفار کو شکست دینے کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے آمادہ ہونا، جنگ میں شرکت کرنا اور جہاد بالنفس کرنا۔ البتہ ایک جہاد بالنفس، نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق نقل ہوا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک گروہ آیا جو جہاد فی سبیل اللہ سے واپس آیا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ایک بڑے جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا اس سے بڑا جہاد کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نفسانی خواہشات سے جہاد کرنا۔

اس آیت میں جہاد بالنفس سے مراد جنگ میں شرکت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے نیکی کا وعدہ دیا ہے۔ ''اَلْقَاعِدُوْنَ'' سے وہ افراد مراد ہیں جو جنگ میں جانے سے رہ گئے، ایسے زمانے میں کہ جب اُن کے جنگ میں جانے کی ضرورت نہیں تھی اور اتنی مقدار میں چلے گئے تھے جو اُس محاذ جنگ پر کافی تھے۔ اسی لیے فرماتے ہیں کہ جو گھر بیٹھے رہے اور جو جنگ میں گئے ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اچھائی کا وعدہ دیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ جہاد میں شرکت زیادہ فضیلت رکھتی ہے تاکہ مسلمان جہاد میں جانے کے لیے جلدی کریں اور ایک دوسرے پر سبقت لیں۔

''دَرَجَة'' سے مقام، منزلت، مرتبہ اور شان مراد ہے کہ ایک کا مرتبہ دوسرے کے مرتبہ سے بلند ہے۔ ایک کی منزل دوسرے سے برتر ہے۔ تو اللہ نے تینوں گروہ ،1۔ مجاہدین اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے، 2۔ قاعدین جو جنگ میں نہیں گئے اس وجہ

سے کہ جنگ میں ان کی ضرورت ہی نہیں تھی، 3۔ وہ جو کہ معذور ہیں، ظاہر ہے معذور کسی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوا مثلاً اس کا عضو شل ہے یا نابینا ہے یا کوئی اور خاص بیماری ہے جس کی وجہ سے جنگ میں شرکت نہیں کر سکتا تو یہ افراد معذور ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لیے اچھائی کا وعدہ دیا ہے۔ البتہ ان میں سے ہر ایک کے درجات، مراتب ہیں اور ان میں فرق ہے، یہ سارے برابر نہیں ہیں۔ مجاہدین جو جنگ میں گئے ہیں اُن کا مقام دوسروں سے بالاتر ہے البتہ جو گھر پر رہ گئے ہیں اللہ کے ہاں ان کا بھی مقام ہے اور اُن کے لیے بھی اجر ہے۔

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

"ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے"۔

اللہ کی طرف سے رحمت و مغفرت

رحمت کیا ہے؟ رحمت اللہ کی عطاء ہے، اللہ کی ایسی بخشش ہے جو نعمت تک پہنچنے کی راہ میں حائل رکاوٹ کا خاتمہ کرتی ہے۔ مغفرت ساری نعمات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ رحمت اور مغفرت اس لحاظ سے کہ اللہ کی راہ میں قیام کیا ہے، خدا بخشنے والا ہے اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ معاف کر دیتا ہے اور جو رکاوٹیں ہیں وہ دُور کرتا ہے تاکہ رحمت ان کو نصیب ہو، اللہ کی نعمتیں بغیر رکاوٹ کے انہیں ملیں، وہ مہربان ہے اپنے بندوں کو عطیات دینے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ

وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝97

''بے شک جو لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں بے بس تھے، فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، سو ایسوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے''۔

اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کا انجام

اس آیت میں ''ظلم بنفس'' سے مراد دین خدا سے پھرنا، اللہ کے شعائر اور اللہ کی عبادت کے جو عناوین ہیں اُن کو قائم کرنے میں کوتاہی کرنا، احکام الٰہی پر عمل چھوڑ دینا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ ایسے ملکوں اور ایسے شہروں میں تھے جہاں شرک تھا اور وہ کفار کے درمیان زندگی گزار رہے تھے۔ جب انسان ایسی جگہ ہو تو اس کے لیے دینی معارف حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے، ایسی موقعیت میں عبودیت کے فرائض کو انجام دینے کے لیے اُسے کوئی راہ مہیا نہیں ہوتی کیونکہ بلاد کفر میں کمزور حیثیت میں ہوتے ہیں۔ اس موقعیت نے انہیں کمزور بنا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ اس چیز کو دینی فرائض پر عمل نہ کرنے کے لیے اچھا عذر سمجھتے تھے جبکہ وہ مجبور نہیں تھے کہ وہیں پر رہیں اور کافروں کے دائرے میں ذلت سے رہیں بلکہ وہ ہجرت کر سکتے تھے لیکن ہجرت کے راستے میں آنے والی مشکلات سے ڈرتے تھے اس لیے کفار کے ساتھ ذلیلانہ اور رسوائی کی زندگی گزارنے کو اختیار کیا۔

''قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ'' والا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے جو روایات کی زبان میں بھی آیا ہے کہ فرشتے ہر مرنے والے سے سوال کرتے ہیں۔ یہ سوالات درج ذیل امور کے

متعلق ہوں گے: 1۔ عقائد کے بارے میں، 2۔ شب و روز کن کاموں میں گزارے، 3۔ عمر کے بارے میں، 4۔ جوانی کے بارے میں، 5۔ صحت کے بارے میں، دُنیا میں کیسے زندگی گزار کر آئے ہو؟ دُنیا میں اس کا ہم و غم کیا تھا؟ کیا مصروفیات تھیں وہ سب پوچھیں گے۔ جیسا کہ کہا گیا فرشتے اُن کے اس بہانے کو معتبر نہیں سمجھیں گے بلکہ اس کے جواب میں کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی؟ کیا تم ہجرت نہیں کر سکتے تھے تاکہ آرام اور اطمینان سے دینی فرائض کو انجام دیتے۔ یہ سوال ایک قسم کی توبیخ اور سرزنش ہے۔ جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے اللہ اس کو پناہ دیتا ہے، پناہ کی جگہ فراہم کرتا ہے، اس کے فوائد ہیں۔

سورہ النساء آیت 100 میں ہے کہ جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، اللہ کی زمین میں بہت سارے فوائد پائے گا اور اسے خوشحالی ملے گی۔ لہٰذا جب وہ یہ کہیں گے کہ ہم کمزور تھے اور ہمارے اوپر کفار کا تسلط تھا اس لیے ہم دینی فرائض انجام نہیں دے سکے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم تو ہجرت کر سکتے تھے تو ہجرت کیوں نہیں کی؟ اُن کی یہ دلیل کمزور تھی اور اس وجہ سے اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾

"ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے واقعی کمزور ہیں جو نکلنے کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں پاتے"۔

مستضعفین کا حکم

یہ استثناء، استثناء منقطع ہے۔ یہ عربی گرائمر کی اصطلاح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سابقہ آیت میں ذکر شدہ لوگ حقیقی مستضعف نہیں تھے وہ مستضعف ہونے کا دعویٰ کرتے

تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں کمزور بنا کر رکھا گیا ہے لیکن وہ حقیقی مستضعف نہ تھے۔ حقیقی مستضعف وہ ہیں جن کے پاس وہاں سے باہر جانے کا کوئی چارہ نہ ہو کوئی حیلہ نہ ہو، ان کے لیے ایسی رکاوٹیں ہیں ان رکاوٹوں کو وہ عبور نہیں کر سکتے تو یقیناً ان کی صورتحال ان سے مختلف ہے جن کے لیے تمام تر وسائل موجود تھے جو کفر کے علاقہ کو چھوڑ کر دوسری طرف جا سکتے تھے، فقط سفر کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ ایک تو وہ ہیں جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، ان کے لیے امکان تھا کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں اور اللہ کے فرائض پر عمل کریں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ دوسرے وہ ہیں جن کے پاس یہ امکان ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اس دوسرے گروہ کو استثناء دے دیا گیا کہ ان کا ٹھکانہ جہنم نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقی معذور تھے۔

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

''پس اُمید ہے کہ ایسوں کو اللہ معاف کر دے، اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے''۔

مستضعفین کے لیے اللہ کی معافی

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ گروہ ہے جس نے جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ وہ جہالت کی وجہ سے اس کے مرتکب ہوئے ہیں تو معذور ہیں یا ایسی حالت میں ہیں کہ وہ ہجرت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انسان کو ہر حال میں اللہ کی عفو اور مغفرت کی ضرورت ہے۔ وہ اللہ کے عفو سے بے نیاز نہیں ہے۔ خداوند ہی اپنی عفو اور بخشش سے دل سے شقاوت اور گناہوں کا اثر صاف کر دیتا ہے۔ اس آیت میں عفو کی اُمید دلائی گئی ہے کہ جو صدق دل سے اللہ کے حضور اپنے آپ کو پیش کرتا ہے اور واقعی مشکل میں ہوتا ہے تو پھر اس کی غلطیوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے۔

وَ مَنۡ یُّهَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّ سَعَةً ؕ وَ مَنۡ یَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَیۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ثُمَّ یُدۡرِکۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۰۰﴾

''اور جو کوئی اللہ کی راہ میں وطن چھوڑے وہ اس کے عوض بہت کھلی جگہ اور وسعت پائے گا، اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرکے نکلے پھر اس کو موت پالے تو اللہ کے ہاں اس کا ثواب طے ہو چکا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

مہاجرین فی سبیل اللہ کے لیے وسعت

اس جگہ مذہب راستے کے معنی میں آیا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کرے، اللہ اس کے لیے بہت سارے راستے کھول دیتا ہے۔ جس راستے میں گناہ ہوں یا رکاوٹ ہو تو وہ پھر دوسری جگہ جا کر پناہ لیتا ہے اور اس رکاوٹ کو رگڑ دیتا ہے اور اس رکاوٹ کی پرواہ نہیں کرتا اور اس رکاوٹ کو ہٹانے کے لیے کوشش کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے۔ یہ بات مومنوں کے دلوں کو مضبوط کرنے اور انہیں دلیر بنانے کے لیے کی گئی ہے کہ مشرکین کے شہروں سے اور ان کے ممالک سے ہجرت کرنے میں پریشان نہ ہوں۔ اگر ایک جگہ سے ہجرت کی ہے اور دوسری جگہ گئے ہو اور وہاں پر بھی رکاوٹ ہے تو اس رکاوٹ کو توڑ کر تیسری جگہ چلے جاؤ، چوتھی جگہ چلے جاؤ۔

جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے لیے راستے کھول دے گا اور امکان فراہم کردے گا۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنا، یہ کنایہ ہے اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنے سے جہاں پر قرآن اور سنت پر عمل کرنا آسان ہو

۔جو شخص ایسی حالت میں مرے جب وہ ایک ایسی سرزمین پر جارہا تھا جہاں پر احکام الٰہی پر عمل کرنا آسان ہو تو حتمی طور پر اس کا اسے اجر ملے گا، خداوند تبارک و تعالیٰ کو اس کی الوہیت کے حوالے سے نہ تو کوئی چیز عاجز کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے لیے دشوار ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے بندوں کے لیے آسانی پیدا کر سکتا ہے۔

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾

"اور جب تم سفر کے لیے نکلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں سے کچھ کم کر دو، اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے، بے شک کافر تمہارے صریح دشمن ہیں"۔

سفر میں نماز قصر پڑھنے کا حکم

اس آیت میں نماز کے حوالے سے حکم ہے کہ سفر کی حالت میں نماز قصر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے چار رکعتی نماز کو دو رکعت پڑھنا۔ اگرچہ یہ عبارت نماز قصر کرنے کے جواز کو ظاہر کرتی ہے لیکن یہ بات قصر کے واجب ہونے سے منافات نہیں رکھتی کیونکہ اہل بیت سے منقول روایات کے مطابق سفر میں نماز قصر پڑھنا واجب ہے۔ یہاں پر اجمالی حکم بیان ہوا ہے، اس کی توضیح اور تفصیل یہاں بیان نہیں ہوئی ہے۔ فتنے کا خوف و ڈر ہو کہ کافر شکنجہ کریں گے، مار ڈالیں گے، قتل کر دیں گے، اذیت دیں گے۔ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز قصر پڑھنے کا حکم شروع میں خوف کی حالت اور دشمن کی طرف سے نقصان کا اندیشہ اور ڈر کی صورت میں تشریع (قانون بنا تھا) ہوا تھا۔ لیکن یہ خصوصی مورد عمومی قانون سے منافات نہیں رکھتا جس کی بنا پر عام حالت میں سفر میں نماز قصر پڑھنا واجب ہے۔ آخر میں فرمایا کہ

کافر تمہیں ہمیشہ نقصان دینے کے درپے ہیں اور تمہارے کھلے دشمن ہیں ان سے اچھائی کی توقع نہیں رکھو۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَ لْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

''(اے نبی) جب تم ان (مسلمانوں) میں موجود ہو اور انہیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ کھڑی ہو اور اپنے ہتھیار ساتھ لے لیں، پھر جب یہ سجدہ کریں تو تیرے پیچھے سے ہٹ جائیں اور دوسری جماعت آئے جس نے نماز نہیں پڑھی پھر وہ تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار ساتھ رکھیں، کافر چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم اپنے ہتھیاروں اور اسباب سے بے خبر ہو جاؤ تاکہ تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں، اور اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو ہتھیار رکھ دینے میں کوئی

مضائقہ نہیں، اور (تب بھی) اپنا بچاؤ کا سامان ساتھ رکھو، بے شک اللہ نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

حالت جنگ میں نماز کا طریقہ

اس آیت میں جنگ کی حالت میں نماز کا طریقہ بتایا جا رہا ہے جسے نماز خوف کہتے ہیں۔ جنگ کی حالت میں نماز خوف باجماعت پڑھنے کا حکم یہ ہے کہ نمازی دو دستوں میں تقسیم ہو جائیں، ایک دستہ اقتداء کرے اور اسلحہ ساتھ رکھے اور دوسرا گروہ ان کے مال و جان کی حفاظت کرے۔ پہلا دستہ نماز کو پورا کر لے تو وہ دفاع کے لیے پیچھے کھڑے ہو جائیں اور دوسرا دستہ پیغمبر ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھے۔ دونوں حالتوں میں اسلحہ ساتھ ہو۔ کیونکہ کفار تو چاہتے ہیں کہ تم تھوڑی سے غفلت کرو اور وہ تم پر ٹوٹ پڑیں۔ نماز خوف کی کیفیت یہ ہے کہ خوف کے عالم میں تم اس طرح نماز پڑھو۔ کفار چاہتے ہیں کہ جب تم نماز میں مصروف ہو اور اپنا اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان سے غافل ہو تو تم پر حملہ کر دیں۔ جب اسلحہ ساتھ ہو گا تو تم میں سے ایک گروہ نماز پڑھے گا اور دوسرا تمہاری حفاظت کر رہا ہو گا تو دشمن کی جرات نہیں ہو گی کہ وہ تم پر حملہ کرے۔

آیت کے دوسرے حصے میں کہا جا رہا ہے کہ جب بارش ہو رہی ہو یا بیماری کی وجہ سے مشکل ہو تو اسلحہ کے بغیر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھیں اور احتیاط کریں، کفار سے غافل نہ ہوں کیونکہ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ مومنوں کو غافل کریں اور انہیں نقصان پہنچا سکیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شریعت سے ان کی دشمنی کی وجہ سے ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

فَاِذَا قَضَیۡتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ ۚ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾

''پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہونے کی حالت میں یاد کرو، پھر جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو پوری نماز پڑھو، بے شک نماز اپنے مقررہ وقتوں میں مسلمانوں پر فرض ہے''۔

فریضہ نماز کی اہمیت

فریضہ نماز میں کوئی چھوٹ نہیں ہے، یہ ہر حالت میں فرض ہے۔ نماز میں تبدیلی نہیں آسکتی اور کسی بھی حالت میں فرض نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں سفر یا خوف کی حالت میں نماز کو قصر پڑھنے کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ چار رکعتی نماز کو آدھی پڑھو تو یہ خاص حالات کی وجہ سے ہے لیکن جنگ کی حالت نہ ہو اور اپنے وطن میں ہوں، سفر میں نہ ہوں تو پوری نماز پڑھنا ہو گی، نماز واجبی امر ہے جو کسی حالت میں نہیں چھوٹتا۔ مجبوری کی حالت میں روزہ کا کفارہ دیا جاتا ہے لیکن نماز میں ایسا نہیں ہے، نماز ہر حالت میں ادا کرنی ہے۔ اگر قضاء ہو جائے تو پھر اسے پڑھنا ہو گا۔

وَ لَا تَہِنُوۡا فِی ابۡتِغَآءِ الۡقَوۡمِ ؕ اِنۡ تَکُوۡنُوۡا تَاۡلَمُوۡنَ فَاِنَّہُمۡ یَاۡلَمُوۡنَ کَمَا تَاۡلَمُوۡنَ ۚ وَ تَرۡجُوۡنَ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا یَرۡجُوۡنَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۰۴﴾ؑ

"اور ان (دشمن) لوگوں کا تعاقب کرنے سے ہمت نہ ہارو، اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو وہ بھی تمہاری طرح تکلیف اٹھاتے ہیں، حالانکہ تم اللہ سے جس چیز کے اُمیدوار ہو وہ نہیں ہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

دشمن کے تعاقب کا حکم

اس آیت میں مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ کفار کا پیچھا کرنے میں کوتاہی بھی نہ کرو اور کمزور بھی نہ پڑو۔ کیونکہ اگر تم لوگ جنگ اور جہاد سے گھبرا جاؤ گے، اُکتا جاؤ گے تو پھر تمہیں خسارہ ہوگا۔ معلوم ہے کہ جنگ میں سختی ہوتی ہے، مشکل ہوتی ہے، تکلیف ہوتی ہے لیکن یہ تکلیف برداشت کرو، تمہارا دشمن تم سے بدتر حالت میں ہے کیونکہ تمہیں تو اللہ کی طرف سے فتح اور کامیابی کی اُمید دلائی گئی ہے، مغفرت کی اُمید ہے، بخشش کی اُمید ہے، اللہ کی رحمت کی اُمید ہے۔ یہ چیزیں کفار کے لیے تو نہیں ہیں، کفار کے ہاں تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اُن کے لیے تو بس یہی دُنیا ہی ہے، تمہارا ولی اللہ ہے جبکہ دشمنوں کا کوئی مولا اور سرپرست نہیں ہے کہ جن سے وہ اُمید وابستہ کریں اور ان کے عمل میں چستی آئے۔ فقط دُنیا اُن کے مد نظر ہے کوئی اور سہارا اُن کے پاس نہیں ہے جو انہیں کامیابی کی ضمانت دے، اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے مفادات سے واقف ہے۔ اس کے اوامر اور نواہی حکمت اور مصلحت کے تابع ہیں۔ تم اللہ کے اوامر اور نواہی کی انجام دہی میں کوتاہی مت کرو!۔

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَا تَكُنۡ لِّـلۡخَآٮِٕنِيۡنَ خَصِيۡمًا ۙ‏ ﴿۱۰۵﴾

''بے شک ہم نے تیری طرف سچی کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں میں انصاف کرے جیسا کہ تمہیں اللہ نے بتایا ہے، اور تو بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والا نہ ہو''۔

انصاف قائم کرنے کے لیے کتاب الٰہی کا اتارا جانا

اس آیت میں کتاب الٰہی قرآن اُتارنے کا ہدف بیان ہوا ہے۔ قرآن اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ شریعت کے قوانین کے مطابق عمل ہو اور اللہ کے قوانین کی حاکمیت یقینی ہو، لوگوں کے درمیان حکم کا معنی اُن کے درمیان جو جھگڑے ہیں جو دشمنیاں ہیں اُن میں قضاوت اور فیصلہ کرنا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو سند قرار دیا ہے اور اس کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری ہے اور حضور پاک ﷺ کے فیصلے کو دلیل بنایا ہے اور آپ کے حکم کو قضاوت اور جھگڑوں میں آخر فیصلہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ حکم کسی معاملے میں فیصلہ سنا کر اس جھگڑے کو ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی جو کہ حاکم ہے وہ فیصلہ کرتے وقت اپنا نظریہ اور اپنا عقیدہ بیان نہیں کر رہا ہوتا بلکہ اس کتاب میں جو کچھ درج ہے اس کی روشنی میں فیصلہ دیتا ہے۔ آنحضرت ﷺ عمومی اور خصوصی قوانین کے متعلق سب کلیات اور ان کے احکام سے آگاہ ہیں اور یہ جو کہا گیا ہے ''بِمَآ اَرٰىكَ اللهُ'' یہ اللہ کی طرف سے رائے دینا ہے نہ کہ شرائع کی تعلیم؛ جیسا کہ بعض مفسرین نے احتمال دیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ خیانت کاروں کی طرفداری نہ کرو، ''خَصِیْم'' شکایت کرنے والے کے دعویٰ یا ہر وہ چیز جو دعویٰ کے حکم میں ہے کا دفاع کرنے والا۔ پیغمبر اکرم ﷺ خیانت کاروں کا دفاع نہ کریں بلکہ جو حقدار ہیں اُن کی طرفداری کریں اور عدالت پر مبنی فیصلہ دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ہمیشہ حق کے مطابق فیصلہ دیتے ہیں

اور ان کا فیصلہ برحق ہوتا ہے اور وہ قرآن کے دیئے ہوئے احکام کی روشنی میں ہی فیصلہ دیتے ہیں، ان کا فیصلہ قرآن کے احکام کے خلاف نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب بنا کرامت کو اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار نہیں کہ وہ طرفین میں کسی کی طرف داری کریں تو کسی اور کے لیے یہ حق کس طرح ہو سکتا ہے؟

وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

''اور اللہ سے بخشش مانگ، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اللہ سے طلب مغفرت

''استغفار'' ان چیزوں پر پردہ ڈالنے اور چھپانے کی درخواست کرنے کے معنی میں ہے جن کو انسان نے خورد برد کیا ہوتا ہے یا دوسروں کے حقوق کو پامال کیے ہوتے ہیں، نفسانی خواہشات کی پیروی کی ہوتی ہے، تو اس کے لیے طلب مغفرت کرنے کو استغفار کہا جاتا ہے۔ کہ جو کچھ اس سے ہوا ہے اس پر پردہ ڈالا جائے، اس عمل پر بخشش مانگنا، معافی مانگنا۔ جیسا کہ بعد والی آیات میں ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو عصمت کے گوہر سے آراستہ فرمایا ہے۔

یہ آیت ان مفسرین کے نظریہ کو رد کرتی ہے جنہوں نے کہا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو جو استغفار کا حکم دیا گیا ہے یہ اس واقعے کے متعلق ہے جس میں آپؐ پر کسی بندے کی چوری کا دفاع کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ کیونکہ یہاں پیغمبر ﷺ کا اپنی ذات کے لیے استغفار کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی طلب کر رہے ہوں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ جو کچھ انسان کی طبیعت اور مزاج میں آتا

ہے اور موجود ہے اور اسکی وجہ سے دوسروں کے حقوق غصب کرتا ہے اور نفسانی خواہشات کی جانب مائل ہوتا ہے اس پر معافی مانگ رہے ہیں۔ اللہ بخشنے والا ہے اور مہربان ہے۔

اس استغفار سے ایک خاص عبادت مراد ہے۔ توبہ گناہ سے اللہ کی طرف رجوع ہے۔ استغفار میں یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان پہلے جرم کر چکا ہو اور اس جرم کی معافی مانگ رہا ہو، مغفرت کا معنی عام ہے یہ گناہوں اور خطاؤں کے اوپر پردہ ڈالنے کو بھی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام مانگنے کو بھی شامل ہے۔ یہاں پر کہا گیا ہے کہ انسان جو کچھ اپنے مزاج کی وجہ سے کرتا ہے، حضور پاک ﷺ چاہتے ہیں کہ وہ ان کے اندر نہ ہو ان کے اندر ایسے خیالات نہ آئیں اور آتے بھی نہیں کیونکہ وہ معصوم ہیں۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۚ﴿۱۰۷﴾

”اور ان لوگوں کی طرف سے مت جھگڑو جو اپنے دل میں دغا رکھتے ہیں، بے شک اللہ اسے پسند نہیں کرتا جو دغا باز گناہگار ہو“۔

خیانت کار لوگوں کا دفاع نہ کرو

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خیانت کی نسبت نفس کی طرف اس وجہ سے دی گئی ہے کیونکہ خیانت کا جو وبال یا بوجھ ہے؛ وہ نفس کی طرف ہی پلٹتا ہے۔ یا اس لیے ہے کہ کلی طور پر نافرمانی کرنا نفس سے خیانت ہے۔ لیکن اس کا صحیح تر معنی یہ ہے کہ مومنین سب کے سب ایک ہی جان کی مانند ہیں، سب کا مال حقیقت میں ایک مال ہے لہٰذا سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی حفاظت کریں اور اسے تباہ ہونے سے بچائیں اور اس میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے جیسے چوری کرنا ہے۔ گویا دوسرے کا مال چوری کرنا اپنا مال چوری

کرنے کے مترادف ہے، دوسرے کے ساتھ خیانت کرنا اپنی ذات کے ساتھ خیانت کرنے کے مانند ہے۔ خائن اسم فاعل ہے جو ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے یعنی جو مسلسل خیانت کرتا ہے، مسلسل گناہ کر رہا ہے اور گناہ اس کے اندر جگہ بنا چکا ہے تو خداوند تبارک و تعالیٰ ایسے خیانت کار کو بالکل دوست نہیں رکھتا، خواہ خیانت کم ہو یا زیادہ۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

''یہ لوگوں انسانوں سے تو چھپتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب رات کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں، اور ان کے سارے اعمال پر اللہ احاطہ کرنے والا ہے''۔

اللہ کا انسان کے سارے اعمال پر احاطہ

کسی امر کو اللہ سے پوشیدہ کرنا محال اور ناممکن ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لوگ کس طرح اپنے امور کو اللہ سے چھپا سکتے ہیں؟ لیکن ہم لوگوں سے تو کچھ امور کو چھپا سکتے ہیں اور جو امور ہماری پسند کے ہیں اُن کو ہم ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس کلام کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر مخفی کرنے سے، چھپانا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے حیاء کرنا، شرم کرنا مراد ہے۔ آیت میں خیانت کاروں کی بحث ہو رہی ہے، وہ رات کو اپنی خیانت کے بارے میں قابل مذمت منصوبے تیار کرتے ہیں کہ کس طرح بتائیں گے کہ ہم نے خیانت نہیں کی اور آپس میں ایسی باتیں کرتے جن میں اللہ کی رضا نہیں، جبکہ اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ان کے اعمال پر اللہ کا احاطہ ہے۔ یہ اس قسم کا کام عوام کے سامنے نہیں کرتے، اگر ان سے ایسا کام صادر بھی ہو جائے تو اس کام کو ان سے چھپانے کی کوشش

کرتے ہیں، کیونکہ انہیں شرم آتی ہے لیکن ان کو اللہ سے شرم نہیں آتی۔ اللہ کی نافرمانی وہی کرتا ہے جو بے حیا اور بے شرم ہوتا ہے۔

هٰاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

"ہاں تم لوگوں نے ان مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا، پھر قیامت کے دن ان کی طرف سے اللہ کے ساتھ کون جھگڑے گا یا ان کا وکیل کون ہوگا"۔

آخرت کا سخت مرحلہ

خیانت کاروں کا دفاع کرنے یا ان کے بارے جھگڑا کرنے یا ان کو بچانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ فقط دنیاوی زندگی تک محدود ہے لیکن اللہ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ قیامت میں تو کوئی نہیں ہوگا جو ان کے امور کی منصوبہ بندی کرے وہاں تو انہوں نے جو کیا ہے اس کا نتیجہ بھگتیں گے۔ حقیقی زندگی تو اُخروی حیات ہی ہے جو اللہ کے ہاں بڑی منزلت والی ہے وہاں خیانت کاروں کا کوئی دفاع کرنے والا نہ ہوگا ان کا کوئی وکیل نہ ہوگا، ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا، ان کی خاطر جھگڑا کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ آخرت کا معاملہ بہت ہی سنگین ہے اس جگہ اس بارے فکر مند ہونا چاہیے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

''اور جو کوئی برا فعل کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے بخشوائے تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا''

اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خیانت کاروں کو شوق دلایا ہے کہ وہ اللہ کی طرف پلٹ آئیں اور اس سے معافی طلب کریں مغفرت مانگیں، انہوں نے دوسروں پر جو ظلم و زیادتی کی ہے یہ دوسروں پر نہیں خود اپنے اوپر ظلم و زیادتی کی ہے۔ ''سُوًٓءا'' ایسی معصیت کو کہتے ہیں جو ظلم کی برائی سے تھوڑا نیچے ہے، ایسا چھوٹا گناہ جو بڑے گناہ کے مقابلے میں اس سے کمتر درجہ کا ہو اسے سوء کہتے ہیں۔ بہر حال خداوند تبارک و تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ آیت اور بعد والی دو آیات ایک ہی مقصد کو بیان کر رہی ہیں، یہ آیات انسان کے اس گناہ کی مختلف جہات کو بیان کر رہی ہیں جس کو وہ گناہ اور معصیت سمجھ کر انجام دیتا ہے، پہلی آیت میں روشن کیا گیا کہ انسان سے سرزد ہونے والی ہر معصیت کے اثرات اور نتائج ہیں جو اس کے نفس اور ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ برائی اثرات چھوڑتی ہے اور اس کے اعمال درج ہوتے ہیں البتہ بندہ توبہ اور استغفار کے ذریعے اس کے برے اثرات کو دُور کر سکتا ہے کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

دوسری آیت میں یہ یاد دلایا گیا ہے کہ گناہوں کے ارتکاب کا نقصان فقط اور فقط خود گناہ انجام دینے والے کو ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اُس کے گناہ کا اثر اس پر نہ پڑے اور اس کی بجائے کسی اور کو اس کا نقصان ہو۔ ایسا نہیں ہوتا! لہٰذا گناہگاروں کو بے ہودہ سعی و کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے گناہوں کو دوسروں کی گردن پر ڈالیں اور افتراء اور تہمت کا راستہ اختیار کریں۔ تیسری آیت میں وضاحت ہے کہ گناہ کا مرتکب ہونے والا انسان اگر فرض کر لیں اس گناہ کا الزام دوسرے کی گردن پر ڈالے گا تو اس نے دوسرے گناہ کا ارتکاب کیا ہے

اور یہ افتراء اور تہمت ہے اور یہ پہلے گناہ کے اوپر ایک اور گناہ ہو گا لہٰذا اس سے ان کو بچنا چاہیے۔

وَ مَنۡ یَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا یَكۡسِبُهٗ عَلٰی نَفۡسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَكِیۡمًا ﴿۱۱۱﴾

"اور جو کوئی گناہ کرے تو وہ خود پر ہی (بوجھ) ڈالتا ہے، اور اللہ سب باتوں کا جاننے والا حکمت والا ہے"۔

گناہوں کا بوجھ گناہ کرنے والے پر

گناہ کا نقصان خود گناہ کرنے والے ہی کو ہو گا اور حقیقت میں خود اس کے خلاف ہی جاتا ہے اور خود اسی کو اسکا نقصان ہوتا ہے اور اس کی خرابیاں اس کے اپنے وجود کو نقصان پہنچاتی ہیں اور گناہ کے اثرات اس سے ہٹ کر دوسرے کی طرف نہیں جاتے۔ خدا جانتا ہے کہ کون گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس کی حکمت اور اس کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ وہ گناہگار کو ہی اس کی سزا دیتا ہے کسی اور کو نہیں دیتا۔

کسی گناہ کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں لاد دیا جاتا۔ (سورہ انعام آیت 164)

جس نے گناہ کیا ہے اسی کو اس گناہ کی سزا ملے گی۔

وَ مَنۡ یَّكۡسِبۡ خَطِیۡٓـَٔةً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِهٖ بَرِیۡٓـًٔا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُهۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۲﴾ ع

"اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر کسی بے گناہ پر تہمت لگا دے تو اس نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ سمیٹ لیا"۔

بے گناہ پر تہمت لگانا صریح گناہ

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک چیز کا ارادہ کرتا ہے لیکن وہ چیز اسے نہیں ملتی ،اس چیز کے بجائے دوسری چیز اسے مل جاتی ہے یا اس کا کوئی اور کام ہو جاتا ہے تو ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے خطاء کی ہے۔ یہاں پر ''خطاء'' سے مراد یہی ہوتا ہے کہ انسان کچھ چاہ رہا ہوتا ہے ، ارادہ کچھ اور کیا ہوتا ہے لیکن جس چیز کا ارادہ کیا ہوتا ہے وہ چیز حاصل نہیں ہوتی بلکہ دوسری چیز ہاتھ آجاتی ہے تو اسے کہتے ہیں غلطی ہو گئی۔ اگر وہی چیز اسے مل جائے تو کہتے ہیں ہاں ٹھیک ہے، صحیح ہوا۔ اس بنا پر ''خَطِیْٓـَٔةً'' کا لفظ معنی کے لحاظ سے ''سیئۃ'' کے لفظ کے قریب ہے ۔'' خَطِیْٓـَٔةً ''وہاں استعمال ہوتا ہے جب اصلی مقصود نہ ملے بلکہ اس کے بدلے دوسری شئے حاصل ہو جائے تو اسے کہتے ہیں کہ یہ غلطی ہو گئی کہ میں کچھ کرنا چاہ رہا تھا کچھ اور ہو گیا مثلاً شکار کے لیے تیر چلایا تو پروگرام تو شکار کو مارنا تھا لیکن تیر جا کر کسی انسان کو لگ گیا۔ کہتے ہیں کہ بھئی اس نے غلطی کی ہے، غلطی سے لگ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا یعنی اس نے ارادے اور قصد سے اور جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اگر جان بوجھ کر کیا ہو تو پھر وہ معصیت ہے۔

'' اِثْمًا ''اس عمل کو کہتے ہیں کہ جس عمل کے کرنے کے نتیجہ میں انسان کے اندر نااُمیدی پیدا ہو جائے اور بہت سارے فوائد اس کے ہاتھ سے جاتے رہیں۔ جیسے شراب پینا، جوا کھیلنا، چوری کرنا؛انسان جب اس قسم کے غلط کاموں میں سے کوئی کام انجام دیتا ہے تو ان کو خیر سمجھ کر انجام نہیں دیتا۔ یہ اعمال معاشرے کی گراوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ ان کاموں کے انجام دینے سے آدمی کی معاشرتی موقعیت اور حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے میں اس کے اوپر اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ پس جو بھی معصیت کرتا ہے اس کا وبال اور نقصان خود اسی کو ہوتا ہے، مثلاً جو واجبات چھوڑتا ہے یا بعض حرام شدہ کاموں کو انجام دیتا ہے تو اس کے

نقصانات خود اسی پر ہیں جیسے کسی کو ناحق قتل کر دیا، چوری کر دی۔ اب اگر کوئی شخص خود چوری کرے اور اس کو کسی اور کی گردن پر ڈال دے، خود قتل کرے اور کہے میں نے نہیں کیا فلاں نے قتل کیا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو گویا کہ اس نے افتراء اور بہتان باندھا ہے یعنی پہلے ایک گناہ کیا اور اس کے بعد اس گناہ کو دوسرے کی گردن پر ڈال دیا تو اس طرح اس نے کھلا بہتان باندھا ہے ایک اور گناہ کیا ہے۔ اس کا بوجھ کسی اور پر ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس سے بھی نہیں بچا اور اس کا گناہ ڈبل بھی ہو گیا۔ ایسا شخص اس طرح اپنی پوری زندگی میں خیر کے کاموں سے محروم ہو جاتا ہے اور جو اس سے گناہ سرزد ہوا ہے اس کا بوجھ اس کی گردن پر ہی رہنا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت ہی عمدہ انداز سے اس مطلب کو بیان کیا ہے۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

"اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتے تھے اور وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے، اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تجھے وہ باتیں سکھائی ہیں جو توں نہ جانتا تھا، اور اللہ کا تجھ پر بہت بڑا فضل ہے"۔

کفار تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے

اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ کفار نے یہ طے کیا تھا کہ پیغمبر ﷺ کو کسی طرح خیانت کار افراد کا دفاع کرنے پر راضی کریں۔ اُنہوں نے جو طے کیا تھا تو وہ ایسا فیصلہ کرنے میں گمراہ تھے کیونکہ اُن کا یہ منصوبہ عین معصیت ہے اور ہر معصیت گمراہی ہے، بے راہ روی ہے۔ حقیقت میں یہ گمراہی خود اُن کے اپنے لیے ہے اُن کی ذات سے باہر نہیں جائے گی اور قطعی طور پر کسی اور کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ ان افعال اور ان باتوں کا نقصان خود اُنہی کے لیے ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہر قسم کے ایسے امور کو رسول اللہ ﷺ سے نفی کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتا ہے کہ تیرے مخالفین تجھے کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔

یہ حکمت اور کتاب جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر نازل فرمائی ہے یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے تمہارے خلاف گمراہ افراد کی سازشیں اور ان کے منصوبے ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں رکھا ہے اور ان کو عصمت کا ملکہ عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو علم پیغمبر اکرم ﷺ کو عطا کیا ہے اور جو عصمت کا شرف انہیں دیا ہے یہ مانع اور رکاوٹ ہے کہ وہ گمراہ ہوں یا کوئی انہیں صحیح راستے سے ہٹا سکے یا ان سے غلط فیصلہ لے سکے۔ کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے، حکمت عطا کرنا، علم دینا جو عصمت کا سبب ہے یہ اللہ کی جانب سے اپنے پیغمبر ﷺ کے لیے بڑا فضل ہے۔ اس عظیم نعمت کے لیے پیغمبر اکرم ﷺ کو درگاہ الٰہی میں شکر انجام دینا چاہیے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝١١٤

''ان لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر کوئی بھلائی نہیں ہوتی ہاں مگر ایسا کیا جائے صدقہ کرنے کے لیے یا کوئی نیک کام کرنے کے لیے یا لوگوں میں صلح کرانے کے لیے (تو اچھی بات ہے)، اور جو شخص یہ کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے تو ہم اسے بڑا ثواب دیں گے''۔

خفیہ سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں

خفیہ سرگوشی کرنے میں کوئی اچھائی نہیں ہے مگر یہ کہ سرگوشی صدقہ دینے یا نیک عمل انجام دینے یا کسی کے درمیان اصلاح کرنے کے لیے ہو؛ جو کوئی بھی اللہ کی رضا کے لیے ایسا کرے تو اسے ہم بڑا اجر دیں گے۔ ''نَجْوٰی'' آہستہ سے گفتگو کرنے کو کہتے ہیں اس طرح کہ دوسرے کو پتہ نہ چلے چاہے رات کی تاریکی میں ہو یا چھپ کر یا آہستہ سے کان میں کی جائے، یعنی رازدارانہ اور مخفیانہ گفتگو کرنا۔ جن صورتوں کا استثناء کیا ہے تو یہ استثناء منقطع ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی امر کے بارے میں صدقے کا حکم ہوا تو صدقہ دے کر سرگوشی کر سکتے ہیں یا لوگوں کے درمیان جھگڑا نپٹانے کے لیے سرگوشی کر سکتے ہیں یا کسی نیک کام کے لیے رازدارانہ گفتگو کرنا خیر ہے۔

خود صدقہ معروف ہے اس لیے اس کے معروف کو لانے کی علت شاید یہ ہو کہ کبھی ایک عام امر ذکر ہوتا ہے اس کے بعد اس عام کے مصادیق میں سے ایک مصداق لایا جاتا ہے جس کی وجہ اس عام کے مصداق میں پائی جانے والی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس مقام پر بھی صدقے کی خصوصیت یہ ہے کہ صدقہ معروف کا فرد کامل اور پورا نمونہ ہے اور کیونکہ صدقہ دینے میں رازداری اپنانا زیادہ ضروری ہے اس لیے اس کو ذکر کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ رات کو خاموشی کے ساتھ چھپ کر بعض کاموں کے متعلق گفتگو کرتے اور منصوبہ بندی کرتے تھے جبکہ اسلامی تربیت کے نقطہ نظر سے جب انسان کو کوئی

مشکل پیش آئے تو پہلے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور اگر شخصی اور ذاتی مسئلہ ہے اور نہیں چاہتے کہ لوگوں میں عام ہو تو پھر رازداری سے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں آکر پیش کر دیں اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ نہ رکھیں اور تنہائی میں کوئی اقدام نہ کریں، اپنے آپ کو شخصی اور نجی مسائل اور ذاتی مشکلات میں منحصر نہ کریں۔

آخر میں فرمایا کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لیے رازدارانہ بات کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اللہ کے قرب کا ذریعہ بنے گا اور اللہ اسے بڑا اجر دے گا۔ لیکن جیسا کہ آیت میں بیان ہوا ہے اگر یہ عمل رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور دشمنی میں ہو اور خود ایسے راستے کا انتخاب کرے جو مومنین کے علاوہ ہو تو پھر اس کو مہلت تو ملے گی مگر اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت ہی پست اور گھٹیا جگہ ہے جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہوگا۔

وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

"اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر سیدھی راہ کھل چکی ہو اور سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف چلے تو ہم اسے اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا ہے اور اسے دوزخ میں ڈالیں گے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔

دوزخ، پیغمبرؐ کے مخالفین کا ٹھکانہ

"مشاقہ" شقہ سے ہے، جس کا معنی کسی چیز سے ایک ٹکڑا علیحدہ کرنا یا اکھاڑنا ہے۔ اس آیت میں شِقَاق مخالفت سے کنایہ ہے؛ کیونکہ جو مخالفت کرتا ہے تو رسول اللہ ﷺ سے خود کو علیحدہ کرتا ہے جو مومنین کی مخالفت کرتا ہے تو ان کی جماعت سے خود کو

الگ کرتا ہے۔ رسول اللہؐ کی مخالفت حقیقت میں اللہ کی مخالفت ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرے تو اس نے اللہ کی اطاعت نہیں کی۔

''سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی اطاعت ہے کیونکہ مومنین ایمان میں اکٹھے ہیں اور ایمان اُن کی ہم آہنگی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے مومنین کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں اور اسلامی معاشرے میں افتراق نہ ڈالیں اور جو افراد خیانت کار ہیں، رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں، مومنین کے طریقے اور راستے کو چھوڑتے ہیں اور اُن کے مخالف راستے کو اپناتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ اُن کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو ان کے اعمال کا تقاضا ہے اور اُنہیں اُن کی خواہش کے مطابق کہ انہوں نے مومنین کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا ہے تو اللہ بھی اُن کے اسی راستے میں اُن کی مدد کرے گا کیونکہ انہوں نے خود ایسا کیا ہے اور یہی کسی کو خدائے بزرگ و برتر کا شریک قرار دینے کے مترادف ہے، وہ شرک کے راستے پر گئے ہیں اور دُنیا میں بھی اُن کو سزا ملے گی اور آخرت میں وہ جہنم میں جائیں گے اور جہنم بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

''بے شک اللہ اس کو نہیں بخشتا جو کسی کو اس کا شریک بنائے اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے، اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا تو وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا''۔

خدا مشرک کو نہیں بخشتا

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اللہ تبارک و تعالیٰ کا شرک ہے اور الٰہی راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے کو اختیار کرنا اور اسلام کا پرچم چھوڑ کر دوسرا پرچم بلند کرنا ہے اور اللہ کے دشمن کو اپنا دوست بنانا اور غیر اللہ کو اپنا معبود بنانا اور الٰہی سنت اور طریقہ میں ہر طرح کی تحریف کرنا ہے؛ خدا ایسوں کو معاف نہیں کرتا لیکن شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کو اگر خدا چاہے تو ان کو معاف کر دیتا ہے۔

شرک بڑے گناہوں میں سے ہے اور تمام گناہوں میں بدترین گناہ ہے۔ جو بھی اللہ کا شرک کرتا ہے اور غیر خدا کی عبادت کرتا ہے اور غیر خدا کے احکام کی پیروی کرتا ہے اور ہدایت کے راستے کو چھوڑتا ہے تو بہت بڑی گمراہی میں ہے۔ کیونکہ الٰہی روش اور الٰہی طریقہ میں دُنیا و آخرت کی سعادت کی ضمانت موجود ہے جو اس راستے سے دُور ہو جاتا ہے اور دوسرے راستے پر چل پڑتا ہے اور اپنے لیے باطل، غیر صحیح اور ناحق راستہ اپنا لیتا ہے اور اہل باطل کے ساتھ معاہدے کر لیتا ہے اور اپنی خواہشات سے ابھرے ہوئے نظریات کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس نے ایسا راستہ اختیار کیا ہے جس میں نہ تو اس کے لیے دُنیا کی سعادت ہے اور نہ ہی اسے اللہ کی مغفرت ملے گی اور وہ جہنم میں جائے گا اور جہنم بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۙ﴿۱۱۷﴾

"یہ لوگ اس (اللہ) کے سوا عورتوں کی عبادت کرتے ہیں، اور صرف شیطان سرکش کی عبادت کرتے ہیں"۔

اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کرنے والے

''اناث'' انثیٰ کی جمع ہے جس کا معنی نرم، اثر پذیر، دوسرے سے اثر قبول کرنا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے ''انث الحدید'' لوہا نرم اور ہتھوڑے کے اثر کو قبول کرنے کے قابل ہوا۔ ''انث المکان'' فلاں جگہ بہت سرسبز ہو گئی کہ اس نے سبزے کو قبول کیا یا قابل کاشت ہو گئی۔ ان سب میں مشترک معنی یہ ہے کہ ان میں متاثر ہونے اور دوسری شئے سے اثر قبول کرنے کا معنی پایا جاتا ہے۔

بتوں کو اس لیے اناث کہا گیا ہے کیونکہ منفعل ہیں اور دوسروں سے اثر کو قبول کرتے ہیں وہ خود انسان کی مخلوق ہیں اور انسان سے وہ متاثر ہوتے ہیں انہوں نے جس طرح اس کو بنایا ہے اسی طرح وہ بن گئے ہیں اور یہ سورہ الحج کی آیت کا ترجمہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے علاوہ جن مخلوقات کی وہ عبادت کرتے ہیں تو وہ سب ایک مکھی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی کیوں نہ بنیں، اگر ایک مکھی ان سے کچھ چھین لے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے، یہ تلاش کرنے والے اور جو تلاش کر رہے ہیں دونوں بہت ہی کمزور ہیں اور انہوں نے خدا کو جس طرح پہچاننا چاہیے تھا اس طرح نہیں پہچانا اور عبودیت کا حق ادا نہیں کیا اور یہ نہیں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ قوی ہے، شکست ناپذیر ہے۔ یہ جن جمادات کی عبادت کرتے تھے وہ بے اثر ہیں وہ کسی پر اثر نہیں ڈال سکتے اور دوسرے کا اثر قبول کر لیتے ہیں جمادات کو جس طرح جوڑا اسی طرح بن گئے، جو ان کی عبادت کرتے ہیں انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بتوں کو اناث اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ ہر مخلوق سے اثر لے لیتے ہیں، انسان سے بھی اثر لیتے ہیں، ہر مخلوق سے اثر لیتے ہیں لہٰذا جب وہ دوسرے کا اثر لیتے ہیں تو وہ خالق نہیں ہو سکتے ان کی عبادت نہیں ہو سکتی، ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ کوئی قانون، شریعت اور دین بنائیں۔

''مرِید'' اسے کہتے ہیں جو ہر قسم کی خیر سے عاری اور خالی ہو۔ غیر خدا کی عبادت اور شیطان کی دعوت پر عمل کرنا ہے مرید یعنی ہر خیر سے عاری ہے کیونکہ یہ شیطان کی اطاعت ہے اور وہاں انہیں کوئی خیر نہیں ملتی۔ بتوں کی عبادت کے باطل ہونے کے لیے یہ بہت عمدہ دلیل دی گئی ہے اگر سوچیں کہ انسان جب ان پر خود تصرف کرتا ہے اور وہ خود کچھ تصرف نہیں کر سکتے وہ نہ کچھ سمجھتے ہیں نہ وہ کچھ بنا سکتے ہیں نہ کسی سے کچھ لے سکتے ہیں نہ کسی کو کچھ دے سکتے ہیں تو ان کی عبادت کیسی؟!

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿١١٨﴾

''اس (شیطان) پر اللہ کی لعنت ہے، اور کہا کہ اے اللہ میں تیرے بندوں میں سے حصہ مقرر لوں گا''۔

شیطان پر اللہ کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اپنی رحمت سے دُور کیا ہے۔ یہ شیطان کی ایک صفت ہے۔ اس کی دوسری صفت پہلی صفت کی وجہ ہے گویا اللہ تعالیٰ سمجھانا چاہتا ہے کہ شیطان ہر خیر سے عاری ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ راندہ درگاہ الٰہی ہے۔ اللہ کی رحمت سے دُور ہو چکا ہے۔ بعد والا جملہ شیطان کا ہے جو دوسری آیات میں بھی اس سے نقل ہوا ہے، بطور مثال سورہ ص آیت 82 شیطان کی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ اس نے کہا: تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور دھوکہ دُوں گا اور اغوا کروں گا''۔ یہاں پر اس مطلب کو سمجھایا جارہا ہے کہ جو لوگ شیطان سے دھوکہ کھا چکے ہیں اور شیطان نے انہیں بہکایا ہے اس کے باوجود یہ اللہ کے بندے ہیں، وہ شیطان کے بہکاوئے میں آنے کے باوجود اللہ کی بندگی سے نہیں نکل سکتے اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ کی بندگی سے باہر ہو جائیں جبکہ اللہ تعالیٰ عالمین کا پروردگار اور رب ہے

ان سب کا خالق ہے، ان کے بارے وہ جو چاہے حکم جاری کر سکتا ہے۔ جبکہ شیطان ایسا نہیں ہے ۔ جو شیطان کے بہکاوے میں آ کر اللہ کی اطاعت چھوڑتے ہیں وہ خسارہ میں ہیں۔

وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

"اور البتہ انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور البتہ ضرور انہیں اُمیدیں دلاؤں گا اور البتہ ضرور انہیں حکم کروں گا کہ جانوروں کے کان چیریں اور البتہ ضرور انہیں حکم دوں گا کہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتیں بدلیں، اور جو شخص اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے گا وہ صریح نقصان میں جاپڑا"۔

انسان کو گمراہ کرنے کے متعلق شیطان کا اعلان

شیطان کہہ رہا ہے کہ حتمی طور پر میں انہیں گمراہ کروں گا وہ اس طرح کہ میں انہیں اُمیدیں دلاؤں گا، انہیں آمادہ کروں گا کہ وہ حلال حیوانات کے گوشت کو اپنے اوپر حرام کریں، ان کے کانوں میں سوراخ کریں، ان کو دستور دُوں گا تاکہ اللہ کی مخلوق کو دگرگوں کردیں، ان کی ہیئت بدل دیں۔ اللہ فرمارہا ہے جو بھی اللہ کی اطاعت کے بجائے شیطان کی بات مانتے ہوئے اس کی اطاعت کرے اور اسے اپنا سرپرست بنائے حتمی طور پر بڑے نقصان میں ہے۔

شیطان کا یہ جملہ پچھلی آیت کا تتمہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ میں ان انسانوں کو تیرے راستے سے ہٹاؤں گا، تیری اطاعت سے بہکاؤں گا، تیرے دین پر انہیں نہیں رہنے دُوں گا، تیرے رسول کی مخالفت ان سے کرواؤں گا اور خیالی اور وہمی آرزوؤں میں انہیں سرگرم رکھوں گا اور انہیں کہوں گا۔ اس لیے جو بھی اللہ کے امر کی مخالفت

کرے اور شیطان کی دعوت اور اس کی بات کو قبول کرے جیسے بعض حیوانوں کے کانوں میں سوراخ کرنا۔ ''بحیرۃ'' ایسی اونٹنی کہ جو پانچ دفعہ بچے جَن چکی ہے۔ ''سائبۃ'' ایسا اونٹ جو عہد کو پورا کرنے کے عنوان سے آزاد کر دیا جاتا ہے۔ اُن کے کانوں میں سوراخ کر دے تاکہ ان کا گوشت اپنے اوپر حرام قرار دیں۔ یہ گمراہی کے نمونوں میں سے ایک نمونہ ہے۔

سابقہ آیت کی طرح یہاں پر بھی عمومی گمراہی کے بعد اس عمومی گمراہی کے مصادیق میں سے ایک خاص مصداق کا ذکر ہوا ہے۔ شیطان کہتا ہے کہ میں انہیں آمادہ کروں گا کہ اللہ کی مخلوق میں تبدیلی لے آئیں مثلاً مردوں میں ازدواج کی توانائی ختم کر دیں یعنی انہیں خصی کر دیں یا مصلی کر دیں کہ بعض اعضاء کو کاٹ دیں یا مرد ہم جنسی کریں ایک دوسرے کے ساتھ لواط کریں اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ مساحقہ کریں۔ مرد اور عورت آپس میں شادی نہ کریں۔ یہ سب باتیں فطرت کے قانون کے خلاف ہیں اور دین حنیف جس میں شرک کی نفی کی گئی ہے اس کو چھوڑنا ہے اور شریعت الٰہی کے خلاف جو قوانین ہیں ان کو اپنانا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا شیطان کے اس اعلان پر کہ جو بھی اللہ کی بجائے شیطان کو اپنا دوست بنائے گا، سرپرست بنائے گا تو وہ بڑے خسارے میں ہو گا جو رب العالمین جو کل ہستی کا حاکم ہے، کل جہان کا معبود ہے، کل جہان کا ولی ہے اس کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا سرپرست بنا لے یقینی بات ہے وہ بہت بڑے خسارے میں ہے کیونکہ اللہ کا راستہ برتر ہے۔ کامیابی اسی میں ہی ہے۔

جو اللہ کے راستے کو چھوڑتا ہے تو وہ منحرف ہو گیا ہے اور غلط راہ پر چل پڑا ہے اور اس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہو گا؟ ایسے شخص نے حقیقی سعادت کو چھوڑ دیا ہے، خلقت کا جو کمال ہے اسے چھوڑ دیا ہے اور جس نے سعادت کو چھوڑا ہے اور سعادت کے علاوہ دوسرے راستے کو اختیار کیا ہے تو وہ اس آیت کا مصداق بن گیا ہے جس نے شیطان کو اپنا ولی بنا لیا ہے تو ایسا شخص بڑے خسارے میں ہے، مسلمانوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے۔ شیطان پرست، کفار اور

مشرکین جن کا کام ہی فساد کرنا ہے اور فاسد کرنے کے علاوہ کوئی اور ان کا عمل نہیں ہے، خرابی ہی خرابی ان کا مطمعٔ نظر ہے، یہ اس آیت کے واضح نمونے ہیں۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿١٢٠﴾

"(شیطان) ان سے وعدے کرتا ہے اور انہیں امیدیں دلاتا ہے، اور ان سے صرف جھوٹے وعدے کرتا ہے"۔

شیطان کے جھوٹے وعدے

شیطان کے سب وعدے وسوسوں کے سوا کچھ نہیں اور وہ وسوسے بغیر واسطے کے ان کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے لوگ وہمیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور شیطانی وسوسہ اسی سے ہوتا ہے۔ جھوٹی تمناؤں اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ نے غرور کہا ہے۔ یعنی سیدھا سادہ دھوکہ ہے اور شیطان کا وعدہ غرور اور فریب ہے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْھَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

"ایسے لوگوں کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور کہیں جگہ نہ پائیں گے اس سے بچنے کے لیے"۔

شیطان سے دھوکہ کھانے والوں کا انجام

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے وعدوں کو بیان کرنے کے بعد شیطان کا دھوکہ کھانے والوں کا انجام بتایا کہ جنہوں نے شیطان کی پیروی کی تو ان کی منزل دوزخ ہے اور اس کے علاوہ کوئی ان کے لیے راستہ اور چارہ ہی نہیں ہے جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ انسان ایسی جگہ پناہ لیتا ہے جہاں اسے آرام ملے لیکن یہ تو جہنم کی جانب جا رہے ہیں جہاں عذاب ہی عذاب ہے اور وہاں سے واپسی بھی ممکن نہیں ہے وہاں سے فراری بھی نہیں ہو سکتے، بے امن جگہ ہے سکون تو وہاں ہے ہی نہیں۔

وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيۡلًا ﴿۱۲۲﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہیں ہم باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور اللہ سے زیادہ سچا کون ہے''۔

نیک کام کرنے والے مومنین کا انجام

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان سے دھوکہ کھانے والوں کی حالت اور ان کا انجام بتا دیا تو ضروری تھا کہ ان کے بارے بھی بتائے کہ جو ان کے مقابلے میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ضمیر متکلم وحدہ یعنی میں کہنے کی بجائے ضمیر متکلم مع الغیر یعنی ہم کو استعمال کیا ہے اور مومنین کے بارے میں بتایا ہے کہ ہم اُن کے لیے ایسا کریں گے ویسا کریں گے۔ یہ قریب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مومنین کے درمیان کوئی مانع نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔ اسی طرح اس عبارت سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ مومنوں کے مقام کا مقابلہ شیطان سے دھوکہ کھانے والوں سے نہیں ہو سکتا، دنیا بے اہمیت، حقیر اور معمولی ہے۔ اس کے مقابلے میں مومنین کی جگہ بہت عظیم، بزرگ اور محترم ہے، بڑی اہمیت والی ہے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ جنہوں نے شیطان سے دھوکہ کھایا ہے یہ اس کے برعکس ہے، یہ وعدہ برحق ہے شیطان جو وعدے دیتا تھا تو وہ جھوٹا تھا اس نے کوئی وعدہ پورا نہیں کرنا لیکن اللہ جو وعدہ دے رہا ہے، اللہ سچ بولتا ہے اور اللہ کے علاوہ کون ہے جو اس طرح سچ بولے؟ اللہ جو کہتا ہے وہ عینِ حقیقت ہے، عینِ صداقت ہے۔ اللہ کے علاوہ سب مخلوق ہیں وہ سب اللہ کے

کنٹرول میں ہیں، اللہ ہی کا ان سب پر اثر ہے وہ سب اللہ کی خلقت ہیں وہ سب اللہ کے ارادے کے تحت ہیں۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

''نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر، جو کوئی برائی کا کام کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی، اور اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں پائے گا''۔

برائی کرنے والے کو برائی کی سزا

''امانِیّ'' سے آرزوئیں اور غلط قسم کی توقعات مراد ہیں، خیالی تصورات اور وہمیات، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا فرماتا ہے اللہ کے ہاں جو کرامت ہے وہ تمہاری مرضی سے نہیں ہے اور نہ ہی اہل کتاب کی مرضی سے ہے بلکہ اللہ کے ہاں کرامت کا دارومدار عمل پر ہے اگر تمہارا عمل خیر ہو گا تو خیر ہی پاؤ گے، اگر شر ہو گا تو شر ہی پاؤ گے۔ کیا تمہیں سوائے اس کے کچھ اور بدلے میں دیا جائے گا جو تم نے عمل کیا ہے؟ جو عمل کیا ہے وہی بدلہ تمہیں دیا جائے گا، اسی کا اثر تمہیں ملے گا۔ (سورہ النمل، آیت 90)

یہ آیت بعض ان مومنین کے حالات کو بیان کر رہی ہے جو خیال کرتے تھے کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان کی وجہ سے ان کا یہ حق ہے اور خدا پر واجب ہے کہ وہ ان کا لحاظ رکھے اور جب کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اس میں مومنین کی مدد کرے اور ایمان کی وجہ سے ان کو صاحب کرامت اور صاحب حرمت بنائے اور یہ ایمان ہی ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں محترم ہیں۔ اہل کتاب بھی باطل اور غلط اُمیدیں رکھتے تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ وہ اللہ کے

بیٹے ہیں اپنے آپ کو اللہ کا دوست سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اُمی یعنی مکہ والے اور رسول اللہ ﷺ کو ہمارے اوپر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ یہ سب ان کے خیالات ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہے کیونکہ صرف اسلام میں داخل ہونا کرامت نہیں لے آتا اور نہ ہی یہودیت یا نصرانیت میں داخل ہو جانے سے کرامت آجاتی ہے بلکہ کرامت کا دارومدار عمل پر ہے جو بھی برا عمل کرے تو اس کو اس کے برے عمل کی سزا ملے گی۔ شریعت اسلامی میں قصاص کا قانون ہے، وہی چلے گا۔ یہاں مطلق آیا ہے کہ دُنیاوی سزائیں بھی ہیں اخروی بھی سزائیں ہیں اور کوئی بھی اپنے آپ کو برے عمل کے نتیجے سے بچا نہیں سکتا، برے عمل کا نتیجہ برا ہی ہے اور برائی کا برا اثر اسی دُنیا میں بھی اسے دیکھنا پڑے گا اور جو کوئی برائی کرتا ہے تو اسی برائی کرنے والے کی طرف اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ کسی کی ہتک عزت کرنا برا عمل ہے جو اس برے فعل کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ لوگوں کے درمیان نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی کسی کو قتل کرتا ہے تو لوگوں کے درمیان اسے نفرت سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کی طرف سے بیان شدہ قانون کی خلاف ورزی کرے گا تو اسے سزا ملے گی۔ تنہا یہ کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ایمان عمل چاہتا ہے، عمل ہوگا تو یہ دلیل ہوگی کہ تم صحیح مومن ہو۔ ایسے شخص کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور یاور ومددگار نہیں ہوگا۔ دُنیا میں تو اس کے رشتے دار اور اس کے دوست ہوتے ہیں جو اس کو سزا سے بچا سکتے ہیں لیکن آخرت میں کوئی اسے نہیں بچا سکتا، آخرت میں ان کے کئے ہوئے سب اعمال کی انہیں سزا ملے گی جو عمل کیا ہے اس کا نتیجہ اسے ملے گا۔

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

''اور جو کوئی اچھے کام کرے گا مرد ہو یا عورت لیکن وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا''۔

نیک کام کرنیوالوں کے عمل کا پورا بدلہ

اس آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے پہلے تو بتایا ہے کہ بہشت مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے ان میں سے جو بھی نیک عمل کرتا ہے تو وہ بہشت میں ہی جائے گا۔ اس کے بعد بہشت میں جانے کو مقید کر دیا ہے اور اس کو ایک شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے اور وہ شرط ایمان ہے کہ یہ نیک عمل جنت میں لے جائے گا اس شرط کے ساتھ کہ نیک عمل انجام دینے والا باایمان ہو۔ اگر نیک عمل انجام دینے والا باایمان نہ ہو گا تو اس کا یہ عمل اسے جنت میں نہیں لے جائے گا۔

لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت میں فرق نہیں ہے۔ اسلام کا یہ نظریہ ان اقوام کے نظریہ کے خلاف ہے جو خیال کرتے تھے کہ عورتوں کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے جیسے ہندوستان، مصر اور باقی بت پرست اقوام کا یہی نظریہ تھا وہ اس بات کے قائل تھے کہ عورتوں کے اچھے اعمال کا کوئی اجر نہیں ہے۔ یہودی اور نصرانی بھی عورتوں کو اللہ کے ہاں ذلیل و خوار اور بے حثیت سمجھتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ عورتوں کی خلقت ناقص ہے، ان کا اجر تھوڑا ہے اور عورتوں کی کرامت و حرمت اور عزت مردوں کی وجہ سے ہے۔ اسلام نے تمام ادیان اور اقوام کے عورت کے متعلق خیالات کے برعکس فرمایا کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ہیں، جس طرح مردوں کو اچھے عمل کا اجر دیا جائے گا اسی طرح عورتوں کو بھی ان کے اچھے عمل کا اجر دیا جائے گا، ان کے نیک عمل کے اجر سے ذرہ برابر بھی کم نہیں ہو گا۔ عمل صالح اور ایمان کی وجہ سے جس طرح مرد بہشت میں جائیں گے اسی طرح عورتیں بھی بہشت میں جائیں گی۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾

"اس شخص سے بہتر دین میں کون ہے جس نے اللہ کے حکم پر پیشانی رکھی اور وہ نیکی کرنے والا ہو گیا اور ابراہیم کے دین کی پیروی کی جو یکسو تھا، اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا"۔

اسلام اور ایمان کا فائدہ

اس آیت میں ایک پوشیدہ سوال کا جواب ہے کہ اگر مسلمان، یہودی یا نصرانی ہونا اللہ کے ہاں کرامت اور عزت کا سبب نہیں ہے تو اسلام اور ایمان کا کیا فائدہ ہے؟ آیت میں اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ دینی کرامت ایک ایسا امر ہے جس کا حسن اور خوبصورتی کسی عقل مند پر پوشیدہ نہیں ہے اور یہ طے شدہ امر ہے، تسلیم شدہ ہے کہ اسلام بہترین دین ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے سامنے تسلیم کر دے، خود کو اللہ کے حوالے کر دے اور اس کا رُخ اللہ کی جانب ہو۔ وہ اللہ جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے، وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جس طرح ہر مخلوق اللہ کے حضور حاضر ہے۔ یہ وہی آئین اور دین ہے جو ابراہیم کا دین تھا، یہ دین فطرت کے مطابق ہے اور ساری غیر الٰہی شریعتیں اور قوانین کو ختم کرتا ہے، نیکی سے مراد یہاں پر عقیدہ اور عمل کی نیکی ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلمان تھے، مشرکین سے نہیں تھے۔ اسی طرح وہ اللہ کے خلیل تھے کہ اللہ سے ان کو ایسا عشق و محبت تھی کہ پورے جسم اور رُوح کے ساتھ اس میں کوئی رخنہ نہیں تھا بس محض اللہ کے تھے اور اللہ نے بھی اسے اپنا خلیل قرار دے دیا۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع

”اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ سب چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے“۔

آسمانوں اور زمین پر اللہ کا احاطہ

پس اللہ کا حکم انسان کے بنائے ہوئے باطل اور ناحق احکام اور قوانین کی طرح نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مالک مطلق ہے، وہ کسی کا مملوک نہیں ہے ہر چیز پر اس کا احاطہ ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے بادشاہ، حکمران اور سرداروں کی مالکیت ہرگز مطلق نہیں ہوتی، ان کی مالکیت محدود ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص قوم کے فیصلوں کے تحت حکومت پر آتے ہیں اور بعض دوسرے اُن کو ساقط کرتے ہیں۔ اگر اُن کا کام عام لوگوں کی رائے کے خلاف ہو تو پھر انقلاب آتے ہیں اور ان کی حکومت کو گرا دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اس کی حکمرانی ہر شئے پر ہے، اس کی حکمرانی کو کوئی توڑ نہیں سکتا۔

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

”اور تجھ سے (یتیم) عورتوں کے (نکاح کے متعلق) پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں حکم (اجازت) دیتا ہے، اور جو (حکم) تمہیں قرآن سے پڑھ کر سنایا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جن کا تم حق تو نہیں دیتے لیکن ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور (اسی طرح وہ حکم جو) کمزور بچوں کے بارے میں

ہے، اور یہ (بھی حکم ہے) کہ یتیموں کے حق میں انصاف پر قائم رہو، اور تم جو نیکی بھی کروگے پس تحقیق اللہ اسے جاننے والا ہے"۔

یتیم عورتوں سے انصاف اور نیکی کا حکم

اس آیت میں عورتوں کے معاملات کے بارے میں ان مشکل احکام کا سوال ہوا ہے جنہیں اسلام نے پہلی مرتبہ بیان کیا، جو زمانہ جاہلیت میں نہیں تھے لہٰذا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے عورتوں کے حوالے سے وراثت کے احکام اس سورہ میں بیان کر دیئے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو ان کے باپ کی میراث کا حصہ نہیں ملتا تھا۔ باپ کی میراث صرف مردوں کو ملتی تھی۔ اگر وہ یتیم عورتیں حسین و جمیل ہوتی تھیں تو ان سے شادی کر لیتے تھے اور اگر خوبصورت نہ ہوتی تھیں تو اُس کے ساتھ ہمبستری بھی نہیں کرتے تھے اور اسے شادی کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے تاکہ اس کے مال کو ہڑپ کر سکیں۔ اس آیت میں اللہ نے عورتوں کے ارث اور وراثت کے بارے تفصیل سے بیان کیا ہے اور یتیموں کا حق بھی بتایا ہے اور ایسے بچے جو بے سرپرست یا معذور ہیں، خلقت کے اعتبار سے ان کے اعضاء میں نقص ہے تو وہاں بھی کہا گیا ہے کہ عدل اور انصاف کے ساتھ ان کے ساتھ برتاؤ کرو اور ان کا سہارا بنو اور یتیموں کے بارے میں عدالت کی رعایت کرو اور عورتوں اور یتیموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کے بیان شدہ احکام پر عمل کرو؛ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور یہ وہی احکام ہیں جو اللہ نے بتائے ہیں وہ بہتر جانتا ہے کیا ہونا چاہیے۔ یہ ترغیب اور تشویق ہے کہ ان احکام پر عمل کرو اور ڈرایا بھی گیا ہے کہ اگر مخالفت کروگے اور ان کے مطابق عمل نہیں کروگے تو سزا بھی ملے گی۔

وَ اِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِہَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَہُمَا صُلۡحًا ؕ وَ الصُّلۡحُ خَیۡرٌ ؕ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۲۸﴾

''اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے لڑنے یا منہ پھیرنے سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح سمجھوتہ کر لیں، اور سمجھوتہ بہتر ہے، اور (انسان کے) نفس میں حرص تو ہوتی ہے، اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ کو تمہارے اعمال کی پوری خبر ہے''۔

شوہر اور بیوی کا آپس میں سمجھوتہ

''نشوذ'' منہ پھیرنے اور توجہ نہ کرنے اور بے رغبت ہونے کے معنی میں ہے۔
اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر عورت دیکھے کہ اس کا شوہر زوجیت کے تقاضے پورے نہیں کر رہا اور وہ اس میں رغبت نہیں رکھتا تو بیوی کو حق ہے کہ وہ توافق ایجاد کرنے کے لیے اپنے بعض حقوق کو چھوڑ دے اور ان سے چشم پوشی کر لے تاکہ اس حیلے سے طلاق نہ ہو۔ صلح کی شرط میں اس لیے نشوذ و اعراض کا خوف رکھا گیا ہے کیونکہ صلح اس وقت ہوتی ہے جب دونوں کے درمیان اختلاف ہو اور طلاق مد نظر نہ ہو۔ بخل انسان کے نفسیاتی خواہشات کا اہم حصہ ہے اور انسان کی طبیعت میں داخل ہے۔ بخل ہی کی وجہ سے انسان اپنے منافع اور اپنے مفادات کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ پس نفسیاتی لحاظ سے ہر شخص میں بخل موجود ہے۔ بخل کا عنوان اور حالت ہر وقت اس کے اندر موجود ہے۔

زوجیت کے حقوق جن میں لباس، خوراک اور ہمبستری اور مقاربت شامل ہے، کے حوالے سے عورت بخل رکھتی ہے یعنی اگر اس کے حقوق ضائع ہو رہے ہوں تو سامنے

کھڑی ہو جاتی ہے۔ اگر مرد اپنی بیوی سے بے رغبت ہو جائے تو اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے تو اس صورت میں دونوں پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ آپس میں صلح اور توافق کر لیں اور اپنے کچھ حقوق سے چشم پوشی کر لیں اور کچھ پر عمل کریں اور پھر مردوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ احسان اور تقویٰ پر عمل کریں اور یہ بات یاد رکھیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے اور عورتوں کے ساتھ ظلم و جور کا رویہ نہ رکھیں اور ان کو اپنے حقوق سے چشم پوشی کرنے پر مجبور نہ کریں۔ شوہر اور بیوی دونوں کو چاہیے کہ باہمی تعلق کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ایک اپنے کچھ حقوق کو چھوڑ کر باہمی سمجھوتہ کر لیں اور اپنے گھر کا ماحول خراب نہ کریں ایک دوسرے کو سکون فراہم کریں۔

وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنْ تُصْلِحُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

''اور تم عورتوں (بیویوں) کو ہرگز برابر نہیں رکھ سکو گے اگرچہ اس کی حرص کرو، سو تم بالکل ہی ایک طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری عورت کو لٹکی ہوئی چھوڑ دو، اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

بیویوں کے درمیان عدالت قائم کرنے کا حکم

یہاں پر اس واقعیت اور حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر انسان کی کئی بیویاں ہیں تو تمام بیویوں میں عدالت کا لحاظ رکھے، معاشرت میں افراط و تفریط نہیں ہونی چاہیے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت زیادہ کوشش کرنے کے باوجود بھی حقیقی عدالت قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ البتہ شرعی واجب کی رعایت ہو سکتی ہے۔ حقیقی برابری دینا ایسا امر ہے جس پر کوئی

مرد قادر نہیں لیکن ان پر واجب ہے کہ جس قدر اس سے ہو سکتا ہے وہ تمام بیویوں کے درمیان مساوات اور برابری رکھے اور ان میں سے کسی کے حق کو ضائع نہ کرے۔ جہاں تک دل کا تعلق ہے تو وہ مرد کے بس سے باہر ہے۔ لیکن جو حقوق زوجیت ہیں جیسے مقاربت، رہائش، لباس اور خوراک میں تمام بیویوں کے درمیان مساوات قائم کرے اور ان میں سے کسی ایک کو دوسری پر فوقیت نہ دے۔ ایک بیوی سے زیادہ تعلق اس بات سے مانع نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری بیوی کے حقوق ضائع ہوں اور انہیں اس قدر بے سہارا کر دے جیسے گویا کہ وہ اس کا شوہر ہی نہیں ہے۔

اس آیت میں جس عدالت کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ مراد ہے کہ سب بیویوں کے ساتھ شوہر کا رویہ ظاہری طور پر اچھا ہو۔ یہاں پر جس عدالت کا ذکر ہوا ہے اس سے حقیقی عدالت کی بجائے تقریبی عدالت مراد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بیوی کا حق ضائع نہ ہو۔ لیکن سورہ نساء آیت ۳ '' فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً '' اگر تمہیں ڈر ہو تو کہ انصاف نہیں کرو گے تو پھر ایک رکھو'' میں تقریبی عدالت مراد ہے یعنی عدالت کے قریب قریب۔ جو چیزیں واجب ہیں وہ ادا کی جائیں، اگر ان کا لحاظ نہیں ہو سکتا تو پھر ایک عورت پر ہی اکتفاء کیا جائے۔ آیت کے آخر میں مردوں کو اس بات کی تشویق دلائی گئی ہے کہ اگر تمہارے درمیان چپقلش بڑھ رہی ہے تو آپس میں اصلاح کرنے کے درپے ہو جاؤ کیونکہ اصلاح تقویٰ کے مصادیق میں سے ہے، تقویٰ کی وجہ سے اللہ کی مغفرت اور رحمت آتی ہے۔ اس جملہ میں پہلے والی آیت میں جو احسان اور تقویٰ کا کہا گیا تھا اسی بات کی مزید تاکید کی گئی ہے۔

وَ اِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

''اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو اللہ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے پروا کر دے گا، اور اللہ وسعت کرنے والا حکمت والا ہے''۔

شوہر اور بیوی کی جدائی

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر بیوی اور شوہر آپس میں اکٹھے نہیں رہ سکتے اور صلح انجام نہ پائی اور باہمی توافق نہ ہو سکا تو پھر وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے۔ اللہ کا فضل وسیع ہے، وہ مرد کو ایک ایسی عورت دے گا جو اس کے ساتھ موافق ہو گی اور عورت کو بھی ایسا شوہر دے گا جو اس کے موافق ہو گا۔ پہلے سے بہتر ہو گا یعنی نفقہ، محبت، مقاربت اور زوجیت کے دیگر لوازمات اور تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو گا۔ ایسا نہیں ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے فلاں عورت کو صرف فلاں مرد کے لیے ہی خلق کیا ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو بات ہی ختم ہو جائے اور ان کے لیے دوسرا کوئی راستہ نہ ہو، نہیں ایسا نہیں ہے ازدواج اللہ کی طرف سے فطری طریقہ ہے اور اسے معطل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ دونوں آپس میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں، ان کے لیے بہتر افراد مل جائیں گے یعنی مرد کو دوسری بیوی مل جائے گی اور بیوی کو دوسرا شوہر مل جائے گا۔ اور اگر ان کے درمیان صلح ہو جائے تو ٹھیک ہے تب بھی خدا وسعت دینے والا ہے، حکیم ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے فضل سے ان کو بے نیاز کر سکتا ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِیَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۱﴾

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور ہم نے حکم دیا ہے پہلی کتاب والوں کو بھی اور تمہیں بھی کہ اللہ سے ڈرو، اور اگر ناشکری کرو گے تو

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ بے پروا تعریف کیا ہوا ہے"۔

اللہ تعالیٰ جہان ہستی کا مالک مطلق

یہاں پر مطلق مالکیت کا حکم بتایا جا رہا ہے جو مالکیت رکھتا ہے اسی کو قانون بنانے کا حق ہے۔ تقویٰ کا لحاظ رکھنے کی مزید تاکید کی گئی ہے۔ ازدواج کے جتنے بھی مراحل ہیں اُن سب میں اللہ کا تقویٰ پیش نظر رہے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ مسلمانو! یہ فقط تمہیں نہیں کہا جا رہا، تم سے پہلے جو گزرے ہیں ان کو بھی یہ بات کہی گئی تھی۔ تقویٰ اختیار نہ کرنا کفر ہے۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو اللہ نے واجب قرار دیا ہے اس کو ادا کرو اور جو حرام قرار دیا ہے اسے چھوڑو اور اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ۔ اللہ کی نعمتوں کا انکار، کفر کا منشاء اور سبب بنتا ہے۔ خواہ یہ کفر ظاہری ہو جیسے کفار اور خدا کے وجود کا انکار کرنے والے یا مشرکین کا کفر، خواہ یہ کفر باطنی ہو جیسے مسلمان بندے سے گناہ کا سرزد ہونا باطنی کفر ہے۔

کفر خواہ باطنی ہو یا ظاہری ان میں سے کوئی بھی اللہ کو نقصان نہیں دیتا، کیونکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کا ہی ہے، اللہ کو تمہاری احتیاج نہیں ہے اور نہ ہی اللہ کو تمہارے تقویٰ کی ضرورت ہے، اللہ تم سے بے نیاز ہے، اللہ کو تمہارے شکر کیبھی ضرورت نہیں ہے۔ تم خواہ شکر کرو یا کفران اس کا فائدہ یا نقصان تم ہی کو ہو گا۔ تقویٰ تمہارے اصلاح و ترقی کے لیے ہے وگرنہ وہ ساری چیزوں کا مالک ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور اُس کی خلقت کے جتنے بھی معاملات ہیں وہ سب اسی کے اختیار اور تصرف میں ہیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کارساز کافی ہے"۔

اللہ کی مالکیت

خدا ایسا مالک ہے جو مملوک نہیں۔ وہ جس طرح چاہے اپنی مخلوقات میں تصرف کر سکتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے امور کو چلانے کے لیے اکیلا ہی کافی ہے۔ اس معاملے میں اسے کسی کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس بنا پر اگر اسے بندوں کے اعمال اچھے نہ لگیں تو وہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ اور ان کی جگہ دوسری قوم کو وجود میں لا سکتا ہے۔ جس طرح وہ ایک قوم کو دوسری قوم پر برتری دے سکتا ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَ یَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِیْرًا ﴿۱۳۳﴾

”اگر (اللہ) چاہے تو تمہیں لے جائے اے لوگو! اور دوسروں کو لے آئے، اور اللہ اس پر قادر ہے“۔

اللہ کا اختیار

ان آیات کا مضمون بھی سابقہ آیات کے تسلسل میں، تقویٰ کی رعایت کرنے کی تاکید کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ مالک مطلق ہے اس لیے وہ جس طرح چاہے اپنی مخلوقات میں تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اس کی عبادت کریں اور اس کا لحاظ رکھیں۔ اگر وہ اللہ سے نہ ڈریں اور اس کا تقویٰ اختیار نہ کریں تو وہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ اور ان کے بدلے دوسری قوم کو لا سکتا ہے۔ جو اللہ کے احکام کو بجا لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے۔

بیضاوی نے ایک حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ نے جب اس آیت کی تلاوت کی تو سلمان فارسی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: وہ قوم جو اللہ تعالیٰ کے

احکام پر عمل کرنے اور اس کی آواز پر لبیک کہنے میں عربوں پر سبقت لے جائے گی وہ اس مرد کی قوم ہوگی۔

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا فَعِنۡدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیۡعًۢا بَصِیۡرًا ﴿۱۳۴﴾

''جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے پاس دنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا بھی، اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

دنیا اور آخرت کا ثواب

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ جو تقویٰ الٰہی کو چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کا پاس نہیں رکھیں گے، جن کا مقصد مادی اجر و پاداش کا حصول اور دنیاوی مفاد ہو تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بہت بڑی غلطی پر ہیں۔ کیونکہ دنیا اور آخرت دونوں کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی نگاہیں کیوں محدود رکھی ہوئی ہیں۔ وہ اس اجر و پاداش کو چھوڑ کر جو بہت ہی قیمتی اور باارزش ہے، کیوں اس اجر و پاداش کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جو نہایت ہی پست اور بے ارزش ہے؟ یا کم از کم وہ لوگ کیوں ان دونوں اجر و پاداش کو حاصل کرنے کے لیے اقدام نہیں کرتے؟ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت کی تفسیر یہ ہے۔

لیکن ہماری نظر میں درست یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی سعادت کا مطلب ان دونوں کا ایک ساتھ ہونا ہے۔ یہ امر بھی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا اللہ کے بندے کو چاہیے کہ وہ تقویٰ کے ذریعہ اس کا تقرب حاصل کرے۔ جو شخص مادی اور دنیوی اجر کے پیچھے لگا ہوا ہے اس کو بھی چاہیے کہ دنیا اور آخرت کی سعادت کو اللہ سے مانگے۔ کیونکہ دنیا اور آخرت کی

سعادت تقویٰ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور تقویٰ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کے بغیر ممکن نہیں، کس طرح ممکن ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے افاضہ اور اس کی مدد کے بغیر سعادت اور ثواب تک پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے وہ اپنی مخلوق کی آواز کو سنتا ہے اور اس سے آگاہ ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

''اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو (اور وقت آنے پر) اللہ کی طرف گواہی دو اگرچہ خود پر ہو یا اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں پر، اگر کوئی مالدار یا فقیر ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، سو تم انصاف کرنے میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اور اگر تم کج بیانی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے''۔

انصاف کرنے کی تاکید

''قسط'' عدالت رعایت کرنے اور سیدھے راستے سے دائیں بائیں نہ مڑنے اور خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرنے کو کہتے ہیں۔ ''قیام بہ قسط'' عادلانہ عمل کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اللہ کے لیے گواہی دو، حق کو ظاہر اور زندہ کرنے کے لیے گواہی دو اگرچہ یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے والدین یا

تمہارے رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ حب نفس اور رشتہ داروں اور دوستوں کی محبت تمہیں حق کو چھوڑنے اور ناحق گواہی دینے پر مجبور نہ کرے۔

"اگر کوئی مالدار یا فقیر ہے تو اللہ ان کا تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، سو تم انصاف کرنے میں دل کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اور اگر تم کج بیانی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو بلاشبہ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے"

یعنی مالدار کا مال اور فقیر کا فقر اس بات کا سبب نہ بنے کہ تم حق کی رعایت نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی حالت کو بہتر جانتا ہے اور ان کے بارے تم سے زیادہ مہربان ہے۔ اس کے مہربان ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے حق کی پیروی کرنے کو تم پر واجب قرار دیا ہے اور تمہیں قسط و عدل کی دعوت دی ہے۔ یقینی طور پر جس معاشرے میں حق کی پیروی کی جاتی ہو اور قسط و عدل کی رعایت کی جاتی ہو ایسا معاشرہ آباد ہوگا۔ اگر کسی معاشرہ میں حق کی پیروی نہ کی جاتی ہو اور قسط و عدل کی رعایت نہ کی جاتی ہو تو ایسے معاشرے میں باطل قوی ہو جائے گا۔ ایسے معاشرے میں انسانیت مٹ جاتی ہے۔ اس بنا پر معاشرے میں قسط و عدل کی رعایت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ مالدار بھی اس میں باقی رہے اور غریب کی حالت بھی بہتر ہو جائے۔ لہٰذا تمہیں ہر صورت میں نفسانی خواہشات کی پیروی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ نفسانی خواہشات کی پیروی حق سے منحرف ہونے کا سبب بنتی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تم غلط گواہی دو یا گواہی دینے سے انکار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال سے آگاہ ہے۔ اور وہ تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ آیت کا آخری حصہ لوگوں کو غلط گواہی دینے یا گواہی دینے سے انکار کرنے اور اس طرح کے اعمال بجالانے کے برے انجام سے ڈرا رہا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿۱۳۶﴾

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر یقین لاؤ اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو پہلے نازل کی تھی، اور جو کوئی انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا تو پس وہ شخص بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا“۔

اجمالی اور تفصیلی ایمان

آیت میں بیان شدہ پہلا ایمان اجمالی اور سربستہ ہے جبکہ دوسرا ایمان تفصیلی ایمان ہے جس میں معارف کی جزیات بیان کی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک پر ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک سب پر ایمان نہ لایا جائے۔ اس لیے اگر کوئی ان میں سے بعض پر ایمان لائے اور بعض پر ایمان نہ ہو تو حقیقت میں وہ سب کا کافر ہے۔ اگر ان میں سے بعض کا انکار ظاہری ہو تو کافر ہے اور اگر بعض کا انکار ظاہری نہ ہو بلکہ باطنی ہو تو منافق ہے۔ منافق کے مصادیق میں سے ایک یہی ہے کہ ایمان کا اظہار کرے لیکن روش اور طریقہ ایسا اپنائے کہ جس کے نتیجے میں یہ ہو کہ بعض احکام کو قبول کرتا ہے بعض احکام کو قبول نہیں کرتا۔ اس طرح وہ پھر منافق کہلائے گا جیسے خود کو اسلامی اور مومنین کی سوسائٹی سے دُور کرنا اور کفار کی سوسائٹی کے قریب کرنا، کفار سے محبت کا اظہار اور مومنوں اور دین داروں کے بارے میں جھوٹے اعتراضات کرنا اور ان کا مذاق اڑانا، حق اور اہل حق کی بات کو نہیں ماننا۔ لہٰذا تفصیلی ایمان یہ ہے کہ انبیاءؑ کرام

اور ان پر اتاری جانے والی کتابوں میں جو طریقہ اللہ نے بتایا ہے اس کے مطابق عمل کرے اور کسی ایک کا انکار نہ کرے کیونکہ کسی ایک کا انکار کرے گا تو سب معارف کا انکار لازم آئے گا کیونکہ یہ پورا ایک سلسلہ ہے جو احکام کا مجموعہ ہے جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿١٣٧﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے رہے تو اللہ ان کو ہر گز نہیں بخشے گا اور نہ انہیں راہ دکھائے گا''۔

اللہ مرتدوں کو ہر گز نہیں بخشتا

اس آیت میں مرتدین اور بعض ان منافقین کا حال بیان ہوا ہے جن کا ایمان ثابت نہیں ہے زبان سے تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل سے مومن نہیں ہیں اور اللہ کے امر کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ جو بھی ایسے ہوں یقینی طور پر اللہ کی رحمت و مغفرت سے دُور ہیں ہدایت ان کے شامل حال نہیں ہوتی کیونکہ وہ خود ثابت قدم نہیں ہیں۔ شاید یہ اہل کتاب کو بھی شامل ہو جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور گوسالہ پرستی میں لگ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا اور بعد والے مراحل میں حضرت عزیر اور عیسیٰ پر ایمان لے آئے اور پھر دوبارہ کافر ہو گئے اور آخر میں انہوں نے حضرت محمد ﷺ کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر دیا۔

بعد والی آیات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں کیونکہ ان کا معاملہ ڈانواں ڈول ہے، کبھی مان لیتے ہیں کبھی کافر ہو جاتے ہیں پھر توبہ کر لیتے ہیں پھر کفر میں

چلے جاتے ہیں، اُن کی توبہ مستقر اور ثابت نہیں ہے، ان کا ایمان متزلزل ہے، ڈانواں ڈول ہے۔ خدا ان کو معاف نہیں کرتا کیونکہ اُنہوں نے ہدایت کو گمراہی کے ساتھ بدل دیا ہے۔ ان کے لیے اب ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے البتہ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جس کی توبہ حقیقی نہ ہو ایسی صورت میں وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔ کیونکہ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک جماعت میں ایسے افراد یا ایک آدمی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو توبہ کرتا ہے اور اپنے پیمان اور وعدے پر باقی رہتا ہے اور اپنے ایمان کو ضائع نہیں کرتا تو اس صورت میں خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے جو سچی توبہ ہے اور اس کو ہدایت بھی دیتا ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًاۙ ﴿۱۳۸﴾

"منافقوں کو خوشخبری سنا دے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

منافقین کیلئے دردناک عذاب

یہ آیت منافقین کو دھمکا رہی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی اور مومنوں سے کٹ کر رہنا اُن کے لیے سخت ترین عذاب کا سبب ہے۔ البتہ یہ وصف منافقین سے عام تر ہے جو زبان سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کا دل ایمان نہیں لایا، اور کچھ تعداد اُن مومنین کی بھی ہے جو دل سے ایمان رکھتے ہیں لیکن کفار سے دوستی کرتے ہیں جبکہ حکم یہ ہے کہ کفار سے فاصلہ رکھیں اور ان سے دوستی نہ رکھیں۔ یہ باطن میں کفار سے رابطے میں ہیں۔ ظاہراً اس آیت میں منافقین سے مقصود دوسرا گروہ ہے، نہ وہ جو بالکل ایمان ہی نہیں لائے۔ جیسا کہ بعد والی آیات اس مطلب پر ثبوت ہے۔

الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ﴿۱۳۹﴾

''وہ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں کیا ان کے ہاں سے عزت چاہتے ہیں، سو ساری عزت اللہ ہی کے قبضہ میں ہے''۔

کفار سے دوستی رکھنے سے منع

اس آیت میں استفہام انکاری ہے اس سے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ عزت، حرمت، اقتدار یہ سب ملک اور مملکت کی فروعات اور اسی کی شاخیں ہیں۔ جب اللہ کے سوا کوئی حقیقی مالک نہیں تو عزت و احترام اور حرمت بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ آیت اُن کے وصف کو بیان کر رہی ہے جن کا ہدف کفار سے دوستی لگا کر ان سے مادی فائدے اُٹھانا ہے یا نفسانی خواہشات کی پیروی یا مال اور جاہ اور ظاہری عزت کے خواہاں ہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ عزت فقط اور فقط اللہ سے متعلق ہے۔ اللہ کے دشمنوں سے دوستی کرنے سے انہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ وقتی فائدہ لے کر اپنے لیے ہمیشہ کا نقصان حاصل مت کرو۔

وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

''اور اللہ نے تم پر قرآن میں حکم اتارا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں پر انکار اور مذاق ہوتا ہوا سنو تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں، ورنہ تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے، اور اللہ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں ایک ہی جگہ اکٹھا کرنے والا ہے''۔

اللہ کے احکام کا مذاق اڑانے والے

اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام آیت 168 میں بھی فرمایا کہ جس وقت تم انہیں دیکھو جو ہماری آیات میں غوطہ ور ہیں اور اُن کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں، ادھر اُدھر کی باتیں بناتے ہیں تو ان سے منہ موڑ لو یہاں تک کہ وہ دوسری گفتگو میں مصروف نہ ہو جائیں۔ اگر شیطان تمہیں اس مطلب کو بھلا دے تو جیسے ہی تمہیں یہ بات یاد آئے تو جو ظالم لوگ ہیں ان کے ساتھ مت بیٹھو۔ سورہ انعام مکہ میں نازل ہوئی اور سورہ النساء مدینہ میں نازل ہوئی لہٰذا نزول کے زمانے کو مدنظر رکھیں تو وہ سورہ النساء پر مقدم ہے۔

اس سے یہ معنی استفادہ ہوتا ہے اگرچہ ظاہری خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں پوری اُمت اس سے مراد ہے۔ اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ فرما رہا ہے ہماری آیات کے بارے میں غلط رائے رکھنے والے کفار، ہماری آیات کا انکار کرنے والے اور ان آیات کا مسخرہ کرنے والوں کے ساتھ نشست و برخاست نہیں ہونی چاہیے کیونکہ کسی کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، اس سے اثر لینے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح اُن کی باتوں کے اثر میں آ کر تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ گے اور اس کا انجام یہ ہو گا کہ تم بھی قیامت کے دن انہی کفار کے ساتھ محشور ہو گے اور اللہ تبارک و تعالیٰ تمہارے ساتھ وہی رویہ اپنائے گا جو کفار کے ساتھ اپناتا ہے۔ اس آیت میں واضح حکم دیا گیا ہے کہ جس محفل میں اللہ کے احکام کا مذاق اڑایا جا رہا ہو تم ایسی محفلوں میں مت بیٹھو۔ اگر پہلے سے وہاں موجود ہو تو جیسے ہی احکام الٰہی کے بارے غلط گفتگو شروع ہو تو اس محفل کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارا حشر ان ہی کے ساتھ ہو گا جو اللہ کے احکام کا مذاق اڑانے والے اور اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ہیں۔

الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوٓا أَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَإِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِينَ نَصِيبٌ ۙ قَالُوٓا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ

عَلَيۡكُمۡ وَ نَمۡنَعۡكُمۡ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَ لَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

''وہ منافق جو تمہارے متعلق انتظار کرتے ہیں، پھر اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ہو تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تمہیں مسلمانوں سے بچا نہیں لیا، سو اللہ تمہارا اور ان کا قیامت میں فیصلہ کرے گا، اور اللہ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہرگز غالب نہیں کرے گا''۔

منافقوں کی باتیں

یہ آیت منافقوں کا ایک اور وصف بیان کر رہی ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ مومن اور کافر دونوں جماعتوں کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھیں تاکہ دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ جس طرف کی ہوا ہوتی ہے ادھر ہی چل پڑتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین کی کامیابی کو ''فتح'' اور کفار کی کامیابی کو ''نصیب'' کہا ہے تو اس سے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ کفار کی کامیابی حقیقی کامیابی نہیں ہے یہ وہمی اور خیالی امر ہے اور اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔ مومنین کی کامیابی ہی اصل اور حقیقی کامیابی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مومنین کا سرپرست اور ولی ہے اور جو اللہ کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔

اس کے علاوہ قیامت کا دن جب آئے گا تو وہاں مکر و حیلہ نہیں چلے گا اور دل کی بات کو چھپا بھی نہیں سکیں گے، خداوند اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ دے گا اور خداوند کبھی کفار کو مومنوں پر غلبہ اور تسلط نہیں دے گا۔ ہمیشہ فیصلہ مومنوں کے حق میں اور کفار کے خلاف ہی

ہو گا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہے، منافقین کے لیے یہ اعلان ہے کہ تم اپنے غلط مقصد کو کبھی نہیں پا سکو گے۔ آیت بتا رہی ہے کہ کامیابی ہمیشہ مومنین کے لیے ہے اور وہ کفار پر بھی غالب رہیں گے۔ آیت اس بات کا اعلان ہے کہ کافر اپنے غلط مقصد کو پانے میں مایوس ہو جائیں گے اور یہ بتا دیا گیا ہے کہ مومنین ہی حقیقت میں کامیاب ہیں، فتح انہی کو نصیب ہونی ہے۔

اس میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ مومنوں پر کفار کے "سبیل" کی جو نفی کی گئی ہے، یہ دُنیا کے حوالے سے بھی ہے اور آخرت کے حوالے سے بھی ہے، یعنی مومنین دُنیا اور آخرت دونوں میں کبھی کفار کے زیر تسلط نہیں آئیں گے۔ وہ اللہ کے اذن سے دلیل و منطق کے اعتبار سے بھی اور عملی طور پر بھی ہمیشہ غالب ہی رہیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مومنین ایمان کے لوازمات اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کریں، اگر ایمان کے تقاضے پورا نہیں کریں گے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت میں کمزوری دکھائیں گے تو ذلت ان کا مقدر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران، آیت 139 میں فرمایا ہے کہ "سستی مت کرو غمگین بھی مت ہو جاؤ اگر مومن ہو تو تم ہی برتر ہو"۔ تو بات یہ ہے کہ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو ایمان کے تقاضے ہیں ان پر عمل کیا جائے یعنی اللہ کے احکام اور قوانین کی پیروی کی جائے۔ اگر ان کی پیروی نہیں ہو گی تو اس کا مطلب ہے ایمان انسان کے وجود پر حاکم نہیں بنا جس وجہ سے ایمان کے جو فوائد ہیں وہ ان کو نہیں مل رہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾

"منافق اللہ کو فریب دیتے ہیں اور وہ ان کو فریب دے گا، اور جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سست بن کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں"۔

منافقین کے بعض اوصاف

یہ آیت منافقین کا ایک اور وصف بیان کر رہی ہے کہ یہ ہمیشہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ ''مخادعہ''خدعہ اور فریب دینے میں شدت کا معنی دیتا ہے، بہت زیادہ دھوکہ دینا۔ یہ ہمیشہ اس کے درپے ہیں کہ خدا سے مکاری کریں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، انہیں مہلت اور چھوٹ دیتا ہے کہ وہ ان غلطیوں میں پڑے رہیں اور گمراہی کا جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں اور زیادہ دُور چلے جائیں، صراط مستقیم سے دور ہو جائیں اور دوزخ کے راستے پر گامزن رہیں۔ اس کی وجہ ان کی پلید اور نادرست نیت اور ان کے برے اعمال ہیں جو وہ انجام دے رہے ہیں۔ تو ان کو جو خیال آیا کہ وہ اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں حقیقت میں وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

منافقین کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ نماز میں بڑی سستی، کاہلی اور بے رغبتی کرتے ہیں، وہ اگر نماز پڑھ بھی لیتے ہیں تو خودنمائی، دکھاوا اور دوسروں کو بتانے کے لیے پڑھتے ہیں کہ ہم تو اللہ کی یاد میں ہیں حالانکہ وہ اللہ کو یاد نہیں کر رہے ہوتے، وہ بہت تھوڑا اللہ کو یاد کر رہے ہوتے ہیں۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

''اس (کفر اور ایمان کے) معاملے میں متذبذب ہیں نہ پورے اِس طرف ہیں اور نہ پورے اُس طرف، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے تو ہر گز کہیں راہ نہ پائے گا''۔

ایمان اور کفر کے درمیان سر گردان لوگ

منافقین کی ایک اور صفت یہ ہے کہ وہ مومنین اور کفار دونوں کے ساتھ اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں جبکہ ان کا نہ تو مومنوں سے تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی کافروں کے ساتھ۔ وہ نہ تو حقیقی مومن ہیں اور نہ حقیقی کافر۔ وہ تذبذب اور سرگردانی کی حالت میں ہیں۔ اس وجہ سے وہ ہدایت کا راستہ نہیں پا سکتے۔ آیت میں "متذبذب" کے بجائے "مذبذب" اس لیے کہا ہے تا کہ یہ سمجھایا جائے کہ منافقین نے اس سرگردانی کو خود اپنے لیے انتخاب نہیں کیا بلکہ یہ سرگردانی اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے کہ ان کی زندگی میں جو ان کی سعی و کوشش ہوتی ہے وہ کسی ایک طے شدہ ہدف پر قائم نہ ہو اور اُن کو کہیں بھی سکون اور آرام نہ ملے اور وہ ہمیشہ پریشانی کی حالت میں رہیں۔ کسی ایک طرف خود قرار نہ دینے کی وجہ سے وہ ہمیشہ پریشان و حیران ہی رہتے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

"اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیا تم اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لینا چاہتے ہو"۔

ایمان والو! کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ

اس آیت میں مومنوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ اللہ کی ناراضگی سے بچو اور ایمان کی کمزوری اور دل کی بیماری سے چوکنے رہو، کافروں سے دوستی اور مودت مت رکھو اور اُن کو اپنا ولی اور سرپرست مت بناؤ کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی منافقین کی طرح ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہارے اس عمل سے اللہ کے پاس ثبوت ہو گا کہ تم منافقوں جیسے ہو گئے ہو۔ اللہ

تعالیٰ ان اعمال اور رویوں کی بنیاد پر ناراض ہوتا ہے۔ جب تم کفار سے دوستی کروگے تو یہ اس بات کا جواز بنے گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تمہیں سزا دے۔

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيۡرًا ۙ﴿۱۴۵﴾

”بے شک منافق دوزخ کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے، اور تو ان کے لیے ہر گز کوئی مددگار نہ پائے گا“۔

منافقین کا ٹھکانہ دوزخ کا نچلا درجہ

کیونکہ منافقین دُنیا میں سقوط اور پستی کی جانب رواں دواں تھے۔ وہ ظاہر میں تو مسلمانوں کے گروہ سے تھے اور ایمان کے فوائد بھی حاصل کر رہے تھے لیکن باطن میں کافروں کے ساتھ تھے اور دل سے کفار کی کامیابی چاہتے تھے، خداوند تبارک و تعالیٰ بہت جلد ان کا احتساب کرے گا اور ان سے نپٹے گا اور ان کے باطنی نفاق اور منافقت کی بنیاد پر انہیں جہنم کے نچلے درجے میں ڈالے گا۔ وہاں ان کا کوئی یاور و مددگار نہیں ہو گا تاکہ وہ انہیں دوزخ کے عذاب سے رہائی دلائے۔ دُنیا میں تو وہ ظاہری اسلام کی وجہ سے کفر کی سزا سے بچے رہے لیکن آخرت میں ایسا نہیں ہو گا، آخرت میں انہیں نجات نہیں ملے گی، آخرت کا معاملہ دُنیا کے معاملے سے مختلف ہے۔ دُنیا میں توانہوں نے ظاہری اسلام کا فائدہ حاصل کرلیا ہے لیکن آخرت میں اُنہیں کچھ نصیب نہیں ہو گا۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ اعۡتَصَمُوۡا بِاللّٰهِ وَ اَخۡلَصُوۡا دِيۡنَهُمۡ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ وَ سَوۡفَ يُؤۡتِ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۴۶﴾

''مگر جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور اللہ کو مضبوط پکڑا اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لیے قرار دیا تو وہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں، اور اللہ جلدی ایمان والوں کو بہت بڑا ثواب دے گا''۔

ایمان والوں کیلئے اجر و ثواب

اس آیت میں استثناء ہے اُس عذاب کے وعدے سے جو اللہ نے منافقین کے لیے دیا ہے کہ وہ جہنم کے پست ترین طبقے میں ہوں گے۔ عذاب کے اس وعدے سے استثناء یہ ہے کہ جو شخص منافقین کی بیان شدہ صفات کو ترک کر کے مومنوں کی صف میں آجائے اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرے، کفار کی ہم نشینی چھوڑ دے تو آخرت میں وہ مومنوں کا ہم نشین ہو گا اور مومنوں کی طرح اسے بڑا اجر ملے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس آیت میں چند ایسی چیزیں بیان فرمائی ہیں جس سے نفاق کی جڑ ختم ہو جاتی ہے اور جب تک یہ چیزیں ختم نہیں ہوں گی نفاق کا خاتمہ نہیں ہو گا۔

سب سے پہلی چیز توبہ ہے اللہ کی طرف پلٹ جانا، ایمان سے ملحق ہو جانا۔ حقیقی واپسی اس وقت ہو گی اور مفید ہو گی جب توبہ کرنے والا اب تک انجام دیئے گئے برے اعمال کی اصلاح کرے گا اور یہ اصلاح بھی اس وقت نتیجہ دے گی جب انسان سیدھے راستے سے انحراف کے ڈر اور خوف سے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے۔ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرے۔ یہ رابطہ اور تعلق پورا نہیں ہو گا مگر یہ کہ جب انسان اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرے۔ اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ جب یہ سب چیزیں ہوں تو پھر حقیقی توبہ ہو گی۔ اور وہ گذشتہ دور میں انجام دئے گئے برے اعمال اور باطل خیالات کی اصلاح کرے گا۔ اللہ سے توسل کرے گا اور دین کو اللہ کے لیے خالص بنائے گا تو

پھر حقیقی مومن ہو جائے گا اور اس کا ایمان شرک کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہو گا۔ ایسے شخص کا ایمان نفاق کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گا اور جو راستہ گم کر چکا تھا واپس اس کو پا لے گا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام کی آیت 82 میں فرمایا ''جو لوگ ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، تو ان کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتگان میں سے ہیں''۔ لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ عقیدے کی اصلاح، نیکی اور باطن کے خلوص کی بنیاد پر منافقین کو مومنوں کا ہم نشین بنائے گا اور مومنین کے بڑے اجر میں وہ بھی شراکت دار ہوں گے۔ اور وہ بھی مومنوں کی طرح اجر عظیم پائیں گے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

''اللہ تمہیں سزا دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان لے آؤ، اور اللہ قدر دان جاننے والا ہے''۔

سزا کی وجہ بندوں کے اعمال ہیں

یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ اگر بندے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر نہ کریں اور ایمان نہ لائیں گے تو خود کو عذاب کا مستحق بنائیں گے۔ خدا کو تو کسی کو سزا دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے، خدا کو تو اپنے بندوں کو سزا دے کر کچھ نہیں ملنا، نہ اس میں خدا کا کوئی مفاد ہے۔ گناہگاروں کے وجود سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تاکہ انہیں عذاب دے کر اپنے آپ سے ضرر اور نقصان کو دُور کرے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو تم نے اپنے اوپر واجب اللہ کے حق کو ادا کیا اور جب تم ایسا کرو گے تو پھر کوئی سبب

نہیں بنتا کہ وہ تمہیں عذاب دے۔ اللہ تعالیٰ تو ایمان لانے والوں کا شکر گذار ہے ان کے ایمان لانے کو قبول کرتا ہے اور ان کے حالات سے آگاہ بھی ہے اور وہ شناخت اور معرفت میں غلطی بھی نہیں کرتا۔ یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ گمراہی کا سبب بننے والے اعمال جیسے گمراہی، شرک، معصیت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں دی جا سکتی جو عذاب کا سبب بنتے ہیں۔ ان اعمال کو اسی بندے ہی کی طرف نسبت دینی چاہیے جس نے انجام دیے ہیں اور خدا تبارک و تعالیٰ بندوں کو ان کے اعمال کی بنیاد پر سزا دیتا ہے؛ البتہ یہ الگ بات ہے کہ وہ مسبّب الاسباب ہے اور ہر سبب کی سببیت اس کا سبب بننا اللہ کی طرف سے ہے لیکن اس سبب کا اختیار بندے کے ہاتھ میں ہے جیسا سبب اس نے اختیار کیا ہے اسی کے مطابق اس کا اثر ہونا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

"اللہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کی بری بات ظاہر کرے مگر وہ جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

بری بات کا اظہار ناپسندیدہ عمل

"اَلْجَهْرَ" کا لفظ وہاں پر استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی چیز انسان کے حواس بینائی اور شنوائی (دیکھنے اور سننے) سے تھوڑے فاصلے پر ہو۔ "بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ" یعنی ہر وہ بات جو کسی سے کہی جائے تو وہ اسے بری لگے، جیسا کہ کس کو نفرین کرنا کسی کو برا کہنا، گالی دینا یا

بری بات کا اظہار کرنا۔ اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار، دوسروں پر نفرین کرنے یا دوسروں پر تہمت لگانے یا کسی کے عیب کو ظاہر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ خدا حب اور بغض کی حالتوں سے پاک و منزہ ہے، اس بنا پر خدا کے پسند نہ کرنے سے شریعت میں اس امر کا ناپسند ہونا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے جس میں اس نے اس چیز سے منع کیا ہے کہ برائی کی بات کو ظاہر کیا جائے یا کسی کو برے الفاظ سے پکارا جائے یا کسی کے اوپر بلند آواز سے چڑھائی کی جائے۔ خواہ یہ چیزیں حرمت کی حد کو پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں۔ البتہ اس میں ایک استثناء ہے کہ جو مظلوم ہے جس پر ظلم ہوا ہے تو وہ اپنی آواز بلند کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ لوگو میرے اوپر ظلم ہوا ہے، فلاں نے مجھ پر ظلم کیا ہے، میری مدد کرو۔ وہ ظالم کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے اس انداز کو اور شور مچانے کو ناپسند نہیں کرتا یہ قانون الٰہی ہے۔

إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴿۱۴۹﴾

''اگر تم نیک کام کو اعلانیہ کرو یا خفیہ کرو یا کسی برائی کو معاف کر دو تو اللہ بڑا معاف کرنے والا قدرت والا ہے''۔

اعلانیہ اور خفیہ امور سے اللہ کی آگاہی

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تم عمل خیر جیسے مال خرچ کرنا، ایسا نیک عمل انجام دینا جس سے دین کی شان بلند ہو، لوگوں کو اچھائی کے کاموں پر آمادہ کرنا چاہے گفتگو سے ہو یا عمل سے جیسے نعمت عطا کرنے والے کا شکر بجالانا یا اس کی تعریف کرنا تاکہ دوسروں کو شکر بجالانے کی تشویق کرے کہ وہ بھی ایسا کریں، ان اعمال کو علنی اور ظاہر کرکے انجام دو تو

بھی اللہ تعالیٰ ان سے آگاہ ہے۔ اور اگر ان کاموں کو خفیہ انجام دو تو بھی اللہ ان کو جانتا ہے۔ ان کاموں کو خفیہ انجام دینے کا مقصد یہ ہے کہ ریا اور دکھاوے سے دور رہے اور خلوص کے ساتھ انجام دئے جائیں۔ یا دوسروں سے درگذر کرو، انہوں نے جو تمہارے ساتھ برا کیا ہے تم اس کی برائی پر پردہ ڈال دو اور اس عمل کی جو اس نے تیرے خلاف کیا ہے تلافی نہ کرو تو یہ اللہ کی صفات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بدکاروں سے انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے لیکن ان سے انتقام نہیں لیتا بلکہ ان کی برائیوں سے در گزر کرتا ہے، تم بھی ایسا کرتے ہو تو یہ صفات کمالیہ سے ہے اور اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾

”بے شک ایسے لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے ہیں اور بعض کے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ کفر اور ایمان کے درمیان ایک راہ نکالیں“۔

اہل کتاب کے حربے

یہاں کفار سے اہل کتاب یہودی و نصاریٰ مراد ہیں۔ یہودی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے مگر عیسیٰ علیہ السلام اور حضور اکرم ﷺ کو ماننے سے انکار کیا۔ نصاریٰ عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے مگر حضور اکرم ﷺ پر ایمان نہ لائے۔ یہ دونوں گروہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کے بعض رسولوںؑ پر ایمان لانا اور بعض کا کفر کرلینا آنا ٹھیک ہے جبکہ ایسا

نہیں ہے اور اللہ کے رسولوںؑ کے درمیان فرق کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ خدا فرماتا ہے اللہ اور اللہ کے رسولوںؑ کے درمیان فرق نہیں ڈالا جا سکتا سب کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک کا کافر ہوگا تو اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس نے کفر کیا، اللہ تعالیٰ کا کفر کیا ہے۔ لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھتے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور سارے رسولوںؑ پر ایمان لانے اور اللہ اور بعض رسولوں پر ایمان لانے کے لیے کوئی درمیانی راستہ اختیار کریں، بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا کفر کریں۔ حالانکہ ایسا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اللہ کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ سب رسولوںؑ پر ایمان لایا جائے، کیونکہ سب رسولوںؑ کو اللہ نے بھیجا ہے، سب کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، اس لیے سب کو ماننا ہوگا۔ ایک کی نفی سب کی نفی ہے اور حقیقت میں اللہ کے رسولؑ کی نفی خود اللہ کی نفی ہے۔ کسی ایک رسولؑ کا انکار سب رسولوںؑ کا انکار ہے اور یہ اللہ کا کفر ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿١٥١﴾

"ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

کافروں کے لیے عذاب

کافروں کو عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پیغمبر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے لیے آتے تھے ان میں فرق کرتے ہیں، کچھ کو مانتے ہیں کچھ کو نہیں مانتے۔ اللہ فرما رہا ہے کہ ایسا کرنے والے پکے کافر ہیں اور اس کفر کی وجہ سے ان کے لیے سخت ترین اور ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے اور یہ عذاب پوری طرح ان کے اعمال کے مطابق ہے۔ کافر عذاب سے نہیں بچ سکیں گے اور عذاب انہوں نے خود اپنے لیے تیار کیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اللہ کے رسولوں پر اور ان (کو ماننے) میں فرق نہ کیا تو ان لوگوں کو اللہ جلد ان کے ثواب دے گا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان

اس آیت میں کافروں کے مقابلے میں مومنین کی بات ہو رہی ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام انبیاءؑ کو تسلیم کیا ہے اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ڈالا۔ جو پیغمبرؐ پہلے گزرے ہیں ان پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور فرشتوں پر بھی ایمان لائے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان کے لیے ہم نے بڑا اجر رکھا ہے اور اس کی وجہ ان کا ایمان ہے کہ یہ اللہ کے نبیوں میں کوئی فرق نہیں کرتے اور خداوند تبارک و تعالیٰ ان کے اچھے عقیدے کا ثواب دے گا اور ان کو بخشش دے گا اور ان پر لطف و مہربانی کرے گا۔ لطف و مہربانی اور بخشش اللہ کی ایسی صفت ہے جو اللہ سے جدا نہیں ہو سکتی اور یہ مومنین کے لیے اللہ تعالیٰ کا نہایت ہی اچھا وعدہ ہے۔ جسے اللہ نے ہر صورت پورا کرنا ہے۔ پس مومنین کے لیے بڑا ثواب واجر ہے۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا
مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ
بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا
عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

''اہل کتاب تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے لکھی ہوئی کتاب اتار لائے، سو موسیٰ سے اس سے بڑی چیز مانگ چکے ہیں یہ کہہ کر کہ اللہ کو بالکل ہمارے سامنے لا کر دکھا دے پھر ان کے اس ظلم کے باعث ان پر بجلی آن پڑی، پھر بہت سی نشانیاں پہنچ چکنے کے بعد بھی بچھڑے کو (معبود) بنا لیا پھر ہم نے وہ بھی معاف کر دیا، اور ہم نے موسیٰ کو بڑا رعب دیا تھااور واضح روشن دلیل سے نوازا تھا''۔

اہل کتاب کے تقاضے

اس آیت میں اہل کتاب سے یہودی و نصاریٰ مراد ہیں۔ ان دونوں کی بازگشت ایک ہی نقطے پر ہے، دونوں اسرائیلی نژاد اور یعقوب کی اولاد سے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ان میں نبی کے عنوان سے مبعوث ہوئے۔ دونوں پر اللہ کی کتاب اُتری، توریت موسیٰ علیہ السلام پر انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ لیکن دونوں گروہوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ظلم کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ان پر بھی ظلم کیا۔ یہ دونوں گروہ اپنی قومی خصوصیات میں آپس میں شریک ہیں اور ان کا رویہ ایک دوسرے کے مشابہہ ہے۔ وہ اپنے زمانے کے نبی سے ناحق باتیں منسوب کرنے، اللہ سے باندھے گئے معاہدے اور پیمان کی مخالفت کرنے میں ایک جیسے ہیں۔

باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنی آسمانی کتاب میں قرآن کا مشاہدہ کر لیا اور اس کی حقانیت کے متعلق انہیں یقین تھا لیکن وہ مختلف قسم کے فضول بہانے بناتے اور کہتے تھے آسمان سے ایک پرندہ کی چونچ میں ان کی آنکھوں کے سامنے آسمانی کتاب اترنی چاہیے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی لیے ان کے اسلاف کی بات کا حوالہ دیا ہے کہ جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہمیں خدا کا معائنہ کراؤ، خدا دکھاؤ، تو یہ بھی اسی طرح کی بات کر رہے ہیں۔ ان کی

گمراہی، نادانی اور جہالت کی ایک طولانی داستان ہے۔ یہ کسی بھی قسم کا ظلم کرنے اور کفر اختیار کرنے اور اللہ کی واضح نشانیوں کا انکار کرنے سے مضائقہ نہیں کرتے اور کسی بات کا لحاظ نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خداوند تبارک و تعالیٰ کو جسم قرار دیا اور کہا کہ وہ حادث ہے اس کا مشاہدہ کریں گے تو مانیں گے، حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیانات کے باوجود بھی ایسی درخواست کر ڈالی۔ جس کے نتیجے میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان پر بجلی گرائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن بعد کوہ طور سے واپس آنا تھا لیکن جب وہ دس دن تاخیر سے آئے تو اتنے کھلے معجزات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور اسے اپنا معبود بنا لیا۔ اللہ نے ان کے اس گناہ سے عفو و درگزر کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سامری پر غلبہ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے بچھڑے کو جلا دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بڑی روشن دلیل تھی لیکن انہوں نے اس کو بھی نہ مانا اور ان کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ اگر انہوں نے حق کو ماننا ہوتا تو یہ بات تو وہ اپنی کتابوں میں بھی پڑھ چکے ہیں اور قرآن بھی ان کے سامنے ہے جو معجزہ ہے، وہ قرآن کے مقابلے میں ایک آیت بھی نہیں لا سکتے اس کے باوجود وہ کہتے ہیں اگر پرندہ کی چونچ میں آسمانی کتاب نازل ہو جائے تو ہم ایمان لائیں گے، ان کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں۔

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

”اور ہم نے ان پر کوہِ طور اٹھا کر ان سے عہد لیا اور ہم نے کہا کہ (شہر کے) دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور ہم نے کہا کہ ہفتے کے دن کے بارے میں زیادتی نہ کرو اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا۔“

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

یہاں پر ان کی ایک اور نافرمانی کا تذکرہ ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے پیمان لیا تھا کہ ہفتے کی حرمت کا پاس رکھیں گے اور ہفتہ کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کریں گے لیکن انہوں نے چکر چلایا، گڑھے کھود دیے دوسرے دنوں میں مچھلیاں اس گڑھے میں آجاتی تھیں تو یہ اس گڑھے کا راستے بند کر دیتے تھے اور اتوار والے دن اور دوسرے دن مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے تو ہفتے کو شکار نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عمل کا حوالہ دیا کہ کس طرح انہوں نے عہد توڑ دیا۔

طور ایک پہاڑ کا نام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈرانے کے لیے اس پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں کے اوپر لا کھڑا کیا، بغیر اس کے کہ اللہ ان پر جبر کرے۔ بات یہ تھی کہ جو ان سے عہد لیا گیا تھا اس کی وہ پابندی کریں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے ان سے عہد لیا کہ توریت میں جو قوانین بتائے گئے ہیں ان پر عمل کرو اور یہ بھی حکم دیا کہ اللہ کے حضور خصوع و خشوع کریں اور سر جھکائے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے باب حطہ سے داخل ہو جائیں۔ اس طرح اللہ کی عفو و رحمت ان کو نصیب ہو گی۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر بھی عمل نہیں کیا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اپنے رب کے ہمراہ جاؤ اور جنگ کرو ہم تمہارے ساتھ نہیں آتے۔

اسی طرح ان سے جو عہد لیا گیا تھا کہ ہفتے کی حرمت کا پاس رکھو تو انہوں نے ہفتے کی حرمت کا پاس نہیں رکھا اس کا احترام بھی نہیں رکھا اور حیلہ بہانہ بنا کر غلط کام کرتے اور ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار کر لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو یہ سب کچھ بتایا اور ان سے مضبوط پیمان لیا، لیکن انہوں نے اسے توڑ دیا۔ بنی اسرائیل کی عہد شکنی کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے یہ بتانے کے لیے کہ یہ لوگ بے اعتبار ہیں جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔

فَبِمَا نَقۡضِهِمۡ مِّيۡثَاقَهُمۡ وَ كُفۡرِهِمۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتۡلِهِمُ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ وَّ قَوۡلِهِمۡ قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ ؕ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيۡهَا بِكُفۡرِهِمۡ فَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۙ﴿۱۵۵﴾

"پھر انہیں سزا ملی ان کی عہد شکنی پر اور اللہ کی آیتوں سے منکر ہونے پر اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے پر اور یہ کہنے پر کہ ہمارے دلوں پر پردے ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر کفر کے سبب سے مہر کر دی ہے سو ایمان نہیں لاتے مگر کچھ لوگ"۔

اہل کتاب کی عہد شکنی کی سزا

پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کی پیمان شکنی کا تذکرہ ہوا ہے۔اس آیت میں ان کی عہد شکنی پر دی جانے والی سزا کا تذکرہ ہے۔ پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کی نافرمانیوں میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا کفر کیا، گوسالہ پرستی کی اور پیغمبروںؑ کو قتل کیا، حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ناحق قتل کیا اور دوسرے کئی نبیوںؑ کا قتل کیا۔ اُنہوں نے یہ اعمال جہالت اور گمراہی کے تحت انجام دیے ۔ پھر کہنے لگے ہمارے دل تو پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کو سننے سے عاجز ہیں، ہمیں ان کی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حق کے سامنے تسلیم ہی نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرما رہا ہے کہ حق کے انکار اور میری آیات کی تکذیب کی وجہ سے ہم نے ان کے دلوں کو حق سمجھنے سے عاجز بنا دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار اور ان کے ان اقوال اور اعمال کی وجہ سے جو اللہ کے احکام کے خلاف ہیں، انہیں عذاب میں مبتلا کیا ہے اور

ان پر لعنت بھیجی اور ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے اور ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی ہے۔ ان میں سے بہت تھوڑے ہی ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔

وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

''اور ان کے کفر اور مریم پر بڑا بہتان باندھنے کے سبب سے''۔

بنی اسرائیل کا مریمؑ پر بہتان باندھنا

یہاں پر بنی اسرائیل کا ایک اور بڑا جرم بیان کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے حضرت مریم سلام اللہ علیہا پر زنا کی تہمت لگا دی، انہوں نے بہت بڑا جرم کیا، ایسا جرم جس کی معافی بالکل نہیں ہے کفر تو یہ ویسے ہی کر رہے تھے اس پر انہوں نے حضرت مریم پر تہمت بھی لگا دی۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ان کی کتابوں میں ذکر ہوا تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب آپ تین دن کے تھے اور گہوارے میں تھے تو اپنی صداقت اور اپنی ماں کی طہارت اور اللہ کے نبی ہونے کی گواہی دی تھی۔ سورہ مریم آیت 30: ''میں اللہ کا عبد ہوں''۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے واضح کہا کہ بلاشک میں اللہ کا عبد ہوں۔ یہ اس لیے کہا کہ کل کوئی یہ نہ کہے یہ اللہ کا بیٹا ہے بلکہ میں اللہ کا عبد ہوں غلام ہوں اور مجھے اللہ نے کتاب دی ہے اور اللہ نے مجھے ہدایت کے لیے پیغمبر بنایا ہے۔

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾

"اور ان کے یہ کہنے پر کہ ہم نے مریم کے بیٹے مسیح عیسیٰ کو قتل کیا جو اللہ کا رسول تھا حالانکہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا، اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس بھی اس معاملہ میں کوئی یقین نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی کی ہے، انہوں نے یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا"۔

مسیحؑ کا زندہ رہ جانا

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک اور جھوٹ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی پر لٹکا کر قتل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جن کو پھانسی پر لٹکایا تھا وہ عیسیٰؑ نہیں تھے۔ ان کے قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا اور یہ سمجھے کہ ہم نے انہیں قتل کر دیا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل میں ایک اور شخص اُن کے ظلم کا نشانہ بنا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رومیوں کا لشکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صحیح طرح نہیں پہچانتے تھے اس لیے انہوں نے غلطی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے کی بجائے ان کے شبیہ کسی دوسرے شخص کو پکڑا کر سولی پر لٹکایا اور اسے قتل کر دیا۔ اس بارے میں اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس سلسلے میں قرآن کا یہ قطعی اعلان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے ہاتھوں قتل نہیں ہوئے۔ خود ان کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے اختلاف ہے، ان میں سے بعض کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پھانسی چڑھائے جانے اور قتل کئے جانے کے بارے شک ہے۔ کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جاہل تھے ان کو علم ہی نہیں تھا کہ عیسیٰ کون ہیں؟! اس بنا پر ان کی بات گمان، خیال اور وہم تھا اور ایک احتمال کو ترجیح دیتے تھے کہ جس کو قتل کیا ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں حالانکہ یقینی بات ہے کہ انہوں نے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، اللہ تعالیٰ اس بات سے بہتر باخبر ہے۔ اس سے بات سمجھا دی گئی کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں، انہیں مارا نہیں گیا۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

"بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا، اور اللہ زبردست حکمت والا ہے"۔

عیسیٰؑ کا اللہ کی طرف اٹھایا جانا

یہودی دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے دار پر چڑھا کر قتل کر دیا ہے اور نصاریٰ بھی یہودیوں کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار پر چڑھایا گیا اور اس کے بعد جس کو پھانسی دی گئی تھی اس کو انہوں نے دفن بھی کر دیا تھا لیکن تین دن بعد وہ قبر سے اُٹھے۔ لیکن قرآن نے ان کے اس دعویٰ کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کے جسم کے ساتھ ہی اوپر لے گئے اور دشمن سے اُن کی حفاظت کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بدن اور رُوح کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا نہ کہ جیسے انسان مر جاتے ہیں اور اُن کی رُوح کو آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے۔

اس کلام کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کا جسم اور روح دونوں آسمان کی طرف اٹھا لیے ہیں۔ کیونکہ فقط رُوح کو اوپر لے جانا ہوتا تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی خاصیت یا امتیاز نہیں تھا بلکہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ جس کو بھی موت دیتا ہے یا کوئی قتل ہوتا ہے یا پھانسی چڑھتا ہے یا جس صورت میں بھی وہ مرتا ہے تو اس کی رُوح خود بخود اوپر جاتی ہے۔ اس کا جسم قبر میں ہوتا ہے اور رُوح اللہ کے اپنے نظام کے تحت ایک بلند مقام پر ہوتی ہے۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے دشمن کے آزار و اذیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محفوظ رکھا، اس میں فرق نہیں ہے کہ انہیں رُوح قبض

کرنے کے وسیلے سے ہو یا نہ ہو، قتل یا دار پر وہ نہیں چڑھے بلکہ کسی اور طریقے سے اللہ کی طرف اٹھا لیے گئے ہیں جس کے متعلق ہمیں علم نہیں۔ اللہ کی ملاقات ایک زندہ اور باقی مخلوق سے کس طرح ہوتی ہے اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے اور دونوں احتمال عقلی نظر سے محال نہیں ہیں۔ خداوند تبارک و تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر لے گئے اور اپنے پاس اس کی حفاظت کی ہوئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا ماجرا ان کی ولادت کے مسئلہ جیسا ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے اور یہ اللہ کی قدرت اور اقتدار اور حکمت کے لیے ایک معمولی چیز ہے اور اللہ جو بھی چاہتا ہے کرتا ہے، اس کے کُن کہنے سے ہی اس کا ارادہ متحقق ہوتا ہے اور وہ شئے موجود ہو جاتی ہے۔ وہ چاہے تو کسی شئے کو اسی ارادے سے اپنی اصلی کیفیت اور حالت کے ساتھ اوپر لے جا سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے اسی ارادے کے تحت محفوظ ہیں اور جیسا کہ روایات میں بھی ہے آخری پیغمبر ﷺ کے آخری وصی حضرت امام مہدی (عج) کے دور میں وہ تشریف لائیں گے اور بیت المقدس میں ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ امام زمانہ عج کے حوالے سے جتنی بھی روایات ہیں اُن میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔ اللہ تمام امور کی مصلحتوں سے آگاہ اور حکیم ہے اور وہی مقتدر ہے اور اُس کے لیے ایسے امور آسان ہیں۔

وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ‌ۚ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا‌ۚ ﴿۱۵۹﴾

”اور اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے گا، اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا“۔

موت سے پہلے اہل کتاب کا عیسیٰؑ پر ایمان

یہ آیت ایک اور مطلب کو بیان کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں بہت جلد دوبارہ ان لوگوں کے پاس آئیں گے اور جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کی موت سے پہلے ہی ان پر ایمان لائیں گے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ جب "قَبْلَ مَوْتِهٖ"میں ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے وہ ان پر ایمان لائیں گے۔ لیکن اگر اس ضمیر کو اہل کتاب کی طرف پلٹائیں گے تو اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب مرنے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے پر یقینی طور پر ایمان لے آئیں گے اور یقین کر لیں گے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر ہیں اور مرے نہیں ہیں لیکن جان دینے کے وقت اُن کا ایمان لانا ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن سب اہل کتاب پر گواہی دیں گے اور اُن کے اعمال کے بھی گواہ ہوں گے۔

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اہل کتاب ایمان لائیں گے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت امام مہدی علیہ السلام کے زمانہ میں آسمان سے اُتریں گے تو سب اہل کتاب ایمان لائیں گے۔ صحیح تر یہ ہے کہ "قَبْلَ مَوْتِهٖ"میں ضمیر کو اہل کتاب کی طرف پلٹایا جائے۔ اس بنا پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اہل کتاب کے لیے ان کی موت کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقانیت مسلم اور حتمی ہو جائے گی۔

تفسیر قمی میں شہر ابن حوشب سے روایت ہوئی ہے کہ حجاج نے مجھ سے کہا کہ قرآن کی ایک آیت نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کا معنی مجھے سمجھ نہیں آتا، اس کا معنی کیا ہے؟ شہر ابن حوشب کہتا ہے کہ میں نے پوچھا اے امیر! وہ کون سی آیت ہے؟ اس

نے کہا یہ آیت ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتَابِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ '' خدا کی قسم میں نے اس چیز کو آزمانے کے لیے یہودیوں اور مسیحیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور ان کی آخری سانسوں تک اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ دیکھ لوں کہ کیا اُن کے لب ہل رہے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی گواہی دیتے ہیں یا نہیں؟ لیکن میں نے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی ہے۔ شہر ابن حوشب کہتا ہے میں نے اس سے کہا خدا امیر کو سلامت رکھے، اس آیت کا معنی وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ حجاج نے پوچھا تو پھر اس کا معنی کیا ہے؟ تو میں نے کہا عیسیٰ علیہ السلام موت اور قیامت سے پہلے آسمان سے اُتریں گے۔ کوئی بھی ملت باقی نہیں رہے گی نہ یہودی نہ غیر یہودی مگر یہ کہ ان کی موت سے پہلے سب ان پر ایمان لے آئیں گے اور مہدی علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ حجاج نے جب یہ سنا تو کہا وائے ہو تم پر! تو نے مجھے یہ بات سمجھا دی، یہ کہاں سے تم بیان کر رہے ہو، تم نے یہ کہاں سے سنا ہے؟ میں نے کہا محمد بن علی علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا ہے۔ اس پر حجاج نے کہا میں اللہ کی قسم اُٹھا کر کہتا ہوں تو نے علم کے صاف اور پاکیزہ چشمہ سے یہ بات حاصل کی ہے۔

تفسیر درالمنثور میں ابن منذر سے اس نے شہر ابن حوشب سے بعینہ یہی روایت نقل کی ہے۔ البتہ تفسیر درالمنثور کی روایت اس آیت کی تفسیر کے متعلق ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتی ہے۔ اس روایت میں نقل ہوا ہے کہ جب کسی یہودی یا نصرانی کو موت آتی ہے تو فرشتے اُس کے آگے پیچھے سے اسے مارتے ہیں اور کہتے ہیں اے خبیث تم خیال کرتے تھے مسیح قتل ہو چکا ہے؟ وہ اللہ کا بندہ ہے اور وہ اللہ کی رُوح ہے۔ تو وہ شخص عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا لیکن اُس حالت میں ایمان لانا اُس کے لیے کوئی فائدہ نہ دے سکے گا۔ اللہ معاملات کے حقائق سے بہتر آگاہ ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

''سو یہودیوں کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان پر حلال تھیں اور اس سبب سے بھی کہ (وہ لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے''۔

یہودیوں کے لیے سزا

اس آیت میں ظلم سے اہل کتاب کے وہ بعض مظالم مراد ہیں جن کی وجہ سے کچھ حلال چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔ ان کا بار بار اللہ کے راستے سے رُوگردانی کرنا، سود کھانا، ایک دوسرے پر ظلم کرنا، دوسروں کا حق کھانا اور رسولوں پر ایمان نہ لانا، الٰہی قوانین کو پامال کرنا اور الٰہی قوانین پر عمل کرنے سے روکنا اس بات کا سبب بنا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ طیبات کو ان پر حرام کر دیا۔ البتہ یہ خود ان کے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔

وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

''اور ان کو سود لینے کے سبب سے حالانکہ اس سے منع کیے گئے تھے اور اس سبب سے کہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے تھے، اور ان میں سے جو کافر ہیں ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

یہودیوں کے دردناک عذاب کی وجہ

یہاں پر وہی یہودیوں کے حالات کا حوالہ ہے کہ انہوں نے کفر آمیز اعمال انجام دیئے جن میں سود خوری، لوگوں کا ناحق مال کھانا شامل تھا جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ کسی کے مال پر تجاوز اور زیادتی نہ کرو، ناجائز طور پر دوسروں کا مال مت کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ کفار کو ان کے کفر کی دو سزائیں ملیں گی ایک دُنیا میں جو عمومی بات تھی کہ وہ چیزیں جو ان پر حلال تھیں خود ہی انہوں نے اپنے اوپر حرام کر دیں اس کا پہلے بھی تذکرہ آچکا ہے کہ اونٹنی کا گوشت اپنے لیے حرام کر دیا اونٹ کا گوشت بھی حرام کر دیا جبکہ وہ حلال جانور تھے۔ دوسری سزا اخروی ہے جو سب کفار خاص کر یہودیوں کے لیے ہے اور وہ دردناک عذاب ہے۔ یہ عذاب ان کی اس بات کا نتیجہ ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ ہمارے اوپر اُمیوں کا کوئی حق نہیں ہے لہٰذا وہ سب لوگوں کے مال کو اپنے لیے حلال سمجھتے تھے اور کسی بھی ظلم اور زیادتی سے مضائقہ نہیں کرتے تھے۔ جن حقائق کو اپنی کتاب سے جان چکے تھے ان کا انکار کر دیا اور قرآن کو قبول نہ کیا اور رسول اسلام ﷺ کا ہی انکار کر دیا۔ انکے ان جرائم کی وجہ سے انکے لیے دردناک عذاب ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

”لیکن ان میں سے جو علم میں پختہ ہیں اور مسلمان ہیں وہ مانتے ہیں اس کو جو تجھ پر نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے نازل ہو چکا ہے، اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ

دینے والے ہیں اور اللہ اور قیامت پر ایمان لانے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم بڑا ثواب عطا فرمائیں گے"۔

علم میں پختہ مومنین کا اجر

اس آیت میں یہودیوں، مسیحیوں اور کفار کے علاوہ دوسرے افراد خاص کر رسول اللہ ﷺ کے پیروکار جو اہل کتاب میں سے ایمان لے آئے ہیں ان کا حوالہ ہے جن کے پاس علم راسخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ اُن کے پاس مضبوط علم ہے اور وہ مومن ہیں۔ وہ حقیقی ایمان والے ہیں جو پیغمبر اسلام ﷺ اور اس سے پہلے جتنے پیغمبر تھے انسب پر اور آسمانی کتابوں پر ایمان لائے ہیں اور ایمان لانے کے بعد نماز پڑھی، زکوۃ دی، اللہ پر ایمان لائے، روز جزاء پر ایمان لائے، یہ ان سے مستثنیٰ ہیں جنہوں نے انکار کیا۔ یہ اہل کتاب سے مختلف ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کے حق کو قبول کر لینے اور واجبات و فرائض کو انجام دینے اور باطل کو چھوڑ دینے کے بدلے ان کو عظیم اجر عطا کرے گا۔

اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ کَمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی نُوۡحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ۚ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ عِیۡسٰی وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡنُسَ وَ ہٰرُوۡنَ وَ سُلَیۡمٰنَ ۚ وَ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ﴿۱۶۳﴾ۚ

"ہم نے تیری طرف وحی بھیجی جیسے ہم نے وحی بھیجی نوح پر اور ان نبیوں پر جو اس کے بعد آئے، اور ہم نے وحی بھیجی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر، اور ہم نے داؤد کو زبور دی"۔

انبیاءؑ الٰہی کا تذکرہ

یہاں پر حضور پاک ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ آپ پہلے پیغمبر نہیں ہیں بلکہ آپ سے پہلے بھی بہت سارے پیغمبرؑ گذر چکے ہیں جن پر ہم نے وحی نازل کی، پہلا پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام تھے لیکن وہ صاحب کتاب نہیں تھے، پہلے صاحب کتاب اور صاحب شریعت پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام تھے اور حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دوسرے صاحب شریعت پیغمبر جن پر صحیفے اترے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور پھر آل ابراہیم علیہ السلام، جو کہ حضور پاک ﷺ خود بھی ہیں ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے جو انبیاء تھے ان کو ''اسباط'' کہا جاتا ہے بنی اسرائیل۔ اسی طرح باقی انبیاءؑ، پھر کچھ کے نام لیے ہیں جیسے داؤد پر زبور اتاری گئی، زبور لکھے ہوئے کے معنی میں ہے، لکھی ہوئی چیز، جس طرح کتاب مکتوب کے معنی میں ہے۔ پانچ نبی حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ اور محمد ﷺ صاحب شریعت ہیں۔

حضور اکرم ﷺ سب انبیاءؑ سے افضل ہیں اور ان پر کتاب قرآن نازل ہوئی اور یہی پانچ نبی اولوالعزم ہیں۔ ان کے علاوہ باقی انبیاءؑ صاحب شریعت اور اولوالعزم نہیں تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے انبیاءؑ آئے جن پر کتاب نازل نہیں ہوئی وہ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کی پیروی اور تبلیغ کرتے تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک جتنے بھی انبیاءؑ آئے وہ سب مبلغین تھے وہ سب حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کو لے کر چلے۔ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بھی اسی طرح تھا، حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے انبیاءؑ ان کی شریعت کو لے کر چلے۔ حضور پاک ﷺ کے بعد کوئی شریعت نہیں آنی اور قیامت تک بشر نے آپؐ کی شریعت پر عمل کرنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سارے انبیاءؑ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھیجے گئے ہیں سب پر وحی نازل ہوئی ہے، ان میں سے بعض پر کتاب اور شریعت اتری ہے۔ سب نے آکر برے کاموں سے روکا ہے اور برے کاموں کی سزا کو بیان کیا ہے اور لوگوں پر دلیل و حجت تمام کی ہے اور جو اُن کی عقل اچھائی اور برائی کی تمیز دیتی ہے اسی کی روشنی میں انہیں سمجھایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو ان کے لیے احکام ہیں وہ بتائے گئے ہیں، حرام اور حلال کی تمیز بیان کی گئی ہے، ان کے لیے واجبات اور محرمات بیان کئے گئے ہیں اور اللہ کی نافرمانی پر دُنیاوی و اخروی نقصان بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ بے خبر نہ ہوں اور لوگوں پر اللہ کی حجت تمام ہو اور ان کے پاس کوئی بہانہ نہ ہو کہ ہمیں معلوم نہیں تھا۔ اگر وہ اعتراض کریں تو ان سے کہا جائے گا کہ تمہارے پاس تو رسولؑ بھیجے گئے تھے کتاب بھی بھیجی گئی تھی جس میں سب کچھ بیان کیا گیا تھا تو کیوں اس پر عمل نہیں کیا۔

وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

"اور (ہم نے بھیجے) ایسے رسول جن کا حال اس سے پہلے ہم تمہیں سنا چکے ہیں اور ایسے رسول جن کے متعلق ہم نے تمہیں نہیں بتایا، اور اللہ نے موسیٰ سے خاص طور پر کلام فرمایا"۔

رسولوںؑ کا تذکرہ

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے سارے پیغمبروںؑ کے حالات تفصیل سے نہیں بتائے، ان میں سے کچھ کے حالات تفصیل سے بتائے ہیں جن میں حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے بات کی تھی اور وہ کلیم اللہ بنے، مخلوقات سے ایک آواز ایجاد ہوئی

اور اس آواز کے توسط سے اللہ نے موسیٰؑ سے تکلم کیا، یہاں تکلم سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی قدرت سے ایک آواز خلق کی جس آواز نے کہا میں اللہ ہوں اور موسیٰؑ سے گفتگو ہوئی۔ اسکا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ انبیاء میں سے کچھ کا ہم نے آپ کے لیے تذکرہ کیا ہے سب کا نہیں کیا لیکن یہ سارے اللہ کے ہی پیغام رساں تھے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

"(ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ ان لوگوں کا اللہ پر پیغمبروں کے بعد الزام نہ رہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے"۔

رسولوںؑ کو بھیجنے کا ہدف

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ انسان کے لیے عقل حجت باطنی قرار دی گئی لیکن انسان کی ہدایت کے لیے صرف عقل کافی نہیں، اسی لیے انبیاءؑ کو بھیجا گیا جو کہ حجت ظاہری ہیں، اُنھوں نے آکر لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا قانون رکھا اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے قوانین اور شریعتیں جو پیغمبروںؑ کے توسط سے بھیجیں وہ انسانوں کے لیے بتادی، تاکہ کل جب انسان کو اس کی بے عملی اور کفر کی وجہ سے سزا دی جائے تو اس وقت یہ نہ کہے اے اللہ! تیرا حکم اور تیرا پیغام ہمارے پاس آتا تو ہم گمراہ نہ ہوتے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو ہم نے تمہارے لیے کتاب بھیجی، انبیاءؑ بھیجے، واضح راستہ متعین کر دیا اس کے باوجود تم نے خلاف ورزی کی ہے تو اس کی سزا بھگتو۔ اللہ غالب بھی ہے اور اس کا ہر کام مصلحت کے تحت ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

"لیکن اللہ اس پر شاہد ہے جو تم پر نازل کیا، (اللہ نے) اسے اپنے علم سے نازل کیا، اور فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ کافی ہے گواہی دینے والا"۔

قرآن کی حقانیت پر اللہ اور فرشتوں کی گواہی

کیونکہ اہل کتاب قرآن کی حقانیت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ یہ پیغمبر اکرم ﷺ کے خیالات ہیں جو اس تحریر کی شکل میں آئے ہیں یا یہ شیاطین کے وسوسے ہیں جو حضور پاک ﷺ کے ذہن اور دماغ میں ڈالے گئے ہیں اور پھر وہ کتاب کی شکل میں آئے ہیں لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ فرمارہا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ قرآن علم الٰہی سے صادر شدہ ہے، اس میں کوئی باطل نہیں ہے اور فرشتے بھی اس قرآن کے اتارے جانے پر گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی ہی کافی ہے، قرآن سب انسانوں اور جنات کے لیے ہے۔ قرآن کے منکرین سے کہا ہے کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی مانند ایک آیت ہی تیار کرکے لے آؤ، تم اس سے عاجز ہو اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں، تو کیوں اس کا انکار کرتے ہو؟

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

"بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے"۔

راہ خدا میں رکاوٹ ڈالنے والے گمراہ

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرم ﷺ کو اپنا نمائندہ اور رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی طرف سے ہی کتاب آئی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ کتاب اُسی طرح سے ہے جس طرح پہلے نبیوںؑ پر وحی نازل ہوتی رہی ہے اور کتاب آتی رہی ہے اور اس کتاب میں اُسی طرح

گواہی ہے جس طرح پہلی کتابوں میں تھی، اللہ کی گواہی، فرشتوں کی گواہی۔ جو اس کو نہیں مانتے تو وہ کھلی گمراہی میں ہیں اور اُن کا کفر ثابت ہے اور وہ فکری اور اعتقادی اعتبار سے اور اپنے عمل کے اعتبار سے گمراہ ہیں، وہ دُنیا و آخرت میں خسارے میں ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ ظَلَمُوۡا لَمۡ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغۡفِرَ لَہُمۡ وَ لَا لِیَہۡدِیَہُمۡ طَرِیۡقًا ﴿۱۶۸﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر اور ظلم کیا اللہ انہیں کبھی نہیں بخشے گا اور نہ ان کو سیدھی راہ دکھائے گا''۔

قرآن کے منکرین کی سزا

جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لیے عقل بھی دی جو باطنی حجت و دلیل ہے۔ پھر انبیاءؑ بھی بھیج دیئے جو ظاہری حجت و دلیل ہیں اور کتابیں بھی بھیجیں، اگر کسی نے ان کو نہیں مانا، ان کا انکار کیا تو گویا اس نے خود اپنے اوپر ظلم کیا اور یہ ظلم کسی اور پر نہیں ہے، اپنے اوپر ظلم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین فطرت کے مطابق ہیں البتہ اُنہوں نے قوانین پر عمل نہیں کیا اور اُن کو تسلیم نہیں کیا، ان کا انکار کیا اور نفسانی خواہشات میں بہہ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک لمبی گمراہی میں ڈال دیا جہاں سے ان کی واپسی بھی ممکن نہیں ہے، اور وہ ہدایت بھی نہیں پا سکتے اور اللہ نے ان کو معاف بھی نہیں کرنا اور نہ ہی ان کے لیے ہدایت کا کوئی سامان دینا ہے کیونکہ انہوں نے خود ہدایت کا جو سامان اللہ نے بھیجا تھا اُس کا انکار کیا۔

اِلَّا طَرِیۡقَ جَہَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرًا ﴿۱۶۹﴾

''مگر دوزخ کی راہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور اللہ پر یہ آسان ہے''۔

منافقین کے لیے ابدی عذاب

جہنم کا راستہ ان کے لیے کھولا جا چکا ہے، اس کی وجہ وہ خود ہیں کیونکہ دُنیا میں انہوں نے ایسا طریقہ اپنایا تھا جو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے سے مختلف تھا لہٰذا وہ سبب بنا کہ جہنم کے راستے میں پڑ جائیں، جہنم کا راستہ خود انہوں نے اختیار کیا ہے۔ یہ اللہ کو تو عاجز کر نہیں سکتے، اللہ تو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور اللہ کے لیے مخلوق کا حساب لینا بھی آسان ہے اور کوئی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے لیے تو سوائے عقلی محالات کے جن میں موجود ہونے کی صلاحیت نہیں سب کام آسان ہیں۔ اس لیے ان کو سزا دینا ہے اور ان کو جہنم میں ڈالنا بھی اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔ اللہ کا تمام سسٹم ایک نظام کے تحت ہے، اور معلوم ہے کہ انہوں نے جہنم کا سبب خود مہیا کیا ہے تو اللہ نے اس پر مہر ثبت کر دی ہے اور اسی کے تحت ہی ان کا خاتمہ ہونا ہے اور ان کا جائزہ لیا جانا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

"اے لوگو! تمہارے پاس رسول آ چکا تمہارے رب کی طرف سے ٹھیک بات لے کر پس مان لو تاکہ تمہارا بھلا ہو، اور اگر انکار کرو گے تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے"۔

رسول اللہؐ پر ایمان لانے کا حکم

اس آیت میں تمام انسانوں کو خطاب کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا تمہارے لیے خیر اور بہتر ہے۔ ان پر ایمان لاؤ گے تو

تمہیں خیر اور بھلائی ملے گی کیونکہ خیر اور نیکی اس سے جدا نہیں ہے اور اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے، کفر اختیار کروگے تو یہ کفر اللہ کو کوئی نقصان نہیں دیتا، یہ فقط تمہارے لیے نقصان دہ ہے، تم سے دُنیا و آخرت کی خیر چھن جائے گی۔ وگرنہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔ ہر مخلوق کی موجودیت اور اس کا موجود ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مملوک خدا ہے اور جو خدا کے ملک میں ہے اس کا اپنا پھر کوئی اختیار نہیں ہوتا، اسے اسی نہج پر چلنا ہوتا ہے جو اس کے مالک نے اس کے لیے قرار دیا ہے اور جو اپنے مالک کی مخالفت کرتا ہے تو پھر اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا سارا نظام علم اور قدرت کے تحت ہے اور پوری کائنات ایک مصلحت اور حکمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بنائے گئے نظام اسباب و مسببات کے تحت چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء اور اُن کے آثار پر محیط ہے۔اس لیے انسانوں کا کفر، ایمان، اطاعت اور معصیت سب اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے متعلق علم اور تدبیر کے تحت ہی رویہ اپناتا ہے۔

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ وَلَا تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلۡحَقَّۚ إِنَّمَا ٱلۡمَسِيحُ عِيسَى ٱبۡنُ مَرۡيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلۡقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرۡيَمَ وَرُوحٞ مِّنۡهُۖ فَـَٔامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦۖ وَلَا تَقُولُواْ ثَلَٰثَةٌۚ ٱنتَهُواْ خَيۡرٗا لَّكُمۡۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٞ وَٰحِدٞۖ سُبۡحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٞۘ لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلٗا ﴿١٧١﴾

”اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو اور حق بات کے علاوہ اللہ کی شان میں کچھ نہ کہو، بے شک مریم کا بیٹا مسیح عیسیٰ اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہے، سو ایمان لاؤ اللہ

پر اور اس کے سب رسولوں پر، اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس بات کو چھوڑ دو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا، بے شک اللہ اکیلا معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے اس کی اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کارساز کافی ہے"۔

دین میں غلو نہ کرو

اس آیت میں تمام اہل کتاب کو خطاب کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حد و حدود کو نازل کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے اس سے آگے نہیں بڑھو اور باطل گفتگو مت کرو، خدا کی طرف غلط نسبت نہ دو اور یہ مت کہو کہ مسیح یا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے مت جانو یا تین خداؤں کے قائل مت ہو جاؤ حالانکہ حق بات تو یہ ہے کہ عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں اور اللہ کی مخلوق اور اللہ کے عبد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ''کُن'' کہہ کر ان کو خلقت کا لباس پہنایا ہے اور مریمؑ کے اندر اُس کے وجود کو محقق کیا ہے، حالانکہ وہ جو موجود مریمؑ کے رحم میں ڈالا گیا تو وہ رُوح مخلوق تھی جو اللہ کی جانب سے تھی۔

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں دونوں اللہ کی مخلوق ہیں لہٰذا تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ باپ بیٹا اور رُوح القدس کے عقیدے کو چھوڑ دو۔ کیونکہ اللہ یگانہ معبود ہے وہ یکتا اور اولاد اور بیٹا رکھنے سے منزہ ہے کیونکہ بیٹا اپنے باپ کی مانند ہوتا ہے، خدا کا مثل اور مانند ہی نہیں ہے وہ یگانہ اور واجب الوجود ہے اور وہ برتر ذات ہے ایسی اباطیل اور غلط باتوں سے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کا ہے وہ سب اللہ کی مخلوق ہے وہ سب اللہ کی مملوک ہیں۔ خدا انسان کے تمام حالات کا ولی ہے اور اس کے سارے امور کا مدبر اور اُن کا تدبیر کرنے والا ہے اور لوگوں کو اس چیز کی طرف ہدایت کرتا ہے جس میں اُن کی خیر ہے اور انہیں صراط مستقیم کی راہنمائی دیتا ہے۔

لَنۡ یَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِیۡحُ اَنۡ یَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ یَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَ یَسۡتَكۡبِرۡ فَسَیَحۡشُرُهُمۡ اِلَیۡهِ جَمِیۡعًا ﴿۱۷۲﴾

''مسیح خدا کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہیں کرے گا اور نہ مقرب فرشتے، اور جو کوئی اس (اللہ) کی بندگی سے انکار کرے گا اور تکبر کرے گا پھر وہ ان سب کو اپنی طرف اکھٹا کرے گا''۔

مسیحؑ بندہ خدا

انجیل کے سارے نسخوں میں واضح ہے کہ عیسیٰؑ، خدا کی عبادت کرتے تھے۔ جب عیسیٰؑ، خدا کی عبادت کرتے تھے تو پھر کوئی معنی نہیں رکھتا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہوں کیونکہ بیٹا کبھی باپ کی عبادت نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں ہے کہ وہ خود خدا ہوں کیونکہ خدا کبھی بھی دوسرے خدا کی پرستش نہیں کرتا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ تین خداؤں میں سے ایک خدا ہو کیونکہ ایک خدا دوسرے خدا کی پرستش نہیں کرتا، پس مسیح اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسول ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ سارے فرشتے بھی اللہ کے مقرب بندے ہیں وہ نہ تو اللہ کی بیٹیاں ہیں اور نہ ہی معبود ہیں۔ وہ بندے ہیں اور خود اس سے انکاری نہیں ہیں وہ اللہ کی بندگی اور عبادت کرتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ اللہ کی درگاہ کے مقرب فرشتے نہ ہوتے۔ لہٰذا جن اور انس اگر اللہ کی عبادت نہیں کریں گے، تکبر کریں گے تو عنقریب وہ اللہ کے حضور پیش ہوں گے اور اُن کو اس کی سزا ملے گی۔

کلمہ ''یَسۡتَكۡبِرۡ'' ''یَّسۡتَنۡكِفَ'' کے بعد آیا ہے، استنکاف، انسان کا کسی بات سے ناراض ہونے، ناپسند کرنے اور ناک بھوں چڑھانے کے معنی میں ہے۔ استنکاف دو قسم کا ہے ایک وہ استنکاف جو نادانی اور کوتاہ فکری کی وجہ سے ہوتا ہے دوسرا تکبر کی وجہ سے ہوتا

ہے لہٰذا ہر قسم کا استنکاف اللہ کی ناراضگی کا سبب نہیں ہے، ایسا استنکاف اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے جو تکبر کی وجہ سے ہو۔ اس بنا پر جتنی مخلوقات ہیں چاہے بری ہوں یا اچھی؛ اگر تکبر کی وجہ سے اللہ کی عبادت نہیں کرتیں تو خداوند تبارک وتعالیٰ قیامت کے دن ان کو سزا دے گا اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۬ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

''پھر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے انہیں ان کا پورا ثواب دے گا اور انہیں اپنے فضل سے زیادہ دے گا، اور جن لوگوں نے انکار کیا اور تکبر کیا انہیں درد دینے والا عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں پائیں گے''۔

مومنین اور کفار کا انجام

اس جگہ ابتداء میں تو اہل ایمان اور اُن کے اچھے عمل کی بات ہوئی ہے کہ وہ اللہ کی عبادت سے ناک بھوں نہیں چڑھاتے اور تکبر نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے کچھ اضافہ بھی عطا کرے گا۔ لیکن جو لوگ اللہ کی عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں، انکاری ہو جاتے ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اللہ کے حضور نہیں جھکتے اور اللہ کے احکام کی پیروی نہیں کرتے تو پھر ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ان کو عذاب دینے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حق سے رُوگردانی کی ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت کا حق ادا نہیں

کیا ہے اور اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنے لیے ولی اور سرپرست بنایا ہے۔ حضرت مسیحؑ یا فرشتوں کو معبود ماننے کا عقیدہ باطل ہے۔ معبود برحق فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی اتاری ہے"۔

اللہ کی جانب سے واضح دلیل

"برہان" کا مطلب ہوتا ہے روشن اور واضح ثبوت، "نور" سے مراد یہاں قرآن ہے اور قرآن کے برہان ہونے سے مراد یہ ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور پیغمبری کا روشن اور واضح ثبوت ہے۔ اس بنا پر دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید میں ہوں گے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ برہان سے رسول اللہ ﷺ مراد ہوں کیونکہ یہ جملہ اوپر والے جملے کے ذیل میں آیا ہے جو رسول اللہ ﷺ اور ان کی رسالت کی صداقت کو بیان کر رہا ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ کہا جائے قرآن تمہارے پاس آیا ہے کیونکہ قرآن نازل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس معنی میں لیں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ تمہارے پاس رسولؐ آیا ہے جو اللہ کے وجود پر دلیل ہیں اور تمہارے پاس قرآن کتاب اتاری گئی ہے وہ بھی اللہ کے وجود پر دلیل و ثبوت ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾

''سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انھوں نے اسے مضبوط پکڑا تو انہیں وہ اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور اپنے تک ان کو سیدھا راستہ دکھائے گا''۔

اللہ کا سیدھا راستہ

یہ عبارت ان لوگوں کا ثواب بیان کر رہی ہے جو پروردگار کے برہان اور اس کے اتارے گئے نور کی پیروی کرتے ہیں قرآن اور پیغمبر اکرم ﷺ سے متمسک ہیں اُن کی باتوں کو اور اُن کے پیغام کو تسلیم کرتے ہیں اور اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ان کے ایمان کی پوری پوری جزاء دے گا، اپنے فضل و کرم سے ان کے اچھے اعمال سے زیادہ ان کو اجر دے گا اور صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے متمسک ہونا، اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہونے کا معنی سورہ آل عمران کی 101 میں بیان ہو چکا ہے کہ ''جو اللہ کے ساتھ متمسک ہو گیا اور اُس کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ لیا تو وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت یافتہ ہو گیا''۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''تجھ سے حکم دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ اللہ تمہیں کَلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے، اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اسے اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا، اور وہ شخص اس بہن کا وارث ہوگا اس صورت میں کہ

بہن کی کوئی اولاد نہ ہو، اور اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا، اور اگر چند وارث بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا، اللہ تم سے اس لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔

کلالہ کے احکام

''كَلاَلَة''اس مرنے والے کو کہتے ہیں جس کی اولاد نہ ہو۔ ''استفتاء'' کا معنی فتویٰ مانگنا، حکم طلب کرنا کہ فلاں شئے کا حکم کیا ہے۔ البتہ اس بات پر اجماع ہے کہ جو حکم کلالہ کے بارے میں اس آیت میں بیان ہوا ہے وہ اس کلالہ کا حکم ہے جس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں کیونکہ اگر مرنے والے کے ماں باپ زندہ ہوں تو خداوند تبارک و تعالیٰ نے وراثت میں اُن کا حصہ بیان کیا ہے۔ لہٰذا اگر مرنے والے کی وارث اُس کی ایک بہن ہو تو اس کو میراث کا آدھا حصہ ملے گا۔ اسی طرح اگر بہن مر جائے اور اس کا ایک بھائی اس کا وارث ہو تو سارا ارث بھائی کو ملے گا۔ اگر دو بہنیں وارث ہوں تو ان کو میراث کے دو حصے ملیں گے۔ اگر ایک بہن اور ایک بھائی ہوں تو وہ دونوں وارث ہوں گے اور بھائی کو بہن کے حصے کا دوگنا ملے گا۔

وارث کا مرد یا عورت ہون کا میت سے وراثت لینے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اگر میت کے وارث دو بھائی ہوں تو ان دونوں میں سارا مال نصف نصف کرکے تقسیم ہو گا۔ یہ احکام اس لیے بیان کئے گئے ہیں کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ اللہ کو سب کا علم ہے اور اللہ ہی قانون بناتا ہے اور وہی تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرکے گمراہ نہ ہو جاؤ۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''کلالہ'' کا جو حکم بیان ہوا یہ اس مورد کے ساتھ مختص ہے جہاں میت کے وارث اس کے سگے بہن بھائی ہوں یا ایک باپ سے ہوں

۔ لیکن اگر دونوں طرح کے بہن بھائی مرنے والے کے وارث ہوں یعنی سگے بہن بھائی اور باپ کی طرف سے ایک بہن مرنے والے کے وارث ہوں تو پدری بہن کو ارث نہیں ملے گا۔